ملاقاتیں

(مشاہیر کے انٹرویو)

ترتیب

پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

ملاقاتیں

(مشاہیر کے انٹرویو)

ترتیب

پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2015
تعداد : 550
قیمت : -/241 روپے
سلسلۂ مطبوعات : 1844

MULAQATEIN

(Mashaheer Ke Interview)

Complied by: Prof. Khwaja Md. Ekramuddin

ISBN : 978-93-5160-074-9

ناشر: ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8 آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066
فون نمبر: 26109746، فیکس: 26108159 ای میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرز، گلی گڑھیا، بازار مٹیا محل، جامع مسجد دہلی۔ 006 110
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل

برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم و فنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

پروفیسر سید علی کریم
(ارتضیٰ کریم)
ڈائریکٹر

فہرست

	دیباچہ		پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین	xi
	جن سے باتیں ہوئیں		ملاقاتی	
	فکشن			
1	قرۃ العین حیدر سے گفتگو		نمائندہ فانا	02
2	کرشن چندر سے ایک مکالمہ		مشتاق اعظمی	05
3	عصمت چغتائی		کنہیالال ٹنڈن	10
4	قاضی عبدالستار		ممتاز عالم	20
5	انتظار حسین		رشید انصاری	34
6	جوگندر پال	i	خوشنودہ نیلوفر	46
7	ایضاً	ii	مکتی ورما	58
8	شوکت حیات		ممتاز عالم رضوی	65
9	عبدالصمد	i	حیدر علی	74
10	ایضاً	ii	ظفر اعظمی	80
11	سلام بن رزاق		فیروز عالم	86
12	علی احمد فاطمی		ممتاز انور	93

13	منشایاد	اسد فیض	99
14	احمد یوسف	نسیم احمد نسیم	112
15	اقبال مجید	وسیم اختر	118
16	کملیشور	مشتاق صدف	125
17	امریتا پریتم	مکتی ورما	133
18	غضنفر	صفدر امام قادری	137
19	اظہار اثر	ممتاز عالم رضوی	143
20	مظہرالزماں خان	مشتاق صدف	157
21	رتن سنگھ	ممتاز عالم رضوی	165
22	ڈاکٹر رضوان احمد	مناظر عاشق ہرگانوی	174
23	عابد سہیل	ممتاز عالم	184
24	ویریندر پٹواری	فیروز عالم	195
25	رشید امجد	اسد فیض	202
	ڈرامہ		
26	حبیب تنویر	راجیش کیسرا، ترجمہ: رئیس احمد	210
	لسانیات		
27	مرزا خلیل احمد بیگ	i وحید الحق	216
28	ایضاً	ii سمیہ نسرین	230
29	نصیر احمد خان	معید رشیدی	242
30	علی رفاد فتیحی	فیروز عالم	250
	تنقید		
31	محمد حسن	جمیل اختر	262
32	وہاب اشرفی	شہاب ظفر اعظمی	265
33	پروفیسر گوپی چند نارنگ	نند کشور وکرم	271
34	شمس الرحمٰن فاروقی	عزیزہ بانو	280

35	شمیم حنفی	اظہار احمد ندیم	299
36	عتیق اللہ	عبدالحی	303
37	شکیل الرحمٰن	حقانی القاسمی	316
38	سلیم اختر	اسد فیض	322
	تحقیق		
39	خلیق انجم	جاوید رحمانی	330
40	تنویر احمد علوی	اظہار ندیم	342
41	نجے گوڈبولے	فیروز عالم	350
	ترجمہ		
42	ساجدہ زیدی	مشتاق صدف	358
43	بیدار بخت	فیروز عالم	366
	طنز و مزاح		
44	مجتبیٰ حسین	فیروز عالم	374
45	سید مصطفےٰ کمال	فیروز عالم	385
	صحافت		
46	سنتوش بھالیہ	اردو دنیا	398
47	جان میکنسن	مکند پدمنابھن، ترجمہ: معین الدین	404
	تعلیم		
48	محمد علی اشرف فاطمی	ایم۔این۔شاہنواز	412
49	پروفیسر بصیر احمد خاں	محمد نثار	417
50	سید حامد	اظہار احمد ندیم	422
51	پروفیسر مشیر الحسن	سکینہ یوسف خاں	431
52	کرشن کمار	مانش پریتم گوہن، ترجمہ: مشرف علی	435
53	یشپال	مانش پریتم گوہن، ترجمہ: مشرف علی	441

شاعری

54	شہریار	i	عبدالاحد ساز	446
55	ایضاً	ii	فرحان حنیف	455
56	ایضاً	iii	علی ظہیر	462
57	احمد فراز	i	رخشندہ جلیل، ترجمہ: ظفر انصاری	468
58	ایضاً	ii	سلیم صدیقی	473
59	مغنی تبسم		محمد ظفر الدین	477
60	کلیم عاجز		شہاب ظفر اعظمی	483
61	مظہر امام		مکتی ورما	490
62	رفعت سروش		مکتی ورما	497
63	مظفر حنفی		ممتاز عالم رضوی	505
64	شاہد حسن کمال		فیاض عالم	517
65	علقمہ شبلی		محمد افضل خاں	522
66	زبیر رضوی	i	شہپر رسول	526
67	ایضاً	ii	خوشنودہ نیلوفر	538
68	چانگ شی شوان		ونودوار شنے، ترجمہ: فیاض عالم	544

متفرقات

69	رامسے کلارک	مارکس ڈام، ترجمہ: معید الرحمٰن	548
70	شاہ فیصل	پرویز عالم	554
71	ایتابھ گھوش	نوناوالیا، ترجمہ: فضیل خاں	559
72	دیوآنند	سبھاش کے جھا، ترجمہ: شکیل احمد	563
73	اے۔کے۔ہنگل	فیروز عالم	566
74	غلام علی	گورو ٹھاکر، ترجمہ: امتیاز عالم	571
75	پدم شری پروفیسر اختر الواسع	قاسم انصاری	573

دیباچہ

انٹرویو استفسار کا فن ہے، جو دورِ جدید کے صحافتی شعبہ میں معلومات کی حصولیابی کا موثر ذریعہ تصور کیا جاتا ہے۔ یہ دو انسانوں کے مابین ہونے والی گفتگو ہے جس میں ایک سوال کرتا جبکہ دوسرا ان استفسارات پر اظہارِ خیال کرتا ہے۔ انٹرویو کسی مسئلہ، موضوع یا معاملہ میں اس مخصوص شعبہ سے متعلق فرد یا شخصیت کے تجربات، مشاہدات اور خیالات سے آگہی کے حصول میں استعمال ہونے والے طریقۂ کار یا منہج کا نام ہے۔ اس سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ یہ فن مزاجاً محض معلومات کے اکٹھا کرنے جیسی تکنیک سے بالکل مختلف ہے، اس کی کامیابی کا انحصار محض اس پر نہیں کہ انٹرویو کے لیے کتنی بڑی شخصیت کا انتخاب کیا گیا ہے بلکہ اس پر زیادہ ہے کہ انٹرویو کار اس مخصوص شعبہ کے مالہ و ماعلیہ سے کس قدر واقف ہے۔ ساتھ وہ مطلوبہ شخصیت کے کارنامے، مہارت، اس کے رویہ، دورانِ انٹرویو اس کی کہی اور ان کہی باتیں اور حرکات و سکنات کے بین السطور در پردہ مطلوبہ حقائق کا بھی پتہ لگا لے اور اسے Interviewee سے کہلوا لے۔ اس طرح انٹرویو دو طرفہ عمل ہے۔ خطوط اور خطابت کے مزاج کی طرح یک طرفہ نہیں۔

معلومات کی براہ راست حصولیابی تو دونوں میں ہے، تاہم یہ مذاکراتی یا مکالماتی طرز معلومات کا فن ہے۔

انٹرویو لینے والے کو انگریزی میں اصطلاحاً 'Interviewer' جبکہ انٹرویو دینے والے کو 'Interviewee' کہا جاتا ہے۔ صحافت کے حدود سے نکل کر اب یہ پریکٹس علم وآگہی کے جملہ شعبوں میں رائج ہے، جہاں نمایاں شخصیات اور افراد اس کا ہدف ہوتے ہیں۔ اردو مزاج سے ہم آہنگ 'ملاقات نگاری' غالباً انٹرویو کے پورے جامع تصور کی نمائندہ اردو اصطلاح خیال کیا جاتا ہے۔ محادثہ، گفتگو، بات چیت، مصاحبہ، مکالمہ، مخاطبہ بھی لفظِ انٹرویو کے آس پاس کے مفہوم میں بولا اور سمجھا جاتا ہے، تاہم اس سلسلہ میں جوش ملیح آبادی کی رائے زیادہ درست معلوم ہوتی کہ انگریزی کی دیگر اصناف کی طرح اردو میں بھی اسے 'انٹرویو' ہی کہا جائے اور اسی مناسبت سے انٹرویو نگار جیسی اصطلاح کو عام کیا جاسکتا ہے۔

انٹرویو کی صنفی حیثیت ابھی سرِ راہ ہے۔ ابھی قطعیت سے اس پر بہت کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔ ہرچند کہ سلیم شہزاد نے ادبی شخصیات سے انٹرویو کو صنفی دائرہ میں لانے کی بات کہی ہے اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے اسے ادبی صنف بتایا ہے، تاہم اس کے حدود و قیود اور دائرہ کا تعین ابھی باقی ہے۔ اس کے باوجود اس کی روز بہ روز بڑھتی مقبولیت اور افادیت کئی معنوں میں اسے صنفی حیثیت سے قریب کرتے ہیں۔

معیاری تحقیق کے شعبہ میں انٹرویو کی حیثیت ایک افادی آلہ کی ہوتی جارہی ہے۔ حالیہ دنوں میں قاموسی شخصیت کے حامل ماہرین سے انٹرویو نئے علمی ابعاد کی تلاش وجستجو میں پیش خیمہ ثابت ہوا ہے۔ انٹرویو سے حاصل شدہ علمی ذخائر اب دستاویزی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی حیثیت براہِ راست معلومات کی ہے، جن پر انٹرویو دینے والی شخصیت کا پرتو اور استناد کی مہر ثبت ہوتی ہے، اس تناظر میں اس کی خود مکتفی صنفی حیثیت بعید از مکان نہیں۔

انٹرویو کو بنیادی طور پر دو زمروں میں رکھا جاتا ہے، دو بدو انٹرویو اور مراسلاتی انٹرویو۔ طاقتور میڈیا کے اس عہد میں روبرو انٹرویو کی صورتیں بھی تبدیل ہوئی ہیں۔ مثلاً ٹیلیفون پر انٹرویو لیتے وقت ساعت کی حد تک دو متکلم روبرو ہوتے ہیں جبکہ فی الواقع دونوں میں میلوں کا فاصلہ ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں انٹرویو کار شخصیت کے حرکات و سکنات کا بالکل بھی اندازہ نہیں لگا پاتا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ دو بدو انٹرویو ہے؟ اگر نہیں تو لازماً اس کی اخلاقیات بھی انٹرویو کی دوسری صورتوں سے مختلف نوعیت کے ہوں گے۔ جبکہ میلوں کے فاصلہ پر بیٹھ کر ویڈیو کانفرنسنگ کے ذریعہ انٹرویو کار شخصیت سے بالکل اسی طرح ہم کلام ہوجاتا جیسے کہ ایک کمرہ کے دو مختلف کرسیوں پر بیٹھے گفتگو ہو رہی ہو، اس کا دائرہ کار کیا ہوگا۔ اس طرح کے اور گوشے ہیں جن پر صنفی حیثیت سے مباحثہ کی ضرورت ہے۔

مراسلاتی انٹرویو البتہ سوالناموں پر مبنی انٹرویو ہے، جس میں سوال لکھ کر دے دیئے جاتے ہیں اور ان پر مطلوبہ فرد کے خیالات تحریری صورت میں حاصل کر لیے جاتے ہیں۔ فنی نقطۂ نظر سے یہ انٹرویو، روبرو انٹرویو کی جملہ صورتوں سے جداگانہ حیثیت کا حامل ہے۔ ظاہر ہے اس کے صنفی حدود بھی مختلف ہوں گے۔

انٹرویو اپنے موجودہ ہیئت میں خاصا میکانیکی ہوتا جارہا ہے۔ کیمرہ، فوٹوگرافر، جگہ کا انتخاب، انٹرویو دینے والے اور انٹرویو کار کے نشست و برخاست کا طریقۂ کار، حرکات و سکنات وغیرہ ایسے پہلو ہیں جنھیں کامیاب انٹرویو میں کلیدی اہمیت دی جاتی ہے۔ Seidman نے معیاری تحقیق کے تعلق سے انٹرویو کے کردار پر ذیل میں جو اشارے دئے ہیں، انہیں کامیاب انٹرویو کا لازمی عنصر گردانا جاسکتا ہے۔

- دونوں فریقین کا ایک دوسرے کو بغور سننا کامیاب انٹرویو کا وصف ہے۔ خیال رہے کہ انٹرویو دینے والا شخص فی الواقع کیا کہہ رہا ہے۔ ساتھ ہی اس امر پر بھی چوکنا

رہنا ہوگا کہ اس کا اندرونی منشا (Inner Voice) کیا ہے۔ یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ کہیں انٹرویو طویل تو نہیں ہو رہا ہے۔ دلچسپی برقرار ہے یا انٹرویو دینے والا اوب تو نہیں گیا، تھک تو نہیں گیا، اب انٹرویو کار کے پاس کتنے سوالات ہیں اور وقت کتنا باقی ہے، خیال رہے کہ گفتگو باقاعدہ ریکارڈ ہو تا کہ کہی ہوئی بات بعینہ قارئین تک پہنچ سکے۔

- انٹرویو کار عموماً انٹرویو سے قبل تیاری کرتا ہے اور انٹرویو کے لیے ذہن بناتا ہے۔ تاہم اپنے متعینہ سوالات پر انٹرویو میں اسے مزید وضاحتی سوالات کرنے پڑتے ہیں۔ یہ وضاحتیں متعینہ گوشے پر مزید معلومات کا سبب بنتے ہیں جس سے مخفی پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔
- انٹرویو کار کو اپنے حدود اور دائرۂ کار کا پاس لازم ہے۔ سوالات احترام کے دائرہ میں ہوں تا کہ انٹرویو دینے والا اپنی باتیں بتانے میں آپ کے تئیں ذمہ دارانہ اعتماد محسوس کرے۔ انٹرویو دیتے وقت اسے کسی قسم کا تکلف یا بے اطمینانی نہ ہو۔ عین ممکن ہے کہ انٹرویو دینے والا کسی مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے Defensive ہو جائے اور مزید کچھ کہنے سے گریز کرے ایسی صورت میں یہ انٹرویو کار کی صلاحیت پر منحصر ہے کہ وہ انٹرویو میں کس طرح توازن اور اعتدال پیدا کرے۔ اس طرح کہ آگے کے سوالات متاثر نہ ہونے پائیں۔
- انٹرویو کار کو اس امر کا خیال رکھنا ہوگا کہ انٹرویو کے دوران انٹرویو دینے والے کی بات میں غیر ضروری طور پر مخل نہ ہو۔ عین ممکن ہے کہ وہ کسی مخصوص نکتہ پر عدم دلچسپی کا شکار ہو جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انٹرویو دینے والا متعینہ خطوط سے اگر بہک رہا ہے تو یہ بھی انٹرویو کار کی فنکارانہ مہارت ہے کہ اسے موضوع سے منحرف نہ ہونے دے۔

- انٹرویو دینے والے کو دورانِ انٹرویو وہ ماحول فراہم کیا جائے جس میں وہ کھل کر ذاتی طور پر اور احساس کی سطح پر اپنی باتیں رکھ سکے۔ یعنی انٹرویو کار کا برتاؤ دوستانہ اور افرادِ خانہ جیسا ہو، اس طریقہ کو اپنا کر در پردہ مخفی مافی الضمیر کی آواز بھی زبان پر لائی جاسکتی ہے۔

انٹرویو کی اخلاقیات میں انٹرویو کار کا وضع قطع، شائستہ لباس، چاق و چوبند اور ہشاش بشاش رہنا غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی طرح انٹرویو کے لیے متعینہ وقت کا پاس، قبل از وقت پہنچنا، سوال نامہ کی تیاری انٹرویو کے لوازم ہیں۔ الکٹرانک میڈیا میں انٹرویو نشر ہونے کے اوقات سے انٹرویو دینے والے کو مطلع کیا جانا اور انٹرویو شائع ہونے کی صورت میں اس کی ایک کاپی بطور ریکارڈ انٹرویو دینے والے کو دیا جانا، انٹرویو کی بنیادی اخلاقیات میں شامل ہے۔

اس اجمالی بحث سے یہ نکتہ تو صاف ہو جاتا ہے کہ انٹرویو دستاویزی قدر و منزلت کا حامل فن ہے جس کے وسیلے سے گراں قدر علمی شخصیات کے تجربات و مشاہدات کا براہ راست علم ہوتا ہے۔ ''ملاقاتیں'' انٹرویو کے تعلق سے ہماری اسی سوچ کا حاصل ہے۔ این سی پی یو ایل کی ذمہ داری قبول کرتے ہی ہم نے محسوس کیا کہ ادارہ کا ترجمان ماہنامہ اردو دنیا میں علم و تحقیق کے شعبہ کی بڑی وقیع شخصیات کا گراں قدر علمی کارنامہ انٹرویو کی شکل میں بکھرا ہوا ہے۔ ''ملاقاتیں'' میں وہ تمام انٹرویو یکجا کردیے گئے ہیں۔ قاری کی سہولت کی خاطر انھیں فکشن، ڈرامہ، لسانیات، تنقید، تحقیق، ترجمہ، طنز و مزاح، صحافت، تعلیم، شاعری اور متفرقات کے زمروں میں رکھا گیا ہے۔ جس کی مجموعی تعداد 75 ہے۔ یہ علمی اعتبار سے بڑے متمول اور گراں قدر شخصیات کے انٹرویو ہیں۔ جن کا اپنے متعلقہ شعبہ میں وقیع تجربہ ہے۔ ان میں تحقیقی نقطۂ نظر سے بیش بہا خزانہ موجود ہے، جسے اہلِ علم و دانش کے روبرو اس توقع سے پیش کیا جاتا ہے کہ اس سے ادب کے لیے نئے خطوط فراہم ہوں گے۔

پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

28/ جنوری 2014

فکشن

قرۃ العین حیدر سے گفتگو

(گیان پیٹھ ایوارڈ پانے کے بعد، قومی آواز، 25 جولائی 90)

سوال: آپ نے اپنے ناولوں اور افسانوں کے لیے اردو کو کیوں اظہار کا ذریعہ بنایا جبکہ آپ انگریزی پر بھی اتنی قدرت رکھتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آج کا ایک عام اردو قاری آپ کی تحریروں کی گہرائیوں کو پانے سے قاصر رہتا ہے خصوصاً آپ کا وہ طرز تحریر جس میں آپ اشاروں اور کنایوں میں تاریخی ادوار کے حوالے دیتی ہیں۔ اس سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ آپ صرف مخصوص طبقے ہی میں پڑھی جاتی ہیں؟

جواب: بات ایسی نہیں ہے۔ اگر میری تصانیف عام اردو قاری کی فہم سے بالاتر ہوں تو پھر میں پوچھوں گی کہ پھر وہ اتنی زیادہ تعداد میں کیوں پڑھی جاتی ہیں۔ ہاں البتہ میں اتنا ضرور کہوں گی کہ سنجیدہ ادیب، سنجیدہ طبقے اور صائب الرائے طبقے میں ہی پڑھے جاتے ہیں۔ مقبول عام لٹریچر کی صنف دوسری ہے جیسا کہ گلشن نندہ اور ابن صفی جن کو صحیح معنوں میں عوامی ادیب کہہ سکتے ہیں۔

اردو میری مادری زبان ہے اور میں اردو میں کیوں نہ لکھوں؟ میں جس طرح کی چیزیں لکھتی ہوں ان کا انگریزی میں موثر طور سے اظہار نہیں کیا جاسکتا۔ اردو ہندوستانی تہذیب کی عکاس ہے۔ یہ فضا سازی انگریزی میں نہیں ہوسکتی۔

سوال: کیا آپ سمجھتی ہیں کہ آپ کا ناول ''آگ کا دریا'' جس تہذیبی ماحول کا عکاس ہے وہ آج کے ہندوستان کے حالات سے بھی مناسبت رکھتا ہے؟

جواب: ہندوستان کے بڑے حصے میں بولی جانے والی زبانوں میں لکھے گئے ناولوں کے پس منظر ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے ہی عکاس ہوتے ہیں۔

سوال: اردو ناول اپنی منظر کاری میں متمول اور جاگیردار گھرانوں کے گرد ہی کیوں گھومتے ہیں اور اردو شاعری جام وساقی کی بندشوں سے آزاد کیوں نہیں ہوتی؟

جواب: ایسا نہیں ہے۔ اردو میں بھی ہر قسم کے ادیب، مصنف، شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ پریم چند دیہی ماحول اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے عکاس تھے، عصمت چغتائی نے متوسط طبقے کے ماحول کو پس منظر بنایا۔ حیات اللہ انصاری کا آنے والا ناول ''لہو کے پھول'' دیہی پس منظر پر مبنی ہے۔

اردو ادب انتہائی جدید اور انتہائی توانا ادب ہے اور نئے رجحانات کی عکاسی میں دیگر زبانوں کے ادب سے پیچھے نہیں۔ اردو ادب کو ایک ہی ہیئت پر مرکوزیت کا شکار کہنا مناسب نہیں ہوگا۔ البتہ یہ ٹھیک ہے کہ انسان جس ماحول میں رہتا ہے اسی ماحول کی نمائندگی کرتا ہے۔

سوال: آزادیٔ نسواں کے سلسلے میں آپ کا نقطۂ نظر نہ جدت پسندوں سے میل کھاتا ہے نہ قدامت پرستوں سے؟

جواب: ہر چیز میں اعتدال ہونا چاہیے۔ آزادی ایک اضافی اصطلاح ہے۔ آزادی کی حدود اس طرح متعین کی جانی چاہئیں کہ وہ ماحول کی ضروریات کے مطابق ہوں اور کسی کو سماجی طور سے نقصان نہ ہو۔ حد سے زیادہ آزادی سے مغرب میں جو نقصان ہو رہا ہے ظاہر ہے۔ اس حد سے زیادہ تجاوز کردہ آزادی نے خاندانوں کا شیرازہ بکھیر دیا ہے۔

سوال: ''گردشِ رنگ چمن'' میں آپ نے تصوف کو مسترد بھی کیا ہے اور سراہا بھی ہے؟

جواب: میں نے اس موضوع پر مکمل غیر جانبدارانہ اور معروضی انداز سے گفتگو کی ہے۔

سوال: مشرقی یورپ اور روس میں کمیونزم اور سوشلزم کی پسپائی سے آپ کے خیال میں ترقی پسند ادب کی تحریک پر کیا اثرات مرتب ہوں گے؟

جواب: اب کوئی ترقی پسند تحریک باقی نہیں رہی۔ یہ تحریک بہت قبل ہی ناکام ہو چکی ہے۔ حالات میں مسلسل تغیر آتا رہا ہے بلکہ کئی ''ترقی پسند'' خود اپنے ان کٹر نظریات کو ترک کر چکے ہیں۔ تیسری دنیا کے مصنفین پر ان تغیرات کا اثر لازمی ہے کیونکہ ان ادبا اور مصنفین نے بشمول میرے، یہ تصور کیا تھا کہ ہمارے مسائل کا حل ایک مخصوص قسم کی اشتراکیت میں ہے جو ہندوستان کے حالات سے مطابقت رکھتی ہو اور جو مذہب پسند لوگوں کو الگ نہ کر دے۔ اب تو حالات بہت بدل چکے ہیں اور مذہب کا روس اور چین میں بھی احیا ہو رہا ہے، میں بھی دوسروں کی طرح ہی دم بخود ہو کر ان تغیرات کا مشاہدہ کر رہی ہوں۔

سوال: آپ فی الوقت کون سا ناول تصنیف فرما رہی ہیں؟

جواب: ''چاندنی بیگم''

سوال: آپ اپنی تخلیقات میں کسے شاہکار سمجھتی ہیں؟

جواب: میرا آخری ناول ہی میرا شاہکار ہوگا۔

•••

کرشن چندر سے ایک مکالمہ

''ملک کی تقسیم سے پہلے اردو زبان ہندو، سکھ، پنجابی اور کایستھ سب پڑھتے تھے۔ یوں سمجھیے کہ اردو کو اس وقت گویا نیشنل لینگویج کی حیثیت حاصل تھی لیکن تقسیم کا انتہائی برا اثر اردو پر پڑا۔ آج اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہو کر رہ گئی ہے اور یہ جھوٹ نہیں ہے کہ اردو کو زندہ رکھنا اور اسے فروغ دینا اب صرف مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ کرشن چندر جس نسل میں پیدا ہوا ہے آئندہ اس نسل میں کرشن چندر پیدا نہیں ہوگا۔''

کرشن چندر نے یہ باتیں اس وقت کہیں جب میں نے ان سے ہندوستان میں اردو کے مستقبل کے متعلق سوال کیا۔ بنگلہ فلم ''اُترفالگونی'' کا جو ''ممتا'' کے نام سے ہندی میں بن رہی تھی، اس کا اسکرپٹ لکھنے کے لیے کرشن چندر کولکاتا تشریف لائے تھے اور میں وقت لے کر گرانڈ ہوٹل میں ان سے ملاقات کے لیے گیا تھا۔ میرے ہمراہ غلام محمد اختر، کریم رضا مونگیری (اب مدیر روزنامہ ''عکاس'' کلکتہ) اور سلیم قاسمی بھی تھے۔ کرشن چندر نے گفتگو جاری رکھی۔ ''گاندھی جی نے کہا تھا کہ آزاد ہندوستان کی قومی زبان ہندوستانی ہوگی اور یہ اردو، دیوناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جائے گی لیکن تقسیم ملک کے ساتھ ہی ان کی یہ بات بھی ختم ہوگئی۔ کچھ دنوں پہلے لندن میں

جب میں اپنے چند پاکستانی دوستوں کے درمیان ہندوستان میں اردو کے مستقبل کے موضوع پر گفتگو کررہا تھا، تو انھوں نے کہا، ہم تو اردو کو اسی دن رو آئے تھے جس دن ملک تقسیم ہوا۔!''

گویا اردو کے مستقبل کے بارے میں آپ کچھ زیادہ پُر امید نہیں ہیں؟

''نہیں، یہ بات نہیں!'' کرشن چندر بولے۔''میں نے حالات سے مایوس ہونا سیکھا ہی نہیں ہے۔ حالات کس وقت کیا کروٹ بدلتے ہیں، کوئی نہیں جانتا، اس وقت فضا بلاشبہ اردو کے حق میں سازگار نہیں ہے۔ ہمیں اپنے ملک میں اردو کا کوئی اسکوپ نظر نہیں آتا۔ اردو میں ایم۔اے۔ کرنے والوں کو نوکری نہیں ملتی لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ فضا بدلے گی ضرور۔ جس زبان کو لوگ دلوں میں جگہ دیتے ہیں وہ کبھی بھی نہیں مرتی۔ ہاں، اس میں مطلق شبہ نہیں کہ اسے زندہ رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا اب تنہا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔''

اردو کی اس زبوں حالی کا ذمہ دار آپ کے خیال میں کون ہے؟

کرشن چندر نے کہا۔''عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ حکومت اردو کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کررہی ہے لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں حکومت ہندی کے ساتھ بھی برائے نام ہی تعاون کررہی ہے۔ یہ تو ہندی کے سرگرم حامی ہیں جو اس کی ترقی کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ اس لیے اردو کی زبوں حالی کا سارا الزام حکومت کے سر تھوپ دینا سچائی اور دانش مندی کے خلاف ہوگا۔ اہل اردو تو خود ہی پست ہمتی کا شکار ہیں۔ ان پر شدید بے حسی کی کیفیت طاری ہے۔ اردو کے لیے ان کی ایک بھی مضبوط تنظیم نہیں ہے۔ اہل اردو کے پاس روپے اور ذرائع کی کمی نہیں ہے۔ اربوں روپے رکھنے والے کئی اردو والوں کو تو میں جانتا ہوں جو اردو نوازی کے دعوے دار ہیں مگر ان کی تمام تر نوازشیں بس زبانی جمع خرچ تک محدود ہیں۔ مجھے اردو سے بے پناہ محبت ہے اور آج بھی میرا آدھا وقت اردو کی خدمت میں گزرتا ہے لیکن اردو کی قابل قدر مطبوعات کو خریدنے والے آج کتنے ہیں؟ معیاری ادب پیش کرنے والے پرچے دم کیوں توڑ رہے ہیں؟ ان سوالوں کا جواب دہ کون ہے؟ حکومت یا اردو طبقہ؟

آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ ساری باتیں، میں حکومت کی حمایت میں کررہا ہوں۔ میں سرکاری آدمی نہیں کہ جا و بے جا طریقے سے حکومت کی طرف داری کروں۔ یہ تلخ حقیقتیں ہیں جن کو میں

آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔''

''مداخلت کے لیے معافی چاہوں گا کرشن جی! دراصل اردوداں طبقے کا مزاج سطحیت پسند ہوگیا ہے جس میں کچھ دخل ہندی فلموں کا بھی ہے۔'' مقامی شاعر مضطر حیدری (اب یہ بھی مرحوم ہو چکے) جو ہماری گفتگو بہ غور سن رہے تھے، بول پڑے۔ اپنی بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا: ''پچھلے دنوں ساحر لدھیانوی کلکتہ تشریف لائے اور ایک مشاعرے میں شرکت کی تو سامعین مشاعرہ نے فرمائش کی ''ساحر صاحب فلم ''پیاسا'' کا وہ گیت سنایئے۔

''جانے کیا تو نے کہی۔۔۔۔۔۔!''

''اور ہو سکے تو گیتا دت کی آواز میں سنایئے۔'' کرشن نے کمال برجستگی سے فقرے کا اضافہ کیا۔ اس کے بعد اگلا سوال ہوا۔

اردو زبان وادب کے لیے آپ کی خدمات توصیف سے بالاتر ہیں۔ افسانوی ادب کو آپ کے قلم نے غیر معمولی مقبولیت عطا کی ہے لیکن یہ تو بتائیں کہ اردو نے بھی آپ کو کچھ دیا یا نہیں؟ ہماری مراد ہے معاشی اعتبار سے۔

کرشن جی نے تکیہ پلنگ کے سرہانے سے اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔ کہنیاں اس پر ٹکا دیں اور چہرہ ہتھیلیوں کے بیچ میں رکھ لیا۔ کہنے لگے ''ادب کو وسیلۂ معاش بنا کر کوئی خوش حالی کی زندگی نہیں گزار سکتا۔ میرے والدین میرے ذوقِ افسانہ نگاری سے نالاں تھے۔ کہتے تھے کہ میں بے روزگاری کی طرف قدم بڑھا رہا ہوں لیکن مجھے تو عشق تھا اردو سے، افسانہ نگاری سے۔ میں نے اس کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دیں۔ مگر میں نے جو کچھ کمایا فلموں سے، ادب سے نہیں۔ ادب ہم سے بہت کچھ لیتا ہے، دیتا نہیں۔ ہاں شہرت اور عزت کی بات الگ ہے لیکن ان چیزوں سے پیٹ تو نہیں بھر سکتا۔ لوگ میری تحریروں کی وجہ سے مجھے چاہتے ہیں، میری قدر کرتے ہیں۔ یہ میرے لیے خوشی کی بات ہے اور یہی میرا انعام ہے۔

اردو کی روزی سے عدم وابستگی کی بات تو شاید ہمارے ہی ملک میں۔۔۔

''نہیں!'' کرشن چندر نے بات کاٹ دی۔ ''دوسرے ممالک کے لکھنے والوں کے بارے میں ہمارے یہاں ایک غلط فہمی عام ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وہاں کے لکھنے والے بڑی فارغ البالی کی

جب میں اپنے چند پاکستانی دوستوں کے درمیان ہندوستان میں اردو کے مستقبل کے موضوع پر گفتگو کررہا تھا،تو انھوں نے کہا،ہم تو اردو کو اسی دن رو آئے تھے جس دن ملک تقسیم ہوا۔!''

گویا اردو کے مستقبل کے بارے میں آپ کچھ زیادہ پُر امید نہیں ہیں؟

''نہیں، یہ بات نہیں!'' کرشن چندر بولے۔''میں نے حالات سے مایوس ہونا سیکھا ہی نہیں ہے۔حالات کس وقت کیا کروٹ بدلتے ہیں،کوئی نہیں جانتا،اس وقت فضا بلا شبہ اردو کے حق میں سازگار نہیں ہے۔ہمیں اپنے ملک میں اردو کا کوئی اسکوپ نظر نہیں آتا۔اردو میں ایم۔اے۔ کرنے والوں کو نوکری نہیں ملتی لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ فضا بدلے گی ضرور۔جس زبان کو لوگ دلوں میں جگہ دیتے ہیں وہ کبھی بھی نہیں مرتی۔ہاں،اس میں مطلق شبہ نہیں کہ اسے زندہ رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا اب تنہا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔''

اردو کی اس زبوں حالی کا ذمہ دار آپ کے خیال میں کون ہے؟

کرشن چندر نے کہا۔''عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ حکومت اردو کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کررہی ہے لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں حکومت ہندی کے ساتھ بھی برائے نام ہی تعاون کررہی ہے۔ یہ تو ہندی کے سرگرم حامی ہیں جو اس کی ترقی کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگارہے ہیں۔اس لیے اردو کی زبوں حالی کا سارا الزام حکومت کے سر تھوپ دینا سچائی اور دانش مندی کے خلاف ہوگا۔ اہل اردو تو خود ہی پست ہمتی کا شکار ہیں۔ان پر شدید بے حسی کی کیفیت طاری ہے۔اردو کے لیے ان کی ایک بھی مضبوط تنظیم نہیں ہے۔اہل اردو کے پاس روپے اور ذرائع کی کمی نہیں ہے۔اربوں روپے رکھنے والے کئی اردو والوں کو تو میں جانتا ہوں جو اردو نوازی کے دعوے دار ہیں مگر ان کی تمام تر نوازشیں بس زبانی جمع خرچ تک محدود ہیں۔مجھے اردو سے بے پناہ محبت ہے اور آج بھی میرا آدھا وقت اردو کی خدمت میں گزرتا ہے لیکن اردو کی قابل قدر مطبوعات کو خریدنے والے آج کتنے ہیں؟ معیاری ادب پیش کرنے والے پرچے دم کیوں توڑ رہے ہیں؟ ان سوالوں کا جواب دہ کون ہے؟ حکومت یا اردو طبقہ؟

آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ ساری باتیں، میں حکومت کی حمایت میں کررہا ہوں۔ میں سرکاری آدمی نہیں کہ جا و بے جا طریقے سے حکومت کی طرف داری کروں۔یہ تلخ حقیقتیں ہیں جن کو میں

آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔"

"مداخلت کے لیے معافی چاہوں گا کرشن جی! دراصل اردو داں طبقے کا مزاج سطحیت پسند ہو گیا ہے جس میں کچھ دخل ہندی فلموں کا بھی ہے۔" مقامی شاعر مضطر حیدری (اب یہ بھی مرحوم ہو چکے) جو ہماری گفتگو بہ غور سن رہے تھے، بول پڑے۔ اپنی بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا: "پچھلے دنوں ساحر لدھیانوی کلکتہ تشریف لائے اور ایک مشاعرے میں شرکت کی تو سامعین مشاعرہ نے فرمائش کی "ساحر صاحب فلم "پیاسا" کا وہ گیت سنائیے۔ "جانے کیا تو نے کہی۔۔۔۔۔۔!"

"اور ہو سکے تو گیتا دت کی آواز میں سنائیے۔" کرشن نے کمال برجستگی سے فقرے کا اضافہ کیا۔ اس کے بعد اگلا سوال ہوا۔

اردو زبان و ادب کے لیے آپ کی خدمات توصیف سے بالاتر ہیں۔ افسانوی ادب کو آپ کے قلم نے غیر معمولی مقبولیت عطا کی ہے لیکن یہ تو بتائیں کہ اردو نے بھی آپ کو کچھ دیا یا نہیں؟ ہماری مراد ہے معاشی اعتبار سے۔

کرشن جی نے تکیہ پلنگ کے سرہانے سے اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔ کہنیاں اس پر ٹکا دیں اور چہرہ ہتھیلیوں کے بیچ میں رکھ لیا۔ کہنے لگے "ادب کو وسیلۂ معاش بنا کر کوئی خوش حالی کی زندگی نہیں گزار سکتا۔ میرے والدین میرے ذوقِ افسانہ نگاری سے نالاں تھے۔ کہتے تھے کہ میں بے روزگاری کی طرف قدم بڑھا رہا ہوں لیکن مجھے تو عشق تھا اردو سے، افسانہ نگاری سے۔ میں نے اس کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دیں۔ مگر میں نے جو کچھ کمایا فلموں سے، ادب سے نہیں۔ ادب ہم سے بہت کچھ لیتا ہے، دیتا نہیں۔ ہاں شہرت اور عزت کی بات الگ ہے لیکن ان چیزوں سے پیٹ تو نہیں بھر سکتا۔ لوگ میری تحریروں کی وجہ سے مجھے چاہتے ہیں، میری قدر کرتے ہیں۔ یہ میرے لیے خوشی کی بات ہے اور یہی میرا انعام ہے۔

اردو کی روزی سے عدم وابستگی کی بات تو شاید ہمارے ہی ملک میں۔۔۔

"نہیں!" کرشن چندر نے بات کاٹ دی۔ "دوسرے ممالک کے لکھنے والوں کے بارے میں ہمارے یہاں ایک غلط فہمی عام ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وہاں کے لکھنے والے بڑی فارغ البالی کی

زندگی گزارتے ہوں گے۔ ایسا نہیں ہے۔ میں بہتیرے بڑے لکھنے والوں سے مل چکا ہوں۔ مجھے انگلینڈ کی اس مشہور اور دولت مند ادب نواز خاتون کا نام اس وقت یاد نہیں آ رہا ہے، جس نے ایک شاندار ہوٹل کھول رکھا ہے۔ اس ہوٹل میں مفلس ادیبوں اور شاعروں کو مفت کھانا ملتا ہے۔ اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ادیبوں اور شاعروں کی مفلوک الحالی صرف ہمارے ملک تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ دوسرے ممالک میں بھی کم وبیش صورت حال یہی ہے۔'' کرشن چندر تھوڑی دیر کے لیے رک کے چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔ پھر کہنے لگے۔ ''ہمارے یہاں دو یا تین ایسے بڑے ادیب ہیں، جن کو ایک کہانی کا معاوضہ ڈھائی یا تین سو روپے ملا کرتا ہے، اور ایک مہینے میں معیاری کہانی صرف ایک لکھی جاسکتی ہے۔ اب آپ غور کریں کہ اس قلیل رقم میں ایک ادیب اپنا خرچ، بیوی بچوں کے اخراجات اور دیگر ضروری مصارف کیوں کر پورے کرسکتا ہے۔ ہاں، اگر کوئی شخص تنہا ہو یعنی والدین، بھائی، بہنوں اور بیوی بچوں کی ذمہ داری کا بوجھ اس کے سر نہ ہو تو یہ رقم بس ٹھیک ٹھاک ہے۔''

آپ کے معاصر افسانہ نگاروں میں سعادت حسن منٹو نے غیر معمولی شہرت پائی۔ کچھ بتائیں ان کے بارے میں۔

''میرے اور منٹو کے درمیان بہت سارے نظریاتی اختلافات تھے۔ نظریات میں فرق ہو تو اس کا اثر تعلقات پر بھی پڑتا ہے۔ ویسے منٹو بہت اچھا لکھتا تھا۔ ممبئی میں اس نے پیسے بھی اچھے کمائے۔ کم وبیش اٹھارہ سو روپے ماہوار پیدا کرلیا کرتا تھا۔ لوگ اسے چاہتے بھی بہت زیادہ تھے۔ خصوصاً ممبئی اور اس کے گردونواح میں اسے بڑی قبولیت حاصل تھی لیکن ''باجو کی گلی سے'' اس کا پاکستان چلا جانا برا ہوا۔ مجھے یاد نہیں، میں اس وقت کہاں تھا لیکن ممبئی میں نہیں تھا۔ ممبئی میں ہوتا تو اسے ہرگز جانے نہ دیتا اور نہ اس کو یہ کہنا پڑتا کہ ''منٹو بھائی، اگلی راستہ نہیں ملے گا۔'' لاہور میں منٹو بڑی تنگی کا شکار رہا۔ اس نے ایک دن میں دو دو کہانیاں لکھیں، معاشی ضرورت کے تحت۔ شراب وہ ممبئی میں بھی پیتا تھا لیکن لاہور جا کر کثرت سے پینے لگا۔ شراب نے ہی منٹو کو وقت سے پہلے مار ڈالا۔ میں طبّی نقطۂ نظر سے کہہ رہا ہوں۔''

منٹو نام کا صحیح تلفظ کیا ہے؟ مختلف لوگ اس کا مختلف تلفظ ادا کرتے ہیں؟

''یہ بات تو میں خود بھی نہیں جان سکا کہ صحیح کیا ہے۔'' کرشن چندر نے کہا۔ ''میں اسے چڑانے کے لیے کہا کرتا تھا کہ کیا ہو بھئی! منٹو ہو، مَنٹو یا مِنٹو۔؟ مگر میرا خیال ہے کہ مَنٹو صحیح ہے کیونکہ وہ کشمیری تھا۔''

اس کے بعد اسٹوڈیو سے ان کے بلاوے کا فون آ گیا اور ہم لوگوں نے ان سے رخصت چاہی۔ چلنے سے قبل میں نے پوچھ لیا: ''کرشن صاحب فلم 'ممتا' کا اسکرپٹ آپ نے کس رسم الخط میں لکھا ہے۔ اردو میں یا ہندی میں؟''

جواب میں متبسم ہو کر انھوں نے میز پر سے اسکرپٹ کی ضخیم فائل اٹھائی اور کھول کر ہمارے سامنے رکھ دی، اسکرپٹ اردو میں تحریر تھا۔ پھر یکا یک کرشن چندر کے چہرے کا تبسم غائب ہو گیا اور اس کی جگہ ماتھے پر گہری سوچ اور اداسی کی لکیریں ابھر آئیں۔ چند لمحے خاموش رہ کر انھوں نے کہا۔

''دیکھیے یہی وہ زبان ہے جس سے مجھے والہانہ عشق ہے۔ غور سے دیکھ لیجیے۔ شاید پھر یہ رسم الخط دیکھنے کو آنکھیں ترس جائیں۔''

•••

عصمت چغتائی سے گفتگو

''میرا نام عصمت خانم چغتائی تو برتھ سرٹیفکیٹ کے رجسٹر کا ہے، گھر میں تو سبھی ''چنی'' کہتے تھے۔ چنی لکھتی دکھتی بھی ہے، کسی کو کیا معلوم ہوتا تھا۔ رجسٹر کا نام گھر میں کسی کو یاد نہیں آتا تھا۔ دس بھائی بہن تھے ہم... چار بہنیں، چھ بھائی۔ عظیم بیگ میرے بڑے بھائی تھے۔ انھیں نہیں معلوم تھا کہ چنی کا صحیح نام کیا ہے۔ گھر میں جو نام تھے، وہی اہمیت رکھتے تھے، رجسٹر کے نام رجسٹر تک محدود ہوا کرتے تھے۔'' عصمت خانم بولتی جارہی تھیں اور باقاعدہ چٹخارے لے لے کر بول رہی تھیں: ''دس اولادیں پالتے پالتے عاجز آگئی تھیں اماں۔ کہاں تک پالیں۔ جب بھی ہم ان کے پاس جاتے تو کہتیں، ''چل ہٹ، غارت ہو۔ تو یہاں کہاں سے گھس آئی۔'' تو غارت ہونا پڑتا تھا لیکن گھر میں رشتوں میں اٹھنے والے سوال تھے وہ کہاں غارت ہوتے۔ وہ دل میں اٹھ کر رہ جاتے۔ جواب نہیں ملتا تھا۔ اصل میں ہم نے اپنے بچوں کے سوالوں کا جواب دینا بند کر دیا، اصول سمجھاتے رہے کہ یہ کرو، یہ نہ کرو، اس لیے وہ جواب مانگنے کے سلسلے میں دائروں سے باہر چلے گئے۔ ان بیچاروں کا کیا قصور۔ میں ہمیشہ اپنی نئی نسل سے متاثر رہی۔ مجھ سے جتنا بنتا ہے، ان کے سوالوں کا جواب دیتی ہوں۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔

عصمت آپا سے اگر آپ واقف ہیں تو آپ کو بھی ان کی شرارت بھری مسکان کے ساتھ سوالیہ نگاہوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ تخلیق کی طرف مڑتے ہی سوال کرتی ہیں'' آج تخلیق میں نقاد ہی نقاد چھائے ہیں۔ انھوں نے چھوٹے بچوں کو بھی ادھر ہی ہانکا ہے۔ تخلیق کہاں ہو رہی ہے؟ بتایئے کہاں ہو رہی ہے؟اس کے پہلے کہ میں اس کا کچھ جواب دوں، انھوں نے ہی جواب دینا شروع کر دیا: ''اردو پڑھنے والے اب رہے کہاں جا رہے ہیں۔ سب تو موئے انگریزی کی گود میں جا بیٹھے۔ میری بیٹیوں نے اردو نہیں پڑھی، بیدی (راجندر سنگھ بیدی) کے بچوں نے نہیں پڑھی۔ سردار جعفری کے بچوں نے، کرشن چندر کے بچوں نے... کسی نے تو نہیں پڑھی۔

سوال: تب پھر آپ جو لکھتی ہیں، اسے کون پڑھتا ہے؟

جواب: مجھے پڑھنے والا غریب مسلمان ہے۔ وہ مجھے پڑھتا ہے۔ آج کا الیٹ (elite) مسلمان کا بچہ اب مجھے نہیں پڑھتا۔ وہ اردو ہی نہیں جانتا، پڑھے گا کیا؟ میرا باورچی اپنی بچی کو کانونٹ میں پڑھا رہا ہے، میں نے فیس بھری ہے اس کی۔

سوال: جب اردو کے بارے میں آپ اتنی ناامید ہیں تو اردو کے موجودہ جھگڑے کے بارے میں، ہندی سے اس کے تعلقات کے بارے میں آپ سے کیا پوچھوں؟

جواب: پوچھنے کو آپ پوچھیے، لیکن میں آپ سے پوچھوں کہ ہندی میں نے پڑھی ہے لیکن میرے کس کام آتی ہے؟ اردو کو تو چھوڑیے، اردو کو تو پاکستان میں بھی مقام نہیں ملا۔

سوال: اب ایک اور سازش ہو رہی ہے کہ اردو کو مذہب سے جوڑ کر اسلام سے نتھی کیا جا رہا ہے...

جواب: بکواس ہے۔ اس ملک میں تو مذہب تباہ ہے۔ مذہب کیا چیز ہے، یہی نا کہ کسی کو مارو نہیں، قتل مت کرو، امن سے رہو؟ لیکن ہم نے مذہب کو بڑھاتے بڑھاتے دھندا بنا دیا... مٹھائی چڑھایئے، پیسے چڑھایئے۔ اسی لیے مذہب کی شکل بگڑ گئی۔ اس سے زبان کو جوڑ دو گے تو زبان بھی تباہ ہو جائے گی۔ یونہی تباہ ہے بیچاری۔

سوال: آپ کسی مذہب میں عقیدہ بھی رکھتی ہیں؟

جواب: میں سبھی دھرموں پر وشواس کرتی ہوں اور کسی دھرم کو نہیں مانتی۔ دھرم میرے لیے ہے۔

میں دھرم کے لیے نہیں ہوں۔ دھرم نے کہیں پر بھی کسی کا فائدہ نہیں کیا۔ بیوقوف لوگوں کو ڈرا کر بس یوز (Misuse) تو کیا ہے، فائدہ نہیں کیا۔

سوال: تب پھر خدا کے بارے میں آپ کے خیالات دلچسپ ہونے چاہئیں۔ اسے آپ کیا مانتی ہیں؟

جواب: خدا ایک طاقت ہے، ایسا مانتی ہوں۔ انرجی ہے، اٹامک انرجی بھی۔ یہ اپنے اپنے وشواس کی بات ہے۔ یوں ہر پوجا میں شریک ہو جاتی ہوں۔ مجھے کسی مندر میں، مسلمان ہوتے ہوئے پوجا کرنے جانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی... اور وشواس کیسے جڑ پکڑتا ہے، اس کا ایک واقعہ بھی سن لو۔ جموں میں مندر میں گئی تو وہاں کے بندر بڑے بدمعاش، ہر کسی کا پرساد گرا کر کھا جائیں، ڈرا کے۔ سب کا گرا دیا، میرا نہیں گرایا۔ میں نے بندر سے باتیں کرنا شروع کر دیا کہ لینا ہے تو لے جاؤ۔ میرا نہیں ہے، یہ تو ایشور کا ہے۔ میں نہیں ڈری، وہی ڈر گیا۔ پرساد بچ گیا۔

سوال: اس سے وشواس نہیں اندھ وشواس جڑ پکڑتا ہے آپا۔ اگر دھرم میں نہیں تو آپ مارکس میں وشواس کرتی ہوں گی۔

جواب: ہاں، مارکس میں وشواس کرتی ہوں۔ اس لیے کہ ہمارے یہاں کا پرانا فلسفہ مارکس سے تعلق رکھتا ہے۔ ہمارے رشیوں، عالموں کا یہی اصول تھا کہ پیسے کے پیچھے مت بھاگو، سب کی ضرورتوں کا خیال رکھو۔ میں اس نظریے کا سب کچھ تو مارکس میں نہیں لا سکتی، لیکن مارکس نے میری سوچ کو زمین دی ہے... لیکن میں نے یہ تو نہیں کہا کہ دھرم میں وشواس ہی نہیں کرتی۔ کرتی بھی ہوں۔ نہیں بھی۔

سوال: تب پھر آپ کو ایشور کا کوئی نہ کوئی روپ بھی پسند ہوگا؟

جواب: پسند ہے، کنھیا۔ وہ میرا فیورٹ گاڈ ہے جس نے گوپیوں سے کہا کہ کیا اپنے بدن سے شرم کرتی ہو۔ شرم کو چھوڑو، زندگی کو جیو۔ کرشن میری نگاہ میں ایک انقلابی دیوتا تھا۔ زندگی سے لبریز۔ ویسے میرے یہاں لکشمی، سرسوتی اور چنڈی بھی ہیں۔

سوال: آپ نے اپنی تخلیق میں عورت کا کون سا روپ ابھارنا زیادہ پسند کیا؟

جواب: میں نے تو صرف حقیقت بیان کرنا پسند کیا ہے۔ آج بھی صبح اٹھ کر اخبار پڑھتی ہوں۔ دیکھتی ہوں اتنا ہنگامہ روز ہو رہا ہے۔ میری تخلیق بھی اخبار کے جیسے حادثات سے تعلق رکھتی ہے۔ میں تو اپنے آس پاس میں رہنے والوں کے بارے میں لکھتی ہوں۔ ان میں عورت بھی ہوتی ہے، مرد بھی ہوتا ہے۔

سوال: دونوں میں، آج کے سماج میں آپ کو زیادہ پِستا ہوا کون معلوم ہوتا ہے؟

جواب: غریب طبقے میں دونوں پس رہے ہیں۔ امیر گھر کے مرد اور عورت دونوں مزے کر رہے ہیں۔ کچھ طبقے ہیں جہاں دونوں ایک دوسرے کی شکایت کرتے ملتے ہیں۔ پھر بھی یہ محسوس کرتی ہوں کہ سماج میں مرد کو زیادہ دبایا گیا ہے۔ پہلے ماں، پھر بیٹی۔ بہن اور پھر بیوی دباتی ہے۔ پہلے اسے سمجھایا جاتا ہے کہ ماں کے پیر کے نیچے جنت ہے، پھر کہا جاتا ہے کہ بہن کا بوجھ تیرے سر پر ہے، پھر اسے سمجھایا جاتا ہے کہ بیٹی تو تیری عزت ہے... اس سب میں مرد پِستا رہتا ہے۔

سوال: لیکن جب مرد ایک عورت کی مٹی پلید کر کے دوسری عورت کے ہاتھوں اسے ذلیل کرتا ہے، تب بھی آپ کو عورت کی حالت بے چین نہیں کرتی؟

جواب: بے چین ہونا نہ ہونا ایک بات ہے، لیکن حقیقت اپنی جگہ ہے۔ آپ کو پتہ نہیں ہے کہ عورت کی تکڑم بازیاں کیسی کیسی ہیں؟ یہ نہ بھولیں کہ عورت کی وجہ سے ہی دوسری عورت کی مٹی پلید ہوتی ہے۔ عورت کو ذلیل کرانے کے لیے دوسری عورت ہی ہے جو آگے آتی ہے۔ پہلے اسے اپنے جال میں پھنساتی ہے، پھر دوسری عورت کو بے دخل کرتی ہے۔ اس میں مرد کو گنہگار کیوں مانوں؟ میں تو چاہتی ہوں کہ عورتیں، مرد کا ٹیٹوا پکڑنا چھوڑ دیں لیکن میں یہ بات شاید لوگوں کو سمجھا نہیں پائی اور مجھے الٹا عورتوں کی آزادی کا حامی اور ان کا نمائندہ مان لیا گیا۔

سوال: آپ کی یہ بات مان بھی لوں تو مرد کا اتنا گناہ تو آپ بھی مانیے گا کہ وہ دوسری عورت کی طرف مڑا، اس پر فدا ہوا۔

جواب: اگر مرد کسی عورت پر فدا ہوتا ہے تو اس میں گناہ کیا ہے؟ اب تو الٹے لڑکیوں کو یہ شکایت ہے کہ کمبخت لڑکے ان کا نوٹس نہیں لیتے۔ سچ کہوں مرد تو یار پھسپھسے ہوتے ہیں۔ کالج میں اگر

کسی نے مجھ پر کبھی کوئی دلکش پھبتی کسی اور میں نے پلٹ کر اتنا ہی پوچھ لیا کہ "جی آپ نے کچھ کہا" تو بیچارے کی گھگھی بندھ جاتی تھی۔

سوال: ایسے حالات میں آپ نے کبھی شرمانے کی اہمیت کو آنکا ہے؟

جواب: کیوں شرمائیں۔ شرم کی بات کریں تو شرمائیں۔ ہم تو عاشق کی "لیگ پُلنگ" کرتے تھے۔ کِس کے کھنچائی کرنے میں یقین رکھتے تھے۔ میں نے تو لڑکوں سے ہمیشہ "کمپیٹ" (مقابلہ) کرنے کی کوشش کی۔ بھائیوں کے ساتھ رہ کر گھوڑے کی سواری وغیرہ سب کرتی تھی۔ ارے میاں؛ تمھیں پتہ نہیں ہے، عورتیں بڑی گندی گندی باتیں کرتی ہیں۔ میری دوستی مردوں سے زیادہ رہی۔ میں نے اپنی باتیں کھلے طور پر ان سے کہہ بھی دیں اور لکھ بھی دیں۔ شرمانے کی اس میں کیا بات ہے۔

سوال: شاید اسی لیے آپ کے ساتھ "بولڈ" تخلیق کا سرٹیفکیٹ جڑ گیا؟

جواب: میں نے اپنے کو حقیقت بیان کرنے والا مانا۔ "بولڈ" ہوں یہ تو لوگوں نے کہا اور اسی ڈنڈے کو لوگوں نے تھام لیا۔ میرا اس میں کوئی نقصان بھی نہیں ہوا۔ کوئی شکایت بھی نہیں۔ بلکہ الٹے فائدہ ہی ہوا۔ جو سچ لکھے وہی میرے لیے "بولڈ" ہے۔ اس زمانے میں عورتیں میرے جیسا نہیں لکھتی تھیں، اس لیے شاید میرے لیے یہ فقرہ چل پڑا۔

سوال: "بولڈ" تخلیق تھوڑا بنیادی معنوں میں جنسی بیان سے جڑ گئی۔ اس بارے میں آپ کیا سوچتی ہیں؟

جواب: سوچتی یہ ہوں کہ سیکس کو ہمیشہ گندا ہی کیوں مانا جائے۔ سیکس مقدس بھی تو مانا جا سکتا ہے۔ یہ تو ماننے نہ ماننے کا فرق ہے۔ سیکس گندا کہاں ہوتا ہے جہاں وہ بیچا اور خریدا جاتا ہے۔

سوال: عورت مرد کے ہر ممکن تعلق کو بنیاد بنا کر آپ نے کہانیاں لکھیں اور منٹو نے بھی۔ آپ دونوں ہم عصر اور دوست افسانہ نگار رہے ہیں۔ منٹو کی تخلیق نگاری کی حمایت آپ نے عدالت تک میں کی۔ پھر کیا وجہ رہی کہ منٹو نے تو سماجی برائیوں پر لگاتار چوٹ کی اور آپ نے دلچسپ راز کی باتوں پر سے پردہ اٹھا کر ہی چھوڑ دیا۔ ایسا کیوں؟

جواب: یہ راز کی دلچسپ باتوں پر سے پردہ اٹھانا میری نظر میں زیادہ اہم تھے۔ میں تو جو دیکھتی تھی،

وہی لکھتی تھی کہ ایسا سماج میں ہورہا ہے، ہوسکے تو روکو۔ منٹو کی کہانیوں میں اور مجھ میں یہ فرق ہے کہ ہم دونوں مسائل اور ان کے حل کے نظریے میں غیر متفق نہیں رہے لیکن منٹو کے یہاں سیاست بھی آگئی، میں سیاست سے بچتی رہی۔ میں تو یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ مرد کی چھینا جھپٹی میں عورت کیسے سستی ہوگئی اور مرد کو جھپٹنے کے چکر میں عورت کیسی کیسی حرکتیں کرتی ہے۔

سوال: آپ اس چھینا جھپٹی کو جسم کی ضرورت کا حصہ مانتی ہیں یا روحانی یا کچھ اور؟

جواب: میں اس میں زیادہ تر معاشی پہلو کو ذمے دار مانتی ہوں۔ یہ پیسہ کمبخت بڑی خراب چیز ہے، یہ عورت مرد کے تعلقات ہی نہیں، ترقی پسند تحریک تک میں گھس کر اسے چوپٹ کر گیا۔

سوال: لکھنؤ کے ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس میں جو زبان کے مسئلے پر پینترے بازی ہوئی تھی، اس کی طرف تو آپ کا اشارہ نہیں ہے؟

جواب: میں ان دنوں یہاں تھی ہی نہیں، اس لیے نہیں کہہ سکتی کہ لکھنؤ میں کیا ہوا۔ لکھنؤ میں تو پینترے بازیاں ہیں۔ جب انھوں نے دیکھا کہ انقلابی بن کر پیسہ ملتا ہے تو یہ انقلابی بن گئے۔

سوال: کون؟

جواب: نام میں کسی کا نہیں لوں گی۔ لیکن ترقی پسندی سے آمدنی کا جڑ جانا اس کو چاٹتا چلا گیا۔

سوال: کیا وجہ ہے کہ ترقی پسندی کی لہر کے ساتھ شروع سے ہی جڑ جانے کے باوجود اردو ادب خاص کر افسانہ اپنے لیے وہ جگہ نہیں بنا سکا جو ہندی یا دوسری ہندوستانی زبانوں کی کہانی نے بنالی ہے؟

جواب: یہ میں کیسے مانوں۔ پاکستان میں خوب لکھا جارہا ہے۔ یہ فتوے دینے والے کمبخت ''کریٹک'' ہیں، آلوچک جنھیں کہا کرتے ہیں آپ لوگ، وہ نوجوانوں کی قلم پر ایسے ہی اعتراض کرتے اور فتوے دیتے رہتے ہیں جیسے بڑھیوں کی جوانی چلی جانے پر وہ نوجوانوں پر اعتراض کرتی رہتی ہیں۔ میں نے اردو کے ان کمبختوں کو کبھی گھاس نہیں ڈالی۔

سوال: آپ گھاس نہ ڈالیں تب بھی وہ گھاس لے لیتے ہیں۔ مگر اب تو لوگ بھی ہیں کہ کرشن چندر جیسے مصنف کو بھولنے لگے ہیں۔ بیدی کا بھلے پھر سے تجزیہ شروع ہوگیا ہے۔ آپ کو ایسا نہیں لگتا؟

جواب: اس میں افسوس کس بات کا؟ ہم نہیں بھول گئے تھے اپنے زمانے میں بڑے بڑے ادیبوں کو؟ اسی طرح آج کے بچے بھی بھول جائیں گے۔ مجھے اس بھولنے۔ پھولنے سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ رہی کرشن چندر کی بات، تو کرشن کے بہت زیادہ پھیلے ہونے سے اردو والے بِدکتے رہتے ہیں۔ کرشن لکھتے اتنا زیادہ تھے کہ اس میں کچھ واہیات بھی لکھا ہوگا۔ بیدی چن چن کر لکھتے تھے۔ اصل میں ان لوگوں کو لڑکیوں نے تباہ کر دیا۔ کرشن تو شروع سے ہی کھلنڈرے تھے، سو لوگ انھیں معاف کرتے رہے لیکن بعد میں بیدی کو بھی ایک لڑکی ہی لے ڈوبی۔ میں نے ان کے بجائے ان کی بیویوں سے ہی زیادہ تعلقات بنائے۔

سوال: آپ کی پسند کی عورتیں کون سی رہیں؟

جواب: جاہل عورتوں سے میری دوستیاں بیحد گھنی رہی ہیں۔ جاہل عورتیں میں نے چالاک بھی بہت دیکھی ہیں۔ انھیں شاید اس کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ منٹو کو کوئی لڑکی نہیں پھانس سکی تھی۔ اسے اپنی بیوی بہت پسند تھی۔

سوال: آپ گھوم پھر کر پھر اسی عورت پر آ گئیں۔ آپ کی کہانیوں میں جو عورتیں ہیں...

جواب: آپ اپنا جملہ پورا کریں، اس کے پہلے ہی کہہ دوں کہ میری کہانیوں میں یہ کھاتی عورتیں زیادہ ہیں۔ ''چارپائی'' کہانی میں میں نے اس کا خوب پردہ فاش کیا ہے۔

سوال: عورت کی دنیا کو اتنی ہوشیاری اور خوبی کے ساتھ دیکھنے والی آپ جیسی مصنفہ شاہ بانو والے مسئلے پر خاموش کیوں رہی تھیں؟

جواب: اسے میں شاہ بانو کی بیوقوفی مانتی تھی۔ اس نے اپنے بڑھاپے کے لیے بچا کر کیوں نہیں رکھا کہ اس کے بچے اس دولت کے لالچ میں اس کی حفاظت کرتے۔ مرنے کے وقت وہ جس کو چاہتی جو کچھ بانٹ دیتی۔ شاہ بانو نے اپنا سب اپنی اولادوں کو دے دیا۔ میری ماں نے بھی یہی کیا تھا۔ تب کی عورتیں کرتی ہی یہی تھیں۔ اولادیں بھی ان کا خیال رکھتی تھیں۔ اب اصول بدل گئے ہیں۔ اس کا خیال شاہ بانو کو کرنا چاہیے تھا۔ میں نے اپنا پورا پیسہ اپنے بچوں کو ابھی تک نہیں دیا۔ میں ان کے لیے مرتے وقت تک بیش قیمت رہوں گی۔ میں تو اس سارے مسئلے کو معاشی پہلو سے جوڑ کر دیکھتی ہوں۔

سوال: یعنی رشتے ناطے سب دولت پرمنی ہوتے ہیں؟

جواب: ہوتے ہی ہیں۔ اخلاقی اصول کہاں ہیں؟ ہر ایک تو چوری کر رہا ہے، بے ایمانی کر رہا ہے۔ اخلاقی اصول پھر ان رشتوں میں آئیں گے کہاں سے؟

سوال: اس کا مطلب ہے آپ کی نظر میں شادی ایک بے معنی یا مطلب پسند سہولت ہو کر رہ گئی؟ تو کیا ضروری ہے شادی کرنا؟

جواب: قطعی ضروری نہیں ہے۔ اپنی مرضی کا مسئلہ ہے، کرو یا نہ کرو۔ پبلک کو اس میں بیچ میں آنے کی کیا ضرورت ہے۔ میری بیٹی نے اپنی ساس کے پاس جب خوب سارا زیور دیکھا تو بولی ''اگر میں آریہ سماجی ہو جاؤں تو میری ساس بڑا سارا دھن دے دے گی۔'' میں نے کہا تم اگر اس تبدیلی پر یقین کرتی ہو تو ہو جاؤ۔ میری نگاہ میں سارا مسئلہ معاشی ہے جس کے لیے ایک عورت مذہب تبدیل کرنے تک کو تیار ہے۔

سوال: عورت مرد کے رشتوں کو آپ صرف معاشی چشمے سے دیکھیں گی تو اس رشتے کے اور بہت سارے پہلو ان دیکھے رہ جائیں گے۔ اپنے دیش میں شادیاں ٹوٹنے کا جو سلسلہ بڑھا ہے اس کی بنیاد صرف معاشی نہیں ہے۔

جواب: میں ان پہلوؤں کو ان دیکھا نہیں کرتی بلکہ ان پہلوؤں کو سارے دنیا کے آئینے میں دیکھتی ہوں۔ اتنی ساری لڑائیاں لڑتے لڑتے مرد کم پڑ گیا۔ عورتیں زیادہ ہیں۔ پوری دنیا میں دیکھ لیجیے۔ شادی تو پوری دنیا میں ٹوٹ رہی ہے۔ اپنے یہاں ایک شادی کا قانون ہے۔ اس لیے شادی اندر اندر ٹوٹ رہی ہے۔ یورپ میں قانوناً ٹوٹ رہی ہے۔ اپنے یہاں غیر قانونی طریقے سے ٹوٹ رہی ہے۔

سوال: عورتوں کی تعداد زیادہ ہونے پر بھی اردو میں خواتین افسانہ نگاروں کی کم تعداد آپ کو کھلتی نہیں؟

جواب: میں یہ مانتی ہی نہیں کہ اردو میں خواتین افسانہ نگار کم ہیں۔ بہت ہیں۔ پاکستان میں تو بے حد ہیں۔ ہمارے یہاں اردو پڑھنا چھوٹ گیا ہے۔ اس لیے لکھنے والی بھی کم نظر آنے لگیں۔ میری یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ لوگ ہندی والے اردو میں چھپ کر اس غریب مسلمان تک

کیوں نہیں پہنچانا چاہتے جو بے چارہ چاؤ سے پڑھتا ہے اور وہ طبقہ یہاں کم نہیں ہے۔

سوال: ایک طرف آپ اردو زبان کے موجودہ حالات سے پریشان نظر آتی ہیں۔ دوسری طرف اس سے بڑی پُر امید لگتی ہیں۔ آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟

جواب: کہنا یہ چاہتی ہوں کہ اردو کو دبا نہیں سکتے۔ کچھ بھی کریں اسے یہی غریب مسلمان زندہ رکھے گا جس کا زبان کی سیاست سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ میں اس کی طرف تمھارا دھیان کھینچنا چاہتی ہوں۔ اس کی سوچو۔ کتنا بڑا طبقہ ہے وہ۔

سوال: اردو کے مسئلے میں آپ پاکستان کے مصنف کی تو بات کرتی ہیں لیکن وہاں کے اردو پڑھنے والوں کی بات دوسرے انداز میں کرتی ہیں۔ ایسا کیوں؟

جواب: پاکستان میں اردو مصنف ہیں، پڑھنے والے بھی ہیں ہی لیکن اردو کو اہمیت دینے والے نہیں ہیں۔ انھوں نے تو یہاں سے گئے مسلمان تک کو مان کر نہیں دیا۔ ان کی زبان کی بات تو دیگر ہے۔ وہاں کے سندھی، بلوچی، پنجابی اور پیشاوری نے یہاں سے گئے مسلمان کو مان کے نہ دیا آجکل تو وہاں فرقہ وارانہ فساد بھی شروع ہو گئے ہیں۔

سوال: آپ نے اتنی ساری کہانیاں لکھیں۔ چلتے چلتے یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ کسی ایسی کہانی کو یاد کیجیے جس نے آپ کے سارے کٹرپن کے باوجود سب سے زیادہ پریشان کیا ہو۔

جواب: بڑی تکلیف دہ بات چھیڑ دی تم نے۔ میں نے ایک کہانی لکھی تھی، ''زہر کا پیالہ''۔ اس نے مجھے زندگی میں سب سے زیادہ تکلیف پہنچائی۔ خوب کس کے ''ٹارچر'' کیا۔ وہ کہانی میں نے ایک ایسی عورت پر لکھی تھی جو مجھے دودھ پلانے کے لیے کرائے پر رکھی گئی تھی۔

سوال: یعنی آپ نے اپنی ماں کا دودھ نہیں پیا۔ ہمارے راشٹر پتی جی نے ان ماؤں کو اچھا نہیں مانا جو اپنے بچوں کو اپنا دودھ نہیں پلاتیں۔ آپ نے حال میں اخباروں میں اس کا ذکر پڑھا ہوگا۔

جواب: راشٹر پتی جی کیا مانتے ہیں یہ یہاں سوال نہیں ہے۔ یہ ہے کہ مجھے اپنا دودھ پلانے کے لیے جس چمارن کو رکھا گیا تھا اس کا دودھ پی کر میں بڑھی۔ میرے بچپن میں دودھ پلانے والیاں کرائے پر ملتی تھیں۔ اس عورت کے لیے میرے دل میں کتنی عزت تھی اس کا میں بیان نہیں کر سکتی۔ جب کافی بڑی ہو گئی تو وہ ایک دن آئی۔ ایک پیالہ لیے ہوئے مجھ سے اکیلے

میں پوچھنے لگی کہ ''بیٹی میرا دودھ پیے گی۔'' میں بڑی ہوگئی تھی شرما گئی شاید۔ بعد میں وہ پاگل ہوگئی۔ اس پر میں نے کہانی لکھی۔ اف! آج بھی دہل جاتی ہوں اس عورت کے بارے میں سوچ کر، کن حالات میں اس کی موت ہوئی بیان نہیں کرسکتی۔ اس کہانی نے مجھے ہمیشہ ستایا۔ جب جب اس پر سوچا تب تب ستایا۔ اب اس پر زیادہ نہ چھیڑو۔

ملاقاتی: معافی چاہتا ہوں۔

(ہندی سے ترجمہ)

قاضی عبدالستار سے گفتگو

معروف ترقی پسند فکشن نگار پروفیسر قاضی عبدالستار 16 جولائی 1930 کو مچھریٹہ، سیتا پور، اتر پردیش میں ایک زمیندار گھرانے، قاضی عبدالعلی کے یہاں پیدا ہوئے۔ راجا رگھوور دیال کالج سیتاپور سے 1948 میں ہائی اسکول اور 1950 میں انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ 1952 میں بی اے آنرز اول درجے میں پاس کیا اور 1954 میں ایم اے میں ٹاپ کیا۔ ایم اے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کی نگرانی میں ''اردو شاعری میں قنوطیت'' کے موضوع پر ایک بھرپور تحقیقی مقالہ لکھا جس پر انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ ریسرچ کے دوران 1956 میں ہی آپ کا تقرر بحیثیت عارضی لیکچرر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی میں ہو گیا تھا۔ 1961 سے مستقل لیکچرر ہوئے، 1967 سے ریڈر اور 1980 سے پروفیسر کی حیثیت سے درس و تدریس میں اپنی علمی خدمات انجام دیتے رہے اور 1993 میں سبکدوش ہو گئے۔

1936 میں شروع ہونے والی ترقی پسند ادبی تحریک نے پروفیسر قاضی عبدالستار کو بہت جلد متاثر کیا جس کے نتیجے میں وہ طالب علمی کے زمانے سے ہی اس انجمن کی ادبی نشستوں اور پروگراموں میں شریک ہونے لگے تھے۔ سید احتشام حسین اور ڈاکٹر محمد حسن ان کے خاص

اساتذہ میں سے تھے۔ 1946 میں ان کا پہلا افسانہ "اندھا" شارب لکھنوی کی ادارت میں لکھنؤ سے شائع ہونے والے رسالے "جواب" میں آدھا صفحے کے ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ حالانکہ قاضی صاحب نے اپنی ادبی زندگی کی شروعات شاعری سے کی لیکن انھوں نے بہت جلد شاعری سے اپنا رشتہ توڑ لیا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انھیں بہت جلد اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ فکشن کے لیے بہت مناسب ہیں۔ پروفیسر قاضی عبدالستار کا پہلا ناول " شکست کی آواز" منظر عام آیا جو بعد میں "دود چراغ محفل" اور" پہلا اور آخری خط" کے عنوانات سے بھی شائع ہوا۔ یوں تو قاضی عبدالستار نے پیتل کا گھنٹہ، رضو باجی، مالکن ، ٹھاکر دوارہ اور آنکھیں جیسے کئی یادگار افسانے تخلیق کیے ہیں لیکن حقیقت میں وہ ایک ممتاز ناول نگار ہیں اور وہ ناول نگار کی حیثیت سے زیادہ مقبول اور معروف ہوئے۔ شب گزیدہ، مجو بھیا، غبار شب، بادل، صلاح الدین ایوبی، داراشکوہ، غالب، حضرت جان اور خالد بن ولید ان کے مشہور ناول ہیں۔

پروفیسر قاضی عبدالستار کو اس دوران کئی ایوارڈز اور انعامات سے بھی نوازہ گیا۔ 1973 میں پہلا غالب ایوارڈ برائے فکشن، 1974 میں پدم شری، نام پتر نیشنل ایوارڈ، میر ایوارڈ، عالمی ایوارڈ، گیانیندر ایوارڈ، شان سرسید اور اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ، بہادر شاہ ظفر ایوارڈ برائے فکشن دہلی اردو اکادمی ایوارڈ کے علاوہ آپ کو کئی دیگر انعامات پیش کیے گئے۔

سوال : آپ کا کہنا ہے کہ موجودہ تہذیب کا از سر نو جائزہ لینا چاہیے لہٰذا اس کے حوالے سے میرا پہلا سوال یہ ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ آج استاد اور شاگرد کے درمیان کشیدگی، ابن الوقتی اور مفاد پرستی پیدا ہو گئی ہے؟ آپ کا دور کیسا تھا؟

جواب : پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ میرے زمانے میں میرے استاد جو تھے، وہ بہت ریز رو اور بہت ہی نستعلیق تھے۔ مثال کے طور پر پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، پروفیسر نورالحسن ہاشمی، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر آل احمد سرور، ان لوگوں تک پہنچنا ایک قیامت ہوا کرتی تھی۔ میں نے بی اے آنرس ٹاپ کیا، ایم اے میں ٹاپ کیا لیکن میرے پروفیسر نے ایک بار بھی

کچھ نہیں کہا، بس یہ کہہ دیا کہ تم کو گولڈ میڈل ملا خوشی ہوئی بس۔ دراصل ان کو ہمارے وجود سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، ان کی دلچسپی صرف یہ تھی کہ ہم بہترین لیکچر دیں جس سے طلبہ فیض یاب ہوں۔ اور اس کام کو وہ اپنا فرض سمجھتے تھے کہ ان لڑکوں کے علم وفضل کو ایک سطح عطا کرنی ہے۔ یہی حال نور صاحب کا تھا اور یہی حال احتشام حسین صاحب کا تھا۔ وہ ذاتی گفتگو نہیں کرتے تھے۔ وہ کبھی ڈرائنگ روم میں آپ کو پسند نہیں کرتے تھے کہ آپ آئیں۔ یہ تو مجھے ایک دوبار شرف حاصل ہوا کہ انھوں نے میرے ساتھ کافی پی لی کافی ہاؤس میں ورنہ —اس کے مقابلہ جب میں علی گڑھ آیا تو سناٹے میں رہ گیا کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی جیسا نام، ان کے پاس لڑکے چلے آرہے ہیں۔ میں ملنا چاہتا ہوں۔ اچھا اچھا آیئے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ نہ ملیں۔ ایک دو جملے انھوں نے مزاحیہ کہے اور پھر بات کرنے لگے۔ یہ جو قربت تھی اس نے تہذیب کو بڑا نقصان پہنچایا۔ فاصلہ ضروری ہے، جس طرح ایک گاڑی کے پیچھے دوسری گاڑی چلتی ہے تو گاڑی پر لکھا ہوتا ہے "کیپ ڈسٹنس"۔ میرا خیال ہے اسی طرح استاد کو بھی اپنے شاگردوں کے ساتھ ایک ڈسٹنس رکھنا چاہیے۔ اور ان کو وقتاً فوقتاً بتانا چاہیے کہ میاں یہ جو بات آپ کر رہے ہیں یہ آپ کی تہذیب کے خلاف ہے تاکہ آپ ان کر تج ہوں۔ آپ کو غصہ نہ آئے۔ سمجھ رہے ہیں نہ میری بات۔ یہ ڈسٹنس کو مین ٹین رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جیسا کہ ابھی میں نے دو تین مضامین پڑھے جے این یو کے بارے میں کہ استاد کے پاس ایک لڑکا ملنے آیا، چائے پلائی اور گپ کی اور سب کچھ پوچھا اور پھر کہا کہ آپ نے کچھ کام نہیں دکھایا تو لڑکے نے جواب دیا سر آپ میرے گائیڈ نہیں ہیں۔ تو یہ جو بے نیازی ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہمیں قطعاً اپنے ریسرچ اسکالرز سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہم اس کے کام کے تئیں دلچسپی نہیں رکھتے۔ یہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ آپ بالکل بری الذمہ ہوجائیں اور یہ بھی نہ ہو کہ بغیر چائے پلائے نہیں جانے دیں۔ پروفیسر ابن کنول، سید محمد اشرف، طارق چھتاری یہ سب میرے چہیتے شاگردوں میں سے تھے لیکن جب میں بلاؤں تب آپ آئیں گے۔ یہ نہیں کہ بغیر بلائے سلام علیکم۔ نونونونو؟ یہ کوئی وہ نہیں ہے۔ تو میں اس تہذیب کا علمبردار ہوں۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ میری کتاب پر تبصرہ کرتے وقت سید

حامد صاحب جو ہمارے وائس چانسلر تھے اور جن کا میں ہمیشہ احسان مند رہوں گا کہ جنھوں نے بغیر انٹرویو لیے ہوئے مجھے پروفیسر شپ آفر کی، انھوں نے ایک جملہ لکھا ہے کہ قاضی عبدالستار غروب ہوتی ہوئی تہذیب کے نمائندے ہیں۔ مجھے اس جملہ پر فخر ہے، ناز ہے۔ اور میں جو کہہ رہا ہوں وہ یقیناً غروب ہو رہی ہے لیکن کوئی ایک تو مضبوطی سے پکڑے رہے۔

سوال : آپ نے ابھی اپنے جن اساتذہ کا نام لیا وہ سب کے سب نقاد تھے لیکن باوجود اس کے آپ فکشن کی طرف آئے۔ اس کی کیا وجہ تھی؟

جواب : میں پہلے شاعر تھا اور میرا تخلص تھا صہبا مچھر ٹھوی۔ ہمارے دادا کے ایک خرد تھے بابو گر چرن لال شیدا نگینوی، انھوں نے مجھے تخلص دیا تھا اور میری غزلیں وہ اتنی بناتے تھے کہ وہ ان کی معلوم ہوتی تھیں۔ مشاعرے میں جب میں پڑھتا تھا غزل پر داد مجھے ملتی تھی اور لوگ دیکھتے ان کی طرف تھے تو میں بڑی انسلٹ محسوس کرتا تھا۔ جیسے ہی میں بی اے میں داخل ہوا صہبا مچھر ٹھوی کو سولی پر چڑھا دیا اور میں نے سال دو سال بعد شاعری ہی چھوڑ دی۔ اس لیے کہ میرے اساتذہ نے مجھ سے کہا مثال کے طور پر سب سے پہلے مسعود حسن رضوی ادیب نے مجھ سے نہیں کہا بلکہ اپنے بیٹے پروفیسر اختر سے کہا جو پیشاور یونیورسٹی میں فارسی کے صدر شعبہ بھی رہے کہ قاضی سے تم کہو وہ تمہارے دوست بھی ہیں کہ وہ جی جان سے ناول پر لگیں۔ دو کشتیوں پر سوار مت ہوں، نہیں کر پائیں گے کچھ، کیوں کہا انھوں نے مجھے نہیں معلوم۔ پھر میں نے ایک ناول لکھا جب میں بی اے آنرس میں تھا 1953 میں، ہاشمی صاحب کو دکھلایا لیکن مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ میں پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب صاحب کو دکھلاؤں، ہاشمی صاحب ذرا نرم خو، نرم مزاج تھے، نرم کلام بھی تھے، ان کے پاس میں گیا کہ سر یہ میرا ناول ہے دیکھ لیجیے آپ، اگر کسی قابل ہو تو میں شائع کراؤں یا آپ شائع کرا دیجیے۔ دوسرے دن ان کا چپراسی میرے ہاسٹل آیا کہ سر نے آپ کو یاد کیا ہے۔ میں شام کو سیدھا گیا۔ فوراً مجھے دیکھ کر انھوں نے کہا "آؤ قاضی آؤ۔ پہلی بار مجھے شرف حاصل ہوا کہ انھوں نے مجھے قاضی کہا اور آؤ بھائی آؤ کہا۔ فارمل نہیں تھے وہ۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ اچھا ناول لکھا ہے۔ میں چھپواؤں گا اسے، بس میں یہ بتانے کے لیے میں تم کو یہاں بلایا ہے کہ

اس میں دو ایک غلطیاں ہیں جو تم نے کی ہیں وہ تم خود درست کرو۔ آپ نے ڈیگوں لکھا ہے جو لفظ دیغ ہے۔ گ نہیں ہے غ ہے۔ میں نے کہا مگر سر میں نے جو سنا وہ لکھ دیا۔ بس اسی لیے تو بتایا ہے آپ کو۔ انھوں نے خود قلم نہیں لگایا بلکہ مجھ سے بولے تم خود درست کرو۔ اسی طرح ایک اور لفظ تھا جو مجھے اس وقت یاد نہیں ہے وہ آؤٹ آف کنٹیکس تھا۔ کوئی لفظ خوبصورت تو ضرور تھا جو انھوں نے کہا کہ یہ لفظ بہت بھاری لفظ ہے۔

اس طرح میں ناول کی دنیا میں داخل ہوا۔ اور آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ وہاں کے پبلشر شمس لکھنوی نے شائع کیا تھا وہ ابھی زندہ ہیں اور کئی بار مجھے کھانے پر بلا چکے ہیں۔ انھوں نے مجھے تین سو روپے دیے تھے۔ اس وقت سونا ایک سو چالیس روپے تولہ تھا۔ آپ سوچیے کہ اس وقت وہ کتنی بڑی رقم تھی اور لیکچرر کی تنخواہ اس وقت تین سو روپے تھی تب مجھے تین سو روپے ملے تھے۔ تو تین چار دن تک مجھے نشہ طاری رہا۔ اس لیے نہیں کہ ناول میں نے لکھا ہے اتنی بڑی رقم مجھے ملی ہے۔ بس وہیں سے سب کچھ چھوڑ چھاڑ دیا۔ معلوم ہے پہلا ناول شکست کی آواز جو میں نے لکھنؤ میں چھپوایا تھا یہ پوری ایک کہانی ہے، لمبی ہو جائے گی بات میں، بہت ہی مختصر کر دوں۔ پہلے آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ نقوش کا جو ایڈیٹر تھا طفیل وہ چھپی ہوئی چیزیں نہیں چھاپتا تھا۔ وہ اتنا سخت تھا وہ کرشن چندر سے بھی یہ کہہ دیتا اگر وہ تحریر اپنے معیار کے مطابق نہیں پاتا تھا کہ کرشن جی یہ افسانہ تو آپ نے شمع کے لیے لکھا تھا غلطی سے مجھے دے دیا، میرا افسانہ کہاں ہے۔ یہ تھی تہذیب۔ اور وہ سمجھ جاتے تھے کہ یہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ قاضی تمہارا وہ ناول ٹھیک سے اشاعت نہ ہونے کی وجہ سے برباد ہو گیا۔ اس میں آنسو دکھائیں، اس کا ڈسکور بہت ہی خراب بنایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تم اسے اپنے ہاتھ سے لکھ کر لے آؤ۔ میں لکھ کر لے گیا انھوں نے محمد طفیل کو بھیجا مجنون گورکھپوری کے پاس اور یہ لکھا کہ یہ چھپ چکا ہے تم پڑھ لو اور اگر اس قابل ہو تو شائع کر دو۔ وہی پہلا ناول تھا جو دوبارہ شائع ہوا اور جسے نقوش نے شائع کیا "دود چراغ محفل" کے نام سے۔ دود چراغ محفل نام رکھا مجنون گورکھپوری صاحب نے قرۃ العین حیدر نے ان کو خط لکھا کہ یہ کون بزرگ ہیں ان کا جغرافیہ بھیجیے۔ تو محمد طفیل نے وہ

خط مجھے بھیج دیا کہ آپ بزرگ صاحب جواب دیجیے۔ تو میں نے انھیں خط لکھ کر جواب دیا کہ ابھی تو میں اسٹوڈنٹ ہوں۔ اور وہ ناول آپ کو پسند آیا یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔ اس کے بعد قرۃالعین حیدر سے میرا تعلق خاطر پیدا ہو گیا اور وہ ڈپارٹمنٹ آئیں جب تو انھوں نے مسعود حسن رضوی صاحب سے کہا کہ یہ قاضی عبدالستار کون ہیں۔ تو میں اس وقت کلاس لے رہا تھا تو مجھے فوراً انھوں نے چپراسی بھیج کر بلایا کہ کلاس ولاس چھوڑ دیجیے در اصل وہ بہت ہی بد دماغ خاتون تھیں قرۃالعین حیدر، معلوم ہے آپ کو، ان کے لیے مشہور ہے کہ ساحرلکھنوی کی ممبئی میں ایک بار ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے قرۃالعین حیدر سے کہا کہ میں ساحر ہوں تو انھوں نے کہا کہ ہو گے آگے بڑھو۔

ایک پروفیسر ہیں، اس وقت وہ لیکچرار تھے، انھوں نے قرۃالعین حیدر سے بات کرنی چاہی تو انھوں نے کہا کہ آپ شاعر ہیں، میں ناول نگار ہوں پھر کیا کریں گے بات کر کے۔ یہ کہنا منہ پر بہت بڑی تھی۔ خیر میں آ گیا، پھر کیا موصوفہ سے گھنٹوں باتیں کیں۔ شب گزیدہ میں میں نے انھیں سے فلیپ لکھوایا۔ میں رشید صاحب سے لکھوا سکتا تھا، میں نور ہاشمی صاحب سے، احتشام حسین صاحب سے، سرور صاحب سے، کسی سے بھی کہتا، خدا کی قسم وہ لکھ دیتا لیکن میں نے لکھوایا قرۃالعین حیدر سے اور انھوں نے میرے بارے میں مشہور جملہ لکھا کہ '' قاضی عبدالستار سے بہتر ناول قاضی عبدالستار ہی لکھ سکتے ہیں''۔ تو ایک ناول کا اثر یہ ہوا۔ آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ جو میرا پہلا ناول تھا وہ سات زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہوا۔ بابا ناگارجن نے اس پر سیمینار کیا اور مجھے علی گڑھ کے اس سیمینار میں بلایا اور مجھے تام پتر دیا اس سیمینار میں جو میرے پاس اب بھی موجود ہے۔ جب یہ ناول انھوں نے ہندی میں چھاپا تو اس کا نام رکھا '' پہلا اور آخری خط'' مجھ سے اجازت لے کر چھاپ دیا اور اس کے فلیپ پر لکھا کہ '' ہندی کے وہ لوگ جو دیہات پر لکھنا چاہتے ہیں انھیں یہ ناول ٹیکسٹ بک کی طرح پڑھنا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ اس سے ظاہر ہے کہ میں شاعری کی طرف کیوں متوجہ ہوتا، اتنا آ ز مجھے ایک ہی ناول میں مل گیا تھا۔

سوال : قاضی صاحب آپ نے تاریخی ناول بھی لکھے ہیں اور جہاں تک میرا خیال ہے عبدالحلیم شرر کے بعد اگر کسی نے تاریخی ناول لکھا ہے تو وہ آپ ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ آپ نے تاریخی ناول کی طرف اپنی توجہ مرکوز کی؟ شرر کے سلسلے میں تو یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ 1857 کے بعد ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ شرر کو مجبوراً ماضی کی طرف دیکھنا پڑا، آپ کے سامنے کیا مجبوری یا ضرورت تھی۔ آپ نے تاریخی ناول کیوں لکھے؟

جواب: میرے ساتھ کوئی مجبوری نہیں تھی۔ میرا خیال تھا کہ یہ جو ناول لکھے گئے ہیں جن میں عبدالحلیم شرر وغیرہ کے ناول شامل ہیں، یہ ناول نہیں لکھ رہے تھے بلکہ یہ لوگ مسلمانوں کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لیے تحریریں پیش کر رہے تھے۔ اس کی بہت تعریف کی جاتی ہے میں اس ناول کا نام بھول رہا ہوں۔

سوال :فردوس بریں

جواب:نہیں !نہیں !وہ تو بہت معمولی ناول ہے، میں اس کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ ایک اور ہے خیر میں پھر نام بتا دوں گا۔ سرور صاحب نے بھی اس کی تعریف کی ہے مگر وہ بھی معمولی ناول ہے۔ دراصل میرا مقصد تھا کہ اردو کے پاس ایسا ناول ہونا چاہیے جیسا کہ اسکاٹ یا دوسرے ناول نگاروں نے تاریخی ناول لکھے ہیں جو اب تک اردو میں نہیں تھا۔ میرے اوپر یہ نشہ سوار تھا اور میں نے لکھا اور خدا کا شکر ہے۔ آپ کو سن کر حیرت ہوگی۔ میرا ''صلاح الدین ایوبی'' پہلا تاریخی ناول ہے جو کہ داراشکوہ کے بعد چھپا لیکن ہے وہ میرا پہلا تاریخی ناول اور اسی ناول پر فکشن کا پہلا غالب ایوارڈ مجھے ملا جو غالب ایوارڈ کمیٹی نے دیا کہ جس کی چیئر پرسن اندرا گاندھی تھیں، وائس چیئرمین فخرالدین علی احمد تھے اور سکریٹری قاضی عبدالودود تھے۔ اس وقت فخرالدین علی احمد صاحب صدر جمہوریہ نہیں بلکہ وزیر تھے۔ غالب ایوارڈ کمیٹی کے ممبران میں یوسف سہیل خاں صاحب اور بیرسٹر نورالدین صاحب شامل تھے۔ یہ تینوں لوگ ایک زمانے میں آکسفورڈ میں پڑھتے تھے اور فکشن ان کی اسپیشل اسٹڈی تھی۔ تو انھوں نے مجھے خط لکھا اور قاضی صاحب نے لکھا کہ متفقہ طور پر پہلا غالب فکشن ایوارڈ آپ کو دیا جا رہا ہے۔ تو آپ سوچیے کہ اس رات مجھے نیند آئی ہوگی؟ آپ یقین مانیے عزیزم مجھے اس

رات نیند نہیں آئی۔ پیسے کا مسئلہ نہیں تھا۔ الحمداللہ اس کی کبھی کمزوری نہیں رہی، خدا نے مجھے دولت دے رکھی تھی، اور اب بھی دے رہا ہے اور مجھے توقع ہے کہ مستقبل میں بھی دیتا رہے گا۔ آئر کی وجہ سے میں سو نہیں سکا۔ اس خط میں اتنی تعریف لکھی تھی جس کا ذکر میں یہاں انکساری کی وجہ سے نہیں کر رہا ہوں۔ اچھا! وہ خط میرے پاس نہیں ہے کہ آپ یہ کہیں کہ ثبوت دیجیے اور مجھے ایسی بات کرنی بھی نہیں ہے۔ یہ تو چھپا ہوا موجود ہے اور ان لوگوں کی زندگی میں چھپا تھا کہ متفقہ طور پر فیصلہ ہے کہ غالب کا پہلا فکشن ایوارڈ قاضی عبدالستار کو دیا جائے۔ تو پہلے میرے تاریخی ناول کو جب یہ شرف ملا تو مجھے دوسرے تاریخی ناول لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ میں نے دوسرا تاریخی ناول دارا شکوہ لکھا۔ دارا شکوہ نے ہنگامہ کر دیا۔ ہندی میں اس پر خوب چھپا۔ پھر مجھے غالب پر لکھنے کا شوق ہوا۔ مجھے غالب پر ناز نہیں ہے بلکہ غالب کی زبان پر ناز ہے۔ کوئی مائی کا لعل لکھ نہیں سکتا اس زمانے میں۔

سوال : غالب کے بارے میں تو یہ کہا جاتا ہے کہ آپ سے یہ ناول لکھوایا گیا ہے؟

جواب : ہاں لکھوایا بھی گیا ہے۔ لیکن میں اس کی زبان کے لیے دعویٰ کرتا ہوں۔ کوئی صاحب ایک صفحہ لکھ کر دکھا دیں مجھے۔ بھائی چھاپنے کے لیے ہر آدمی موجود ہے۔ پھر مجھے ناز ہے اپنے تاریخی ناول ''خالد بن ولید'' پر۔ ایک اور بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ میرے چاروں ناولوں کی زبانیں الگ ہیں۔ اردو میں کوئی ایسا ادیب بتا دیجیے سب رس سے لے کر آج تک جس کے چار ناول ہوں یا چار کتابیں ہوں اور ان چاروں ناولوں کی زبان یا اسٹائل الگ الگ ہو۔ میرے پڑھنے والے جانتے ہیں۔ میرے دشمن نقاد بھی جانتے ہیں، میرے دوست نقاد بھی جانتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ دوست نقاد لکھتے نہیں ہیں اور دشمن نقاد میرے خلاف لکھتے رہتے ہیں۔ لیکن مجھے کوئی افسوس نہیں ہوتا۔ اس لیے دوست کی تعریف اور دشمن کی تنقیص بے معنی ہے۔

سوال : قاضی صاحب ابھی آپ نے سیمینار میں جدیدیت، مابعد جدیدیت اور ترقی پسندی کے حوالے سے بات کی تھی، خاص طور سے یہ کہ جس وقت جدیدیت وجود میں آ رہی تھی خواہ وہ کسی بھی طریقے سے آ رہی تھی اس وقت آپ نے بہت اسٹینڈ لیا۔ اس اسٹینڈ لینے کا بنیادی محور کیا تھا؟

جواب : جی ہاں۔ایک ہی آدمی تھا علی گڑھ میں اور وہ میں تھا۔میں نے صاف طور پر کہا کہ یہ سب فراڈ ہے۔ یہ صرف شہرت حاصل کرنے کے ہتھکنڈے ہیں۔ان سے کسی شخص کو ادب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔جس افسانے کو یہ لوگ افسانہ کہہ رہے ہیں ''پھندنے'' وہ منٹو کا معمولی افسانہ ہے۔منٹو کے پاس بارہ (12) افسانے ہیں جو دنیا کے کسی بھی زبان کے افسانے کے مقابل رکھے جا سکتے ہیں۔منٹو اردو ادب کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہے۔ پریم چند اور منٹو۔ٹیکنیک میں تو منٹو پریم چند سے بھی بڑا افسانہ نگار ثابت ہوا ہے۔آپ نے اس کی ایک کہانی لے لی پھندنے اور اپنی کہانی جوڑ دی کہ وہ بھی ایسے ہی ہے۔دراصل آپ انڈر ریٹ کر رہے ہیں۔اس لیے ہم نے مخالفت کی ورنہ ہمارا کوئی مقصد نہیں تھا مخالفت کرنے کا۔ آپ کو معلوم ہے اس سیمینار میں ایک مارس جمبو صاحب تھے جو فورن سکریٹری ایمبیسی آف یونائیٹڈ اسٹیٹ تھے وہ میزبان تھے۔وہ پہلے دن رات کو ساڑھے نو بجے میرے گھر آئے اور مجھے بڑی حیرت ہوئی ان کو دیکھ کر، بڑی بھڑک دار بشرٹ پہنے ہوئے تھے اور سفید پتلون۔تو انھوں نے اپنا بیگ کھولا اور ایک قلم، گولڈ شیفرڈ کا ایک پورا سیٹ دیا کہ میں آپ کے لیے لایا ہوں۔میں نے اسے دیکھا اور کہا کہ جی جی بہت اچھا ہے۔میں نے میز پر رکھ دیا۔میں نے کافی پلائی ان کو۔انھوں نے کہا کہ آپ مجھے اپنا ناول ''دارا شکوہ'' شائع کرنے کی اجازت دے دیجیے یہ میں ''ان کورٹ آف لا'' کہہ رہا ہوں۔اجازت دے دیجیے تو آپ کی کوٹھی وائس چانسلر کی کوٹھی سے بڑی کوٹھی ہوگی۔آپ کی موٹر وائس چانسلر کی موٹر سے بڑی ہوگی۔یہ معمولی قالین، اتنا بڑا ادیب اور یہ سب۔تو میں نے کہا کہ ایسا ہے سامان سے ادیبوں کی عزت کا پتہ نہیں چلتا اور نہ ہی ادیبوں کی مہنگی قلم سے پتہ چلتا ہے۔ایک مصرع ہے کسی شاعر کا کہ ''علم کی پہچان ہے زردیٔ رخسار کی'' تو آپ ایسی باتیں مت کریں۔رہ گیا یہ قلم تو وہ میں نہیں لوں گا۔ان کے جیب میں دو پنسلیں لگی تھیں تو میں نے کہا کہ میں یہ لے لوں گا۔یہ آپ کی یادگار رہے گی۔پھر میں سیدھا سلامت اللہ خاں کے پاس گیا جو میرے معترف تھے اور مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔مر گئے بیچارے۔پروفیسر نہیں ہو سکے ریڈر ہی رہے۔جذبی صاحب کی طرح ان کا انتقال ہو گیا۔میں ان کے پاس گیا۔انھوں نے کہا کہ مارس جمبو نے جو کہا ہے

اس سے دوگنا ہوگا لیکن آپ بک جائیں گے، اگر آپ کو منظور ہے تو آپ اجازت دے دیجیے۔ آپ کے نام سے پھر بہت کچھ چھاپا جائے گا اور آپ انکار نہیں کر پائیں گے۔ یہ جو آپ کی ٹیڑھ ہے، ترچھی چال، ترچھی ٹوپی، یہ سب ختم ہو جائے گی۔ چوں چوں کا مربا بن کر رہ جائیں گے۔ ارے! اس پر میں نے کہا لعنت بھیجیے سلامت صاحب میں تو اسی طرح زندہ رہنا چاہتا ہوں اور اسی طرح مرنا چاہتا ہوں۔ اور میں نے صاف جواب دے دیا۔ تین دن کا سیمینار تھا اور میں دوسرے دن ان کے گیسٹ ہاؤس گیا اور مارس جبو سے کہا کہ وہ نکلنے والے تھے میں آپ کے اس آفر کو قبول نہیں کر سکتا۔ اس کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے ایک جملہ پھر کہا تھا کہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اردو میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں۔

سوال : جب ہم آپ کے معاصرین پر نظر ڈالتے ہیں تو کہیں نہ کہیں قاضی عبدالستار بالکل الگ نظر آتے ہیں۔

جواب : الحمداللہ

سوال : حالانکہ حالات وہی تھے، ماحول وہی تھا سب کچھ وہی تھا لیکن کیا وجہ ہوئی کہ قاضی عبدالستار اپنے آپ میں بالکل منفرد اور انفرادی طور پر نمودار ہوتا ہے۔ اس کی کیا وجہ تھی؟

جواب : اس کا ثبوت میری زبان ہے۔ جو میرا نام لیا گیا اور چونکہ یہ بہت ہی مشہور بات ہے، اس لیے میں کہہ رہا ہوں اور میری عمر بھی ایسی ہے کہ جو مجھے معلوم ہے اسے چھپانے کی ضرورت نہیں ہے کہ نہ جانے کب بلاوا آ جائے، تو میری مخالفت کی گئی، کسی نے میرا نام لیا، پروفیسر نصیر نے میرا نام لیا بہادر شاہ ظفر ایوارڈ کے لیے لیکن میرے دشمنوں نے شیلا صاحبہ سے کہا تھا کہ یہ نام مناسب نہیں ہے، اس پر دوبارہ غور کر لیجیے۔ شیلا دکشت نے قرۃ العین حیدر سے پوچھا کہ آپ ان کے بارے میں کیا کہتی ہیں تو انھوں نے وہی کہا جو میں آپ سے کہنے جا رہا ہوں۔ تو انھوں نے کہا کہ ''اردو ادب میں کون ہے جو قاضی عبدالستار جیسی زبان لکھتا ہے۔ اور ان میں میں بھی نہیں ہوں۔ بس انھوں نے فوراً میرا نام منظور کر دیا۔ یہ میرا اٹریبوٹ ہے۔ یہ سرٹیفکیٹ ہے میرا اور میں اس پر ناز کرتا ہوں۔ اردو میں کوئی ادیب نہیں ہے جو چار اسٹائل میں لکھتا ہو لیکن الحمداللہ میں لکھتا ہوں۔ کھتمر مزدور پر بھی لکھتا ہوں، تعلقہ دار اور

زمیندار پر بھی لکھتا ہوں، بادشاہوں پر بھی لکھتا ہوں، فاتحوں پر بھی لکھتا ہوں اور زبان الگ الگ رکھتا ہوں اور جس کو شک ہو تجزیہ کر کے دکھا دے۔

سوال : ایک بات اور وہ یہ کہ ناقدین کی یہ شکایت بھی ہوسکتی ہے اور تعریف بھی اور ایک صحت مند تنقید بھی ہوسکتی ہے وہ یہ کہ آپ کی جو تحریریں ہیں وہ ناول ہو یا افسانہ ہو اس میں کہیں نہ کہیں جو ماضی کی زوال پذیر زندگی ہے اس کا رونا روتے ہیں، ایسا کہا جاتا ہے آخر کیوں؟

جواب : پہلی بات تو یہ کہ یہ لفظ ہی غلط ہے کہ میں رونا روتا ہوں۔ میں نے تو ان کا مذاق اڑایا ہے۔آپ مجھے سمجھ ہی نہیں پا رہے ہیں۔صرف ایک شخص پروفیسر کنور پال سنگھ نے ایک مضمون لکھتے ہوئے میرے بارے میں لکھا ہے کہ "قاضی عبدالستار جو اپنے کرداروں کو پیش کرتے ہیں تو ان کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان کی غربت پر ہنسی آتی ہے نہ کہ فخر محسوس ہوتا ہے"۔بابا ناگارجن نے بھی یہی لکھا جو اردو میں کسی نے نہیں لکھا۔اردو میں صرف طارق چھتاری نے 'پیتل کا گھنٹہ' کے سلسلے میں لکھا ہے کہ وہ مستقبل کی طرف دیکھتا ہے۔ہندی میں بھیرو پرساد گپت نے لکھا، ہندی میں بابا ناگارجن نے لکھا، اور یہی لوگوں نے لکھا ہے۔یہی لکھا ہے جو میں آپ کو سنا رہا ہوں۔دراصل آپ دلچسپی سے پڑھ نہیں رہے ہیں۔میرے دشمنوں کا یہ جملہ ہے کہ جو نہیں چاہتے میرا مجھے حق ملے۔ان کا پیدا کیا ہوا جملہ ہے۔آپ ناول لے کر آئیے اور نشان لگا کر لے آئیے تو میں بھی ذرا دیکھوں کہ کہاں میں روتا ہوں۔یاد رکھیے تعلقہ دار کا بیٹا کبھی نہیں روتا۔موت پر بھی نہیں روتا۔تہذیب کا ماتم تو کر سکتا ہے لیکن رو نہیں سکتا۔

سوال : ابھی تک ناول اور افسانہ نگاری کے حوالے سے بات ہو رہی تھی لیکن میں تنقید پر بھی بات کرنا چاہتا ہوں کیونکہ فکشن کی تنقید کو دیکھ کر کافی افسوس ہوتا ہے کہ جس طرح سے شاعری پر توجہ دی گئی فکشن پر نہیں دی گئی۔اس کی آپ کیا وجہ سمجھتے ہیں؟

جواب : اس کی وجہ ہے۔شاعری پر مضمون لکھنا بہت آسان ہے۔آپ تجربہ کر لیجیے۔احمد فراز کا مجموعۂ کلام نکلوائیے، تین دن میں اسے آپ ختم کر دیں گے اور اگلے تین دن میں آپ مضمون لکھ دیں گے۔میرے کتنے ناول پڑھنا پڑیں گے آپ کو، کتنے افسانے پڑھنا پڑیں

گے، تین مہینے آپ کو چاہیے، اور ہوتا یہ ہے کہ اگلا ناول جب پڑھیں گے تو پچھلا بھول جائیں گے، پھر پڑھیں گے تو پھر وقت لگے گا۔ تو تین مہینے تو یہ لگ گئے، پھر آپ ایک مہینہ میں مضمون لکھیے۔ پھر وہ چھپے، پھر آپ کو سال بھر بعد اطلاع ملے کہ بہت اچھا لکھا تھا۔ وہاں تو تین دن میں پڑھا، تین دن میں لکھا، دھڑا دھڑ اشعار کوڈ کر رہے ہیں، کہیں کوئی لغزش نہیں ہے۔ اس لیے شاعری پر زیادہ لکھا جاتا ہے۔ اس لیے شاعری پر لکھنا آسان ہے۔ ایک بات تو یہ ہوئی، دوسری بات یہ ہے کہ آپ کے ٹولس وہی ہیں جو غزل کے ہیں، جو نظم کے ہیں اور انھیں ٹولس کو آپ ہمارے اوپر اپلائی کرتے ہیں۔ میں بہت ہی حقارت سے یہ بات کہتا ہوں، مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی شرمندگی نہیں ہے کہ آپ بھونسے کے ترازو سے جواہرات تولنے بیٹھے ہیں۔ ہماری نسل جواہرات کا انبار ہے، آپ کا ترازو غلط ہے۔ یہ ترازو بھونسے کا ہے۔ یہ سبب ہے کہ شاعری پر زیادہ لکھا جا رہا ہے اور فکشن پر کم کیونکہ آپ کے پاس فکشن پر لکھنے کے لیے ٹولس نہیں ہیں۔

سوال: آپ کے شاگرد بھی فکشن نگار ہیں۔

جواب: جی ہاں اور مجھے اس پر فخر ہے۔

سوال: اس وقت آپ نئی نسل کو کیسے دیکھ رہے ہیں؟

جواب: مجھے افسوس ہے کہ ہمارے شاگردوں کے بعد جو نسل آئی ہے، اس میں ابھی کسی نے، یا تو ابھی میری نظر سے نہیں گزرا، حالانکہ میں اپنے شاگردوں سے کہتا رہتا ہوں کہ نئے لکھنے والوں کا افسانہ پڑھو بھائی اگر لکھ رہے ہیں تو اور اگر ان کا افسانہ آپ لوگوں کو اچھا لگے تو مجھے بھی دو، دو چار ملے بھی ہیں۔ لیکن ان کو پڑھ کر مجھے علامہ اقبال کا شعر یاد آتا ہے اور خدا نخواستہ میں دل شکنی نہیں کر رہا ہوں، مجھے پوری امید ہے کہ یہ لوگ بہت جلد اچھے افسانے اور ناول لکھیں گے۔ تو اس کے لیے میں کہہ رہا ہوں کہ دو چار کہانیاں میں نے پڑھی ہیں اور بقول علامہ اقبال

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

تو یہ ہے جواب میرا اور میں توقع کرتا ہوں کہ سب بہت اچھا لکھیں گے۔ یہ سب لوگ پہلی دوسری کہانی میں تھوڑی ایسا لکھ رہے تھے۔ نہ اشرف، نہ ابن کنول، نہ پیغام اور نہ طارق۔ہاں لکھتے لکھتے آیا ہے اور ہم نے ہمیشہ ہمت افزائی کی کہ اور لکھو، اور لکھو اور لکھو۔اب یہ لوگ اپنا ایک نام رکھتے ہیں، ان کی ادب میں ایک حیثیت ہے۔

سوال : ایک سوال رہ گیا تھا۔آپ نے ابھی کہا کہ میرے چار ناول ہیں اور چاروں ناولوں کی زبانیں الگ الگ ہیں، اور میں نے جو آپ کے ناول پڑھے ہیں اس میں یہ ظاہر ہوا ہے اور جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا کہ جب میں نے آپ کا ناول ''حضرت جان'' پڑھا تو اس میں ایک الگ قسم کا قاضی عبدالستار نظر آیا ہے۔حضرت جان جیسا ناول لکھنے کا خیال آپ کے ذہن میں کیسے آیا؟

جواب :یہ سوال آج تک کسی نے نہیں کیا اور اب آپ کر رہے ہیں تو میں آپ کو اس کا جواب دے رہا ہوں۔حیات اللہ انصاری صاحب جب راجیہ سبھا کے ممبر تھے تو ویسٹرن کورٹ میں تھے، میں ان سے ملنے جاتا تھا اور میں ان کا بہت ہی ادب ولحاظ کرتا تھا اور وہ مجھ سے کافی محبت کرتے تھے۔انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر تم چار آنے کا ٹکٹ کانگریس کا بھر دو تو میں تم کو راجیہ سبھا کا ممبر بنوا دوں۔تو میں نے کہا کہ بھئی تو پھر میں کیا کروں گا؟ اردو کا کوئی مسئلہ وہاں آئے گا نہیں اور میں جو تقریر کرتا ہوں وہ ٹوٹی پھوٹی اردو زبان پر کر لیتا ہوں، میں تو سیاست جانتا ہی نہیں۔مجھے نہیں چاہیے لہٰذا آپ اس پر مت سوچا کیجیے۔یہ میں نے ان کی محبت کی مثال دی۔ایک روز مجھے کھانا کھلانے کے بعد جب میرے لیے گاڑی آ گئی تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ قاضی صاحب ایک نوٹس ہے۔چونکہ ان کا انتقال ہو گیا اور اس بات کو بہت دن ہو گئے ہیں، ابھی تک میں نے جواب نہیں دیا تھا، اس سوال کا پہلی بار جواب دے رہا ہوں۔اور مرے ہوئے آدمی پر غلط بیانی میرا خیال ہے بہت گھٹیا چیز ہے جو میں نے کبھی نہیں کی۔تو اس سے آپ بالکل مطمئن رہیں کہ میں غلط بیانی نہیں کر سکتا وہ بھی حیات اللہ انصاری کے تعلق سے تو بالکل نہیں۔تو انھوں نے دس بارہ صفحے مجھے دیے کہ اسے پڑھ لیجیے گا۔وہ پوری ایک بکھری ہوئی تحریر تھی۔جو کچھ ہو رہا تھا دلی میں اس کا بالکل من وعن بہت ہی بھونڈا بیان تھا۔ظاہر ہے وہ انصاری صاحب کے قلم کا نہیں تھا۔میں تو ان کی تحریر پہچانتا ہوں، کسی نے

ان کو دیا تھا۔ اور انھوں نے کہا کہ میرے پاس وقت نہیں ہے قاضی عبدالستار سے کہوں گا اگر وہ لکھ سکتے ہیں تو لکھ دیں گے۔ تو میرے پاس فون گیا تین چار روز بعد، آئی ایم ساری۔ اس زمانے میں فون وون نہیں تھا خط گیا میرے پاس کہ آپ پہلی فرصت میں سنیچر کو میرے پاس آ جایئے کیونکہ میں بہت اہم بات کہنا چاہتا ہوں، خیر میں گیا، میں سمجھ گیا تھا کہ اسی سلسلے میں بات کریں گے۔ تو انھوں نے کہا کہ اس پر لکھیے آپ۔ تو میں نے کہا کہ اس پر لکھنے کے لیے منٹو کے آتش خانہ سے آگ لانی پڑے گی۔ تو انصاری صاحب نے کہا کہ مجھے آپ سے یہ توقع نہیں تھی۔ مجھے آپ کی زبان سے یہ سن کر بہت دکھ ہوا۔ اس پر میں نے کہا کہ اگر انصاری صاحب ایسی بات ہے تو میں لکھوں گا۔ اور آپ جب اسے دیکھ لیں گے تب شائع کراؤں گا۔ اور پھر میں نے پورا ناول لکھا۔ وہ ناول انھوں نے دیکھا۔ حیات اللہ انصاری نے دیکھا اور ہندی میں نمیتا سنگھ نے دیکھا۔ میں نے اس لیے دکھایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں نے کچھ زیادہ گرم تحریری کا ثبوت پیش کر دیا ہو۔ تو وہ بتائیں گی مجھے۔ دونوں کا یہ بیان تھا کہ کہیں بھی نکتہ نہیں رکھا جا سکتا۔ اسے من وعن شائع کرا دیجیے۔ شائع ہو گیا۔ تو یہ کہانی ہے۔ یہ چیلنج تھا ایک طرح کا۔ اچھی ہندی والے بھی پوچھتے تھے، کملیشور نے ایک بار کہا کہ کیا ہمارے یہاں کوئی ایسا ناول نہیں ہے جو ہاٹ کیک کی طرح بکے۔ یہ امریکہ میں لوگ کیسے لکھتے ہیں۔ تو میں نے کہا کہ بھائی ایسا ہے وہاں جو سیکس پر ناول لکھے جا رہے ہیں تو انگریزی میں اس لیے لکھے جا رہے ہیں۔ ان کو لکھنے میں کوئی قباحت نہیں ہوتی کہ ان کے یہاں سیکس آرگن کا جو نام ہے۔ وہ گھٹیا اور گالیاں نہیں ہیں۔ ہمارے یہاں آرگنس جو ہیں وہ گالیاں بن گئی ہیں۔ تو اس پر کملیشور نے کہا کہ بھائی صاحب آپ تو استعارات کے جلوس نکالتے ہیں تو کیا استعارے میں بات نہیں کہی جا سکتی۔ میں نے کہا بالکل کہی جا سکتی ہے۔ تو پھر لکھیے اور جب حیات اللہ انصاری نے میری تخلیقیت پر ٹھوکر ماری۔ اس وقت میں نے کہا کہ میں لکھوں گا اور میں نے لکھا۔ ایک صاحب نے سوال کیا کہ آپ نے کیوں لکھا؟ تو میں نے کہا کہ میں نے اس لیے لکھا کہ میں لکھ سکتا تھا اور دوسرا کوئی اس ناول کو نہیں لکھ سکتا تھا۔

•••

انتظار حسین سے گفتگو

انتظار حسین ان قلمکاروں میں سے ہیں جنھوں نے 1960 کے بعد اردو افسانے کی گھٹتی ہوئی مقبولیت کے دور میں اپنے فن کا لوہا منوایا۔ اس ہیجانی دور میں داستانوی اسراریت کی فضا میں علامتوں کو چابکدستی سے استعمال کرتے ہوئے انتظار حسین نے دوسرے افسانہ نگاروں کے رویے اور روش سے انحراف کیا اور اپنی راہ سب سے الگ نکالی۔ ملک کی تقسیم کے بعد رونما ہونے والے المیوں اور ترک وطن یا ہجرت کے مسائل کو انھوں نے اپنے افسانوں میں پیش کیا۔

حیدرآباد میں ان کی آمد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے ان سے طویل ملاقات کی۔ ناسپاسی ہوگی اگر ہم اس سلسلے میں ہماری مدد کرنے والے پروفیسر بیگ صدر شعبہ مرکزی جامعہ (سنٹرل یونیورسٹی) حیدرآباد کا تہہ دل سے شکریہ ادا نہ کریں۔

انتظار حسین صاحب کی پیدائش 1925 میں قصبے دیوائی (ضلع بلند شہر، یوپی) میں ہوئی جو ان کا آبائی وطن ہے۔ 1947 میں جب انھوں نے پاکستان ہجرت کی تو وہ ایم۔اے۔کر چکے تھے۔ پاکستان جانے کے بعد سے ہی وہ لاہور میں مقیم ہیں۔ اس حوالے سے ہمارے سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ لاہور میں ان کے قیام کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ سب سے پہلے لاہور گئے اور لاہور کو اپنے مستقل قیام کے لیے پسند کیا۔ لکھنے لکھانے کے بارے میں انتظار

صاحب کا کہنا تھا کہ لکھنے کا جذبہ اور شوق ان کے دل میں شروع ہی سے تھا۔ کسی بیرونی ترغیب کا اس میں دخل نہیں ہے۔ 1947 ہی میں انھوں نے لکھنا شروع کیا اور اپنی تحریروں کی اشاعت کے لیے ان کو زیادہ انتظار ہی نہیں کرنا پڑا تھا۔ افسانے اور ناول لکھنے کے علاوہ سالہا سال تک لاہور کے روزنامہ ''مشرق'' میں ''لاہور نامہ'' کے عنوان سے ادبی سماجی اور ثقافتی موضوعات پر انھوں نے کالم لکھے۔ آج کل انگریزی روزنامہ ''ڈان'' (Dawn) کے لیے انھی موضوعات پر کالم لکھ رہے ہیں۔ وہ اپنی پرانی کہانیوں کو بھی از سر نو لکھ رہے ہیں۔ دوبارہ لکھی گئی پرانی کہانیوں کا مجموعہ گذشتہ سال 2007 میں شائع ہوا ہے۔

ہجری ادب کے تعلق سے انتظار صاحب کا خیال ہے کہ انھوں نے یا کسی اور نے ہندوستان سے پاکستان جا کر جو لکھا ہے اس کی نوعیت لندن، یا ہندوستان اور پاکستان سے باہر کسی اور جگہ نقل مکانی کرنے کے بعد لکھی جانے والی تحریروں سے مختلف ہے۔ ہندوستان سے سید علی باقر مرحوم کے لندن نقل مکانی کرنے کے بعد انھیں جو تجربے ہوئے ان پر ان کی لکھی ہوئی تحریریں اور وہ تحریریں جو میں نے پاکستان جا کر لکھیں، ایک زمرے میں نہیں آسکتی ہیں کیونکہ بنیادی طور پر ہجرت یا نقل مکانی کی نوعیت مختلف ہے۔ وہ معاشی ہجرت ہے جو روزگار کے لیے یا ملازمت کے لیے کسی دوسرے شہر یا ملک کو کی جاتی ہے۔ ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی نوعیت قطعی مختلف ہے۔ ان دونوں ہجرتوں کا تقابل کرنا الجھن پیدا کرنے کا سبب ہوگا۔ انتظار صاحب نے زور دے کر اس بات کو دہرایا کہ ملک کی تقسیم کے بعد پاکستان کی جانے والی ہجرت لندن، ٹورانٹو، دبئی اور جدہ روزی روزگار کے لیے کی جانے والی ہجرت سے مختلف ہے دونوں کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ دونوں ہجرتوں کے بعد درپیش آنے والے حالات اور تجربات ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔

انتظار صاحب کے افسانوں کا اساطیری داستانوں سے گہرا تعلق رہا ہے، اسی تناظر میں ہمارا سوال تھا کہ افسانوں میں اساطیری داستانوں اور ان کی اسراریت کو شامل کرنے پر ادبی حلقوں کا کیا ردِ عمل تھا؟ انتظار صاحب نے اپنے جواب میں کہا کہ اس پر صرف ترقی پسندوں نے شدید اعتراض کیا تھا اور وہ زور دے کر کہا کرتے تھے کہ ''یہ تو ماضی میں چلا گیا ہے، داستانوں اور اس قسم

میں وہ داستانیں بھی آتی ہیں جو اس دھرتی سے تعلق رکھتی ہیں مثلاً ''نل ودمن'' اور ''شکنتلا'' وغیرہ ان داستانوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی لیکن میں نے جب انھیں اہمیت دی تو مجھے احساس ہوا کہ ان داستانوں کے پیچھے اور بھی داستانیں ہیں''نل ودمن'' اور''شکنتلا'' جیسی داستانوں کا سرچشمہ کہاں ہے؟ کہاں سے یہ کہانیاں چلی ہیں؟ میں نے ان سرچشموں تک پہنچنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ ان داستانوں کا سرچشمہ ہندو دیومالا ہے۔ اگر کوئی ہندو دیومالا سے واقف نہیں ہوتا ہے اور ان سے متعارف ہو کر انھیں سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا ہے تو پھر ہند سے تعلق رکھنے والی داستانوں کو سمجھ ہی نہیں سکتا ہے۔اسی لیے روایتی داستانوں کو سمجھنے کے لیے میں نے ہندو دیومالا کا مطالعہ کیا اور براہ راست ان تک پہنچنے کی کوشش ترجموں کے ذریعے کی۔''

داستانوں کے بعد اردو ناول کے تعلق سے ہم نے سوال کیا کہ کیا اردو میں بڑے ناولوں کی کمی ہے؟ جواب میں انتظار صاحب نے ہم سے ہی سوال کیا کہ بڑے ناول سے کیا مراد ہے؟ بڑا ناول کیا ہوتا ہے؟ انھوں نے کہا کہ ناول ہو یا افسانہ اچھا ہوتا ہے یا برا۔ ناولوں کی معیار کے لحاظ سے درجہ بندی کرتے وقت اچھے ناول کو اونچا درجہ دیا جاتا ہے مثلاً بڑا ناول روسی ادب کا شاہکار وار اینڈ پیس (War & Peace) ہے۔ترقی پسند بیشک ''ماں'' کو بڑا ناول مانتے ہوں لیکن میں نہیں مانتا ہوں۔'' انتظار صاحب نے کہا کہ ''ہمیں اردو میں ''وار اینڈ پیس'' کا ہم مرتبہ ناول تلاش نہیں کرنا چاہیے۔یورپی ناول اور سارا فکشن ایک طویل دور جو صدیوں پر مشتمل ہے گزار چکے ہیں۔ ہر جگہ خواہ روس ہو، فرانس ہو یا برطانیہ ہر جگہ فکشن نے لمبا سفر طے کیا ہے جبکہ ہندوستان میں ناول ہو یا مختصر کہانی یہ سب 1857 کے بعد آئے ہیں۔ ہمارے ہاں ان اصناف کی عمر، تاریخ اور تجربے مختصر ہیں اس لیے ''وار اینڈ پیس'' کے مرتبے کا ناول اردو میں تلاش کرنا غلط ہوگا۔ ہمارا سفر تو بے حد مختصر ہے۔ ''وار اینڈ پیس'' جیسا ناول اردو میں ہے تو کون سا ہے؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں لکھا گیا؟ ایسے سوالات نہیں کرنا چاہیے۔ہاں اپنے آپ کو سمجھنے کے لیے تھوڑا سا موازنہ ان سے کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔اردو ناولوں کے بارے میں انتظار صاحب نے بتایا کہ لڑکپن میں تو مجھ کو ''فسانہ آزاد'' بے حد پسند تھا۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ ناول ہے یا نہیں، تاہم فکشن ضرور ہے۔19 ویں صدی میں ناول کا جو سانچہ تھا وہ اس سانچے میں ڈھلا

ہوا نہیں ہے۔ اس سانچے میں ڈھلا ہوا ایک عمدہ ناول ''امراؤ جان ادا'' اور پریم چند کا ناول ''گئودان'' ہے۔ یہ دونوں اردو میں کلاسیک مانے جاتے ہیں۔ ''فسانہ آزاد'' کو نقاد کس زمرے میں شمار کرتے ہیں وہ جانیں میں تو اسے کلاسیکس (Classics) میں کلاسیک مانتا ہوں۔ اس میں ایک پوری تہذیب کا بیان ہے۔''

ہماری اس بات سے کہ اردو ادب کے نقادوں نے اردو افسانوں سے زیادہ دلچسپی نہیں لی اور دیگر اصناف سخن کے مقابلے میں افسانوں اور ناولوں پر بہت کم توجہ دی گئی، انتظار صاحب نے اتفاق کیا۔ اس کی وجہ پوچھے جانے پر کہا کہ ''ہم غزل کے مارے ہوئے لوگ ہیں۔ شاعری تو ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ فوجی جنرلس ریٹائر ہونے کے بعد غزلیں کہتے ہیں۔ تاجروں اور سیاستدانوں کے بارے میں بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے غزلیں کہہ رکھی ہیں۔ فکشن کا معاملہ مختلف ہے اس میں آدمی کو تھوڑا سا ترد کرنا پڑتا ہے، ریاضت کرنی پڑتی ہے وہ تھوڑی فکر اور سوچ کا تقاضا کرتی ہے۔ فکشن لکھا بھی کم جاتا ہے تو اس پر تنقید بھی کم ہوئی ہے۔ فکشن لکھنے کی طرح اس پر تنقید بھی اتنی آسان نہیں ہے۔''

ہمارا اگلا سوال یہ تھا کہ کیا ترقی پسند تحریک کے زوال کے بعد، تقریباً 1960 کے بعد افسانے سے کہانی رخصت ہوگئی تھی اور یہ صورتِ حال پندرہ بیس سال برقرار رہی؟ اپنے جواب میں انتظار صاحب نے کہا کہ ہمارے یہاں حقیقت نگاری کا دور بڑا لمبا چلا ہے۔ پریم چند سے اس کا آغاز کیا جاسکتا ہے۔ پریم چند کے آخری زمانے میں ترقی پسندی کا آغاز ہو چکا تھا۔ حقیقت پسندی کو نیا رنگ دے کر اسے مارکسی حقیقت پسندی کا نام دے دیا گیا گویا حقیقت پسندی پر مارکسزم کا بگھار لگا دیا گیا۔ یہ حقیقت نگاری خاصے عرصے چلی۔ اس کے ساتھ اسی دہائی میں وہ افسانہ بھی لکھا گیا جسے ہم داخلی حقیقت نگاری کہہ سکتے ہیں یعنی آدمی کے اندر جو کچھ گزر رہا ہے، اسے حقیقی انداز میں بیان کیا جائے۔ 1950 کی دہائی جب ختم ہونے لگی تو اس کے خلاف ایک ردِعمل پیدا ہوا اور یہ کوشش کی جانے لگی کہ اظہار کے لیے کوئی نیا انداز کوئی نئی راہ تلاش کی جائے۔ اس طرح علامتی کہانی وجود میں آئی۔ یہ ایک تجربہ تھا اور جب تجربہ ہوتا ہے تو بہت سی بے معنی تحریریں بامعنی تحریروں کے ساتھ وجود میں آجاتی ہیں۔ آزاد نظم کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا کہ بہت سی

کی چیزوں پر لکھ رہا ہے، یہ تو رجعت پسند ہے۔'' انتظار صاحب کا لاہور کے حلقۂ ارباب ذوق سے جو بھی تعلق رہا حلقے کے تعلق سے ہمارے سوال کے جواب میں کہا کہ حلقے میں ایسا کوئی اعتراض نہیں کیا گیا۔ مزید کہا کہ حلقۂ ارباب ذوق میں ترقی پسند بھی آتے تھے، وہ تو ایک ایسا پلیٹ فارم تھا جہاں ترقی پسند غیر ترقی پسند سب ہی آتے تھے کسی پر کوئی پابندی نہ تھی بلکہ ایک آزاد فضا تھی۔ یہ پابندیاں تو ترقی پسندوں نے لگا رکھی تھیں کہ ہماری تنظیم یا انجمن میں یہ نہ ہو وہ نہ ہو، ہم اپنے رسالے میں غیر ترقی پسند کو نہیں چھاپیں گے۔ حلقۂ ارباب ذوق میں یہ آمریت نہیں تھی۔ آپ کسی قسم کی تحریر پڑھیں اس پر کھلی بحث ہوتی تھی۔ آزادی سے ہر کوئی اپنی رائے کا اظہار کرتا تھا۔ انتظار صاحب نے کہا کہ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ''حلقۂ ارباب ذوق'' میں ان کی تحریروں کو پسند کیا گیا یا نہیں؟ لیکن کسی نے یہ بھی نہیں کہا کہ ''یہ رجعت پسندی ہے، یہ ماضی میں چلا گیا ہے۔'' ادب کو پرکھنے کا یہ انداز ترقی پسندوں سے مخصوص رہا ہے۔ جو غیر ترقی پسند اس انداز میں بات کرتے ہیں وہ بھی ترقی پسندوں ہی کے زیر اثر ہیں۔

ہمارے ایک سوال کے جواب میں انتظار صاحب نے کہا کہ میں ''اساطیری'' کی اصطلاح استعمال نہیں کرتا ہوں میں اسے ''دیومالا'' کہتا ہوں۔ دیومالا میری نظر میں برصغیر کی ہندو دیومالا ہے۔ ایک دیومالا کا تعلق یونان کے دیوی دیوتاؤں کی کہانیوں سے ہے۔ مصر کی بھی ایک دیومالا ہے۔ انتظار صاحب نے فرمایا کہ ہندو دیومالا کا تعلق ہندو مذہب کے دیوی دیوتاؤں سے ہے۔ یہ ہندو مذہب اور تہذیب کا اہم حصہ ہے اس لیے ہندوستان میں رہتے ہوئے انھیں اس سے تھوڑی بہت آشنائی تھی لیکن تفصیلی مطالعہ پاکستان جا کر ترجموں کی مدد سے کیا تھا۔ ہندوستان میں رام لیلا دیکھنے سے ان کو پتہ چل سکا کہ رامائن میں کیا ہے؟ راون کون تھا؟ وشنو اور شیو سے بھی تھوڑا بہت تعارف ہوا تھا لیکن دیومالا سے باقاعدہ تعارف کتابیں پڑھنے سے ہوا۔ ''ہندی میں زیادہ نہیں جانتا ہوں، سنسکرت سے تو بالکل ہی آشنائی نہیں ہے اس لیے جو کچھ پڑھا ترجموں کی مدد سے پڑھا۔ دیومالائی کہانیوں کے ترجمے لاہور کی پنجاب پبلک لائبریری میں موجود تھے کیونکہ لاہور ایک ایسا شہر ہے جو ہندو تہذیب کا بھی مرکز رہا ہے۔ سنسکرت میں لکھی گئی دیومالا کے سارے ترجمے آ سانی سے مل جاتے تھے۔''

دیو مالا سے اپنی دلچسپی پر انتظار حسین صاحب نے خاصی تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ عام طور پر ہم اور آپ مغرب سے آئے ہوئے فکشن (Fiction) تک محدود رہتے ہیں۔ مغربی ناول اور کہانیاں ہم پڑھتے ہیں، روسی فرانسیسی اور دوسری غیر ملکی زبانوں کے ناولوں، افسانوں کے ترجمے ہم انگریزی جاننے کی وجہ سے انگریزی میں پڑھ لیتے ہیں اس لیے تھوڑی بہت شناسائی اس فکشن سے ہے۔ ہمارے ہاں کچھ تحریکیں ایسی تھیں جنھوں نے پرانے ادب کو بالکل رد کر دیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنی طرف سے غزل کو بھی مسترد کر دیا تھا۔ اسے وہ مار دینا چاہتے تھے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ غزل بڑی سخت جان نکلی وہ مر نہ سکی۔ مولانا حالی نے بھی کہا تھا کہ غزل کو ترک کر دینا چاہیے۔ پھر فری ورس یعنی آزاد نظموں والے لوگ آئے۔ جوش ملیح بھی اسی قبیل کے تھے، ان سب کا خیال تھا غزل کا زمانہ ختم ہو رہا ہے لیکن غزل زندہ رہی۔ ممکن ہے کہ غزل کو رد کرنے کی وجہ یہ رہی ہو کہ اس کے بعد شاید بہتر شاعری ہو سکے تاہم اس کا فیصلہ تو کوئی نقاد ہی کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ اس عرصے میں غزل اور غزل سے ہٹ کر کی جانے والی نئی شاعری کتنی بہتر اور معیاری ہے۔ اس طرح کا موازنہ کرنے کے بعد ہی پتہ چل سکتا ہے کہ غزل اور نئی شاعری میں کس کا پلّہ بھاری ہے اور کون کتنے پانی میں ہے؟

انتظار صاحب نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا ''داستانوں کے تعلق سے یہ عرض کروں کہ فکشن میں ہماری جو روایت تھی جس کو داستان کہتے ہیں اسے سرسید تحریک کے مصلحین نے سب سے پہلے رد کیا۔ اس کی وجہ ان کا ''جوشِ اسلام'' تھا اس کے بعد ایسے بھی مصلحین پیدا ہوئے جو کہتے تھے کہ دیو مالائی داستانوں کو آگ میں پھینک دینا چاہیے، بھاڑ میں جھونک دینا چاہیے۔ اس کے بعد ترقی پسندوں نے بھی داستانوں کو مسترد کیا۔ نئے ادب یا جدیدیت والوں کو بھی ان میں کوئی معنی نظر نہیں آتے تھے لیکن میں نے اس روایت کو قبول کرنے کی کوشش کی کہ یہ ہماری روایت ہے اور میں اس سے استفادہ کر سکتا ہوں اور مجھے کرنا چاہیے۔ میری سوچ یہ تھی کہ اگر منٹو، کرشن چندر اور بیدی نے اس سے استفادہ نہیں کیا تو مجھے اس سے غرض نہیں ہے میں اس سے استفادہ کرنا چاہوں گا کیونکہ وہ میری روایت ہے۔ اس روایت سے گزرتے ہوئے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ اس کے پیچھے بھی کوئی روایت ہے۔ ہماری داستانوں میں زیادہ تر داستانوں کا تعلق عرب و عجم سے ہے۔ ان داستانوں میں بیچ بیچ

میں وہ داستانیں بھی آتی ہیں جو اس دھرتی سے تعلق رکھتی ہیں مثلاً ''نل ودمن'' اور ''شکنتلا'' وغیرہ ان داستانوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی لیکن میں نے جب انھیں اہمیت دی تو مجھے احساس ہوا کہ ان داستانوں کے پیچھے اور بھی داستانیں ہیں'' نل ودمن'' اور ''شکنتلا'' جیسی داستانوں کا سرچشمہ کہاں ہے؟ کہاں سے یہ کہانیاں چلی ہیں؟ میں نے ان سرچشموں تک پہنچنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ ان داستانوں کا سرچشمہ ہندو دیومالا ہے۔ اگر کوئی ہندو دیومالا سے واقف نہیں ہوتا ہے اور ان سے متعارف ہو کر انھیں سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا ہے تو پھر ہند سے تعلق رکھنے والی داستانوں کو سمجھ ہی نہیں سکتا ہے۔ اسی لیے روایتی داستانوں کو سمجھنے کے لیے میں نے ہندو دیومالا کا مطالعہ کیا اور براہ راست ان تک پہنچنے کی کوشش ترجموں کے ذریعے کی۔''

داستانوں کے بعد اردو ناول کے تعلق سے ہم نے سوال کیا کہ کیا اردو میں بڑے ناولوں کی کمی ہے؟ جواب میں انتظار صاحب نے ہم سے ہی سوال کیا کہ بڑے ناول سے کیا مراد ہے؟ بڑا ناول کیا ہوتا ہے؟ انھوں نے کہا کہ ناول ہو یا افسانہ اچھا ہوتا ہے یا برا۔ ناولوں کی معیار کے لحاظ سے درجہ بندی کرتے وقت اچھے ناول کو اونچا درجہ دیا جاتا ہے مثلاً بڑا ناول روسی ادب کا شاہکار وار اینڈ پیس (War & Peace) ہے۔ ترقی پسند بیشک ''ماں'' کو بڑا ناول مانتے ہوں لیکن میں نہیں مانتا ہوں۔'' انتظار صاحب نے کہا کہ ''ہمیں اردو میں ''وار اینڈ پیس'' کا ہم مرتبہ ناول تلاش نہیں کرنا چاہیے۔ یورپی ناول اور سارا فکشن ایک طویل دور جو صدیوں پر مشتمل ہے گزار چکے ہیں۔ ہر جگہ خواہ روس ہو، فرانس ہو یا برطانیہ ہر جگہ فکشن نے لمبا سفر طے کیا ہے جبکہ ہندوستان میں ناول ہو یا مختصر کہانی یہ سب 1857 کے بعد آئے ہیں۔ ہمارے ہاں ان اصناف کی عمر، تاریخ اور تجربے مختصر ہیں اس لیے ''وار اینڈ پیس'' کے مرتبے کا ناول اردو میں تلاش کرنا غلط ہوگا۔ ہمارا سفر تو بے حد مختصر ہے۔ ''وار اینڈ پیس'' جیسا ناول اردو میں ہے تو کون سا ہے؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں لکھا گیا؟ ایسے سوالات نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں اپنے آپ کو سمجھنے کے لیے تھوڑا سا موازنہ ان سے کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اردو ناولوں کے بارے میں انتظار صاحب نے بتایا کہ لڑکپن میں تو مجھ کو ''فسانۂ آزاد'' بے حد پسند تھا۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ ناول ہے یا نہیں، تاہم فکشن ضرور ہے۔ 19ویں صدی میں ناول کا جو سانچہ تھا وہ اس سانچے میں ڈھلا

ہوا نہیں ہے۔ اس سانچے میں ڈھلا ہوا ایک عمدہ ناول ''امراؤ جان ادا'' اور پریم چند کا ناول ''گئو دان'' ہے۔ یہ دونوں اردو میں کلاسیک مانے جاتے ہیں۔'' ''فسانۂ آزاد'' کو نقاد کس زمرے میں شمار کرتے ہیں وہ جانیں میں تو اسے کلاسکس (Classics) میں کلاسیک مانتا ہوں۔ اس میں ایک پوری تہذیب کا بیان ہے۔''

ہماری اس بات سے کہ اردو ادب کے نقادوں نے اردو افسانوں سے زیادہ دلچسپی نہیں لی اور دیگر اصناف سخن کے مقابلے میں افسانوں اور ناولوں پر بہت کم توجہ دی گئی، انتظار صاحب نے اتفاق کیا۔ اس کی وجہ پوچھے جانے پر کہا کہ ''ہم غزل کے مارے ہوئے لوگ ہیں۔ شاعری تو ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ فوجی جنرلس ریٹائر ہونے کے بعد غزلیں کہتے ہیں۔ تاجروں اور سیاستدانوں کے بارے میں بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے غزلیں کہہ رکھی ہیں۔ فکشن کا معاملہ مختلف ہے اس میں آدمی کو تھوڑا سا تردد کرنا پڑتا ہے، ریاضت کرنی پڑتی ہے وہ تھوڑی فکر اور سوچ کا تقاضا کرتی ہے۔ فکشن لکھا بھی کم جاتا ہے تو اس پر تنقید بھی کم ہوئی ہے۔ فکشن لکھنے کی طرح اس پر تنقید بھی اتنی آسان نہیں ہے۔''

ہمارا اگلا سوال یہ تھا کہ کیا ترقی پسند تحریک کے زوال کے بعد، تقریباً 1960 کے بعد افسانے سے کہانی رخصت ہوگئی تھی اور یہ صورت حال پندرہ بیس سال برقرار رہی؟ اپنے جواب میں انتظار صاحب نے کہا کہ ہمارے یہاں حقیقت نگاری کا دور بڑا لمبا چلا ہے۔ پریم چند سے اس کا آغاز کیا جا سکتا ہے۔ پریم چند کے آخری زمانے میں ترقی پسندی کا آغاز ہو چکا تھا۔ حقیقت پسندی کو نیا رنگ دے کر اسے مارکسی حقیقت پسندی کا نام دے دیا گیا گویا حقیقت پسندی پر مارکسزم کا بگھار لگا دیا گیا۔ یہ حقیقت نگاری خاصے عرصے چلی۔ اس کے ساتھ اسی دہائی میں وہ افسانہ بھی لکھا گیا جسے ہم داخلی حقیقت نگاری کہہ سکتے ہیں یعنی آدمی کے اندر جو کچھ گزر رہا ہے، اسے حقیقی انداز میں بیان کیا جائے۔ 1950 کی دہائی جب ختم ہونے لگی تو اس کے خلاف ایک ردِ عمل پیدا ہوا اور یہ کوشش کی جانے لگی کہ اظہار کے لیے کوئی نیا انداز کوئی نئی راہ تلاش کی جائے۔ اس طرح علامتی کہانی وجود میں آئی۔ یہ ایک تجربہ تھا اور جب تجربہ ہوتا ہے تو بہت سی بے معنی تحریریں بامعنی تحریروں کے ساتھ وجود میں آجاتی ہیں۔ آزاد نظم کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا کہ بہت سی

بے معنی نظمیں لکھی گئی تھیں، یہاں تک ہوا کہ میرا جی جیسے شاعر پر ٹھپہ لگا دیا گیا کہ ان کی شاعری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ جب تجربے ہوتے ہیں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اب جو تجریدی و علامتی کہانی وجود میں آئی تو اس کی تکنیک ایسی تھی کہ حقیقت نگاری والی کہانیوں کی طرح اس میں کہانی بیان نہیں ہو سکتی تھی تو اس میں کہانی کا عنصر ختم ہو گیا، کہانی کی شکل بدل گئی۔"

1960 تا 1980 کے دور میں افسانے کی مقبولیت گھٹ جانے کے ذکر پر تبصرہ کرتے ہوئے موصوف نے فرمایا کہ نئے افسانے کے ساتھ ہی نہیں بلکہ نئی شاعری کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ انھوں نے یہ وضاحت بھی کی کہ "میں مشاعروں والی شاعری یا غزل کی بات نہیں کر رہا ہوں، غزل کی مقبولیت تو مختلف ادوار میں گھٹتی بڑھتی رہی ہے، میں صرف نئی شاعری کی بات کر رہا ہوں، اس معاملے میں افسانے کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ نئی شاعری کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ اس کی ایک وجہ ادب سے لوگوں کی دلچسپی کا کم ہونا بھی ہے۔ پاکستان میں تو یہ ہوا کہ سنجیدہ سرگرمیوں سے لوگوں کی دلچسپی کم ہو گئی۔ پورا قومی مزاج اس طرز کا ہو گیا کہ علمی سرگرمیوں میں لوگوں کی دلچسپی کم ہو گئی اور اس کے نتیجے میں ہماری قوم کا جو حال ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔ اسی طرح ادب سے بھی دلچسپی نہیں رہی تو ادب کی مقبولیت گھٹ گئی۔" انتظار صاحب نے مزید کہا کہ "اس دور میں لکھے گئے تجریدی، تمثیلی اور علامتی افسانوں میں خاصی تعداد میں ایسے افسانے ہیں جن کی ادب میں اہمیت اور ایک حیثیت ہے۔ نیر مسعود (ہندوستان) کے افسانے ایسے ہیں جنھیں تمثیلی علامتی اور تجریدی افسانوں یا اسلوب کا معیار مانا جا سکتا ہے۔ اسی طرح سریندر پرکاش کا ذکر آپ نے کیا وہ بھی عمدہ کہانیاں لکھتے ہیں۔ اور بھی لوگ ہیں جنھوں نے اس دور میں قابل قدر کام کیا ہے۔" اس کے بعد انتظار صاحب نے افسانے میں کردار، مکالمے، پلاٹ، واقعے اور کہانی پن کی ضرورت سے اتفاق تو کیا لیکن کہا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کی تکنیک، اسلوب اور انداز پہلے کی کہانی کی طرح ہو، ان کے لیے علامتوں کا بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

علامتوں کے استعمال پر ہم نے مرحوم وحید اختر کی رائے انتظار حسین صاحب کو سنائی جس میں واقعے کی جگہ علامتوں کا تانا بانا لینے کی صورت میں افسانے سے کہانی پن غائب ہونے کی بات کہی گئی تھی۔ اس سلسلے میں موصوف کا خیال یہ تھا کہ مختلف کہانی نگاروں کی کہانیوں کے لیے

اسے ایک کلیے کے طور پر استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ ایسا ضرور ہوا ہے کہ بعض لوگوں کے افسانوں میں کہانی ایسے غائب ہوئی جیسے کہ کہانی میں نئی نظم لکھی جارہی ہے۔ مجھے ذاتی طور پر ایسا افسانہ پسند نہیں ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں یہ کہوں کہ مجھے علامتی افسانہ پسند نہیں۔ کسی افسانے میں علامتوں کے ضرورت سے زیادہ استعمال کی بات نکلی تو انتظار صاحب نے سوال کیا کہ علامتوں کے ضرورت سے زیادہ استعمال سے کیا مراد ہے؟'' کوئی کہانی کار اگر اپنے تجربے کو علامتی رنگ میں سوچ کر اس کے مطابق کہانی لکھے تو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ آیا وہ علامت کوئی معنی دے رہی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو اس کا استعمال مہمل ہے۔ علامت کا استعمال ضرورت سے کم یا زیادہ نہیں بلکہ درست یا مہمل اور بامعنی یا بے معنی ہوسکتا ہے۔''

پاکستان کے ادبی ماحول پر مختلف سوالات کے جواب میں انتظار صاحب نے ماضی اور حال میں پاکستان کے ادبی احوال کا بیان کرتے ہوئے کہا کہ جب وہ پاکستان گئے تھے تب کے اور آج کے ادبی ماحول میں بڑا فرق ہے۔ ''اس وقت لکھنے والوں اور ادب سے دلچسپی رکھنے والوں میں ادب سے گہری وابستگی تھی۔ تخلیقی کام پوری تہذیبی دلچسپی سے کیا جاتا تھا۔ ادب کا عام قاری بھی ادب سے گہرا شغف رکھتا تھا۔ عوام بھی ادبی تحریروں کو اہمیت دیتے تھے۔ تب ادبی کام اپنے آپ کو تج کر اپنی ذات کو اس کے لیے وقف کر کے ایک مشن سمجھ کر کیا جاتا تھا۔ اب حالات بدل گئے ہیں، ہر چیز میں تجارتی و کاروباری ذہنیت آگئی ہے، میڈیا کی چکا چوند ہے۔ اس فرق میں کچھ سیاست کا بھی اثر ہے۔ اب مختلف قسم کے مفادات کو ادب پر ترجیح دی جاتی ہے۔ تخلیقی کاموں سے پہلے جیسی وابستگی نہیں رہی۔ اسی طرح ہندوستان پاکستان کے ادبی ماحول میں مشابہت بھی تھی اور فرق بھی تھا لیکن فرق بہت زیادہ نہ تھا۔ ہاں سیاسی سطح پر فرق خاصہ تھا لیکن ادب پر اس کا اثر کم تھا۔ فرق ادب کے لحاظ سے رفتہ رفتہ پیدا ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی دو ادبی برادریاں نہیں بنی تھیں۔ ادیبوں میں ایک دوسرے کو دوسرے ملک کا شہری سمجھنے کا جذبہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ کسی بھی ادیب مثلاً کرشن چندر کی تائید یا مخالفت اسی طرح ہوتی تھی جیسے تقسیم سے قبل کی جاتی تھی۔''

پاکستان میں اردو کے مستقبل کے تعلق سے گفتگو شروع ہوئی تو انتظار حسین نے سب سے پہلے واشگاف الفاظ میں بتایا کہ ''پاکستان میں اردو کی علاقائی زبانوں سے کوئی رقابت نہیں ہے۔

اس رقابت کی حقیقت کچھ نہیں ہے مفروضے زیادہ ہیں۔ بس تصور کرلیا گیا ہے کہ ایسا ہے جو درحقیقت نہیں ہے۔ علاقائی زبانوں میں ان کی ترقی اور فروغ کی تحریکیں کام کررہی ہیں۔ ہر تحریک میں کچھ انتہا پسند ہوتے ہیں لیکن اردو کا مقام وموقف قومی زبان ہونے کی وجہ سے اتنا مستحکم نہیں ہے جتنا اس وجہ سے ہے کہ یہ مختلف زبانیں بولنے والوں کے لیے رابطے کی زبان ہے۔ ایک طرح سے یہ پاکستان کی ایک تاریخی وسیاسی ضرورت کو پورا کررہی ہے۔ اسے نظرانداز یا فراموش کرنا بہت مشکل ہے۔ علاقائی زبانوں سے پاکستان میں اردو کو کوئی خطرہ ہے اور نہ ہی کسی قسم کا تصادم ہے۔''

اردو کی نئی بستیوں کو لندن، جدہ، دوبئی اور شکاگو وغیرہ میں اردو کے مستقبل کی بات نکلی تو انتظار صاحب نے کہا کہ اردو کی نئی بستیاں مت کہیے شاعروں کی نئی بستیاں کہہ لیجیے۔

ہندوستان میں اردو کا ماحول پہلے سے بہتر نظر آنے کی بات انتظار صاحب نے بڑے اعتماد سے کہی۔ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ 1947 کے بعد کا جو فوری زمانہ ہے اور اس کے بعد 30-25 سال تک کا عرصہ اس زمانے میں اردو غریب تقسیم کے تعصبات کی زد میں آگئی تھی اور اسے مسلم لیگ، تحریک پاکستان سے پھر پاکستان سے منسلک کردیا گیا تھا۔ بھلے ہی مسلم لیگ یا پاکستان میں اسے مسلمانوں میں زیادہ بولے جانے یا اظہار کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے اپنایا گیا ہو لیکن زبان تو اپنی جگہ ہے اور رہے گی۔

اردو پڑھنے والوں کی تعداد میں کمی کے بارے میں انتظار صاحب نے کہا کہ'' آپ کے (ہندوستان) کے تعلیمی نظام میں یہ کوشش کی گئی کہ اسے اسکولوں میں پڑھایا جائے۔ یہ تعصبات شروع سے ہیں اسی وجہ سے اردو رسم الخط سے ناآشنائی بڑھ گئی۔ اسکولوں میں اردو تعلیم کے خاتمے کے ساتھ انھوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ خود اردو والوں نے اردو کے تئیں اپنی ذمے داری پوری نہیں کی۔ اردو والوں نے گھر پر بچوں کو اردو پڑھانے کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ انتظار صاحب نے کہا کہ زندہ قومیں اس طرح جیتی ہیں جیسے یہودیوں نے اپنی زبان، عبرانی، کو مرنے نہیں دیا۔ صدیوں کا عرصہ انھوں نے محکومی میں گزارا۔ ان کا کوئی ملک نہ تھا لیکن جب جائز یا ناجائز طریقوں سے نئی مملکت اسرائیل نے حاصل کرلی تو تو وہاں عبرانی کو رائج کردیا۔ انتظار صاحب نے اس بات سے بھی اتفاق کیا کہ اس عبارت کو نمایاں کردیں۔

پاکستان میں اردو زبان میں غیر ضروری طور پر اردو الفاظ کی جگہ انگریزی الفاظ کے استعمال کے رجحان کی بابت انتظار صاحب نے کہا کہ "یہ رجحان اردو زبان کے لیے ہی خطرہ نہیں ہے بلکہ پاکستانی قوم کے لیے بھی خطرہ ہے۔ ایسا صرف پاکستان میں ہی نہیں ہندوستان میں بھی اور صرف اردو کے ساتھ نہیں بلکہ ہندی کے ساتھ بھی ہو رہا ہے۔ پاکستان میں یہ رجحان میڈیا، الیکٹرانک اور پرنٹ دونوں اور تجارتی رسالوں، ٹی وی ڈراموں، ڈائجسٹوں میں زیادہ ہے۔ یہ سب میڈیا کے زمرے میں آتے ہیں لیکن یہ رجحان ادب، شاعری، ادبی رسائل اور کتابوں میں نہیں ملے گا۔ اس رجحان کے تدارک کے لیے بھی پاکستان میں کچھ نہیں ہو رہا ہے۔" انھوں نے انگریزی کے اس غلبے کی ایک وجہ مغرب پرستی اور مغرب سے مرعوبیت کو بھی ٹھہرایا۔ تاہم انتظار صاحب نے کہا کہ جب تک علمی و ادبی کاموں میں یہ رجحان نہ پیدا ہو زبان و ادب کو اس سے خطرہ کم ہے۔

پاکستان میں اخبارات، رسائل اور کتابوں کی اشاعت اور فروخت کی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے انتظار حسین صاحب نے بتایا کہ اخبارات اور عام رسالے تو خوب ہوتے ہیں لیکن سنجیدہ موضوعات پر علمی ادبی اور مذہبی کتب بھی کم بکتی ہیں جبکہ سیاسی موضوعات اور عام قسم کی مذہبی کتابیں خوب بکتی ہیں۔ علم و ادب کی سنجیدہ کتابوں کی اشاعت میں کمی کی وجہ یہی ہے کہ سنجیدہ قسم کے علمی و ادبی کاموں میں لوگوں کی دلچسپی عموماً گھٹ گئی ہے۔ علم و ادب کے تعلق سے سماج کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔

پاکستان میں تعلیم اور خاص طور پر تعلیمی اداروں میں اردو زبان و ادب کے تعلیمی معیار کے بارے میں اظہار خیال سے انھوں نے یہ کہہ کر اجتناب کرنا چاہا کہ میں تعلیم کا آدمی نہیں ہوں تاہم ہمارے اصرار پر کہا کہ "انگریزی دور حکومت میں تعلیمی نظام ایسا تھا کہ اس میں ادبیات پر خاصہ زور تھا، آرٹس کی اہمیت زیادہ تھی، طالب علم کی بھی یہ فکر ہوتی تھی کہ وہ ادب سے بی۔ایم۔ کر لے تو وہ ادب کو بہتر طریقے سے سمجھ سکے گا۔ صرف اردو ادب ہی نہیں دوسری زبانوں کا ادب خاص طور پر انگریزی ادب پڑھنے کا رجحان زیادہ تھا لیکن آج کا طالب علم سوچتا ہے کہ وہ تعلیم حاصل کروں جس سے روزی کمانے میں زیادہ آسانی ہو۔ اس لیے ٹیکنکل تعلیم پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ ادب پڑھنے کا رجحان گھٹ گیا ہے۔ اسی طرح انگریزی کا بھی وہ معیار نہیں ہے جو

پہلے تھا کیونکہ سارا زور ٹیکنالوجی پر ہے۔ ٹیکنالوجی کے طالب علم کو شیکسپیئر سے غرض نہیں ہے۔ اسی طرح پی. ایچ. ڈی. کے لیے بھی ریسرچ کا معیار گھٹ گیا ہے۔ پی. ایچ. ڈی. کو ملازمت میں ترقی ملتی ہے اس لیے جو ایم. اے. کرتا ہے وہ پی. ایچ. ڈی. بھی کرتا ہے اس طرح ریسرچ کرنا عام ہو گیا۔ اس کے اس قدر پھیلنے سے ریسرچ کا معیار بھی گھٹ گیا ہے۔ اسی طرح اب اس مقام و مرتبے کے استاد بھی بہت کم ہیں جس مقام و مرتبے کے استاد ہمارے زمانۂ طالب علمی، 1947 سے قبل یا اس کے بعد ہوا کرتے تھے۔ جب استاد ہی پہلے جیسے نہیں رہے تو تعلیم اور طالب علم پہلے کی طرح کہاں رہیں گے؟ یوں اچھے طالب علم اب بھی موجود ہیں لیکن عام معیار خاص طور پر اردو کے سلسلے میں بہت گر گیا ہے۔'' تاہم انتظار صاحب نے بتایا کہ پاکستانی جامعات میں پی. ایچ. ڈی. کرنے کروانے میں کرپشن کا رجحان نہیں ہے۔

پاکستان میں نئے لکھنے والوں کے بارے میں ہمارے سوالات کے جواب میں انتظار صاحب نے چند نام لیے۔ انھوں نے کہا کہ شاعرہ ہونے کے باوجود فہمیدہ ریاض نے بڑا اچھا فکشن لکھا ہے۔ اسی طرح فکشن لکھنے والوں میں آصف فرخی قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بعض خواتین بڑی اچھی شاعری کر رہی ہیں۔ حقوق نسواں یا Feminism کے حوالے سے متاثر ہو کر فہمیدہ ریاض، شاہدہ حسن، کشور ناہید اور فاطمہ حسن وغیرہ بڑی اچھی شاعری کر رہی ہیں۔ نقادوں کے بارے میں انھوں نے کہا کہ محمد حسن عسکری کے وہ بہت قائل ہیں، فراق گورکھپوری بھی اچھے نقاد تھے۔'' آج کے نقادوں میں شمس الرحمٰن فاروقی اور گوپی چند نارنگ اور شمیم حنفی اعلیٰ درجے کے نقاد ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے یہاں کے مقابلے میں آپ کے پاس اچھے نقاد ہیں۔ پاکستان میں سہیل احمد خاں کا نام قابل ذکر ہے، انھوں نے بڑی اچھی تنقید لکھی ہے لیکن وہ کم لکھتے ہیں۔ ان کی تنقید بڑی اچھی ہے اور داستانوں پر اچھا کام کیا ہے۔ شاعروں میں انتظار صاحب نے احمد مشتاق، ظفر اقبال اور افتخار عارف کے نام پسندیدگی سے لیے۔ ہندوستانی شاعروں میں انھوں نے شہریار اور محمد علوی کے نام لیے۔ نقادوں میں وارث علوی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جب کسی لکھنے والے کے بخیے ادھیڑنے ہوں تو ان کا تنقیدی شعور خوب بیدار ہوتا ہے اور قلم خوب چلتا ہے۔

گروپ بندیوں کے تعلق سے انھوں نے کہا کہ گروپ بندیاں ہر دور میں ہر جگہ رہی ہیں، پاکستان میں بھی ہیں۔ تاہم انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں یہ کچھ زیادہ ہو گیا ہے۔ آخر لڑنا بھی ایک ضرورت ہے ادیب اگر لڑے گا تو اپنے ہم عصر ہی سے لڑے گا۔

•••

جوگندر پال سے گفتگو (۱)

اردو کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے افسانہ نگاروں میں شامل جوگندر پال اپنی ڈھب کے بالکل الگ ادیب ہیں۔ ان کی تخلیقات کا مطالعہ قاری کو زندگی کے اندرون و بیرون کی بڑی گہری سمجھ عطا کرتا ہے۔ تحریر ہو یا تقریر ان کے ہاں کچھ بھی ایسا نہیں جسے سطحی کہا جا سکے۔ ڈاکٹر خوشنودہ نیلوفر نے جو خود بھی ایک فکشن نگار ہیں۔ جوگندر پال سے ان کے فن اور فکر کے تعلق سے دو ملاقاتوں میں ہوئی گفتگو کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

سوال : اپنی پیدائش، تعلیم و ادبی تربیت کے بارے میں مختصر بتائیے؟

جواب : میری پیدائش 5 ستمبر 1925 کو سیالکوٹ میں ہوئی۔ والد چنی لال سیٹھی نمک کے تاجر تھے۔ بڑے ہو کر میں نے بھی ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ 1941 میں گنڈا سنگھ ہائی اسکول سیالکوٹ سے میٹرک اور 1945 میں مرے کالج سے بی اے کی سند حاصل کی۔ یاد نہیں کہ مجھے لکھنے کا شوق کب سے ہوا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس شوق کے ساتھ ہی دنیا میں آنکھ کھولی۔ 1947 میں ایم اے انگریزی میں کیا۔ مگر ملک کے بٹوارے نے زمین کے ساتھ دلوں کے بھی دو ٹکڑے کر دیے، اور میں والد کے ساتھ انبالے آ گیا۔ ہمارا پرانا کاروبار ختم ہو چکا تھا، یہاں ہم نے دودھ کا دھندہ شروع کیا۔ (مسکراتے ہوئے) اسی دوران ایک

خوشگوار حادثہ ہوا۔ میری بیوی کرشنا کے والد کینیا سے بیٹی کا رشتہ ڈھونڈنے انبالے آئے ہوئے تھے، میں انھیں پسند آگیا اور میری بیوی مجھے ڈولی میں بٹھا کر کینیا لے گئی۔ میں وہاں اسکول میں ٹیچر ہوگیا۔ مگر ہندوستان واپسی کی فکر مجھے ہمیشہ ستاتی رہی۔ آخرکار اللہ نے مجھے اس کا موقعہ دے دیا۔ کینیا کی آزادی کے بعد وہاں کی گورنمنٹ نے میرے سامنے یا تو کینیا کی شہریت قبول کرنے یا نوکری سے ریٹائر ہوجانے کی تجویز رکھی۔ مجھے دوسری تجویز پسند آئی اور 14 برس بعد میں ہندوستان لوٹ کر اورنگ آباد کے سرسوتی بھون پی جی کالج میں پرنسپل ہوگیا۔ لکھنے پڑھنے کا جنون مجھے پرنسپل شپ میں سکون کی سانس لینے نہیں دے رہا تھا۔ جب بچے تقریباً سیٹل ہوگئے تو 14 برس بعد میں نے نوکری سے ریٹائرمنٹ لے لی اور کل وقتی ادیب بن گیا۔

سوال : لکھنے کے ابتدائی دور میں سب سے زیادہ آپ نے کس زبان کے ادب کو پڑھا ہے؟

جواب : اردو ادب کو! اس کے بعد جب مجھے تھوڑی انگریزی آنے لگی تب میں نے انگریزی ادب کو پڑھا۔ لکھنے کے لیے پڑھنا قلم کار میں مچورٹی لاتا ہے۔ اللہ میاں ہدایت نہیں کرتا بلکہ خدا کی طرف سے فنکار کو اشارہ ہے کہ قاری تمھاری تحریر میں معنی خود دریافت کرے۔ مطلب مطالعہ تاریخ جمع کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس کی خود کی شرکت کے لیے ہونا چاہیے۔

سوال : کیا تعلیم گاہیں تخلیق کار پیدا کرسکتی ہیں؟

جواب: تعلیم گاہیں تخلیقی فن کار پیدا نہیں کرسکتیں البتہ کسی فنکار میں جو صلاحیتیں ہوتی ہیں انھیں نکھار ضرور سکتی ہیں۔ تعلیم گاہوں کے جو اساتذہ ہوتے ہیں ان میں وہ جذبہ پیدا کرسکتے ہیں کہ آپ اگر معمولی شعر یا افسانہ لکھتے ہیں تو آپ اچھا افسانہ لکھ سکیں یا اچھا شعر کہہ سکیں۔ تعلیم گاہیں ایسے طالب علموں کو جو تخلیقی صلاحیت رکھتے ہوں صحتمند مشورے دے کر ان کو آگے بڑھا سکتی ہیں۔ شوق بلکہ پاگل پن کی حد تک شوق ایک طالب علم کو تخلیق کار بنا سکتا ہے۔

سوال : کوئی ایسی تخلیق جسے آپ تحریر کرنا چاہتے ہوں اور ابھی تک تحریر نہیں کرپائے ہوں؟

جواب : نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے جو رہ گئی ہو؟ میں جو لکھنا چاہتا تھا وہ سب کچھ میں نے لکھ دیا ہے۔ اور مزید مطالعہ جاری ہے۔

سوال : عصرِ حاضر میں آپ کو کیا لگتا ہے کہ ہندی میں اچھی کہانیاں لکھی جارہی ہیں یا اردو میں؟

جواب : ہندی میں اچھی کہانیاں بھی لکھی جارہی ہیں اور معمولی کہانیاں بھی۔ اردو کا حال بھی ایسا ہی ہے۔ یہاں اچھی کہانیاں بھی مل رہی ہیں اور معمولی بھی۔ بہرحال خوشی کا مقام یہ ہے کہ لکھا جارہا ہے۔ یہی ضروری ہے۔

سوال : آپ کی تخلیق میں جو خود کلامی یا داخلی انداز پایا جاتا ہے، جیسے 'دادیاں' اور 'مقامات' وغیرہ میں، اس کے بارے میں کچھ فرمایئے؟

جواب : دراصل کہانیوں کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ جیسی کہانی ہوتی ہے اسی حساب سے اپنے آپ کو لکھوالیتی ہے۔ کوئی بھی دو کہانی ایک جیسی نہیں ہوسکتی اور کوئی بھی کہانی کار پہلے سے یہ طے نہیں کرسکتا کہ وہ کہانی کیسی لکھے گا۔ یہاں کہانی خود فنکار سے لکھواتی ہے، نہ کہ فنکار کہانی لکھتا ہے۔

سوال : کیا آپ رومانی تحریک، ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور مابعدِ جدیدیت سے متاثر ہوئے ہیں؟ اگر ہاں تو کون سی کہانیاں ان سے متاثر ہوکر لکھی ہیں؟

جواب : نہیں میں کبھی کسی تحریک سے متاثر نہیں ہوا، نہ ہی میری کوئی تخلیق اس طرح کی ہے۔

سوال : کیا کوئی فنکار کسی نقاد کے بغیر ادب میں زندہ نہیں رہ سکتا؟

جواب : نقاد کے بھروسے کوئی بھی تخلیق کار، تخلیق کار نہیں بن سکتا۔ کیونکہ نقاد میں جو ایک بنیادی سچائی ہونی چاہیے وہ ان میں نہیں ہے۔ وہ تعصب کا ایک جال بچھائے بیٹھے ہیں اور بغیر مصلحت کے ایک بھی لفظ نہیں کہتے۔ دراصل نقادوں میں جو ایک تخلیقی اپروچ ہونی چاہیے وہ متعصب نقادوں میں ممکن نہیں ہے، اس لیے وہ سچی تنقید نہیں کرپاتے۔ صرف اور ٹیلنٹ ہی کسی انسان کو تخلیق کار بنا سکتی ہے۔ ہمارے یہاں اردو میں بہت کم ظرف لوگ ہیں جو ناموری کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ ان کے پاس سوچنے کا وقت ہی نہیں ہے۔

سوال : زندگی کی بہتر ترجمانی میں ناول افسانوں پر سبقت رکھتے ہیں؟ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب : کوئی کلیہ نہیں ہے۔ عام طور پر ایسا ہونا چاہیے کہ تخلیق میں (ناول ہو یا افسانہ) ساری

زندگی کا عکس آ جائے۔ قاری کو اس تخلیق میں اپنی آپ بیتی نظر آنے لگے اور یہ بات ہر قاری کے ساتھ الگ الگ ہو۔ اگر تخلیق کار نے جو لکھنا چاہا ہے بالکل وہی چیز قاری تک پہنچی تو تخلیق کار کامیاب نہیں ہوا اور اس میں یہ تاثر بھی ضروری ہے کہ اس کہانی یا ناول کو پڑھ کر ایسا محسوس ہو کہ یہ کسی پر گزر چکا ہے اور اب پھر نہیں گزرے گا۔ اس کہانی یا ناول میں قاری کو اپنے میں پوری طرح غرق کرنے کی صلاحیت ہو۔ (سوچتے ہوئے) جیسے میری ایک کہانی میں جب ایک عورت کا جوان بیٹا مر جاتا ہے تو اس کے ساتھ آس پڑوس کی کئی عورتیں بھی روتی پیٹتی ہیں لیکن یہ تمام عورتیں اپنے اپنے غم کو روتی ہیں۔ بظاہر تو ایسا لگتا ہے کہ وہ اس عورت کے بیٹے کے لیے رو رہی ہیں، مگر ان میں کسی عورت کو اپنا مرا ہوا بھائی یاد آتا ہے، کسی کو اپنا شوہر یاد آتا ہے، جبکہ مرنے والے کی بھابھی کو اپنا وہ محبوب یاد آتا ہے جسے وہ گاؤں میں چھوڑ آئی ہے، آپ جس طرف نکل پڑیں وہیں ایک کہانی مل جائے۔ جب تخلیق کار کچھ لکھنا چاہے تو سب سے پہلے اس میں جینا سیکھے۔

سوال : ادیب کل وقتی ادیب ہوتا ہے، لیکن روزگار کے مسائل اسے جز وقتی ادیب بنا دیتے ہیں۔ آپ ادیب کے معاش کے مسئلے کا حل تجویز کرتے ہیں؟

جواب : اگر نوکری کے بغیر چارہ نہیں ہے تو نوکری کرے۔ لیکن ساتھ میں لکھے بھی۔ اس کے اندرون میں جو ایک حساس تخلیق کار بیٹھا ہے اسے کبھی بھی مرنے نہ دے۔ مثلاً ہر قدم پر اپنے ساتھ برتی گئی ناانصافی کا احساس، دوسروں کے ساتھ اپنی شمولیت میں کمتری کا احساس اور ذلت اٹھانے کا جذبہ برقرار رکھے۔ کیونکہ اگر یہ ساری چیزیں ایک حساس فنکار کے اندر موجود ہیں تو اس سے وہ اپنا کام کرواتی رہیں گی۔ مگر سوچ صحتمند اور تعمیری ہونی چاہیے، تخریبی نہیں کیونکہ کمینہ اور گھٹیا انسان بڑا ادب تخلیق کرنے والا کبھی نہیں ہو سکتا۔ کامیاب آدمی کبھی بہت اچھا تخلیق کار نہیں ہو سکتا۔ اردو میں چونکہ ادیب کو پیسہ نہیں ملتا، یا بہت کم ملتا ہے اس لیے کئی بار ذہن میں آیا کہ انگریزی میں لکھوں اور پروفیشنل بن جاؤں مگر پھر احساس ہوا کہ اللہ نے مجھے پیدا ہی اردو میں لکھنے کے لیے کیا ہے، اگر میں اردو میں نہیں لکھوں گا تو اپنی ادبی روح کے ساتھ ناانصافی کروں گا۔

سوال : علامتی افسانوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب : علامتی ہو یا کہ سیدھے پلاٹ کی کہانی، اسے قاری کو سمجھ میں آنا ضروری ہے۔ افسانے کی کمزوری کی وجہ سے قاری اصل مدّعے تک نہ پہنچے تو یہ فنکار کی ناکامی ہے۔ دراصل پڑھنے والے کا ذہن بھی تخلیقی ہونا چاہیے۔ قاری میں ہر افسانہ اور کہانی سے ایک نیا معنی اخذ کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیے، یہ بہت ضروری ہے۔ اگر لکھنے والے نے جو کچھ لکھنا چاہا ہے ٹھیک وہی چیز جوں کی توں قاری تک پہنچ گئی ہے تو لکھنے والا اچھا تخلیق کار کبھی نہیں ہو سکتا۔ کہانی میں معنی کی تہیں ہونا ہی کسی کہانی کی کامیابی کی دلیل ہے۔

سوال : کیا ادب کے ذریعے سماج کو بدلنے اور سماج پر اثر انداز ہونے کے امکانات باقی ہیں؟

جواب : ادب تو سماج پر ہمیشہ اثر انداز ہوتا ہے اور سماج بھی ادب پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مگر سماج کو سدھارنے کے لیے ادب کو ایک تحریک کی شکل نہیں دینی چاہیے۔ یہاں تخلیق کار کو زیادہ انڈر اسٹینڈنگ سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ یہ باتیں ہمیشہ سے ہی رہی ہیں کہ ہم فائدے کے لیے نہیں پڑھتے انٹرٹینمنٹ کے لیے پڑھتے ہیں۔ خواہ وہ ہمارے سر کے اوپر سے ہی کیوں نہ گزر جائے، لیکن پڑھنے والا اثر ضرور لیتا ہے۔ اب یہ بات چاہے ڈائرکٹ وعظ کے ذریعے کہہ دی جائے یا ادبی فن پاروں کے ذریعے، اثر ضرور رکھتی ہیں۔ سوچ دکھوں کا انعام ہوتی ہے۔ سماج میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ حسّاس قلم کار کے دل و دماغ کو قید کر لیتا ہے۔

سوال : کیا ٹیلی ویژن اور دوسری ترغیبات نے ادب کے متبادل کے طور پر جگہ حاصل کر لی ہے؟ اگر ایسا ہے تو ادیب کا طریقۂ کار کیا ہونا چاہیے؟

جواب : ادب تو ان ساری چیزوں کی بنیاد ہے۔ یوروپ وغیرہ میں بھی دیکھیے ساری چیزیں ادب سے ہی لے لیتے ہیں۔ ہمارے یہاں ٹی وی والے ابھی اتنے میچور نہیں ہوئے ہیں، اسی لیے پیچھے ہیں۔ پڑھنے کے ساتھ ہی دیکھنے سے بھی تربیت ملتی ہے مگر یہاں خوبی پیش کرنے والے کی ہے کہ وہ کتنا بہتر طریقے سے کوئی چیز پیش کر سکتا ہے۔ ادب یہ نہیں ہوتا کہ سب کچھ صحیح ہے۔ صرف پیش کش کا طریقہ ایسا ہونا چاہیے کہ کہانی میں روح پیدا ہو جائے۔ دکھ کا

نہ ہو بلکہ دیکھنے والا اسے جی رہا ہو تو بات بن جاتی ہے۔ کتابی چالاک لوگ سنجیدہ تخلیق کار کو نظر انداز کرتے ہیں، مگر آپ ان کے پیچھے نہ لگیں۔ آپ خاموشی سے اپنا کام کیجیے، دکھ بانٹنے کے لیے صرف پیسہ کمانا آپ کا مقصد بن جائے، تو آپ گھٹیا بن جائیں گے۔

سوال : آپ کی کہانیوں کے بیشتر کرداروں سے آپ کی ملاقات رہی ہے؟ یا ان میں سے زیادہ تر آپ کے تخیل کی پیداوار ہیں؟

جواب: (سوچتے ہوئے) سوچ کر بھی لکھتا ہوں، کبھی ملاقات بھی رہتی ہے۔ کچھ طے نہیں رہتا۔ دراصل ادب میں ایسا نہیں ہے کہ کوئی چیز ایسی ہی ہے، بلکہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی چیز ایسی ہو سکتی ہے۔ کبھی کوشش کر کے بھی لکھتا ہوں۔ افسانہ جب سوجھ جاتا ہے تب بھی کہانی کو سوچ کر لکھنا پڑتا ہے۔ کہانی ذہن میں پکتی رہتی ہے۔ دراصل بیٹا! یہ ایک بہت بڑی تپسیا ہے۔ بہت بدنصیب آدمی ہی ہمارے جہان کو اپنے میں سمونے کا ہنر سیکھ پاتا ہے۔

سوال : اور جو یہ کہا جاتا ہے کہ افسانہ نگار جس کردار کے بارے میں لکھتا ہے اسے پہلے خود پر طاری کر لیتا ہے یا وہ کردار خود فنکار بن جاتا ہے۔ اس میں کتنی صداقت ہے؟

جواب : بالکل صحیح تجزیہ ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم کسی چور کے بارے میں لکھ رہے ہیں تو چور کے ذہن تک پہنچنے کے لیے جو ذلتیں ہوں گی انھیں پہلے اپنے اوپر محسوس کریں یہی تخلیق کار کا وصف ہے کہ وہ ہر ذلت کو برداشت کرنے کے لیے آمادہ ہو۔ ایسی صورت میں اللہ اس فنکار پر مہربان ہو جاتا ہے اور اپنی فیاضیوں کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ مطلب احساس کی شدت تخلیق کار کو چور، قاتل، خونی غرض کہ دنیا کے کسی بھی گنہ گار میں بدل سکتی ہے۔ دراصل معاملہ کسی بھی کردار کو اپنی روح میں یعنی تخلیق کار کی روح میں جذب کرنے کا ہے، باقی چیزیں خود بہ خود ہو جاتی ہیں۔

سوال : آپ کی ملاقات منٹو، بیدی، کرشن چندر، عصمت، قرۃ العین حیدر جیسے ادیبوں سے رہی ہوگی۔ کیا آپ ان میں کسی سے متاثر ہوئے تھے؟

جواب : متاثر کیا ہوتا ہے؟ مل کر جی خوش ہوتا تھا۔ یوروپ سے لوٹا تو منٹو کا انتقال ہو چکا تھا۔ بیدی، خواجہ احمد عباس، کرشن چندر سے ملاقاتیں رہیں۔ بیٹا! انسان اپنی کوشش

اور پریکٹس سے اچھا یا بڑا بنتا ہے صرف ملاقاتوں سے نہیں۔قرۃ العین حیدر سے میری زیادہ ملاقاتیں رہی ہیں کیونکہ وہ میری ہم عمر تھیں، باقی سب میرے سینئر تھے۔ قرۃ العین حیدر نے بہت اچھے افسانے لکھے مگر وہ اپنے وقت سے پہلے تھیں اس لیے لوگ ان کو سمجھ نہیں پائے۔

سوال : کسی بھی ادیب یا فنکار کے لیے انعامات کتنی اہمیت رکھتے ہیں؟

جواب : مصلحت پسندوں نے بہت برے جال بچھا رکھے ہیں۔ایک سچا فنکار ان خرافات سے دور رہے تو بہتر ہے۔نام وری کی خواہش ایک عمر تک کے لیے ٹھیک ہے مگر عمر بھر کے لیے یہ عادت گھٹیا پن کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ بیٹا! یہ اتفاق کی بات نہیں ہے کہ خدا نظر نہیں آتا۔ جوانی کی عمر کی بات الگ ہے مگر تخلیق کار کو کہیں نظر نہیں آنا چاہیے۔انعاموں کی تکڑم بازی سے باہر آ کر ہی آپ کچھ کام کر سکتے ہیں۔گھٹیا ماحول میں ایک تخلیق کار بہتر سوچ ہی نہیں سکتا۔ بڑے تخلیق کاروں کو شہرت کی خواہش گھٹیا بنا رہی ہے۔ اللہ کسی کو بھی بڑی یا چھوٹی سوچ دے کر پیدا نہیں کرتا، یہ ساری چیزیں شعوری کوشش کے تحت قلمکار کے اندر پیدا ہوتی ہیں۔حالانکہ عالمی ادب میں اردو کہانیاں بہت اچھی جگہ پر ہیں۔ ریڈر شپ اچھی ہو تب اچھے قلمکار بھی ہو جاتے ہیں لیکن مشہور ہو جانا لازمی طور اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہ آپ بہت بڑے قلمکار ہیں۔جو خدا کو دیکھ سکتے ہیں اللہ اس کے سامنے ہے مگر دیکھنے کی صلاحیت یہاں اہم چیز ہے۔آپ نے بہت اچھی کہانی لکھی مگر اس کی روح تک نہیں پہنچے تو آپ نے کچھ نہیں کیا مطلب صرف(فیلوشپ ان سفرنگ)ہی کسی تخلیق کار کو اس کے اصل مقصد تک پہنچاتی ہے۔اردو میں کہانی کار ہونے کی جو ذلت ہے وہی کہانی بناتی ہے۔یہ دور جہالت سے بھرپور لوگوں کا دور ہے۔لوگ صرف کورس پڑھتے ہیں جبکہ پڑھنے کا مطلب تباہی کا حوصلہ پیدا کرنا ہونا چاہیے۔منٹو ہماری زبان میں اتفاق سے نہیں آ گیا اس نے تباہی کو گلے لگایا اور بڑا تخلیق کار بن گیا۔وہ جیسا دکھائی دیتا تھا اندر سے بالکل ویسا نہیں تھا۔مسکرانے کی شعوری کوشش اس کے اندرون میں کوئی چیز پکاتی رہتی تھی۔جس کا اظہار وہ قلم کے ذریعے کرتا تھا۔

سوال : کیا اردو کہانی انحطاط پزیر ہے؟

جواب :اس کا کیا جواب ہوسکتا ہے؟it depends کہ کہانی کا معیار کیا ہے۔ پچاس سال پہلے کے معیار کی بات چھوڑیے۔کہانی کے معیار کے مطابق ہی اس بارے میں کچھ کہا جاسکتا ہے۔

سوال :منٹو، بیدی، کرشن چندر اور عصمت اپنے دور کی پہچان تھے۔اردو فکشن کے موجودہ دور کی پہچان آپ کے خیال میں کن لوگوں کو کہا جاسکتا ہے؟

جواب :دور کی پہچان کا مطلب کیا ہوتا ہے۔جن کا زمانہ نام لیتا ہے وہ مر چکے ہوتے ہیں۔آج کے زمانے میں کسی کا نام لینا وقت سے بہت پہلے کی بات ہے۔جن کا زمانہ آج نام لے رہا ہے ان میں سے کتنے تو مر جائیں گے۔ان میں سے جن کا نام لیا جارہا ہے وہ کم سے کم survive تو کر سکے۔دوٹوک جواب نہیں دیا جاسکتا۔یہ وقت کے ساتھ طے ہو جائے گا۔ صرف لفظوں کی گنتی زیادہ ہو جائے یہ ہی کافی نہیں ہے۔سوال تو یہ ہونا چاہیے کہ زمانے کو آج کیا پوچھنا اور جاننا ہے۔تلاش ہونی چاہیے بیٹا! باقی سب کچھ وقت پر چھوڑ دیجیے۔دس ہزار جواب ہو سکتے ہیں۔یہ کوئی mathematics تو ہے نہیں کہ دو دو چار ہو جائے۔ جواب تو ایسا ہونا چاہیے جسے پڑھ کر قاری خود کو اس گفتگو میں شامل کر سکے کچھ حاصل نہ بھی ہو تو پرواہ نہیں مگر گفتگو زمانے کی رفتار کے مطابق اچھی اور صحت مند ہو۔

سوال : جدیدیت پسند نقادوں نے فکشن میں راست بیانیہ کی مخالفت کی تھی اور بالواسطہ بیانیے اور علامت نگاری کو اس کا حسن قرار دیا تھا۔اس مفروضے سے آپ کہاں تک متفق ہیں؟

جواب :کوئی چیز بہ ذات خود یہ یا وہ اچھی یا بری نہیں ہوتی۔سوال یہ ہوتا ہے کہ کس موقعے پر کیا کہنا ہے۔کہیں راست بیانیہ ٹھیک ہے، کہیں ٹیڑھی میڑھی بات ضروری ہے۔پڑھتے ہوئے آپ کو یہ لگے کہ آپ کہانی میں خود کو شامل کر پار ہے ہیں۔راست بیانیہ کے ذریعے ہو یا کہ بالواسطہ طریقے سے، مقصد صرف قاری کو اس میں محو کر دینا ہے۔ادب میں کوئی بھی چیز دوٹوک نہیں ہوتی۔کہانی لکھنے کا کوئی خاص فارمولہ نہیں بنایا جاسکتا۔جیسے کہ اللہ میاں یہ سوچتا ہے کہ بندہ صبح اٹھے گا تو یہ کرے گا، وہ کرے گا تو اس میں کوئی حادثے کیوں پیدا ہو جاتے

ہیں۔ کیوں کہ حوادث بھی زندگی کا ایک حصّہ ہیں۔ آپ یہ کہیں کہ حادثے کہانی میں روز روز تھوڑے ہی ہوتے ہیں، لیکن کبھی نہ کبھی ہوتے تو ہیں اور اگر ہوتے ہیں تو وہ حادثے نہیں بلکہ عام حالات کا ایک حصّہ ہیں۔ بیٹا! اب آگے کی کہانی کا سوچیے کہ کیا ضرورت ہے۔

سوال : نئے کہانی کار کو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ نقاد انھیں روایتی طرز پر پرکھتے ہیں اور اس کے مطابق ہی ان کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ سنا دیتے ہیں۔ اس بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

جواب : بیٹا! کہانی کے اتنے ہی انداز ہوتے ہیں جتنے کہ دنیا میں انسان کے چہرے۔ ایک کہانی ایک بار زندگی میں جیسی پیش آتی ہے ویسی دوبارہ کبھی نہیں آتی۔ اگر کہانی پڑھتے ہوئے قاری کو بھی یہی محسوس ہو رہا ہے تو وہ اچھی کہانی ہے، کامیاب ہے۔ اگر لگے کہ کہانی ہی نہیں بلکہ بنائی گئی ہے تو کچھ گڑبڑ ہے اس میں۔ ایک تخلیق کار کو خود اپنے طور پر چیزوں کا مشاہدہ کرنا اور ایک نتیجے پر پہنچنا ضروری ہوتا ہے۔ میرا یہ تجربہ ہے کہ کہانی کہیں سے بھی آ جاتی ہے۔ جسے آپ بالکل احمق سمجھتے ہیں ہو سکتا ہے وہ آپ کو سب سے بڑی کہانی دے جائے۔ ہمیں اس سے کوئی فلسفہ تو اگلوانا نہیں ہے۔ کئی بار کوئی بچہ تالی بجاتے ہوئے کوئی بات کہتا ہے تو وہ سب سے بڑی کہانی کہہ جاتا ہے۔ کہانی وہ ہوتی ہے جس میں دھڑکن کا احساس ہو۔ اس میں کوئی بڑی ہو قطعی ضروری نہیں۔ اس کا احساس اتنا ضروری نہیں ہے جتنا یہ کہ کہانی دھڑکتی ہوئی ہو، جیسے زندگی دھڑکتی ہے۔ تو وہ اپنے آپ معیاری ہو جاتی ہے۔ کہانی کا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ آپ کو کوئی گہری بات کہنی ہے بلکہ کہانی کا مسئلہ یہ ہے کہ ایسا لگے کہ وہ ہو بہو اسی طرح پیش آئی ہے۔

سوال : کہیں آپ نے لکھا ہے کہ آپ کو میلے میں ایک ننھی منی کہانی ملی تھی، آپ نے اس کو پالا پوسا۔ پالتے پوستے آپ بوڑھے ہو گئے لیکن کہانی ابھی تک ننھی منی بچی ہے۔ وہ کہانی ابھی تک ننھی منی بچی کیوں ہے؟

جواب : ہاں وہ ابھی تک بچی ہے کیونکہ زندگی بچی ہے۔ زندگی بوڑھی ہو جائے گی جب تو اللہ میاں آپ کو پیدا کرنا بند کر دیں گے۔ زندگی اسی لیے عمدہ ہے اور اللہ میاں اسی لیے لاجواب ہے اور کہانی کی گنجائش اسی لیے بچی ہوئی ہے کہ انسان کو ابھی پیدا ہونا ہے۔ اگر آپ یہ تصور

کر لیں کہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تو پھر بیوقوف ہے خدا کہ وہ زندگی کو جاری رکھے۔ خدا نے زندگی کے تواتر کا راز سمجھایا ہے۔ کسی بھی زندگی کے تواتر کا راز یہ ہے کہ اس کی اسراریت بھی بنی رہے اور اس کی وضاحت بھی بنی رہے۔ کچھ لگے کہ پتہ نہیں ہے اور کچھ لگے کہ پتہ ہے۔ کچھ لگے کی آپ کر رہے ہیں اور کچھ لگے کہ اپنے آپ ہو رہا ہے۔ تو یہ ساری باتیں confuse کر کے جب mix ہو جاتی ہیں تو وہ زندگی کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

سوال : اردو اور ہندی میں ایک اچھا خاصا دور پاپولر لٹریچر یا مقبول عوام ہلکے پھلکے ادب کا گزرا ہے جس میں گلشن نندہ، دت بھارتی، ابن صفی، اظہار اثر وغیرہ کے رومانی، سماجی اور جاسوسی ناول شمار ہوتے ہیں۔ کیا انہیں ادب کے دائرے میں شمار کیا جا سکتا ہے؟ آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب : پاپولر لٹریچر بہت اچھا بھی ہو سکتا ہے جب اس کی کہانی پڑھنے میں لگے کہ وہ اپنے آپ ہو رہا ہے۔ جیسے زندگی چلا تو اللہ میاں رہا ہے مگر ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے آپ ہو رہا ہے۔ آج آپ گھر سے نکل کر یہاں تک خود ہی آئی ہیں مگر دراصل یہ صرف سوچا آپ نے ہے مگر خواہش اللہ کی ہے۔ اس نے سوچا کہ وہ آپ کو میرے پاس بھیجے گا تو آپ کی خواہش ہوئی اور حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ آپ آگئے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ بنا کر کہانی میں کوئی بات نہ کی جائے۔ میں نے خود ابن صفی کو بہت پیار سے پڑھا ہے جب پڑھتا ہوں تو یہ مجھے engage کرتا ہے۔ کچھ تو خوبی ضرور ہے ان میں۔ مجھے اس لٹریچر کے لکھنے والوں کو کچھ نہیں کہنا ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا لکھنا ان کی ضرورت ہو مگر جب ہم کہانی کو دیکھتے ہیں تو یہ نہیں دیکھنا ہوتا کہ وہ ابن صفی ہے یا جوگندر پال ہے بلکہ یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ وہ زندگی ہے یا غیر زندگی۔ اس میں کون ٹوٹ جائے گا اور کون بچ جائے گا یہ کہانی ہی طے کرے گی۔ کہانی کی دلچسپی یقیناً ایک خوبی ہے مگر دلچسپی کے ساتھ ہی جو کچھ اصل زندگی میں ہو رہا ہے کہانی کو اس سے الگ نہیں لگنا چاہیے۔ کہانی کا دلچسپ ہونا اسی طرح اہم ہے جیسے زندگی کا دلچسپ ہونا۔ کہانی اچھی وہی ہوتی ہے جسے حالات خود ڈھالتے ہوئے سے محسوس ہوں۔

سوال : میں نے سنا ہے کہ آپ طنز و مزاح کو ادب کا حصہ نہیں بلکہ محض ایک اسلوب مانتے ہیں، کیا یہ درست ہے؟

جواب : میں سب چیزوں کو ادب کا حصہ مانتا ہوں۔ میں نہیں کہتا کہ طنز و مزاح ادب کا حصہ نہیں ہے۔ طنز و مزاح صرف وہی نہیں ہے جو صرف خالص طنز و مزاح ہو۔ طنز و مزاح کہانیوں میں بھی ہوتا ہے۔ طنز و مزاح جس طرح کہانی میں آجاتا ہے آپ اسے روک تو نہیں سکتے۔ اصل چیز تو کہانی کی ضرورت ہے۔

سوال : عالمی ادب میں مرد قلمکاروں کے مقابلے میں خواتین فنکاروں کی تعداد کم دیکھی جاتی ہے۔ آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

جواب : مصروف زیادہ ہوں گی۔ ہندوستان میں تو تعلیم کی کمی بھی ایک مسئلہ ہے۔ آپ کا میاں آپ کو اپنے سے بڑا دیکھنا نہیں چاہتا۔ ہندوستان ہو یا یوروپ کام تو سب عورتوں کا وہی ہے گھر سنبھالنا۔ یوروپ میں عورتیں بڑا کام بھی کر رہی ہیں۔ وہ بھروسہ بہت کرتی ہیں۔ سوچنے والی ہوتی ہیں اور بہت ٹیڑھی بھی۔ کہانی پر باریکی سے سوچنا، لکھنا، دراصل دیکھا جائے تو یہ عورت کا کام ہے۔ وہ زیادہ باریکی سے سوچتی ہیں۔ مرد تو بیوقوف سیدھا دوڑتا چلا جاتا ہے۔ اگر بیٹھ کر سوچنا ہو، یا دنیا کو دوڑانا ہو تو اس وقت عورت چپ چاپ سوچ لے گی اور کر گزرے گی۔ قرۃ العین...! جو ہے اس پر سو مرد قتل کر دیجیے تب جا کر ایک قرۃ العین تیار ہو گی۔ ایک عورت تخلیق کار ہو جائے تو آپ دس ہزار مرد تخلیق کار کو کوڑے میں ڈال دیجیے۔ قرۃ العین...! وہ عظیم تھی۔ ادبی فکر میں نسوانیت نہیں ہو تو یہ بے مزہ ہو جائے گی۔ اس کی نسوانیت اسے پیارا بناتی ہے فکری اعتبار سے دیکھا جائے تو لٹریچر کو چاہے عورت نہ بھی لکھ رہی ہو مگر ادب میں ایک عورت پن تو ضرور ہوتا ہے۔ وہ نہ ہو تو مرد صرف گھوڑے کی طرح ریس لگا تا رہے (ہنستے ہوئے) وہ ہے بھی صرف دوڑنے کے لیے۔ عورت اپنی بے وقوفی میں جتنی عقلمند ہے اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ عورت کے یہاں ایک تخیل ہے، خوبصورتی ہے، بندش ہے مرد میں ایک طاقت ہے، دوڑ ہے، تو دونوں کسی جگہ مل جاتے ہیں تو فطرت انھیں مکمل کر دیتی ہے۔ آج کی زندگی میں تو دونوں کو الگ الگ دیکھنا ہی غلط ہے۔ دراصل

زندگی خوبصورت تب ہوتی ہے جب آپ میں غور وفکر کا ایک سلسلہ چلتا رہے۔ جہاں یہ سلسلہ ختم ہوا آپ سب کچھ کھونے لگتے ہیں۔

سوال : کہانی میں جو کہانی پن کی بات کی جاتی ہے۔اس بارے میں آپ کچھ فرمایئے۔

جواب :سب بکواس ہے۔ یہ پن کیا ہوتا ہے۔میرے نزدیک کہانی پن کچھ اور ہے آپ کے نزدیک کچھ اور۔ کہانی کو دلچسپ بنانے کی شعوری کوشش مت کیجیے۔ دلچسپی اپنے آپ ہی آتی ہے۔اگر اپنے آپ دلچسپی نہ آئے تو آپ کہانی خراب لکھ رہے ہیں۔صرف دلچسپی ہو مگر کرید نہ ہو تو ساری محنت خاک میں مل جاتی ہے۔ کہانی بڑی وہ ہوتی ہے جسے تخلیق کار اپنے اندرون میں بسا لیتا ہے۔ بڑی کہانی کا مطلب بڑی بڑی باتوں اور فلاسفی کا ہونا نہیں ہے، بلکہ صرف کہانی فنکار کے دل و دماغ میں بس جائے تو وہ (فنکار) کامیاب ہو جاتا ہے۔ ہمارے یہاں اردو میں مشکل یہ ہے کہ سکے بند ریڈنگ اور سکے بند رائٹنگ ہے۔اس سے ایسے لوگ جو نہیں پڑھتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ان کو ضرورت نہیں ہے۔کہانی ضرورت نہیں ہے کسی کی، کہانی شوق ہے۔زندگی جینا آپ کی ضرورت نہیں بلکہ آپ کا excitment ہے۔اس لیے ضروری ہے۔

ملاقاتی: آپ کا بہت بہت شکریہ سر۔آپ نے مجھے اپنا قیمتی وقت دیا۔

•••

جوگندر پال سے گفتگو (۱)

سوال: کہانی لکھنے کی تحریک آپ کو کہاں سے ملی اور آپ نے پہلی کہانی کب لکھی؟

جواب: غریب بچوں کو چھوٹی عمر میں ہی اپنے شعور سے کام لیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ تجربے آدمی کو عمر سے پہلے بڑا کر دیتے ہیں اور یوں کئی لوگ چھوٹی عمر میں ہی بالغ ہو جاتے ہیں۔ یہی میرے ساتھ ہوا۔ غربت، ستاؤ اور اپنے بے بس والدین کی بے چارگی محسوس کر کے مجھے دس بارہ برس کی عمر میں ہی زندگی کی سوجھ بوجھ ہونے لگی۔ ان دنوں بچوں کا رسالہ ''پھول'' نہایت مقبول تھا، اسے پڑھ کر میں بھی ویسی ہی کہانیاں لکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اور خود آپ ہی اپنی کہانیاں پڑھ پڑھ کر خوش ہو لیتا۔ لکھنے کا شوق تو بڑھتا چلا گیا، مگر کسی کو اپنی کہانی سناتے ہوئے جھجک ہوتی۔ کالج میں پہنچ کر تھوڑی خود اعتمادی ہوئی اور ایک دفعہ ہمت کر کے اکھڑے اکھڑے انداز میں جوش و خروش سے اپنی الٹی سیدھی کہانی ''تعبیر''، عشق اور غریبی کے موضوع پر کالج کی بزمِ ادب میں سنا دی ہمارے اردو کے لیکچرار Daniel Baksh نے اس کی اتنی تعریف کی کہ کالج کے اسٹوڈنٹ ایڈیٹر نذیر احمد نے اسے چھاپ دیا۔ اس واقعے کے بعد یہ شوق اب جنوں کی حدوں میں داخل ہونے لگا۔

سوال: کالج سے نکلنے کے بعد آپ کو صبح چار بجے دودھ کا ڈرم لے کر 40 کلومیٹر کا سفر طے کرنا پڑتا تھا، زندگی کی یہ کڑواہٹ کیسی رہی؟

جواب: 1947 میں سیالکوٹ سے انبالہ پہنچ کر سائیکل پر دودھ کے وزنی ڈرم ڈھونا مجھے اس لیے گراں نہ گزرا کہ وہاں بھی دودھ کے ڈرم نہ سہی، زندگی کو بھی وزنی ڈرموں کے مانند ہی ڈھوتا رہا تھا۔ انبالہ میں یہ آرام ہو گیا تھا کہ سارے دن کی مشقت کے بعد بڑے مزے کی نیند آ جاتی تھی۔ سیالکوٹ کے مشکل حالات میں گویا نیند کو بھی ڈھونا پڑتا تھا۔ انبالہ کے یہ دن مجھے اس لیے بھی اچھے لگنے لگے تھے کہ بھایا جی (میرے والد) کو جو سیالکوٹ میں اپنی عمر اور گرتی صحت کے باوجود گھر چلانے کے لیے دن رات محنت کرتے رہتے تھے، اب اطمینان اور فرصت کی زندگی میسر ہو گئی تھی مگر وہ کوئی ڈیڑھ سال میں ہی مختصر سی بیماری کے بعد اچانک چل بسے۔

سوال: کینیا میں آپ کی شادی کیسے ہوئی؟

جواب: میرے سسرال والے ہمارے دور کے رشتے دار تھے اور اپنی لڑکی کے لیے ور کی تلاش میں کسی لڑکے کا پتہ لے کر اس سے ملنے انبالہ آئے تھے۔ میں سارا دن اس لڑکے کی تلاش میں اپنے سسر کے ساتھ گھومتا رہا اور وہ لڑکا بالآخر انہیں مل گیا۔ میں!

افریقہ سے لڑکیوں کے والدین ان کے لیے شوہر ڈھونڈنے کے لیے اکثر یہاں آتے تھے اور شوہروں کی ڈولی اٹھوا کر اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ ان نوجوانوں کو ان کی بے چارگی کے پیش نظر "ڈولک" کہا جاتا تھا۔ میں بھی "ڈولک" بنا اپنی بیوی اور ماں کے ساتھ زندگی میں پہلی بار سمندری جہاز میں جا بیٹھا۔ جہاز کو نیروبی کی جانب روانہ ہوتے دیکھ کر میری بیوی کی زبان جو کھلی تو وہ گویا ابھی سے وہاں جا پہنچی تھی۔ پاپا جی کی بڑی خواہش تھی کہ کوئی ایسا لڑکا ملے جو فرفر انگریزی بولتا ہو (مجھے تو اپنی پنجابی بھی تیز بولنا نہ آتی تھی)۔ بہرحال میں نے وہاں پورے چودہ سال گزارے۔ کینیا میں انگریزی کا بول بالا تھا۔ شہروں کے لوگ عام طور پر انتظامیہ کے انگریز افسروں، چھوٹے موٹے ایشیائی سرکاری نوکروں اور تاجروں اور ان کے گھروں میں

کام کرنے کے لیے افریقی بوئیوں (ہاؤس بوائز) یا آیاؤں پر مشتمل تھے اور کالے باشندوں کو غیر مقامی عناصر سے تعبیر کیا جاتا تھا جو کام نہ ملنے پر اندھیرے میں کسی ہندستانی کو کہیں تنہا پاکر اس کی جیب سے چونی دونی ہی مل جانے کی آس پر بھی اس پر ہلہ بول دیتے تھے۔ ہندستانی گھروں میں ان پر کڑی نظر رکھتے اور گھروں سے باہر ان سے دور دور رہتے اور اپنی اکیڈمک بحثوں میں ان کی حالت زار کی ساری ذمے داری انگریزوں پر تھوپ دیتے۔

میں کینیا سے واپس تو آنا چاہتا تھا۔ مگر ہندستان لوٹتے ہوئے ڈرتا تھا کہ یہاں کی کھلی ہوا کے سوا کھانے کو کچھ نہیں ملے گا۔ چنانچہ میں اس وقت تک وہیں رہا جب تک کینیا کی آزادی پر اپنی جزوی برٹش پنشن محفوظ نہ کر لی۔ سچ پوچھیے تو اسی پنشن کے بھروسے میں گزشتہ چوتھائی صدی سے اپنی کہانیاں لکھتا چلا آ رہا ہوں۔

سوال: ہندوستان واپسی کے بعد کا تجربہ کیسا رہا؟

جواب: یہاں پہنچ کر کئی ماہ نوکری کی تلاش میں بھٹکتا رہا، مگر بھٹکتے ہوئے عین وہیں جا پہنچا جہاں پہنچے بغیر نوکری نہ مل پاتی، حیدرآباد دکن، جہاں پہنچ کر جب میرا دم ٹوٹ چکا تھا۔ وہاں مجھے نوکری مل گئی۔ میرے ساتھ کہانی لکھنے میں بھی یہی ہوا کہ بھٹک بھٹک کر اپنی منزل پر آ پہنچا۔ منزل انجانی ہو تو بھٹکے بغیر وہاں پہنچنا ممکن نہیں ہوتا۔ اورنگ آباد میں مجھے نہ صرف بڑی اچھی نوکری مل گئی، بلکہ لکھنے پڑھنے کے لیے بھی نہایت عمدہ ادبی ماحول میسر آ گیا۔

سوال: آپ کی سب سے اچھی کہانی آپ کی نظروں میں کون سی ہے؟

جواب: معلوم نہیں، آپ کو اس سوال کا جواب کیسے دوں۔ میری کہانیوں کو چھوڑیے، آپ یوں بھی پوچھیں کہ تمام کہانیوں میں سب سے اچھی کہانی کون سی ہے تو بھی مجھے جواب دینے میں تامل رہتا۔ جیسے کہ بتا چکا ہوں کہ کہانیاں ہمیں وارداتا پیش آتی ہیں اور اگر وہ اسی مانند پیش بھی کی جا سکیں تو قاری بھی انھیں اپنے کسی وارداتی تلازمے سے جوڑ کر اس میں اپنے ذاتی معانی دریافت کر لیتا ہے۔ اور یوں ہر معنی اپنے وقوعی سیاق و سباق میں یکساں اہمیت کا حامل معلوم ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے آپ کہہ سکتے ہیں ہر اچھی کہانی اپنی جگہ بہت اچھی ہے۔

سوال: ماضی کی کچھ ایسی یادیں جو آپ کو ستاتی ہوں؟

جواب: میری دودھ اور سندور جیسی بیس سالہ بہن ابھی دس بارہ سالہ بچی کے مانند نہایت معصوم، نہایت سیدھی تھی اور اپنی شادی کا جوڑا پہنے پہلی بار سسرال جارہی تھی اور میرے گلے لگ کر اس لیے بھی پھوٹ پھوٹ کر روئے جارہی تھی کہ میں اور ہماری ماں اسے چھوڑ کر اگلے ہی روز سمندر پار جارہے ہیں اور شاید اسے لگ رہا تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے...... اور اس نے واقعی کوئی سال بھر میں ہی اپنی پہلی زچگی پر خاطر خواہ طبی سہولت مہیا نہ ہو پانے کی وجہ سے ہماری غیر موجودگی میں دم توڑ دیا!...... اُس سے بچھڑنے کا وہ پل مجھے اس طرح ہمیشہ یاد آتا ہے گویا میں بھی اس کی موت کا ذمہ دار ہوں۔

ایک اور واقعہ جو دل میں نقش ہو گیا وہ یہ ہے کہ افریقہ سے ممبئی آتے ہوئے ہم نے دو ایک روز کے لیے کراچی میں قیام کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ جہاز سے اتر کر کراچی میں برسات کی اندھیری رات میں ہم نے نیروبی کی ایک منہ بولی بہن کے بڑے بھائی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔'باجی' کے بڑے بھائی نے ہمارا نہایت پرتپاک استقبال کیا اور دوران قیام ہماری دیکھ بھال اور خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ہندستان پہنچ کر کئی دن بعد ہمیں پتہ چلا کہ وہ شریف آدمی 'باجی' کا بڑا بھائی نہ تھا، مگر میں نے سر جھٹک کر اپنے آپ کو یقین دلایا کہ وہ جو بھی تھا، باجی کے بڑے بھائی کے سوا اور کون تھا؟

سوال: آپ نے کرشن چندر، بیدی اور منٹو کے بعد افسانے کو نیا موڑ دیا۔ اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: نئے ادبا کو ہی اپنا ادبی دور تخلیق کرنا ہوتا ہے اور اس کے لیے انھیں اپنے دور میں پنپتی ہوئی نئی اور مختلف سچائیوں کے آزادانہ تخلیقی احساس و ادراک کے بغیر چارہ نہیں۔ جس مقصد کے تحت کرشن، بیدی اور منٹو نے اپنے عہد کے مطابق افسانے کو نیا موڑ دیا، اسی مقصد کی انجام دہی کے لیے میرے لیے بھی لازم تھا کہ اپنے دور کی مخصوص سچائیوں کے اظہار کے لیے مخصوص اسلوب اختیار کروں، اس طرح قارئین کو بھی اگر نئی کہانیوں میں اپنے زمانے کی مانوس چاپ محسوس ہونے لگے تو وہ ان سے جلد جڑ جاتے ہیں۔ 'تمنا کا دوسرا قدم'، 'مارکیٹ

اکانومی، کھات، بجھتے سورج کا ہے یا دیگر کہانیوں کو میں نے اور میرے دور کے پڑھنے والوں نے مل جل کر تخلیق کیا ہے میں نے انھیں لکھ کر اور انھوں نے پڑھ کر۔

سوال: ناول ''نادید'' لکھنے کا خیال کیسے آیا؟

جواب: ''نادید'' اندھوں کی کہانی ہے۔ اپنے قیام افریقہ کے دوران ایک دفعہ مجھے بچاکوس کے ایک بلائنڈ ہاؤس جانے کا اتفاق ہوا، جہاں میں گھپ کالے چہروں پر اندھی آنکھیں دیکھ کر ایک عجیب ذہنی کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔ یہ چہرے کئی سال میرے دل و دماغ میں محفوظ رہے، اور پھر ہندستان میں آنے کے بعد مجھے ہونے لگا کہ ہمارا ملک بھی شاید ایک بہت بڑا بلائنڈ ہاؤس ہے اور ہم سب لوگ اندھے۔ اس طرح ذہن میں کہانی بننا شروع ہو گئی، تاہم اس کا ایک بڑا حصہ لکھنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ کہانی تو اندھوں کی ہے اور میں نے اسے آنکھوں والوں کی کہانی بنا دیا ہے، چنانچہ میں نے اسے دوبارہ لکھنا شروع کر دیا۔ اس بار کسی اندھے کی طرح دیکھنے کی بجائے ٹٹول ٹٹول کر اسے پورا کرنے لگا اور اس طرح یہ ناول پورا کیا۔

سوال: تقسیم ملک کے سانحے کا آپ کی کہانیوں پر کیا اثر پڑا؟

جواب: اس وقت میں تقریباً بائیس برس کا تھا۔ جن حالات میں ہمارا وہاں سے نکلنا ہوا اور اس عرصے میں میں نے وہاں سے یہاں اور یہاں سے وہاں آتے جاتے پناہ گزینوں کو جس لٹی پٹی، جنونی حالت میں زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار دیکھا، وہ دن میری پوری زندگی پر نقش ہو گیا۔ یہ اچھا ہوا کہ میں نے اپنی یہ کہانیاں ان واقعات کے کئی سال بعد لکھیں، جب انھوں نے ہماری حالیہ تاریخ پر اپنے واضح اثرات مرتب کرنا شروع کر دیے تھے۔ میری کہانی ''پناہ گاہ'' میں میری ماں ہندستان کے گاؤں میں گھر بار اور عزت و آبرو سب کچھ لٹا کر فسادیوں سے پوچھتی پھرتی ہے، لوگو، میرے اپنے لوگ کہاں چلے گئے ہیں۔ لوگ اسے جواب دیتے ہیں، جاؤ، تم بھی وہیں چلی جاؤ، ہم نے تمھارے لوگوں کو پاکستان پیک کر دیا ہے۔ مگر ان کے لوگوں کو فسادات کے بعد گاؤں کے قریب ہی شہر کے ایک کیمپ میں رکھا گیا تھا، جہاں گاؤں کا بوڑھا مکھیا ماں پر ترس کھا کر اسے بھی چھوڑ آیا۔ آگے سنیے، کیمپ میں ایک نوجوان ہندو ڈاکٹر کو نہایت محبت سے اپنی دیکھ بھال کرتے

ہوئے پا کر میرا اشن اپنی بھری بھری آواز میں اسے مخاطب کر کے کہنے لگی، "بیٹا، میرے لوگوں کو بکھر کر دو، میں بھی پاکستان آ پہنچی ہوں۔" اپنی ایک اور کہانی "ڈیرہ بابا نانک" تو میں نے حال ہی میں لکھی ہے۔ان دنوں لکھتا تو کہانی کو غم جذبات میں خراب کر دیتا، اپنا ناول "خواب رو" بھی میں نے اسی لیے چند ہی سال پہلے لکھا، تا کہ وقوعی حوالے ہماری حالیہ تاریخ سے چھن چھن کر اپنا تناظر بنا پائیں۔

سوال: پاکستان میں جب آپ نے اتنے برسوں بعد اپنے گھر میں قدم رکھا تو آپ کو کیسا لگا؟

جواب: میں نے اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو سامنے کے گھر سے آواز آئی، گھر والے باہر گئے ہوئے ہیں!

سوال: کیا آپ کو اپنے طویل ادبی سفر میں اپنے ناشرین سے کوئی گلہ رہا؟

جواب: میرا پہلا گلہ تو اپنی زبان کی عام ریڈنگ پبلک سے ہے جنھیں خرید کر کتابیں پڑھنے کی عادت نہیں۔

سوال: موجودہ عہد میں گلوبلائزیشن ہمارے لیے کتنا مفید ہے؟

جواب: ایک اردو سماج ہی نہیں، آج کوئی بھی سماج اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تیار کر کے بھرپور زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ گلوبلائزیشن کا عمل نئے دور میں ہماری زندگی کا ایک نہایت ضروری حصہ ہے۔ نئی زندگی کا یہی تقاضہ ہے کہ ہم اپنے پرانے تعصبات سے نجات حاصل کر کے مل جل کر ایک سانجھی انسانی برادری کے نصب العین پر پورے اتر پائیں، تاہم ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اپنے اس عمل کو ہم اپنے ملک اور دنیا کے کمزور طبقوں کے معاشی استحصال کا حیلہ نہ بنالیں۔

سوال: موجودہ صورت حال میں اردو کی ترقی کے لیے موثر ترین اقدام کیا ہو سکتا ہے؟ اس سلسلے میں قومی اردو کونسل کی کوششوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: موجودہ صورت حال میں اردو کی بقا کے لیے اہم ترین اقدام یہی ہے کہ جیسے بھی ہو اردو کی ابتدائی تعلیم کے مسائل کو ترجیحی بنیاد پر حل کیا جائے۔ بڑی مسرت کا مقام ہے کہ قومی اردو کونسل جہاں اس پہلو کی طرف پوری توجہ برت رہی ہے وہاں زبان کے ترویجی تسلسل کے لیے ان اقدامات پر بھی نظر رکھے ہوئے ہے جن کی بدولت علم کی بالائی سطحوں کو بھی تقویت

پہنچتی رہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے سبھی متعلقہ عوامی ادارے بھی کونسل کے پروگراموں کی تکمیل میں معاونت کریں۔

•••

شوکت حیات سے ایک ملاقات

1970 کے بعد سامنے آنے والی نسل میں شوکت حیات کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو افسانے کے ارتقا اور فروغ میں اہم کردار نبھایا ہے۔ شوکت حیات کی پہلی پہچان ان کی افسانہ نگاری ہے لیکن وہ تنقیدی صلاحیتوں سے بھی بہرہ ور ہیں۔ علاوہ ازیں وہ اچھے مقرر بھی ہیں۔ 1997 میں شوکت حیات کو "گنبد کے کبوتر" کے لیے "کتھا ایوارڈ" تفویض کیا گیا اور ان کی اس کہانی کا ترجمہ بعنوان "Pigeons of the Dome" پریم چند کی پوتی اور مشہور اسکالر سارا رائے نے کیا۔ ابھی چند ماہ قبل انھیں بہار اردو اکادمی کے "لائف اچیومنٹ ایوارڈ" سے نوازا گیا۔ شوکت حیات سے جو گفتگو ہوئی اس کا خلاصہ ذیل میں پیش ہے۔

سوال : آپ نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیوں کیا؟

جواب : اگر میں اس کی تفصیل میں جاؤں گا تو ظاہر ہے کہ بات کہیں سے کہیں تک جا پہنچے گی۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ میرے والد سید محفوظ الحسن مطالعے کے بڑے شوقین تھے۔ ان کے کمرے میں اس زمانے کے تمام فکشن لکھنے والوں کی کتابیں جمع تھیں۔ بچپن میں میں ان کے کمرے

کی لائبریری کا چور reader ہوا کرتا تھا۔ یہ بھید کھلنے پر کہ میں نصاب کی کتابیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے مشہور افسانہ نگاروں کی کہانیاں بھی پڑھ رہا ہوں، ڈانٹ پڑی تھی۔ شاید مار بھی کھائی ہو۔ ٹھیک سے یاد نہیں ــــ لیکن ایک بار والد صاحب کے ساتھ دہلی جاتے ہوئے والد نے مجھے ایک ڈائری تھما دی اور مجھے پٹنہ سے نئی دہلی کے درمیان آنے والے تمام اسٹیشنوں اور خاص تجربات ومشاہدات کا احوال لکھنے کی ہدایت کی۔ پھر یہ ہدایت بھی کہ جو اچھا لگے، یہ لکھیں کہ کیوں اچھا لگا۔ اور جو خراب لگے، اس کے بارے میں لکھیں کہ کیوں خراب لگا۔ میں والد کی طرف سے دی گئی ڈائری میں اپنے مشاہدات اور تجربات لکھنے لگا اور کیوں؟ کا بیان بھی کرنے لگا۔ بعد میں ان کے انتقال کے بعد مجھے افسانہ نگاری کی طرف راغب کرنے میں ڈائری لکھنے کی عادت کا بہت بڑا ہاتھ رہا۔ بچپن میں شفیق والد کے انتقال نے بڑی اولاد ہونے کے ناطے مجھے ذہنی طور پر اس دنیا اور اپنے وجود سے آزردہ کردیا۔ چھ بھائی بہنوں کی ذمے داریوں نے بچپن میں ہی مجھے بوڑھا بنا دیا۔

والد کی طرف سے ذہن میں بٹھائے گئے کیوں نے دنیا کے اسرار ورموز اور اس کی بنیاد کی طرف قدم بڑھانے کو مجبور کیا تو اپنے مشاہدات اور محسوسات کے اظہار کے لیے افسانے کی صنف مجھے سب سے زیادہ موزوں لگی۔ میں اپنی اداسیوں اور زندگی کے تئیں بیزاری کی وجہ سمجھنا چاہتا تھا۔ گوتم بدھ کی طرح نروان کی طرف بڑھا تو راستے میں یہ صنف میرے ہمراہ ہوگئی۔ آج کی مایوس کن، تبدیل پذیر، پیچیدہ اور تہہ در تہہ زندگی کے اظہار کے لیے یہ صنف مجھے موزوں ترین معلوم ہوئی۔ چنانچہ 1965 سے میں کہانی لکھنے لگا۔ والد کے انتقال کے فوراً بعد یا میری شخصیت اور میری زندگی میں جو اچانک خلا پیدا ہوا اسے بھرنے کے لیے جس تیز رفتاری سے افسانہ نگاری کی ہوا میرے قریب آئی، کوئی دوسری صنف نہ آسکی۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے رف اور لطف ہونے کے احوال کا بیان کہانی کے سوا کسی اور صنف میں ممکن بھی نہیں والد کی ہدایت کے زیر اثر کیوں؟ کے ساتھ کیا اور کیسے کے لوازمات بھی شامل ہوگئے۔ اور کیوں، کیسے اور کیا جیسے سوالات اچھے تخلیق کار کو ریلی ونٹ افسانہ نگار بناتے ہیں ایسا میرا ماننا ہے۔

سوال : آپ کس افسانہ نگار سے زیادہ متاثر ہوئے؟

جواب : والد صاحب کی گھریلو لائبریری میں (جو بعد میں امی جان کے نام پر قمر النسا لائبریری میں تبدیل ہوگئی) سہیل عظیم آبادی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی وغیرہ موجود تھے جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ لیکن سائنس کالج میں داخل ہونے کے بعد بنگالی دوستوں کے ذریعے جب کامیو، سارترے، موپاساں، چیخوف، گوگول، خلیل جبران وغیرہ جیسے دیگر زبانوں کے مصنفین کو پڑھنا شروع کیا، ساتھ ساتھ مارکس لینن، فرائڈ، یونگ، لوبیا وغیرہ کو بھی پڑھا تو مجھے خلیل جبران، سارترے اور کامیو نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ سارترے کی وجودیت نے والد کے کسی اور دنیا میں چلے جانے کے دکھ کو کم کیا۔ اس سے پہلے بچپن میں مجھے کئی سالوں تک لگتا رہا کہ مرحوم والد اچانک آئیں گے اور پوچھیں گے:

''بیٹا آپ نے ڈائری لکھنا بند تو نہیں کیا۔''

سارترے وغیرہ نے زندگی پر از سر نو غور کرنے پر مجبور کیا۔

سوال : آپ کو کن افسانوں سے شہرت ملی؟

جواب : ویسے تو 1965 سے میں بچوں کے لیے لکھنے لگا تھا۔ اس زمانے کے بچوں کے رسائل نور (رامپور)، کھلونا (دہلی)، مسرت (پٹنہ) میں بہت شائع ہوا۔ لیکن بعد از اں غیاث احمد گدی، احمد یوسف، مظہر امام، سلطان اختر، ظفر اوگانوی، شمیم فاروقی، ظہیر صدیقی، ارمان نجمی کے یہ احساس دلانے پر کہ یہ چادریں میرے گہرے استغراق اور فکری گہرائیوں کے اظہار کے لیے چھوٹی پڑ رہی ہیں۔ 1970 سے بڑوں کے لیے لکھنا شروع کیا۔ پہلی کہانی ''بکسوں سے دبا آدمی'' کتاب لکھنؤ جیسے معیاری رسالے میں چھپنے اور مدیر عابد سہیل کے ہمت افزائی کرنے کے بعد باضابطہ بڑوں کے لیے لکھنے لگا۔ کلام حیدری نے ''آہنگ'' میں خصوصی گوشہ چھاپا۔ اس زمانے کی دو کہانیوں ''تین مینڈک'' اور ''بانگ'' مجھے اہم افسانہ نگاروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ مہدی جعفر، حامدی کاشمیری، نظام صدیقی اور کئی اہم ناقدین نے میری کہانی ''بانگ'' کو اردو افسانے کا Turning point قرار دیا۔ کیوں

ناقدین نے میری کہانی ''بانگ'' کو اردو افسانے کا Turning point قرار دیا۔ کیوں کہ اس کہانی میں ادبی وفنی گہرائی کے ساتھ ساتھ میں نے بڑے بھائیوں کے ہاتھوں افسانے کے گم کردہ عناصر تجسس واشتیاق اور کہانی پن کی مسماری کے برخلاف بھرپور کہانی پن اور نفسیاتی نظام کی استواری کو بطور خاص اپنے عصری میلان اور عصری تقاضوں کے تحت بروئے کار لانے کی کوشش کی تھی۔ بعد میں مجھے کوبڑ، بھینڑا، ڈھلان پر رکے ہوئے قدم، بلی کا بچہ، گنبد کے کبوتر، مسٹر گلیڈ، شکنجہ، سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ، رانی باغ، جیسی کہانیوں سے مزید شہرت اور مقبولیت ملتی رہی۔ میرے قاریوں کا ایک حلقہ بن گیا۔ ''شوکت حیات فینس ایسوسی ایشن'' جیسی تنظیم کی بنیاد بھی پڑی۔ ایم ٹی خاں، پروفیسر سید شوکت علی، پروفیسر اروند، کامریڈ انیتا اروند، ڈاکٹر مظفر، سید نہال اشرف، جاوید حیات، خورشید حیات وغیرہ اس کے ارکان ہیں۔

''گنبد کے کبوتر'' نے نہ صرف قومی کتھا ایوارڈ سے مجھے سرفراز کیا بلکہ یہ باور بھی کرایا کہ آپ بیتی جب فنی نقطۂ نظر اور تخلیقی موقف کے ساتھ جگ بیتی بنتی ہے تو وہ کہانی اپنے عصر سے زیادہ آفاقی حقیقتوں اور ازلی زندگی کی نامیاتی قوتوں سے متصف ہو جاتی ہے اور عہد بہ عہد زندہ رہنے کی تخلیقی قوت حاصل کر لیتی ہے۔ اس کہانی کے بارے میں مہدی جعفر نے لکھا کہ بابری مسجد پر کچھ اور نہ بھی لکھا جاتا تو اکیلی شوکت حیات کی یہ کہانی اس تاریخی سانحے کے Pathos کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ اب خود میں ''گنبد کے کبوتر'' کو پڑھتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور تعجب ہوتا ہے کہ کیا اتنے تہہ در تہہ علامتی انداز میں زندگی کو اس کے ازلی اور عصری امتیازات کے امتزاج کے ساتھ پیش کرنا ممکن ہے؟ میں نہیں سمجھتا کہ اگر میرا دوسرا جنم ممکن ہو اور مسجد دوبارہ مسمار کی جائے تو میں خود ایسی شاہکار لکھ پاؤں۔ سچ پوچھیے تو اس وقت کے میرے سکتے اور گونگے پن نے مجھے اس کہانی کے ذریعے قوت گویائی دی۔ ''رانی باغ''، ''مثبت''، ''سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ''، ''گھونسلا''، ''کوبڑ'' اور ناولٹ ''سرپٹ گھوڑا'' نے بھی میری شہرت اور اس کی استقامت کو لگاتار بڑھانے میں میری مدد کی۔

سوال : آپ اپنے کرداروں کے سلسلے میں کیا کہیں گے؟

جواب : یوں تو میں مانتا ہوں کہ یہ عہد کردار مرکوز افسانے لکھنے کا نہیں ہے کیوں کہ پوری سچویشن ہمیں Haunk کرتی ہے اور حالات کی سفاکی، ہیبت ناکی اور ہولناکی نے کرداروں کی جگہ لے لی ہے۔ ہر چہرہ کٹا پھٹا اور آدھا ادھورا۔ فی زمانہ کرداروں کی integrity اور ان کا وجود غیر معتبر بن چکے ہیں۔ آج ہمارا معاشرہ ایسی ذلیل ترین سیاسی اور سماجی صورت حال سے دوچار ہے کہ ہمیں قدامت پسندوں اور ترقی پسندوں کے افسانوں کی طرح بھرپور اور مکمل کردار دکھائی نہیں دیتے۔ انسانیت اور انسانی آبادی ادھورے پن اور پیچیدگیوں میں گھر کر رہ گئی ہے۔ ہر کردار اپنے اپنے سچویشن پر Obsession میں گرفتار دکھائی دیتا ہے اور depression سے دوچار ہے۔ چنانچہ بطور خاص میں نے سچویشن سیریز کی کہانیاں لکھیں جہاں آج کے عہد کے Paradox کو Inprovise کرتے ہوئے قاری کے سامنے عصری اور آفاقی تقاضوں کو بروئے کار لانے کا عمل اور منظر نامہ دکھائی دیتا ہے۔

مجھے باضابطہ کرداروں کے گم ہو جانے اور سچویشن کی اسیری میں جکڑے ہوئے انسانوں کے احوال بیان کرنے کے جواز کے پیمانوں نے نہ صرف چھ سچویشن سیریز کے افسانے لکھنے پر مجبور کیا جو شب خون، اظہار، نشانات، تحریک جیسے مقتدر رسائل میں شائع ہوئے بلکہ سچویشن نمبر 6 کے ساتھ ''سچویشن سیریز کیوں؟؟ جیسا مضمون بھی جواز (مالیگاؤں) جیسے اہم رسالے کے خاص نمبر میں شائع کرایا۔ نئے تخلیقی منطقوں کی دریافت و بازیافت کی طرف سچویشن سیریز کی کہانیوں کو عصری عہد کا شناخت نامہ قرار دیا گیا۔

ویسے میں نے رحمت صاحب، منحنی، عبدالسنان، مسز فلیڈ، گنبد کے کبوتر، کے سین دادا، ریزہ اور مسٹر تھامسن جیسے کرداروں کی کئی کردار نگاری بھی ہے، منحنی جیسے کردار میری کئی کہانیوں مثلاً ''موم بتی پر رکھی ہتھیلی''، ''بے گھری''، ''تین مسافر'' میں بار بار در آئے ہیں جو دراصل چارو مجمدار، بھگت سنگھ، اشفاق اللہ خاں اور پیر علی جیسے کرداروں کے استعارے کے طور پر ابھرے ہیں۔ پھر بھی مجموعی طور پر یہ مانتا ہوں کہ یہ عہد کرداروں کا نہیں بلکہ ان کی گمشدگی کا ہے۔ اور ان کو گم کرنے والا آج کا گلوبل بازار واد، استحصالی نظام اور فاشسٹ تحریکیں ہیں

جنھوں نے کردار کے وجود کو مسمار کردیا ہے۔ لہٰذا آج کے کردار حالات کے جبر اور ہولناکیوں میں اپنے دبے کچلے وجود کو کھولتے چلے جارہے ہیں۔ ویسے میرے افسانوں میں طبقاتی افسانوں کے چہروں کے نقوش واضح ہوتے ہیں جنھیں بڑے بھائیوں نے گم کردیا تھا۔

سوال : آپ ہم عصر ناقدوں کے رویے سے مطمئن ہیں یا نہیں؟

جواب : ناقدوں کا کام ہوتا ہے کہ فن کار کی تخلیق کی پرتوں کو کریدیں اور قاری اور فن پارے کے درمیان پل کا کام کریں۔ لیکن آج کے بیش تر ناقدین تحکمانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے ڈنڈے اور چابک گھماتے ہوئے نظر آتے ہیں پھر بھی کچھ ناقدین غنیمت ہیں کہ یہ تخلیقات کی اولیت کے قائل ہیں اور تخلیقات کے اندر سے ان کی جانچ پرکھ کرنے کے لیے خود اس فن کار اور فن پارے کے بطن سے پیدا ہونے والے تاثر کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ زیادہ تر ناقدوں نے فن پارے کے تئیں فتوے صادر کرنے والے کٹر مولوی اور پنڈت کا رویہ اختیار کر رکھا ہے جو مجھے سخت ناپسند ہے۔

سوال : معاصر افسانہ نگار کے ہاں کیا چیز ہے جو آپ کو زیادہ متوجہ کرتی ہے؟

جواب : مجھے ایسے ہی معاصر افسانہ نگار متوجہ کرتے ہیں جو عصریت سے آفاقیت کے امتزاج اور انجذاب کے ساتھ ذات وکائنات، فرد اور سماج کی ہم آہنگی سے زندگی کی ترجمانی کرتے ہوئے اس زندگی کا رشتہ ازلی زندگی کے ساتھ قائم کرتے ہیں — ظاہر ہے ایسے معاصر افسانہ نگار کم ہیں۔

سوال : آج کے افسانے بڑے کردار نہیں دے پا رہے ہیں ایسا کہا جاتا ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب : آج صورت حال یہ ہے کہ ہر آدمی......وقت کی نقاب اوڑھے ہوئے ہے اور اصلی آدمی اور کردار ان نقابوں کے پیچھے گھٹتا ہوا مر رہا ہے بلکہ شاید غائب ہو چکا ہے۔ ادیب زندگی کا ترجمان ہوتا ہے اور زندگی مسلسل بدلتی چلی جارہی ہے۔ خیر وشر کی لڑائی جاری ہے اور خیر کی لڑائی لڑنے والا نام نہاد سیاست داں خود بہت بڑے شر میں تبدیل ہو چکا ہے۔ آپ کو معلوم

ہونا چاہیے کہ انگریز جتنی دولت ہندوستان سے بٹور کر لے گئے اس سے زیادہ دولت ہمارے سیاست دانوں اور سیٹھوں کے غیر ملکی بینکوں میں پڑی ہوئی ہے۔ پریم چند کا اندیشہ صحیح ثابت ہوگیا کہ انگریز چلے جائیں گے لیکن دیسی اور کالے انگریز رہ جائیں گے اور بدیسی انگریزوں سے زیادہ اس ملک کے عوام کا خون نچوڑ دیں گے۔ آپ غور کریں کہ ایسے حالات میں بڑے کردار کیونکر پیدا ہو سکتے ہیں۔

سوال :ادب میں آپ کے یہاں انامیت، نامیاتیت اور امکانیت پسندی پر بڑا زور ہے، ان کے بارے میں کچھ بتائیں گے۔

جواب :جی ہاں ضرور بتاؤں گا۔ جب 1970 میں میرے افسانوں کے شعور کی آنکھیں کھلیں تو اس زمانے میں ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کا زور کم ہو رہا تھا۔ ہمیں ترقی پسند حضرات ترقی پسندی کے لیبل کے ساتھ اور جدید حضرات جدیدیت پسندی کے لیبل سے برانڈ کرنا چاہ رہے تھے۔ 1970 والوں کی اور خود اپنی الگ شناخت قائم کرنے کے لیے میں نے ان دونوں کو مسترد کرنے کا اعلان کیا۔ اپنی اور اپنی نسل کی شناخت کے لیے کوئی مناسب نام نہ سوجھنے پر namelessness جیسی تھیوری کی تجویز پیش کی جسے میری نسل کے تقریباً تمام دوستوں نے پسند کیا۔ یعنی ہمیں نہ ترقی پسند سمجھو، نہ جدید۔ بلکہ ہم ماقبل کے تمام افسانہ نگاروں اور افسانوی تاریخ کو آگے بڑھانے والے وہ ہراول دستے ہیں جو پہلے والوں سے مختلف ہیں۔ اس تعلق سے میں دوبار ''کتاب نما'' (دہلی) کا مہمان اداریہ اور دیگر مضامین لکھ چکا ہوں۔

بعد ازاں مجھے خیال آیا کہ اپنی اور اپنی نسل کی شناخت ہی اہم نہیں بلکہ افسانوں کے استحکام اور ان کی سرمدیت کی اہمیت ہے۔ ہر عہد میں اچھے اور بڑے فن پارے ہوتے ہیں۔ تو گویا بڑے فن پاروں کی شناخت کے لیے میں نے ''انامیت پسندی'' کی تھیوری دی۔ یعنی افسانے میں ''قوت نامیہ'' کو ناگزیر بتایا اور اس پر زور دیا کہ ہر عہد کی وہی کہانی زندہ رہ سکتی ہے جس میں قوت نامیہ کا بنیادی جوہر ہو۔ لہٰذا آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اردو کے پہلے افسانہ نگار علی محمود (جو بہاری تھے) سے لے کر موجودہ زمانے کے تخلیق کاروں نے بعض ایسی عمدہ کہانیاں لکھ دی ہیں جو عہد بہ عہد grow کر رہی ہیں اور انھیں ہر عہد میں relevant بناتی ہیں۔

ابھی کچھ سال قبل سارک رائٹرس کانفرنس میں مجھے مدعو کیا گیا اور اس بات کی آزادی دی گئی کہ میں افسانے کے کسی بھی پہلو پر لکھوں تو میں نے ''امکانیت پسندی'' کی تھیوری پر مبنی مقالہ لکھا جو تمام مندوبین نے پسند کیا۔ پاکستان کے انتظار حسین، رشید امجد اور مرزا حامد بیگ وغیرہ موجود تھے۔ قاضی عبدالستار اور اقبال مجید وغیرہ بھی تھے۔ مرزا حامد بیگ میری تھیوری سن کر اچھل پڑے اور انھوں نے میرا گال چھوتے ہوئے کہا ''یار تم نے کیا بات پیدا کی ہے، ہم لوگوں نے تو اس انداز میں سوچا ہی نہیں تھا''

''امکانیت پسندی'' دراصل حقیقتوں کا سینہ چیرنے اور سچویشن میں مداخلت اور نئی گہری حقیقت برآمد کرنے کا عمل جسے آپ CRUX کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح حقیقت کی ایک نئی دنیا آشکار ہوتی ہے اور پڑھنے والے کے اندر ایک ایسا انکشاف پیدا کرتی ہے جو متبادل اور بہتر نظام حیات کے قیام کے لیے مثبت انداز میں سوچنے پر مجبور ہوتا ہے۔

Probabilities کی دنیا دراصل ہمارے تخلیقی افسانے کا نقطۂ عروج ہے جس کے معیار پر پورا اترنا آسان نہیں۔ اس کے لیے گہرے فکری وفنی شعور وادراک، گہرے استغراق اور اپنے حالات ضم ہوجانے کا عمل ناگزیر ہے۔ اتنا بڑا جوکھم آج کے بیش تر افسانہ نگار مول لینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

آج زیادہ تر لوگ status coast ہیں اور کچھ سوچے سمجھے بغیر کہ افسانے کی روایت کے تسلسل میں اسے کہاں پر stand کرنا چاہیے۔ بس اندھادھند لکھے جارہے ہیں۔ میں اندھادھند لکھے جانے سے شروع سے احتراز کرتا رہا ہوں۔

سوال : آپ نئی نسل کو کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟

جواب : نئی نسل ہے کہاں۔ ہم ہی لوگ تو نئی نسل ہیں۔ 70 اور 80 کے بعد کے لکھنے والے بھی تو اس نئی صدی میں لکھ رہے ہیں۔ دو سال پہلے الٰہ آباد میں امرکانت نے سجاد ظہیر کانفرنس میں کہا تھا کہ ہندی ادب میں نیا خون نہیں آرہا ہے۔ وہی حال اردو کا ہے۔ میں خود کو اور آنے والی نسل کو (جس کی شبیہہ ابھی غیر واضح ہے) اور اپنے دوستوں کو پیغام دینا چاہتا ہوں کہ ہمیں اسٹیبلشمنٹ کے خلاف ہونا چاہیے تبھی ہم افسانہ نگار کے حقیقی منصب سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔

سوال : مستقبل میں کیاارادے ہیں؟

جواب : ویسے تو میں پچھلے ڈیڑھ سال سے بیمار ہوں۔ پٹنہ کے بعض ڈاکٹروں نے مجھے جواب بھی دے دیا ہے۔ دہلی علاج کی غرض سے آیا ہوا ہوں۔ اگر جانبر ہو گیا تو میں ایک نئی ادبی اور نئی افسانوی تھیوری پر کام کر رہا ہوں۔ کئی طویل افسانے اور تین ناولٹ لکھے ہوئے ہیں جنھیں صیقل کرنا ہے۔ ان کی اشاعت میری پہلی ترجیح ہوگی۔ پھر اگر میرے مالی حالات درست ہو گئے (ہم لوگوں کے ڈیپارٹمنٹ کا کیس سپریم کورٹ میں چل رہا ہے۔ جیت گئے تو بقایاجات کی ادائیگی ہوگی) تو دوسری ترجیح ہوگی کہ ایک رسالہ نکالوں ''نیاراوی'' جو سہیل عظیم آبادی کی یاد میں شائع کیا جائے گا۔ وہ ''راوی'' نکالتے تھے جو خالصتاً افسانوں کا رسالہ تھا۔ او ربھی کئی منصوبے ہیں۔ لیکن ذرا میں مرنے سے تو بچ جاؤں، صحت مند تو ہو جاؤں۔

سوال : ''اردو دنیا'' کی اشاعت سے اردو زبان وادب کو کس حد تک فروغ حاصل ہوا ہے؟

جواب : ''اردو دنیا'' میرا محبوب رسالہ ہے۔ صرف دس روپئے میں جس طرح اردو کے تخلیقی ادب اور زبان کے مسائل اور حالات کی عکاسی یہ رسالہ کر رہا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ حل تلاش کرنے کی کوششیں بھی کر رہا ہے۔ لسانی مسائل، مختلف ریاستوں میں اردو کی صورت حال، نوجوانوں کے کیریئر سے متعلق مضامین، ادیبوں سے ملاقات اور انٹرویو، ادبی خبرنامہ، کتابوں پر تبصرے گویا یہ ایک ایسا رسالہ ہے جو ہر طرح سے ادب، زبان اور تخلیقیت کی بحالی اور مضبوطی کے لیے کوشاں ہے۔ جو ادارہ اسے نکال رہا ہے یعنی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان وہ بھی ہمارے کلاسیکی ادب کی اشاعت کم قیمت کی کتابوں کو چھاپ کر کر رہا ہے وہ بڑی بات ہے۔

ملاقاتی : آپ کا بہت بہت شکریہ کہ بیمار ہونے کے باوجود آپ نے اتنا وقت دیا۔

شوکت حیات : آپ کا بھی شکریہ کہ بیماری کے obsession میں گم ہوتے ہوئے شوکت حیات کو آپ نے یاد رکھا اور اس کی عیادت کے لیے آئے۔ جس کے بہانے مجھے اپنے دل کی بہت ساری باتیں آپ سامنے کہنے کا موقع مل گیا۔

●●●

عبدالصمد سے گفتگو (۱)

اردو فکشن کی دنیا میں عبدالصمد ایک معتبر نام ہے، جنھوں نے ہندو پاک کی تقسیم اور قیام بنگلہ دیش کے اثرات، قسم کے نتیجے میں ہونے والے فسادات، ہندو پاک تعلقات کی کشیدگی، سیاسی پراگندگی، مصلحت کوشی، بدعنوانی، اخوت، استحصال، تعلیم کے زوال اور اقدار کے انہدام کا منظرنامہ اپنے ناولوں وافسانوں میں بڑی فنکاری سے پیش کیا ہے۔
اب تک ان کے چار ناول (دوگز زمین، خوابوں کا سویرا، مہاتما، مہا ساگر) اور افسانوں کے چار مجموعے (بارہ رنگوں والا کمرہ، پس دیوار، سیاہ کاغذ کی دھجیاں، میوزیکل چیئر) شائع ہو چکے ہیں۔ دوگز زمین کو 1990 میں ساہتیہ اکادمی انعام سے نوازا جا چکا ہے اور ''خوابوں کا سویرا'' انگریزی زبان میں میک ملین کے ذریعے شائع ہو کر انگریزی ادیبوں ونقادوں سے بھی داد وتحسین حاصل کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ 1998 میں انھیں بھارتیہ بھاشا پریشد کے ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا گیا۔ پیش خدمت ہے یہاں جناب عبدالصمد سے طویل گفتگو کا خلاصہ۔

سوال: ادب اور زندگی کا رشتہ چولی دامن کا ہے۔ اس نہج سے زندگی کو سمجھنے میں افسانہ کیا رول ادا کر سکتا ہے، بالخصوص آپ کے افسانے تفہیم حیات میں کتنی مدد کرتے ہیں؟

جواب: افسانہ ہو یا ادب کی کوئی دوسری صنف، وہ انسانی مزاج پر اثر انداز ہوتی ہے اور زندگی کو سمجھنے میں ایک اہم کردار ادا کرسکتی ہے، لیکن یہ چیز سارے انسانوں پر لاگو نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے ادب سے فطری مناسبت اور تعلیم وشعور کا ہونا ضروری ہے۔ ادب ہمیشہ ایک مخصوص اور چھوٹے طبقے میں مقبول رہا ہے۔ عوامی ادب نام کی چیز یا تو پیدا نہیں ہوئی یا یہ ایک Myth ہے۔

سوال: آپ کے افسانوں میں جنس اور جنس کی نفسیات موجود ہے۔ ہمارے ہاں منٹو اس حوالے سے ایک اہم نام ہے۔ منٹو اور آپ کے افسانوں میں جو بُعد نمایاں ہے وہ صرف زندگی کے بدلتے رُخ کے باعث ہے یا پھر فنکار کی اپنی شمولیت بھی ایک وجہ ہے۔

جواب: جنس ہماری زندگی کا اہم ترین حصہ ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اس کے ساتھ جو ''گندگی'' کا تصور جڑ گیا ہے وہ ہمیں اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی مہلت نہیں دیتا۔ ضروری نہیں کہ افسانہ نگار کی عملی شمولیت بھی اس کے لکھنے میں شامل ہو۔ بہرکیف جنس یا جنسیات کو اس کے صحیح تناظر میں سوچا جانا چاہیے۔

سوال: ہمارے یہاں ''ادب برائے ادب'' اور ''ادب برائے زندگی'' جیسے نظریات موجود ہیں۔ بطور فکشن نگار آپ کس کو اہمیت دیتے ہیں؟

جواب: میں دونوں کو اہمیت دیتا ہوں لیکن ادب برائے زندگی کی اہمیت مقدم ہے۔

سوال: آپ نے افسانے بھی لکھے ہیں اور ناول بھی۔ اس صارفی سماج میں ناول لکھنا کیا جوکھم مول لینا نہیں ہے؟ ''مباحثہ'' کے حالیہ شمارے میں ناول کی موت کا اعلان بھی کردیا گیا ہے۔ اگر آپ اس خیال سے متفق ہیں تو یہ بتائیے کہ ناول کے قاری کون ہیں۔ اگر یہ کوئی مخصوص طبقہ ہے تو کیا اس کے ذریعے سماج میں کوئی اہم تبدیلی نمایاں ہوسکتی ہے؟ کیا ادب سماج کو بدلنے میں معاون ہے؟

جواب: میں نہیں مانتا کہ ناول یا ادب کی کسی صنف کی موت ہوگئی ہے۔ ''وقتی پڑاؤ'' کو موت کا نام نہیں دیا جاسکتا ہے۔ یہ اعلانات پہلے بھی ہوتے رہے ہیں اور غلط ثابت ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ناول لکھنا خاص طور پر اردو میں جوکھم مول لینے کے برابر ہے۔ نہ صرف لکھنا بلکہ اسے چھاپنا بھی۔ جہاں تک اس کے ذریعے سماجی تبدیلی کا سوال ہے تو اس کا جواب آپ

کے پہلے سوال میں دیا جا چکا ہے۔ لیکن ایک بات یاد رکھیے کہ دنیا کے سارے ادب میں ناول سب سے مستحکم اور معتبر صنف ادب ہے اور اسے ہمیشہ سر آنکھوں پر جگہ دی جاتی ہے۔

سوال: ادب اور سماج کے رشتے کو کم و بیش تمام مفکرین نے قبول کیا ہے۔ آپ بطور افسانہ نگار کیا صرف سماج سے مواد حاصل کرتے ہیں؟ واضح ہو کہ سماج ایک given reality ہے جبکہ فن interpreted reality ہے۔ کسی فن پارے کے ذریعے سماج کو کس طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

جواب: افسانہ نگار فرد اور سماج کے رشتے کی مضبوطی، گہرائی، گیرائی اور دیرپائی پر اپنی وہ نگاہ نہیں رکھتا جو اس کی مخصوص تیسری آنکھ کا خاصہ ہونا چاہیے۔ given reality اور interpreted reality دونوں کو اگر غور سے دیکھا جائے تو، دونوں میں اتنا زیادہ بُعد نہیں ہے، جتنا کہ تصور کیا جاتا ہے۔ یہ دراصل Perception کا معاملہ ہے۔

سوال: ترقی پسندوں نے "ادب برائے سماج" پر اصرار کیا ہے، یہاں تک کہ انھوں نے نعرے بھی لگائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادب پروپیگنڈا بنتا ہوا محسوس ہوا۔ انھیں کے درمیان منٹو بھی افسانہ لکھ رہے تھے، جن کے یہاں ایک مخصوص سماج اور اس کے تئیں ہمدردی ہے۔ آپ اپنے کو ترقی پسندوں سے جوڑتے ہیں یا اس سلسلے میں آپ کا کوئی دوسرا موقف ہے؟

جواب: ادب، فرد اور سماج ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ انھیں الگ الگ خانوں میں بانٹ کر نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس زمانے میں صرف منٹو ہی نہیں، کرشن چندر، بیدی، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، غلام عباس، اپندر ناتھ اشک اور ان جیسے دوسرے بہت سے فنکاروں نے بہترین افسانے لکھے جو ہمارے ادب عالیہ میں شمار کیے جا سکتے ہیں اور کلاسک کا درجہ رکھتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو کسی سے نہیں جوڑتا ہوں۔ میں جو کچھ محسوس کرتا ہوں وہ لکھتا ہوں۔

سوال: کسی فن پارے، سماجیاتی مطالعہ کرتے ہوئے کیا یہ ضروری ہے کہ فنکار کی زندگی کا بھی مطالعہ کیا جائے۔ چونکہ فنکار کہیں نہ کہیں اپنے فن میں شریک ہوتا ہے۔ آپ کے جو افسانے ہیں ان میں کیا صرف آپ کا "سماجی شعور" ہے یا آپ کی زندگی کا نجی تجربہ بھی؟

جواب: کوئی ضروری نہیں۔ فنکار بھی سماج ہی کا ایک حصہ ہوتا ہے اس لیے وہ لازمی طور پر اپنے فن

میں شریک ہوتا ہے۔ تجربہ اور سماجی شعور دونوں افسانہ لکھنے کے لیے لازم ہیں۔

سوال: آپ کے خیال میں جینوئن ادب کیا ہے؟

جواب: جس میں بے ساختگی سے آپ کی اور آپ کے سماج کی تصویر نظر آئے۔

سوال: موجودہ عہد میں ادب ہماری کس ضرورت کو پورا کرتا ہے؟

جواب: جمالیاتی حس کو، جس کی آج سے پہلے کسی عہد میں اتنی اہمیت نہیں تھی۔

سوال: آپ سیاسیات کے استاد ہیں اور ایک اہم فکشن نگار بھی۔ آپ یہ بتائیے کہ بطور ایک فن کار اس علم سے کتنا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

جواب: میں سیاسیات کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ اور میں نے اس علم سے اپنے لکھنے پڑھنے میں بہت استفادہ کیا ہے۔

سوال: آپ اپنے فن پاروں کو پیش کرتے ہوئے حقیقت نگاری کا کس طور پر خیال رکھتے ہیں، کیا حقیقت نگاری بالکل حقیقت کی طرح ممکن ہے؟

جواب: صحافت اور ادب میں یہی فرق ہے کہ صحافت میں سماج پر سیدھی نگاہ ڈالی جاتی ہے جبکہ ادب اس کو اپنی مخصوص نگاہ سے دیکھتا ہے، پرکھتا ہے اور تولتا ہے۔

سوال: فکشن تنقید کی جو صورت حال ہے، آپ اس میں کسی تبدیلی کے خواہاں ہیں؟

جواب: فکشن کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ تنقید نگار اس کا باریکی اور باقاعدگی سے مطالعہ نہیں کرتے اور زیادہ تر سنی سنائی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں۔ اگر تنقید نگار فکشن کا ویسا مطالعہ کریں جو اس کا حق ہے تو یقیناً فکشن کی تنقید کی موجودہ صورت حال میں تبدیلی آئے گی۔

سوال: کوئی ایسی بات یا تجربہ بتائیے جس کی روشنی میں آپ کے تخلیقی عمل کو بہتر طور پر سمجھا جا سکے۔

جواب: میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ناول ہو یا افسانہ میری تحریروں کو سیدھا سادہ بیانیہ نہ سمجھا جائے بلکہ بین السطور جو کچھ کہنے کی کوشش کی ہے، اسے تلاش کرنے کی سعی کی جائے۔

سوال: آپ نے جدیدیت کے زیر اثر افسانہ لکھا ہے ایسا ہمارے نقادوں کا خیال ہے اور مابعد جدیدیت والے بھی آپ کو اپنی صنف میں رکھتے ہیں۔ جدیدیت نے فرد کو اہمیت دی تھی،

اور اس معاملے میں مابعد جدیدیت والے ترقی پسندوں کے تقریباً ساتھ ہیں، کیا یہ فن کے ارتقائی مدارج ہیں یا بطور فنکار آپ کبھی فرد کو اہمیت دیتے ہیں اور کبھی سماج کو؟

جواب: میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میرے سامنے فرد اور سماج نیز ان کے درمیان اٹوٹ رشتے کی بہت اہمیت ہے، اب یہ رشتہ ترقی پسندوں کو پسند آتا ہے، جدیدیوں کو آتا ہے یا مابعد جدیدیوں کو، اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا، یا میرے افسانے کو کون کس خانے میں رکھتا ہے، اس سے میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

سوال: اگر افسانہ یا کوئی فن پارہ کسی خاص سماج کی پیداوار ہے (قصیدہ ایک خاص سماج کی پیداوار تھی) تو کیا وہ آفاقی ہوسکتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو وہ کون سے عوامل ہیں جو کسی فن پارے کو آفاقی بناتے ہیں؟

جواب: افسانہ آفاقی ہوسکتا ہے اور ہوا ہے۔ اس کے یا کسی بھی صنف ادب کے آفاقی ہونے کی بس ایک شرط ہے......فن......اعلیٰ فن۔

سوال: زندگی کو پیش کرتے ہوئے افسانہ لکھنا آسان ہے یا ناول یہ سوال اس لیے بھی کر رہا ہوں کہ ہمارے یہاں اکثر فکشن نگاروں کو بطور افسانہ نگار یاد رکھا گیا ہے۔ ایسا تو نہیں کہ ناول کسی مخصوص تاریخی سائیکی کو نمایاں کرتا ہے اور افسانہ عصری حسیت کو؟

جواب: میں تو افسانے بھی لکھتا ہوں اور ناول بھی اور دونوں مجھے آسان نہیں معلوم ہوتے، بلکہ افسانہ لکھنا زیادہ مشکل ہے کیوں کہ اس عمل میں دریا کو کوزے میں بھرنا پڑتا ہے۔ ناول لکھنے کے لیے دیر طلب غور و فکر، وقت کی فراوانی، مکمل یک سوئی اور بے حد صبر کی ضرورت ہوتی ہے، ورنہ ناول لکھنے میں وہ آزادی بھی رہتی ہے جو افسانے میں نہیں رہتی۔ اس میں شک نہیں کہ ناول اپنے وقت کا بہت بڑا تحریری Document ہوتا ہے اور اس کا دائرہ بہت بڑے وقت کو اپنے احاطے میں لیتا ہے، افسانے کو یہ امتیاز حاصل نہیں، مگر کچھ افسانے ناول سے بھی زیادہ دیرپا ثابت ہوتے ہیں مثلاً منٹو کے افسانے۔

سوال: ہمارے افسانوں میں عورتوں کی سائیکی زیادہ ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ جب کہ مرد بھی مسائل سے گھرا ہوا ہے؟

جواب: میں ایسا نہیں سمجھتا۔ مردوں کی نفسیات پر بھی بہت لکھا گیا ہے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ عورتوں کی نفسیات مردوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ فکشن لکھنے والوں کو وہاں زیادہ مواد ملتا ہے اور یہ گویا ان کے لیے ایک چیلنج ہے۔

سوال: آپ اپنے آنے والے ناول کا نام بتایئے اور اس کے تخلیقی محرکات پر روشنی ڈالیے؟

جواب: ناول تو میرے دو دو مکمل ہیں مگر میں نے ابھی ان کے نام طے نہیں کیے اور ان کے تخلیقی محرکات پر ابھی کچھ کہنا مناسب نہیں ہے۔

سوال: بطور افسانہ نگار آپ اردو کے کس افسانہ نگار کو اپنا ہیرو سمجھتے ہیں؟

جواب: کسی ایک کو نہیں۔ ویسے میں راجندر سنگھ بیدی اور قرۃ العین حیدر سے بہت متاثر ہوں۔ میں قرۃ العین حیدر کو بحیثیت افسانہ نگار بہت عظیم تصور کرتا ہوں، ناول نگار سے بھی زیادہ۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ افسانے میں ان کی پوری شخصیت سمٹ آتی ہے، جب کہ ان کے ناولوں میں یہ بات مجھے محسوس نہیں ہوتی۔ راجندر سنگھ بیدی جتنے سیدھے سادے نظر آتے ہیں، اپنے بین السطور میں اتنے ہی پیچیدہ اور دل چسپ۔ وہ کوزے میں دریا کو بھرنے کا فن جانتے ہیں۔ اور اس معاملے میں ان کا کوئی ہم عصر ان کے قریب نہیں پہنچتا۔

سوال: آج کے سماج کی سب سے بڑی سائیکی کیا ہے؟ اور بطور فنکار اس سائیکی نے آپ کے ذہن پر کتنا اثر ڈالا۔

جواب: کوئی ایک نہیں ہے۔ مجھے Contradiction سب سے زیادہ Hit کرتا ہے۔ اس کے علاوہ میں سوشل سائنس کا طالب علم ہوں، اس لیے سیاسی اور سماجی عوامل میرے ذہن پر زیادہ اثر ڈالتے ہیں اور بھی بہت سے محرکات ہیں۔

سوال: ہماری زندگی کا کون سا رخ ہے جس کو آپ نے اب تک اپنے افسانوں میں پیش نہیں کیا ہے؟

جواب: زندگی کے بے شمار رخ ہیں جو ابھی تک فنکاروں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ میں فکشن کی دنیا میں اپنے آپ کو طفلِ مکتب سمجھتا ہوں اور مجھے ہمیشہ اس کا احساس رہا ہے کہ جو مجھے لکھنا چاہیے وہ میں نے ابھی تک نہیں لکھا۔

•••

عبدالصمد سے گفتگو (II)

سوال: آپ نے وسیلۂ اظہار کے طور پر فکشن کا ہی انتخاب کیوں کیا؟

جواب: اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ اس کے علاوہ اور کوئی وسیلۂ اظہار میرے پاس ہے ہی نہیں یا یوں کہیے کہ اور کسی وسیلۂ اظہار کا میں اہل ہی نہیں ہوں۔ جرنلزم کی طرف مائل تھا اور اب بھی کسی حد تک ہوں لیکن طبیعت سو فی صد اس طرف مائل نہیں ہوتی۔ شاعری اپنے بس کی چیز ہے نہیں تو پھر فکشن ہی ایک وسیلہ رہ جاتا ہے۔

سوال: آپ کن افسانہ نگاروں یا ناول نگاروں سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں؟

جواب: پریم چند سے کیوں کہ ان کے نام کے بغیر اردو فکشن کی بسم اللہ ممکن ہی نہیں، مگر یہ کوئی ضروری نہیں کہ آدمی جس فنکار سے متاثر ہو اس کے اسلوب کو اپنانے کی کوشش بھی کرے۔ ویسے میں راجندر سنگھ بیدی، منٹو، احمد ندیم قاسمی، غلام عباس اور قرۃ العین حیدر کو اردو افسانے کا ستون مانتا ہوں۔ آپ کو شاید یہ سن کر حیرت ہو کہ میں عینی صاحبہ کو ناول نگار سے زیادہ افسانہ نگار تسلیم کرتا ہوں۔ یوں ناول نگاری میں ان کا مقام کم بلند نہیں۔ بلاشبہ وہ اس وقت اردو کی سب سے بڑی ناول نگار ہیں۔ خدیجہ مستور کا

''آنگن'' مجھے بہت پسند ہے اور مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں کہ ''آنگن'' ہی ''دو گز زمین'' کی تخلیق کا محرک بنا ہے۔ کرشن چندر بھی میری نظر میں ایک بڑے ناول نگار ہیں۔

سوال: تقسیم ہند اور قیام بنگلہ دیش کو بہت سے لوگوں نے اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ مگر آپ نے بالکل مختلف انداز میں اس سانحے کے جائزہ لیا اور بہار کی مخصوص تہذیبی فضا کے پس منظر میں اس کی Irony کو بالکل الگ ڈھنگ سے پیش کیا۔ یہ کیسے ممکن ہو سکا؟

جواب: مجھے شروع سے اس کا احساس تھا کہ تقسیم کے المیے کا اردو فکشن میں وہ اظہار نہیں ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ میری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ تقسیم کے المیے سے سب سے زیادہ بہار اور یوپی کے مسلمان متاثر ہوئے اور بنگلہ دیش کے قیام سے تو بہار ہی کے مسلمان سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ خدیجہ مستور صاحبہ نے بلاشبہ ایک بڑا ناول لکھا لیکن انھوں نے پاکستان میں بیٹھ کر یہ ناول لکھا، اس سے نقصان یہ ہوا کہ بعض اہم حقائق کی طرف ان کی نگاہیں نہیں گئیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرا گھر خود متضاد سیاسی تحریکات کا اڈا رہا۔ میں نے بہت قریب سے ان چیزوں کا مشاہدہ کیا۔ ''دو گز زمین'' لکھنے کا آئیڈیا بچپن ہی سے میرے ذہن میں پل رہا تھا، اس وقت سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیسے لکھ سکوں گا۔

سوال: ''خوابوں کا سویرا'' کو ''دو گز زمین'' کی توسیع کہا جاتا ہے۔ ''دو گز زمین'' میں ''کوئے یار میں زمین پانے کی حسرت'' اور ''خوابوں کا سویرا'' میں ''ہند و پاک کی مشترکہ تہذیب کی واپسی'' کے خواب کو Nativity قرار دیتے ہوئے انھیں مابعد جدید ناولوں کے زمرے میں رکھا گیا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: میرے ناولوں کو کس زمرے میں رکھا گیا ہے یا رکھا جا رہا ہے اس کے بارے میں، میں کیا بتا سکتا ہوں۔ یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن یہ بات صحیح ہے کہ میرے تینوں ناول دو گز زمین، خوابوں کا سویرا اور مہاساگر ایک ہی زمین کی تین کہانیاں ہیں مگر ایک کو دوسرے کی توسیع کہنا صحیح نہیں ہوگا۔ ان کہانیوں کے موضوعات الگ الگ ہیں البتہ ان کی زمین ایک ہے۔

سوال: افسانے میں کہانی پن اور بیانیہ کی واپسی کو مابعد جدید تحریک سے جوڑا جا رہا ہے جبکہ یہی چیزیں ترقی پسند تحریک کا حصہ بھی رہی ہیں۔ اس لحاظ سے پرانی بوتل پر نیا لیبل لگانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

جواب: دیکھیے پرانے بیانیے اور نئے بیانیے میں بہت فرق ہے اس لیے پرانی بوتل پر نیا لیبل لگانے جیسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم روایت سے روگردانی نہیں کر سکتے، ہمیں پریم چند بھی عزیز ہیں۔ منٹو، بیدی، کرشن چندر بھی اور آج کے نئے افسانہ نگار بھی، جنھوں نے کہانی کو بڑے جتن سے کہانی کے محور پر واپس لایا ہے اور بیانیہ کے نئے امکانات تلاش کیے ہیں۔

سوال: آج کے افسانوں اور ناولوں میں کردار نگاری پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی۔ اس لیے کوئی ایسا کردار ابھر کر نہیں آسکا جو خوجی، امراؤ جان ادا، ہوری، شمن، عالیہ، گوتم نیلمبر، ٹوبہ ٹیک سنگھ، موذیل، سوگندھی اور کالو بھنگی کی طرح لازوال ہو جائے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: وجہ یہ ہے کہ آج کردار سازی سے زیادہ ماجرا سازی پر زور ہے۔ آج واقعات کے افسانے لکھے جا رہے ہیں، آج کا افسانہ پس منظر اور پیش منظر کا افسانہ ہے جس میں کردار کو مرکزی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ پھر بھی ایسا نہیں ہے کہ اچھے کردار تخلیق نہیں ہو رہے۔

سوال: 1970 کے بعد بیشتر ناولوں میں ماضی کی طرف مراجعت زیادہ ملتی ہے۔ قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، قاضی عبدالستار، خدیجہ مستور، جیلانی بانو، حسین الحق وغیرہ اور خود آپ کے یہاں ماضی کی طرف مراجعت ملتی ہے۔ آخر یہ ماضی پرستی کیوں؟

جواب: ماضی ہمارا بہت بڑا خزانہ ہے۔ اس کی طرف توجہ کرنا ماضی کی طرف مراجعت نہیں ہے۔ ماضی سے کٹ کر نہ ہمارا مستقبل ہے نہ حال۔ اس لیے یہ بات ذہن نشیں کر لیجیے کہ آج جو بھی تخلیق ہو رہی ہے وہ ماضی پرستی نہیں ہے۔ آج کا ناول آج کا ناول ہے اور ہمارا آج ماضی سے کٹا ہوا نہیں ہے، نہ ہو سکتا ہے۔

سوال: موجودہ فکشن میں کوئی نظریہ حاوی نہیں ہے جبکہ شاعری جیسی مقبول صنف میں جدیدیت، ترقی پسندی اور مابعد جدیدیت کے نظریات غالب ہیں۔ ایسا کیوں؟ کیا آپ کسی نظریے سے متاثر ہیں؟

جواب: میں اسے موجودہ فکشن کی ایک اہم خصوصیت مانتا ہوں۔ ویسے آپ خود کہہ رہے ہیں کہ بعض ناولوں پر مابعد جدیدیت کا لیبل لگایا جارہا ہے بعض پر ترقی پسندی کا۔

سوال: آج کل بازار میں نیم ادب، جاسوسی اور سستے رومانی ناولوں اور ڈائجسٹوں کی فروخت زیادہ ہورہی ہے جس سے قاری کے معیار اور پستی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟ سطحی ناولوں کی مقبولیت میں اضافہ کیوں ہورہا ہے؟

جواب: یہ تو دنیا کے ہر ادب میں ہوتا ہے۔ عام پڑھنے والا ریل گاڑیوں میں اور فرصت کے اوقات میں ایسی ہی چیزیں پڑھنا چاہتا ہے جس سے اس کے ذہن و دماغ پر زیادہ زور نہ صرف کرنا پڑے اور اُس کا وقت آسانی سے کٹ جائے۔ خالص ادب کے قاری ہر زمانے میں اور ہر زبان میں کم ہوتے ہیں۔ خالص ادب بھیڑ بھاڑ کی چیز ہی نہیں۔

سوال: ''دوگز زمین'' جتنی سنجیدگی سے لکھا ہوا ناول ہے خوابوں کا سویرا، مہاتما اور مہاساگر تک پہنچتے پہنچتے اس میں بتدریج کمی آگئی ہے۔ ادب کی دنیا میں ان پر مختلف زاویوں سے تبصرے بھی کیے گئے ہیں۔ آپ اس سے کس حد تک اتفاق کرتے ہیں؟

جواب: میں ایسا نہیں سمجھتا۔ اور جو بھی اچھے برے تبصرے آئے ہیں ان پر میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ تبصرہ چاہے اچھا ہو یا برا، تبصرہ تبصرہ ہے۔ میں تمام تبصروں کا دل سے خیر مقدم کرتا ہوں۔ آپ کو میں بتا دوں کہ میں کبھی بھی منفی تبصرے مجھے بہت کچھ سوچنے کا موقع دیتے ہیں اور میں پھر نئے سرے سے اپنا محاسبہ کرتا ہوں۔ یقین مانیے مجھے اس قسم کے تبصروں سے ہمیشہ فائدہ پہنچا ہے۔

سوال: کوئی افسانہ یا ناول مکمل کرنے کے بعد آپ کیسا محسوس کرتے ہیں؟

جواب: ظاہر ہے کہ افسانہ یا ناول مکمل کرنے کے بعد ہر لکھنے والا بہت کچھ محسوس کرتا ہے۔ ایک خاص قسم کی سرشاری طاری رہتی ہے اور اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک کہ پھر کوئی نئی تخلیق ذہن کو اپنی گرفت میں نہ لے لے۔

سوال: آپ نے اپنے ناولوں، افسانوں کے لیے پریم چند کے سادہ و راست بیانیہ اسلوب کی روایت کو ترجیح دی ہے علامتوں، استعاروں، تمثیلوں اور رمز و کنائے کے استعمال آپ کا یہاں بہت کم ملتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: میں نے اپنے ناولوں اور افسانوں کے لیے وہی اسلوب اختیار کیا جس کا موضوع نے تقاضا کیا۔ میں نے علامتی پیرائے میں بھی لکھا ہے اور آج بھی ضرورت پڑنے پر اس پیرائے کو استعمال کرتا ہوں۔ البتہ ایک بات میں نے محسوس کی کہ ناولوں کے لیے ایک خاص اسلوب اور پیرایہ ضروری ہے جس میں آپ براہ راست اپنے قاری سے مخاطب ہو سکیں۔ بھئی ناول تین چار سو صفحات کے ہوتے ہیں، آپ کو یہ بھی سوچنا ہے کہ آپ جو اتنی محنت کر رہے ہیں وہ اس تک بھی تو پہنچے، جس کے لیے لکھا جا رہا ہے۔

سوال: جب کوئی نقاد آپ کے کسی افسانے یا ناول پر تنقید کرتے ہوئے کمیاں اجاگر کرتا ہے یا نقص نکالتا ہے تو آپ کیسا محسوس کرتے ہیں؟

جواب: مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ یہ خیال آتا ہے کہ کم سے کم اُس نے میری چیز پڑھی تو — پھر کسی تخلیق کے چھپنے کے بعد آپ کو یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ آپ یہ توقع رکھیں کہ آپ کے قاری آپ سے متفق ہوں گے ہی یا سب کو آپ کا لکھا ہوا پسند آئے گا۔ سخت تنقید تخلیق کار کے لیے بہت مفید ہوتی ہے اس لیے اس کا کبھی برا نہیں ماننا چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ اپنی کسی تخلیق کو حرف آخر نہیں سمجھنا چاہیے۔ ہمیشہ یہ خیال رہنا چاہیے کہ ہم نے ابھی اپنا شاہکار تو لکھا ہی نہیں۔ سب سے عمدہ لکھنا تو ابھی باقی ہے۔

سوال: بہار میں اردو دوسری سرکاری زبان ہے پھر بھی اردو کے فروغ کے لیے سرکاری کوششیں صفر کے برابر ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: سرکار نے کچھ اقدامات ضرور کیے ہیں جیسے اردو ڈائرکٹوریٹ وغیرہ کا قیام۔ لیکن بات دراصل یہ ہے کہ اس قسم کے اقدامات کے لیے جو Political will ہوتا ہے اس کا فقدان ہے اس لیے جو کچھ کرنا ہے اردو سماج کو کرنا ہے وہ چاہیں گے تو اردو کبھی نہیں مرے گی۔ ہم اپنی زبان کو زندہ رکھنا چاہیں گے تو ہمیں کون روک سکے گا؟

سوال: قومی اردو کونسل نے اردو داں طبقے کو نئے ابھرتے ہوئے ٹیکنالوجیکل منظرنامے سے جوڑنے کی کوشش کی ہے اور کر رہی ہے۔ اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: بہت مفید کام ہو رہا ہے۔ اردو کونسل نے وقت کی اہمیت کو سمجھا ہے اور سماج کو اس پر لبیک کہنا چاہیے۔

سوال: اردو تعلیم کو بہتر بنانے اور اسے فروغ دینے کی اور کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟

جواب: اپنے بچوں کو بہت سنجیدگی اور توجہ کے ساتھ اردو پڑھانا چاہیے۔ بس یہی ایک واحد نسخہ اس کی بقا کا ہے۔

سوال: فروغ اردو کے لیے قومی اردو کونسل کئی اسکیمیں مثلاً کتاب میلہ، موبائل وین، مصنفین کی مالی امداد اور بلک پرچیز وغیرہ چلا رہی ہے۔ ان کوششوں سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: قومی اردو کونسل کے اقدامات بہت مستحسن ہیں۔ اردو سماج نے ان کا خیر مقدم بھی کیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جو بھی قدم اٹھایا جائے ان پر ضروری نگرانی بھی رکھی جائے۔ قدم اٹھا کے مطمئن ہو جانے سے سیر حاصل نتیجہ نہیں مل پاتا ہے۔

سوال: ''اردو دنیا'' کے قارئین کو آپ کا کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

جواب: اپنی زبان سے محبت کریں، اس کو اپنانے اور اس کا اظہار کرنے میں شرمندگی محسوس نہ کریں۔ اگر ہم زبان کو زندہ رکھنا چاہیں گے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے ختم نہیں کر سکتی۔ حکومت کی طرف بار بار دیکھنے سے بات نہیں بنے گی۔ حکومت جو بھی ہو اس مسئلے یا کسی مسئلے کو سیاسی عینک سے دیکھے گی اور اسی لیے یہ مسئلہ اتنا الجھ گیا ہے۔ اسے سیاست کے چنگل سے نکالیے اور اپنی قوتِ بازو پر بھروسہ کیجیے۔ ہماری زبان اتنی زندہ ہے کہ اسے مارنے کی سازش کامیاب نہیں ہوگی۔ شرط صرف یہ ہے کہ ہم اپنی ذمے داریوں کو سمجھیں، اپنی آنکھیں ہمیشہ کھلی رکھیں۔

•••

سلام بن رزاق سے گفتگو

سلام بن رزاق دور حاضر کے اہم افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں۔ آپ کی پیدائش 15 نومبر 1941 کو ممبئی کے قریب پنویل میں ہوئی۔ آپ نے میٹرک تک کی تعلیم وہیں سے حاصل کی۔ بعد ازاں ممبئی آ گئے اور درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہو گئے۔ آپ 1999 میں اسکول کی ملازمت سے بطور پرنسپل سبک دوش ہوئے۔ اب تک آپ کی سات کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ''ننگی دوپہر کا سپاہی'' (افسانوی مجموعہ 1977)، ''ماہم کی کھاڑی'' (مراٹھی کہانیوں کا اردو ترجمہ 1980)، ''معبّر'' (افسانوی مجموعہ 1987)، ''کام دھینو'' (ہندی 1988)، ''شری پید کرشن کولھاٹکر'' (مونوگراف 1990)، ''عصری ہندی کہانیاں'' (1995) اور ''شکستہ بتوں کے درمیاں'' (افسانوی مجموعہ 2001)۔ سلام بن رزاق کی کہانیوں کا مراٹھی، ہندی، تیلگو اور پنجابی کے علاوہ انگریزی، روسی اور نارویجن میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ آپ نے مختلف ڈراموں، فلموں اور ٹی وی سیریلوں کا اسکرپٹ بھی لکھا ہے۔ آپ کو ساہتیہ اکادمی انعام برائے ترجمہ، مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی انعام (چار بار) اتر پردیش اردو اکادمی انعام (دو بار)، بہار اردو اکادمی انعام (دو بار) اور کتھا انعام مل چکا ہے۔ حال ہی میں افسانوی مجموعہ ''شکستہ بتوں کے درمیاں'' پر ساہتیہ اکادمی انعام دیا گیا ہے۔

سوال: اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتایئے؟

جواب: میں ممبئی سے چند کوس کے فاصلے پر واقع پنویل میں پیدا ہوا، وہیں پلا بڑھا۔ ساتویں تک میں نے اردو میڈیم میں تعلیم حاصل کی لیکن ہمارے علاقے میں کسی ہائی اسکول میں اردو ذریعۂ تعلیم کا انتظام نہ ہونے کے باعث مجھے آٹھویں سے مڈل تک مراٹھی میڈیم میں تعلیم حاصل کرنی پڑی۔ ذریعۂ تعلیم تبدیل ہونے سے پریشانی ہوئی لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اردو کے ساتھ ساتھ مراٹھی سے بھی شغف پیدا ہو گیا۔

سوال: آپ افسانہ نگاری کی طرف کیسے مائل ہوئے؟

جواب: اگر چہ لکھنا ایک شعوری عمل ہے مگر لکھنے کی خواہش ادیب کے لاشعور کی گہرائیوں میں پروان چڑھتی رہتی ہے اور مناسب وقت پر الفاظ کا جامہ پہن کر صفحۂ قرطاس پر نمودار ہوتی ہے۔ کئی بار ہمیں خود پتہ نہیں چلتا کہ ہم نے کب اور کیسے لکھنا شروع کیا۔ مجھے بچپن کا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ میں ابھی چھوٹا تھا تیرنا نہیں جانتا تھا مگر تالاب کے کنارے بیٹھ کر دوسرے بچوں کو تیرتے ہوئے دیکھنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ ایک دن اچانک کسی نے پیچھے سے ڈھکا دے دیا۔ میں پانی میں گر کر غوطے کھانے لگا مگر ڈوبنے سے بچنے کے لیے غیر ارادی طور پر ہاتھ پاؤں بھی چلاتا رہا۔ بالآخر کسی طرح کنارے آیا، مگر اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ مجھ میں حیرت انگیز طور پر تبدیلی آ گئی ہے۔ میرے دل سے گہرے پانی کا خوف جاتا رہا اور میں بھی رفتہ رفتہ دوسرے بچوں کے ساتھ تیرنے لگا۔ میری افسانہ نگاری کا آغاز بھی اسی طرح ہوا۔ بچپن میں میری ماں ''نور نامہ'' اور اسی طرح کی دیگر کتابیں پڑھتی تھیں۔ اس طرح مجھے بھی کہانیاں پڑھنے کا شوق ہوا۔ داستانِ امیر حمزہ، الف لیلیٰ، طوطا مینا، حاتم طائی، باغ و بہار وغیرہ داستانیں صادق سردھنوی، عبدالحلیم شرر اور نسیم حجازی کے تاریخی ناول، ابن صفی کے جاسوسی ناول اور جانے کیا کیا پڑھتا رہا۔۔۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ پڑھتے پڑھتے کب لکھنا شروع کر دیا۔ میری پہلی تحریر وی ایس کھانڈیکر کی مراٹھی کہانی ''آئی'' (ماں) کا ترجمہ تھی جو روزنامہ ''انقلاب'' میں چھپی۔ ''رین کوٹ'' میری پہلی کہانی تھی جو ماہنامہ ''شاعر'' ممبئی میں شائع ہوئی۔ بعد

میں پانچ چھ سال تک میں نے کوئی کہانی نہیں لکھی، 1969 سے پھر لکھنا شروع کیا۔

سوال: آپ نے جس دور میں لکھنا شروع کیا اس وقت ادبی فضا کیسی تھی؟

جواب: اس زمانے میں پنویل، جہاں میرا بچپن گزرا وہاں تو کوئی خاص ادبی فضا نہ تھی لیکن ممبئی میں صابو صدیق کے مشاعرے میں لوگ ٹرکوں میں بھر کر جاتے تھے۔ ساحر اور مجروح میرے پسندیدہ شاعر تھے اور کرشن چندر اور منٹو پسندیدہ افسانہ نگار۔ کرشن چندر کا رومانوی انداز بے حد اپیل کرتا تھا۔ Mature ہونے کے بعد منٹو میرے آئیڈیل افسانہ نگار بن گئے۔

سوال: منٹو کی کس خصوصیت نے آپ کو زیادہ متاثر کیا؟

جواب: منٹو کی نگاہ بے حد تیز تھی، اس کی نظر سماج کے ان گوشوں پر جاتی تھی جہاں کسی کی نظر نہیں جاتی تھی۔ وہ انسانی نفسیات کے باطن میں اتر کر اس کی پرتیں کھولتا ہے۔ وہ سماج کے ان افراد پر قلم اٹھاتا ہے جنھیں عام طور سے نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ طوائفیں، دلال اور جرائم پیشہ افراد اس کے افسانوں کے کردار بنتے ہیں اور اپنے باطن میں چھپی انسانیت سے معاشرے کے نام نہاد شرفا کو اپنے گریبان میں جھانکنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ پھگو بھنگی، موذیل، ٹوبہ ٹیک سنگھ، سلطانہ، ممد بھائی اور منگو کوچوان جیسے لازوال کرداروں کی تخلیق صرف منٹو ہی کر سکتا تھا۔

سوال: افسانے اور ناول کی کردار نگاری میں کیا فرق ہے؟

جواب: افسانوں کی کردار سازی میں Sharpness کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں چند سطروں میں کردار کی پوری شبیہہ ابھارنی ہوتی ہے جبکہ ناول میں تمام تفصیلات کی گنجائش ہوتی ہے۔

سوال: آپ اپنے افسانوں کے موضوعات کہاں سے لیتے ہیں؟

جواب: میرا تعلق سماج کے نچلے متوسط طبقے سے ہے اور میں اپنے افسانوں کے موضوعات و کردار بھی اسی طبقے سے لیتا ہوں۔ ممبئی آنے کے بعد میں چالی والے محلے میں رہا اور مضافات کے کرداروں سے روبرو ہوا۔ ''انجام کار''، ''ہدف''، ''بنارسی ساڑی'' وغیرہ کہانیاں اسی ماحول میں لکھی گئیں۔ یہ سماج کے دبے کچلے اور پسماندہ لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ یہ وہ لوگ

ہیں جو روز ٹوٹتے ہیں، بکھرتے ہیں مگر دوسری صبح اپنے بستر سے صحیح وسالم اٹھتے ہیں، زندگی سے جدوجہد کرنے کے لیے۔ یہ روز شکست کھاتے ہیں مگر زندگی جینے کا حوصلہ نہیں ہارتے۔ یہ وہ بدنصیب لوگ ہیں جنھیں حالات نے اپنے چکرویو میں جکڑ رکھا ہے۔ وہ اس سے نجات پانا چاہتے ہیں مگر ابھیمنیو کی طرح اس کو توڑ کر اس سے باہر نکلنے کا منتر نہیں جانتے۔ میں حالات کے چکرویو میں پھنسے انھی بیمار، تھکے ہارے، کمزور اور مظلوم لوگوں کا افسانہ نگار ہوں۔ ان کا دکھ درد، ان کی یاس و محرومی اور ان کا اضطراب و انتشار ہی میرے افسانوں کا محرک و موضوع ہے۔ میرے لیے معاشرے میں رونما ہونے والا ہر واقعہ ایک کہانی ہے اور ہر فرد ایک کردار۔

سوال: آپ کے کرداروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مفاہمت پسند ہیں۔ اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ آپ خود ناامیدی کا شکار ہو گئے ہیں۔ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ سماج میں اب کوئی تبدیلی نہیں آنے والی اور طاقتوں کے ذریعے کمزور کا استحصال ہوتا رہے گا؟

جواب: بعض افسانوں کے ساتھ ایک متھ (Myth) جڑ جاتا ہے۔ میرے افسانوں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا اور کہا گیا کہ میرے کردار مفاہمت پسند ہیں، لیکن ایسا نہیں ہے۔ وہ کردار زندہ ہیں اور زندہ رہنے کے لیے مفاہمت ضروری ہے۔ میرے معاشرے میں کوئی باغی نہیں ہے اس لیے میں باغیوں کی کہانیاں نہیں لکھتا۔ آج ساری قدریں مٹ رہی ہیں۔ مذہب، ذات، قوم اور علاقے کے نام پر لوگوں کو اس طرح تقسیم کر دیا گیا ہے کہ پورے سماج کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ میرے کردار اسی پارہ پارہ معاشرے کے افراد ہیں اور اس گھناؤنے معاشرے میں جینے اور مرنے پر مجبور ہیں۔ انھیں غصہ آتا ہے، وہ احتجاج بھی کرتے ہیں مگر ان کا غصہ اور احتجاج اس الاؤ کی مانند ہے جس کی آگ راکھ کے ڈھیر میں تبدیلی ہو چکی ہے۔ میرے کردار جس الاؤ کے گرد بیٹھے ہیں گرچہ اس کی آگ سرد پڑ چکی ہے مگر ان کے لہو میں ایک مدھم چراغ روشن ہے جو ان کے اندر زندگی کی حرارت پیدا کرتا ہے۔ میں اپنے افسانوں کے ذریعے اسی بجھے ہوئے الاؤ سے چنگاریاں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

میں نے اپنے افسانوں میں ماحول اور معاشرے کی گندگی اور جبر و ناانصافی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر لوگوں کو اس ماحول سے نفرت اور اس صورت حال پر غصہ آئے تو کیا میں کامیاب نہیں ہوں؟ لوگ تصور میں انقلاب دیکھتے ہیں، میں خواب کے بجائے حقیقت کو آئینہ دکھاتا ہوں۔ ''انجام کار'' میں جب کہانی کا ہیرو شنکر دادا کے ہوٹل میں جا کر بیٹھتا ہے اور بیرے کو آرڈر دیتا ہے تو شنکر دادا کا ردعمل دیکھنے کی چیز ہے۔ وہ علاقے کا ایک بڑا غنڈہ ہے لیکن اس کے چہرے پر خوف کی لکیر صاف پڑھی جا سکتی ہے۔

سوال: آپ اپنا کوئی افسانہ مکمل کرنے کے بعد کیسا محسوس کرتے ہیں؟

جواب: کہا جاتا ہے کہ سیپی کے سینے میں جب کوئی کنکر گڑ جاتا ہے تو وہ اس کے اندر ٹیس پیدا کرنے لگتا ہے۔ سیپی اس ٹیس کو کم کرنے کے لیے اپنے اندر ایک لعاب پیدا کرتی ہے اور لعاب کو اس پھنسے ہوئے ذرے کے گرد لپیٹتی رہتی ہے۔ کنکر پر لعاب کی تہہ جمتی رہتی ہے اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ لعاب سے مل کر موتی بن جاتا ہے۔ افسانہ لکھنا بھی دراصل اپنے اندر پھنسے کسی خیال کی ٹیس سے نجات پانے کا عمل ہے۔

سوال: اردو میں افسانوی ادب کی تنقید شاعری کے مقابلے کم ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: ہمارے یہاں شاعری کی قدیم اور وقیع روایت رہی ہے اس لیے ناقدین نے شروع سے ہی اس پر توجہ دی۔ شاعری کے مقابلے افسانے کی عمر بہت کم ہے۔ 1960 کے بعد نقادوں نے اس جانب خاصی توجہ دی لیکن افسانے کی تنقید کے لیے بھی شعری تنقید کی اصطلاحات سے ہی کام لیا جا رہا ہے۔ افسانے اور شاعری کی تنقید الگ الگ ہونی چاہیے۔

سوال: موجودہ دور میں ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کی وجہ سے مطالعے میں کمی آئی ہے۔ کیا مستقبل میں ادب کا وجود خطرے میں آ سکتا ہے؟

جواب: پاپولر کلچر، میڈیا اور عالم کاری نے ساری دنیا میں ادب کو حاشیے پر ڈال دیا ہے۔ لفظ کی حرمت کم بھلے ہو جائے، ختم نہیں ہوگی کیونکہ اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ ہمیں چاہیے کہ میڈیا اور کمپیوٹر سے فائدہ ضرور اٹھائیں لیکن انھیں خود پر حاوی نہ ہونے دیں۔ اس کے نقصانات پر بھی نگاہ رکھیں اور اپنی پرانی اقدار، روایات اور ادب سے قطع تعلق نہ کریں۔

سوال: بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں شاعروں اورادیبوں کی ایک نئی نسل منظر عام پر آئی جسے مابعد جدید کا نام دیا گیا۔ مابعد جدید ادب اور جدید ادب میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

جواب: کسی عہد کا نام راتوں رات نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ وقت کے ساتھ ساتھ یادداشت کا حصہ بنتا ہے۔1970 کے بعد جو ادب وجود میں آیا اسے مابعد جدید ادب یا معاصر ادب کا نام دیا جا رہا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کے مثبت عناصر سے کسب فیض کیا۔ ترقی پسند افسانے میں جہاں یک رخا پن اور اشتراکیت کا پروپیگنڈہ حاوی ہو گیا تھا وہیں ترقی پسند مشاہیر کا عامرانہ رویہ بھی نقصان دہ ثابت ہوا۔ جدیدیت کے نام پر ابہام، تجریدیت اور مغرب کی نقالی پر زور دیا جانے لگا، جس کی وجہ سے افسانہ معمہ بن گیا۔ ہماری نسل کے سامنے سوال یہ تھا کہ وہ اپنا راستہ الگ کیسے بنائے چنانچہ مابعد جدید ادب میں ترقی پسند ادب اور جدید ادب کی مثبت اقدار کو شامل کرنے کے ساتھ ساتھ کلاسکی روایت پر بھی نظر رکھی گئی۔ معاصر افسانے میں علامتیں، تہہ داری اور رمز و کنایہ ہیں لیکن ابہام یا یک رخا پن نہیں ہے۔

سوال: موجودہ عہد میں لکھے جانے والے اردو کے افسانوی ادب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: اردو میں بہت اچھے افسانے نہیں لکھے جا رہے ہیں۔ ملک میں اردو کی صورت حال، اسکولوں میں اردو تعلیم کا انتظام نہ ہونا اور گھروں میں اردو کے کم ہوتے چلن کی وجہ سے اردو ادیبوں میں بھی مایوسی کا عنصر نظر آتا ہے۔ اردو کے مقابلے ہندی میں زیادہ اچھے افسانے لکھے جا رہے ہیں۔

سوال: کیا آپ ملک میں اردو کے مستقبل سے مایوس ہیں؟

جواب: میں مایوس نہیں ہوں اور مایوس ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ جب تک زبان کے بولنے اور پڑھنے والے کسی نہ کسی علاقے میں موجود ہیں، زبان زندہ رہے گی۔ ہم اردو والوں نے غلطی کی یہ کہ اس زبان کی ترویج و ترقی کے لیے کوئی لائحہ عمل نہیں بنایا۔ ہم صرف

حکومت سے مدد چاہتے ہیں حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ کوئی زبان صرف سرکاری امداد پر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ہبرو زبان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ یہودیوں نے صدیوں تک خانہ بدوشی کی زندگی گزاری لیکن زبان کو سینے سے لگائے رکھا۔ ہمیں بھی اردو کے ساتھ اسی محبت کا ثبوت دینا ہوگا۔

سوال: قومی اردو کونسل نے اردو کی ترویج وترقی کے لیے جو کوششیں کی ہیں ان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: کونسل نے اس سلسلے میں بہت اچھے کام کیے ہیں۔ کمپیوٹر کورس کے ذریعے اردو پڑھنے والوں کو روزگار مرکز تربیت، کلاسیکی ادب کے ساتھ ساتھ ادب اطفال کی اشاعت پر خصوصی توجہ اور اردو سکھانے کے لیے ڈپلوما کورس کی شروعات وغیرہ بہت اچھے اقدام ہیں اور ان سے خاطر خواہ فائدہ بھی ہوا ہے مگر کونسل کے کاموں کی رفتار میں مزید تیزی لانے کی ضرورت ہے۔

•••

علی احمد فاطمی سے گفتگو

پروفیسر علی احمد فاطمی ہم عصر اردو فکشن پر خصوصی نظر رکھتے ہیں۔ ذیل میں جدید اردو ناول پر ان سے گفتگو پیش ہے۔

سوال: 1992 ہندستانی سماج وسیاست کا اہم سال ہے۔ اس سال ایک ایسا حادثہ ہوا جس نے زبان وادب کو بھی متاثر کیا۔ افسانے اور ناول پر بھی اس کے اثرات پڑے۔ اس بارے میں کچھ بتایئے؟

جواب: سماج میں جب بھی کوئی بڑا حادثہ ہوتا ہے تو فنکار بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن ضروری نہیں کہ تخلیقی ادب میں اس کے اثرات فوراً دکھائی دینے لگیں۔ ہنگامی موضوع ادب بھی پیدا کرتا ہے اور کبھی کبھی اس کے اثرات دہائیوں میں پھیل جاتے ہیں۔ اگر چہ دونوں کی اہمیت اپنی اپنی جگہ پر ہے لیکن سوچ سمجھ کر لکھا جانے والا ادب اپنی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس حادثے کو بارہ تیرہ برس گزر گئے لہٰذا اب جو لکھا جا رہا ہے اس میں اسے گہرائی سے دیکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ادھر اردو میں کئی قابل ذکر ناول لکھے گئے ہیں جن میں اس حادثے کی گونج سنی جاسکتی ہے۔

سوال: اس موضوع پر جوناول لکھے جارہے ہیں کیا وہ حالات کی سچی تصویر پیش کر پا رہے ہیں؟

جواب: دیکھیے ادب، ادب ہوتا ہے، سماجیات یا معاشیات کی کتاب نہیں۔ ناول نگار کچھ بنیادی باتوں کو لیتا ہے پھر اپنے ڈھنگ سے ناول کا تانا بانا تیار کرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اسے حقیقت کو مسخ نہیں کرنا چاہیے تاہم وہ ناول ہی لکھ رہا ہوتا ہے کوئی تاریخی کتاب نہیں۔ ناول نویسی میں تخیل وتصور سے تو کام لینا ہی پڑتا ہے، کچھ کردار گڑھنے پڑتے ہیں اور ایک فضا قائم کرنی پڑتی ہے جس میں ارضی حقیقت اور تخیلاتی حقیقت کا امتزاج ہوتا ہے۔

سوال: فرقہ واریت کے موضوع پر ہندی میں کئی ناول لکھے گئے ہیں جو بڑے ناول سمجھے جارہے ہیں مثلاً دودھ ناتھ سنگھ کا ''آخری کلام'' یا بعض دوسرے ناول۔ اس پایے کا ناول اردو میں کیوں نہیں آیا؟

جواب: اچھے بہت اچھے اور برے ناول ہر دور میں لکھے گئے ہیں اور ہر زبان میں لکھے گئے ہیں۔ فرقہ واریت سے سب سے زیادہ متاثر مسلمان ہوئے ہیں اور اتفاق سے اردو میں جتنے اہم ناول نگار اس وقت لکھ رہے ہیں وہ بھی مسلمان ہیں۔ ہندی میں اصغر وجاہت یا منظور احتشام کو چھوڑ کر زیادہ تر ہندو ہیں۔ اس موضوع پر براہِ راست متاثر ہونے والوں اور براہِ راست زد میں نہ آنے والوں کی نفسیات میں جو فرق ہونا چاہیے وہ فرق موجود ہے۔ متاثر ہونے والے فنکار جب حادثے کے فوراً بعد لکھیں گے تو ان کا جذباتی ہونا عین فطری ہے۔ جبکہ ناول لکھنے کے لیے جذباتی ہونے سے زیادہ موضوع سے Detach ہونا بھی ضروری ہوا کرتا ہے۔ جتنا آپ جذباتیت سے دور ہوں گے، معروضیت اور حقیقت کے قریب آئیں گے۔ پھر یہ بھی ہے کہ کسی حادثہ یا فرقہ وارانہ فسادات کو واقعاتی سطح پر دیکھنا اور لکھنا اور بات ہے اور تاریخی وتہذیبی تناظر میں اس کی جڑوں کو تلاش کرنا اور بات ہے۔ ''آگ کا دریا'' اور ''اداس نسلیں'' اسی لیے بڑے ناول ہو گئے۔ تازہ ناولوں میں ''مہا ساگر''، ''دش منتھن''، ''بیان'' وغیرہ اچھے ناول ہیں۔ ''آخری کلام'' جیسا دوسرا ناول تو ہندی میں بھی موجود نہیں ہے۔

سوال: ''آخری کلام'' اور ''وش منتھن'' میں مسلمانوں کو مظلوم دکھایا گیا ہے۔ کیا یہ جانب داری نہیں ہے؟

جواب: کیا آپ کے خیال میں مسلمان مظلوم نہیں ہیں۔ کچھ لوگ ان میں انتہا پسند یا فرقہ پرست ہو سکتے ہیں لیکن پوری جماعت پر یہ لیبل لگانا غلط ہے۔ ''وش منتھن'' کا مصنف مسلمان ہے لیکن ''آخری کلام'' کا مصنف تو ہندو ہے۔ تقریباً ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل یہ ناول بے حد تحقیق و تفکر کے بعد لکھا گیا ہے۔ حیرت ہے کہ اردو میں ایسا ناول کیوں نہیں لکھا گیا۔ کیا لوگ محنت نہیں کر رہے ہیں یا جو براہِ راست متاثر ہوتا ہے وہ لکھ ہی نہیں پاتا؟ ادب میں کوئی حتمی بات کہہ پانا مشکل ہے۔ اردو ناول نگار اس اہم موضوع پر سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں اور دردمندی سے لکھ بھی رہے ہیں۔ غضنفر، عبد الصمد اور مشرف عالم ذوقی کے علاوہ یہاں کچھ اور نام بھی لیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً احمد صغیر اور محمد علیم وغیرہ جو اسی موضوع پر لکھ رہے ہیں۔

سوال: 1947 کی فرقہ واریت اور آج کی فرقہ واریت میں کیا فرق ہے، کیا یہ فرق ناولوں میں بھی دکھائی دے رہا ہے؟

جواب: فرق ہے اور یہ فرق دکھائی بھی دیتا ہے۔ 47 کے بعد فرقہ وارانہ فسادات حادثاتی تھے، ان کے پیچھے منصوبہ بندی نہ تھی لیکن آج کے فسادات بڑی حد تک منصوبہ بند ہوتے ہیں۔ پھر ہندستان کی فرقہ واریت کے انیک روپ ہیں۔ وہ کبھی یہاں کی سماجی ساخت اور ذات پات کی دین تھی۔ مسلمانوں کی آمد نے اس میں مذہبی رنگ بھرا لیکن آج کی فرقہ واریت صرف نسلی و مذہبی نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے مغربی پونجی واد کا شاطرانہ نظام کام کر رہا ہے۔ تعلیم و تدریس، تہذیب و ثقافت، کھیل کود یہاں تک کہ کھان پان تک میں اس عالم کارانہ سیاست اپنے قدم جما رہی ہے۔ کیا آپ کی اپنی کوئی سوچ ہے۔ اس تناظر میں ان ناولوں کو بطور خاص ''وش منتھن'' کو دیکھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ''آنگن'' وغیرہ سے آگے کے ناول ہیں۔

سوال: اردو کے تازہ ناولوں میں فرقہ واریت کے علاوہ اور کن موضوعات پر عمدہ ناول لکھے گئے ہیں؟

جواب: موضوعات اور بھی ہیں مثلاً پیغام آفاقی کے ناول ''مکان'' میں جبر و استحصال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ شموئل احمد کے ناول ''مہاماری'' میں کرپشن (Corruption) کو دکھلایا گیا ہے۔ حسین الحق کے ناولوں میں بکھراؤ، ٹکراؤ اور قدروں کا بدلاؤ ہے۔ سید محمد اشرف کے ناول ''نمبردار کا نیلا'' میں انسانی جبلت کی وحشت ناکی کو بڑے خوبصورت پیرائے میں پیش کیا گیا ہے— یعقوب یاور نے وہ تاریخی نوعیت کے ناول لکھے ہیں'' دل من'' اور ''عزازیل'' مجھے یہ دونوں ناول بھی پسند آئے۔ علی امام نقوی اور انور خاں نے ممبئی کی زندگی پر ناول لکھے ہیں۔ جوگندر پال کا ناول ''پار پرے'' قیدیوں کی داستان ہے۔ ساجد زیدی نے ''مٹی کے حرم'' اور اقبال مجید نے ''کسی دن'' اور ''نمک'' لکھے ہیں۔ ایک اور ناول ہے جو اس دور کا سب سے اہم ناول ہے وہ ہے الیاس احمد گدی کا ناول ''فائر ایریا'' جو کوئلے کی کان میں کام کرنے والے مزدوروں کو لے کر لکھا گیا ہے۔

سوال: ایک خیال ہے کہ جدید دور ناولوں کا دور ہے۔ پھر بھی ہمارے ہاں اچھے اور بڑے ناولوں کی کمی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟

جواب: اہم بات یہ ہے کہ ناول لکھے جا رہے ہیں۔ الیاس احمد گدی معمولی افسانہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، وہ ''فائر ایریا جیسا ایک بڑا ناول لکھ جائیں گے، یہ کس نے سوچا تھا۔ ان کے بھائی غیاث احمد گدی جو ان سے بڑے اور اہم افسانہ نگار تھے، کوئی اچھا ناول نہ دے سکے۔ تخلیق کے بارے میں کوئی بات حتمی طور پر نہیں کہی جا سکتی۔ یہ عجیب وغریب سفر ہوا کرتا ہے، ناول لکھنا ایک مشکل کام ہے۔ لارنس نے کہا ہے کہ ناول زندگی کی ایک روشن کتاب ہے۔ ناول ایک ایسا ارتعاش ہے جو پورے انسانی معاشرے کے اندر لرزش پیدا کر سکتا ہے۔ سماج کی حقیقت، عصری صداقت اور تاریخ کی جبریت کو جس طرح ناول اپنے آپ میں جذب کرتا ہے کسی دوسری صنف ادب کے لیے مشکل ہے۔ بحرانی دور میں ناول کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ اس کشاکش اور بحران کو جس قدر بہتر اور موثر ڈھنگ سے ناول پیش کرتا ہے دوسری اصناف نہیں، اس لیے آج کے دور میں ناول کو نثر کا رزمیہ کہا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم ایک بار پھر انتشاری اور بحرانی دور سے گزر رہے ہیں۔ یہ

بحران لمحاتی اور حادثاتی نہیں ہے بلکہ آج کے معاشرے کی جڑوں میں پیوست ہے۔ ایک زمانے میں ناول کی موت کا اعلان کر دیا گیا تھا مگر اب یہ صنف پھر اپنی زندگی کا ثبوت دینے لگی ہے۔

سوال: ناول کی تنقید کم کیوں لکھی جارہی ہے؟

جواب: تخلیق ہی تنقید کو پیدا کرتی ہے۔ ہمارے عہد کے نقاد مصلحت و سیاست کا شکار ہیں۔ وہ ہمعصر تخلیقی ادب پر لکھنے سے کتراتے ہیں۔ دوستاں اور دشمناں بھی اپنا کام کرتے ہیں۔ اردو زبان کے معاملات بھی ہیں لیکن لوگ لکھ بھی رہے ہیں۔ یہاں اگر ایک طرف بزرگ ناقد سید محمد عقیل نے ''جدید ناول کا فن'' لکھی تو نگینہ جبیں جیسی نوجوان ناقد نے ''اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ 47 کے بعد'' لکھی۔ خاکسار بھی جدید ناول پر لکھتا ہی رہتا ہے۔

سوال: کچھ سرکاری ادارے اردو کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں، ان میں قومی اردو کونسل نے اردو داں طبقے کو انفارمیشن ٹکنالوجی سے جوڑنے کی جو کوششیں کی ہیں ان سے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: عام طور پر اردو والے سائنس اور انفارمیشن کی دنیا سے بےخبر رہتے ہیں۔ ایک مدت تک اردو زبان و ادب سے مراد محض شاعری اور اردو شاعری سے مراد غزل گوئی ہی لی جاتی رہی ہے۔ لیکن ادھر چند برسوں میں جب سائنس اور ٹکنالوجی ناگزیری ہوگئی تو اردو کے جن چند اداروں نے انفارمیشن ٹکنالوجی کے فوائد و مقاصد اردو والوں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے ان میں قومی اردو کونسل کا نام سرفہرست ہے۔ اس کی اول وجہ تو اس کے ڈائرکٹر کا باخبر اور روشن خیال ہونا ہے دوسرے ان کا وہ طریقۂ فکر اور طریقۂ عمل جس نے اردو کے اس ادارے کو روایتی انداز میں صرف اردو والوں تک محدود نہیں رکھا۔ میری مراد اردو ادب کے لوگوں تک کونسل کے رسالے ''اردو دنیا'' ہیں میں نے خود ایسے مضامین پڑھے ہیں جن سے مجھے روشنی ملی ہے۔ یہی نہیں اس ادارے کے سربراہ اور ان کا عملہ پورے ملک میں جا جا کر جس طرح مدرسوں اور غریب طبقوں میں اردو کی کتابیں، اردو کا کمپیوٹر اور دیگر انفارمیشن پہنچا رہے ہیں وہ نہایت قابلِ ستائش ہے۔ پرانی نسل اس سے فائدہ اٹھائے یا نہ

اٹھائے لیکن نئی نسل پورے طور پر فائدہ اٹھا رہی ہے جس کے لیے قومی اردو کونسل مبارک باد کی مستحق ہے۔

سوال: اردو کو روزگار سے جوڑنے کے لیے کیا اقدامات کیے جا سکتے ہیں؟

جواب: اردو کو روزگار سے جوڑنے کے معاملات بھی جدید انفارمیشن سے وابستہ ہیں۔ اب اردو پڑھنے والا صرف اردو کا استاد ہی بنے یہ تصور ختم ہو گیا ہے۔ صحافت، انفارمیشن، میڈیا، ترجمہ، اسکرپٹ، فلم اور نہ جانے کتنے راستے کھل گئے ہیں جہاں اردو والا اپنی صلاحیت اور دلچسپی کے اعتبار سے روزگار کا راستہ چن سکتا ہے۔ اگر وہ صرف کمپیوٹر ہی سیکھ لے تو بھی کچھ راستہ نکل سکتا ہے۔ میرے کئی شاگرد ہیں جو کمپیوٹر سیکھ لینے کی وجہ سے اپنی روزی روٹی کما رہے ہیں۔ روزگار کا مسئلہ صرف اردو والوں کے لیے یا صرف ایک ملت کے لیے نہیں ہے بلکہ پورے ملک کا مسئلہ ہے جس پر ہم سبھی کو سوچنا ہے۔

سوال: قارئین ''اردو دنیا'' کے لیے آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

جواب: ''اردو دنیا'' کے قارئین سے میں یہی کہنا چاہوں گا کہ وہ غزلیں، نظمیں اور افسانے ضرور پڑھیں لیکن ان کا مطالعہ صرف یہیں تک محدود نہ رہے۔ آج ایک کامیاب زندگی کے لیے جدید علوم وفنون سے واقف ہونا ضروری ہے۔ دنیا کے حالات سے باخبر رہنا ضروری ہے۔ ترقی، تبدیلی، روشنی، کہاں کیا ہو رہا ہے ان سب پر نظر ضروری ہے۔ آج جدید علوم و فنون سے بے خبری موت کے مترادف ہوگی۔ جدید علوم کے مطالعے سے وژن بڑا ہوتا ہے اور آج کی دنیا میں اگر علم و عمل کے ساتھ وژن اور وزڈم نہیں ہے تو آپ بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ سماجی و سائنسی موضوعات سے باخبر رہنا آج بہت ضروری ہو گیا ہے۔

•••

منشایاد سے گفتگو

منشایاد کا شمار اردو کے سینئر لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔انھوں نے 1950 کی دہائی کے آخر میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔اب تک ان کے دوسو سے زائد افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ان کے افسانوں کا بنیادی موضوع دیہی تمدن ہے۔جدید زمانے میں جبکہ شہروں کی دلکشی میں اضافہ ہو رہا ہے، دیہات کی زندگی اور کسانوں کے مسائل عدم توجہی کا شکار ہیں۔منشایاد نے اس کلچر کو اپنے افسانوں میں تمام تر جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس لحاظ سے وہ پریم چند اور احمد ندیم قاسمی کی روایت کے امین ہیں لیکن معاصر زندگی کے دیگر مسائل بھی ان کے افسانوں کا موضوع بنے ہیں۔

سوال: آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

جواب: میری پیدائش ضلع شیخوپورہ (پنجاب) کے ایک گاؤں ٹھٹھہ نستر نزد منڈی فاروق آباد میں ہوئی۔اسکول اور سروس کے ریکارڈ میں میری تاریخ پیدائش یکم اپریل درج تھی، جو درست نہیں تھی۔والدین کو انگریزی کی تاریخ یاد نہیں تھی مگر اتنا ضرور یاد تھا کہ وہ سال 1937 کی عیدالفطر کا دن تھا۔ایک اندازے کے مطابق یہ پانچ ستمبر تھی۔میں اب اسی کو صحیح مانتا اور کتابوں میں لکھتا ہوں۔

سوال: آپ نے کہاں تعلیم حاصل کی؟

جواب: ابتدائی تعلیم قریبی گاؤں گجیانہ نو میں حاصل کی۔ اس کے بعد حافظ آباد کے ایم۔ بی۔ ہائی اسکول نمبر 1 میں داخلہ لیا اور 1955 میں میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ اسکول آف انجینئرنگ میں داخل ہو گیا اور 1957 میں سول انجینئرنگ میں ڈپلوما حاصل کیا۔ چونکہ اردو ادب پڑھنے اور کہانیاں لکھنے کا شوق بچپن ہی سے تھا اس لیے ملازمت کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے فاضل اردو، بی۔ اے۔، ایم۔ اے اردو اور ایم۔ اے۔ پنجابی کے امتحانات پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیے۔

سوال: کن اداروں میں ملازمت کی؟

جواب: پہلی دو سالہ ملازمت پی ڈبلیو ڈی (پنجاب) کے محکمۂ بحالیات میں کی اور راولپنڈی اور مری میں تعینات رہا۔ اس کے بعد 1960 میں دارالحکومت کے ترقیاتی ادارے (سی۔ ڈی۔ اے) اسلام آباد میں ملازمت شروع کی اور مختلف عہدوں پر کام کرنے اور ترقی پانے کے بعد ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدے سے 1997 میں سبکدوش ہوا۔

سوال: آپ نے افسانہ نگاری کا آغاز کب کیا اور پہلا افسانہ کب شائع ہوا؟

جواب: یوں تو میں نے چھٹی ساتویں جماعت ہی میں بچوں کے رسالوں میں کہانیاں اور نظمیں لکھنا شروع کر دی تھی لیکن پہلا افسانہ دسویں جماعت کا امتحان دینے کے فوراً بعد 'کنوں' کے عنوان سے لکھا جو اس زمانے کے ایک نیم ادبی مگر مقبول ترین رسالے 'شمع' لاہور میں شائع ہوا۔ اس کے بعد میرے افسانے ماہ نامہ "عکسِ نو" لاہور میں شائع ہونے لگے۔ لیکن یہ ابتدائی مشق کا دور تھا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ میری ادبی زندگی کا اصل آغاز اس افسانے سے ہوا جس کا عنوان 'کہانی' تھا اور جو میں نے 1957 میں لکھا مگر یہ 1959 میں اشفاق احمد صاحب کے رسالے "داستان گو" میں شائع ہوا تھا۔

سوال: اب تک آپ کے کتنے افسانوی مجموعے چھپ چکے ہیں؟

جواب: اب تک میرے افسانوں کے نو مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ایک پنجابی افسانوں کا مجموعہ بھی شامل ہے۔ پنجابی میں ایک ناول "ناتواں ناتواں تارا" 1997 میں شائع ہو چکا

ہے۔ان سب کی تفصیل درج ذیل ہے۔

1۔بند مٹھی میں جگنو(1975)

2-ماس اور مٹی(1980)

3-خلا اندر خلا(1983)

4-وقت سمندر(1986)

5-وگدا پانی (پنجابی)(1987)

6-درخت آدمی(1990)

7-دور کی آواز(1994)

8-تماشا(1998)

9-خواب سرائے(2005)

ناول: زیر طبع:1۔راہیں 2-آواز

متعلقہ کتب انتخابات رسائل:

1. منشا یاد کے تین منتخب افسانے مرتبہ خاور نقوی 1992 (پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈ، لاہور)
2. منشا کے بہترین افسانے مرتبہ امجد اسلام امجد 1993 (ادب پبلی کیشنز۔ نئی دہلی)
3. منتخب کہانیاں (انگریزی تراجم) مرتبہ جمیل آذر 1994 (اسٹرلنگ پبلشرز۔نئی دہلی اور لاہور۔
4. منشا یاد کہانی نمبر 'لہراں' لاہور 1986
5. شہر فسانہ (خود منتخب کردہ پچاس افسانوں کا انتخاب) 2004

اس کے علاوہ میں نے افسانوں کے کچھ انتخابات بھی مرتب کیے ہیں اور بچوں کے لیے لکھی گئی ثاقفہ رحیم الدین کی کتاب کا پنجابی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔

سوال: آپ نے افسانے کو ہی اظہار کے لیے کیوں منتخب کیا؟

جواب: میں نے شروع میں شاعری بھی کی مگر ناول اور افسانے سے میری دلچسپی زیادہ تھی۔ ناول لکھنے کے لیے زندگی کے تجربے، ریاضت اور فرصت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اردو کے زیادہ تر ادیبوں کی طرح میں بھی جز وقتی ادیب تھا اور ملازمت کے دوران میں افسانہ لکھنے کا وقت بھی مشکل سے نکال پاتا تھا۔ کئی بار ناول لکھنے کی کوشش کی مگر عدیم الفرصتی کی وجہ سے ہر بار یہ کوشش ادھوری رہ گئی۔

شروع میں تو افسانے کو اختصار کی سہولت کے پیش نظر ہی اختیار کیا مگر پھر محسوس ہونے لگا کہ یہ بہت عمدہ صنف ادب ہے۔ آپ اس میں ہر طرح کے خیالات اور جذبات کا بھرپور اظہار کر سکتے ہیں۔ پھر یہ افسانہ ساتھ ساتھ ادبی رسائل میں چھپتے رہتے ہیں۔ جس سے قارئین کے علاوہ ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور رسائل و جرائد کے مدیروں سے مسلسل تعلق قائم رہتا ہے۔

سوال: کن افسانہ نگاروں کے اثرات آپ کی افسانہ نگاری پر مرتسم ہوئے؟

جواب: جب میں نے افسانہ پڑھنا اور پھر لکھنا شروع کیا تو میں سبھی اچھے اور مشہور افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں سے متاثر تھا۔ میں نے ابتدا میں نسیم حجازی کے سارے ناول پڑھ ڈالے۔ مرزا ادیب کے صحرانورد کے خطوط اور رومان اور اس عہد تک چھپے ہوئے سارے اردو ناول پڑھے۔ لیکن جن افسانہ نگاروں کے افسانے میں دل سے پسند کرتا تھا ان میں پریم چند، احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، کرشن چندر اور اشفاق احمد شامل تھے۔ میں نے ہر ایک سے کچھ نہ کچھ سیکھا۔ ان کے علاوہ نقوش کے ایک افسانہ نمبر میں آغا بابر کا مشہور افسانہ ''گلاب دین چٹھی رساں'' جو ''توازن'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا، احمد ندیم قاسمی کا ''بھرم'' اور تسنیم سلیم چھتاری؛ اور بہت سے دیگر لوگوں کے افسانے اب تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ اس لیے میرے افسانوں پر سبھی کے اثرات مرتب ہوئے ہوں گے۔ میں انتظار حسین کے افسانوں کو بھی پسند کرتا ہوں مگر شعوری طور پر میں نے کسی کی تقلید نہیں کی اور نہ ہی کسی سینئر افسانہ نگار کے فکر و اسلوب کے سحر میں گرفتار ہو کر رہ گیا۔

سوال: افسانہ آپ کے نزدیک کیا ہے؟

جواب: میرے نزدیک افسانہ ایک ایسا مختصر نثر پارہ ہے جس میں کسی واقعہ، منظر، خیال، جذبہ، تجربہ، احساس، کردار یا روحانی کیفیت کو ایسے بہترین اور موثر انداز میں پیش کیا جائے کہ وہ پڑھنے والے کی یادداشت کا حصہ بن جائے اور اسے ان معاملات و مسائل سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ اور شعور بخشے۔

سوال: آپ افسانہ کیسے لکھتے ہیں اور کتنے عرصے میں ایک افسانہ مکمل ہوتا ہے؟

جواب: سب سے پہلے مجھے کوئی خیال سوجھتا ہے۔ اس کے بیجوں میں نشوونما کی گنجائش ہو تو ذہن میں فوراً ہی پلاٹ کی تشکیل شروع ہو جاتی ہے۔ کردار سرگوشیاں کرنے اور ان کے مکالمے سنائی دینے لگتے ہیں۔ مگر میں اسے فوراً ہی لکھنے نہیں بیٹھ جاتا بلکہ اسے ذہن کے اسٹور روم میں ڈال دیتا ہوں جہاں پہلے سے کئی کچے پکے خیالات فالتو سامان کی طرح ادھر ادھر پڑے ہوتے ہیں۔ وہ نیا خیال کبھی خود اور کبھی کسی دوسرے خیال، کردار، واقعہ، تاثر یا احساس سے مل کر نشوونما پانا شروع کر دیتا ہے۔ یہ انڈے سینے جیسا عمل ہوتا ہے۔ اگر یہ پتھریلے نہ ہوں تو کچھ عرصے بعد انڈوں کے خول توڑ کر بچے باہر نکل آتے ہیں اور ذہن چوں چوں کی آوازوں سے بھر جاتا ہے۔ عام طور پر کچھ روز کے وقفوں سے اس پر نظر ثانی کرتا رہتا ہوں۔ جب اس میں مزید مختصر یا بہتر بنے کی گنجائش نہ رہے اور میرے اندر کا نقاد مطمئن ہو جائے تو اسے پرنٹ کر لیتا یا ای میل سے کسی ادبی رسالے کو بھیج دیتا ہوں۔

سوال: 1960 میں جدیدیت کے زیر اثر افسانے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب: زندگی اور فن کے ارتقائی سفر میں تبدیلیاں اور نئے تجربات ناگزیر ہوتے ہیں۔ ہر تبدیلی اور تجربہ فن کی کسی نئی جہت سے روشناس کراتا ہے۔ میں 1960 کی دہائی میں فن افسانہ نگاری میں ہونے والی تبدیلیوں کو بھی اسی نظر سے دیکھتا ہوں۔ ابتدا میں بعض لکھنے والے افراط و تفریط کا شکار بھی ہوئے لیکن مجموعی طور پر جدیدیت کی اس تحریک یا رجحان نے افسانے کو نئی زندگی دی۔

سوال: کیا آپ نے بھی علامتی کہانیاں لکھیں اوران میں علامتیں قابل فہم تھیں؟

جواب: بہت سے دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح میری ابتدائی کہانیاں بھی روایتی اور وضاحتی اسلوب کی حامل تھیں۔لیکن میں بھی عصری افسانے میں ہونے والی تبدیلیوں سے بے خبر نہیں تھا۔ اس لیے علامتی اور نیم علامتی بہت سی کہانیاں لکھیں مگر ایک تو یہ قابل فہم تھیں دوسرے ان میں کہانی پن سے کبھی صرف نظر نہیں کیا گیا۔

سوال: کیا علامتی اور تجریدی افسانے جیسے تجربات نے افسانے کی صنف کو نقصان پہنچایا؟

جواب: اردو افسانے میں علامت نگاری کوئی نئی چیز تو نہیں تھی، اس کی اولین مثالیں ہمیں ابتدائی دور کے افسانوں میں بھی ملتی ہیں بلکہ دیکھا جائے تو داستانوں اور اساطیری کہانیوں کے دیو، پریاں، بھوت، بیتال، آفات، جادوگر اور توتے مینا بھی علامتیں ہی تھیں۔ یلدرم سے لے کر منٹو تک کئی افسانہ نگاروں کے ہاں اس کی مثالیں نظر آتی ہیں۔لیکن بحیثیت ایک تحریک یا رجحان کے علامت نگاری کو1960 کی دہائی ہی میں فروغ ملا۔ کافکار اور دوسرے فرانسیسی افسانہ نگاروں کے زیر اثر اردو افسانے میں بھی علامت اور تجرید کا استعمال شروع ہوا۔ ہندوستان میں اس کا آغاز سریندر پرکاش اور بلراج مینرا اور پاکستان میں انتظار حسین اور انور سجاد نے کیا۔اگر چہ انتظار حسین کی علامت نگاری کی نوعیت ذرا مختلف تھی کہ ان کہانیوں کی فضا، مواد اور اسلوب اساطیری کہانیوں سے متاثر و ماخوذ تھا۔ دوسروں کے ہاں جدیدیت علامت، استعارے اور تجرید کے استعمال و امتزاج اور اسلوب کی تازہ کاری سے آئی۔مگر بعض افسانہ نگاروں نے لسانی تشکیلات کی آڑ میں بے ڈھب اور مہمل جملے بازی کو جدیدیت سمجھ لیا۔ کردار، پلاٹ اور کہانی پن کو نظر انداز کیا جانے لگا جس سے افسانہ روکھا پھیکا اور بے ربط ہو گیا۔مگر1970 کی دہائی کے بعد صورت حال تبدیل ہو گئی اور نئے تجربوں میں پختگی اور استحکام آیا اور ایک متوازن اور معتدل رجحان وجود میں آیا جس میں روایتی افسانے کی خوبیاں بھی تھیں اور جدیدیت کی بھی۔ جو باہر سے ہی نیا نہیں تھا اندر سے بھی یعنی فکری لحاظ سے بھی جدید تھا۔ نئے تجربوں کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ ان سے افسانے کا کینوس وسیع ہوا۔ افسانے کو غیر ضروری اور طولانی تمہید، خارج کے

وضاحتی اور صراحتی بیان اور بے وصف نثری اسلوب سے رہائی ملی۔ اس طرح ان تبدیلیوں نے فن افسانہ نگاری کو نئی زندگی دی۔

سوال: افسانے میں بیانہ کی واپسی کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب: اردو افسانہ تجربوں اور تبدیلیوں کا ایک لمبا چکر کاٹ کر دوبارہ اپنی ڈگر پر آ گیا ہے۔ لیکن یہ ڈگر اصل میں وہی نہیں ہے جسے چھوڑ کر اس نے تجربوں کا سفر شروع کیا تھا۔ واپسی میں اس کے ساتھ بہت کچھ نیا بھی آیا ہے۔ اس لیے یہ خوش آئند بات ہے کہ پلاٹ، کردار اور کہانی کو افسانے میں دوبارہ استحکام حاصل ہوا۔ دراصل فن افسانہ نگاری بنیادی طور پر بیانیہ ہی ہے۔ مگر نئے تجربوں نے بیانیہ کی صورت بھی تبدیل کر دی ہے اور بہت سے نئے امکانات روشن ہو گئے ہیں۔ اب افسانہ پہلے سے زیادہ متنوع، عمیق اور توانا ہو گیا ہے۔

سوال: آپ کے افسانوں کے موضوعات کیا ہیں؟

جواب: افسانے کا عام طور پر کوئی ایک موضوع نہیں ہوتا۔ میرے افسانوں کے موضوعات بھی مخصوص نہیں، متنوع ہیں۔ میں انسانی زندگی کے سارے ہی پہلوؤں اور رخوں کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ دیہاتی اور شہری زندگی کے مختلف پہلو، فرد اور معاشرے کے داخلی اور خارجی معاملات و مسائل اور فکر و خیال کے متنوع رنگ۔ یوں انسانی زندگی کا سب سے بہترین موضوع محبت ہے اور میں نے بھی اس پر بہت سی کہانیاں لکھی ہیں مگر کسی بھی سماجی، نفسیاتی اور سیاسی موضوع کو شجر ممنوعہ نہیں سمجھتا۔ تاہم عام آدمی کے دکھ سکھ، ماحول کی گھٹن، سیاسی جبر اور طبقاتی تقسیم سے متعلق موضوعات میرے بہت سے افسانوں کا موضوع بنے۔

سوال: کوئی ایسی کہانی جو آپ ابھی لکھنا چاہتے ہوں؟

جواب: ایک نہیں ابھی میں بہت سی کہانیاں لکھنا چاہتا ہوں۔ ہزاروں کہانیاں پڑھیں، سیکڑوں لکھیں مگر ایک بڑا اور ناقابل فراموش افسانہ لکھنے کی خواہش میں مسلسل مشق کرتا رہتا ہوں۔ ابھی میرے اندر کہانیوں کا بہت بڑا انبار ہے، اتنا بڑا کہ ان سب کا لکھا جانا ایک زندگی میں ممکن نہیں۔ اس کا حل میں نے یہ سوچا کہ افسانے لکھنا شروع کر دیے ہیں تا کہ وہ

کہانیاں بھی کسی طرح محفوظ کر سکوں جنھیں لکھنے کے لیے میں پورا وقت نہیں نکال پا رہا ہوں۔

سوال: افسانے میں کس کی ساخت پر آپ کی زیادہ توجہ مرکوز رہتی ہے کرداروں پر یا اسلوب پر؟

جواب: اسلوب ایسی چیز نہیں ہے کہ اس پر ہمہ وقت توجہ مرکوز رکھی جائے۔ اس کا تعین افسانہ شروع کرتے وقت ہی ہو جاتا ہے۔ پھر افسانہ مکمل کرنے کے بعد آپ نظر ثانی کرتے ہوئے زبان و بیان کی خامیاں اور اسلوب کی کمزوریاں دور کر سکتے ہیں۔ میری زیادہ تر توجہ اس خیال یا موضوع کی طرف ہوتی ہے جس کی خاطر میں افسانہ لکھتا ہوں۔ کردار تو ذریعہ ہوتے ہیں جو لکھنے والے کی بات قاری تک پہنچاتے ہیں۔ لیکن کرداروں پر پوری توجہ نہ دینے سے کردار مصنوعی اور جھوٹے معلوم ہونے لگتے ہیں۔

سوال: آپ کے خیال میں ایک اچھے افسانے کے ضروری عناصر کیا ہیں؟

جواب: ایک اچھے اور مکمل افسانے میں سارے ہی عناصر اور اجزا، موضوع، پلاٹ، اسلوب، کردار نگاری، منظر نگاری، نقطۂ نظر، ہیئت اور تکنیک وغیرہ ضروری ہوتے ہیں اور ان میں توازن ہونا چاہیے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں سب سے اہم وہ خیال یا موضوع ہے جس کو بنیاد بنا کر یا جس کی بنیاد پر افسانے کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ آپ اسے مرکزی خیال بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی کا تاثر ابھارنے کے لیے افسانہ نگار کردار اور ماحول تخلیق کرتا اور اسی کے مطابق زبان و بیان اختیار کرتا ہے۔ اس کے علاوہ افسانے کی کچھ خصوصیت اور پہچان ہے۔ یوں افسانہ نگار کو فن اور فکر کے سارے پہلوؤں پر توجہ رکھنا ہوتی ہے افسانے کی سرخی یا عنوان سے لے کر اس کے آخری جملے یا اختتامیے تک۔ مثلاً عنوان یاد رہ جانے والا اور بامعنی ہو۔ آخری جملہ ایسا ہو کہ کسی بات کا انکشاف کرے اور تکمیل کا احساس ہو۔

سوال: اگر آپ کو کہا جائے کہ عالمی افسانے کے انتخاب میں آپ اپنا کوئی افسانہ خود منتخب کریں تو آپ کون سا افسانہ شامل کریں گے اور کیوں؟

جواب: میرے بہت سے افسانے دوسری زبانوں میں ترجمہ اور عالمی افسانوں کے انتخاب میں شامل ہو چکے ہیں جن میں بچے اور بارود، اپنا گھر، ماس اور مٹی، دام شنیدن، (ڈنگر بولی)، ریپلیکا (تاج محل کی سیر)، دیدۂ یعقوب، پھندا اور تماشا وغیرہ بے حد اہم ہیں لیکن ''تماشا'' سرفہرست ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اچھے افسانے کی ساری خوبیاں ہیں۔ اس کا موضوع دلچسپ اور گہری معنویت کا حامل ہے۔ اس میں ترقی پذیر ملکوں کے فرد اور اجتماع کے انسانیت کش رویوں کو پیش کیا گیا ہے۔

سوال: کیا آپ کے افسانوں کے تراجم ہوئے؟

جواب: میرے بہت سے افسانوں کے انگریزی، فارسی، ہندی، فرانسیسی، ترکی، عربی، پنجابی (گورمکھی) زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ انگریزی تراجم پر مشتمل ایک مجموعہ ''تماشا اینڈ اینڈ اسٹوریز'' (Tamasha and other Stories) جسے پروفیسر جمیل آذر نے مرتب کیا تھا، 1994 میں دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس میں اٹھارہ افسانے شامل تھے۔ اسی سال کچھ اضافوں کے ساتھ یہ ''سلیکٹڈ اسٹوریز آف منشایاد'' کے نام سے پاکستان میں بھی شائع ہوا۔ امرتا پریتم نے اپنے رسالے ''ناگ منی'' (دہلی) کا ''ماس اور مٹی'' نمبر شائع کیا تھا جس میں اس نام کے مجموعے کی بہت سی کہانیاں پنجابی میں ترجمہ کی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی وہ میری اردو کہانیوں کو پنجابی میں ترجمہ کر کے چھاپتی رہتی تھیں۔ افسانہ دامِ شنیدن (ڈنگر بولی) ہندی اور پنجابی کے علاوہ بھارت کی بعض اور زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا جیسے کنڑ وغیرہ۔

سوال: فکشن کی جو تنقید لکھی جا رہی ہے کیا آپ اس کے معیار سے مطمئن ہیں؟

جواب: پاکستان میں فکشن کی تنقید کے معیار اور مقدار دونوں سے میں زیادہ مطمئن نہیں ہوں۔ ہمارے نقادوں کی زیادہ توجہ نصابی موضوعات اور شاعری تک محدود رہتی ہے۔ ہم عصر افسانے پر بہت کم نقادوں نے توجہ دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لیے خاص مطالعہ اور فرصت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے بہت سے افسانہ نگار خود تنقید لکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی افسانے پر اچھی نظر ہے مگر ان کے مضامین سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نئے

افسانوں کو نہیں پڑھتے ۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا تنقیدی کام قابل داد ہے۔ نئے افسانے کو سید وقار عظیم اور ممتاز شیریں جیسے نقادوں کی ضرورت ہے۔

سوال: فکشن کے کس نقاد کے کام کو آپ تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب: پاکستان میں ڈاکٹر وزیر آغا نے فکشن کی تنقید پر سب سے زیادہ توجہ دی۔ انھوں نے اپنے مضامین، مقالات اور رسالہ ''اوراق'' کے ذریعے نئے افسانے کی حوصلہ افزائی، ترقی اور اشاعت کا کام بھی کیا۔ افسانے کی تنقید پر ان کی کتاب بھی موجود ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ ان کی تنقید بہت تخلیقی اور ٹو دی پوائنٹ ہے اور فکشن کے فن کو سمجھنے میں بہت ممد و معاون ثابت ہوئی۔ سلیم آغا قزلباش کا افسانے پر ڈاکٹریٹ کا تھیسس بھی شائع ہو چکا ہے، جو خاصا وقیع ہے۔ فتح محمد ملک نے اپنے مضامین میں اردو افسانے اور خاص طور پر منٹو کے فن کے بہت اچھے تنقیدی جائزے پیش کیے ہیں۔ وہ بھی افسانے کو بہت اچھی طرح سمجھنے والے نقاد ہیں۔ اسی طرح محمد علی صدیقی، مظفر علی سید، ڈاکٹر انوار احمد، شہزاد منظر، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا تنقیدی کام قابل توجہ ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر اعجاز راہی اور ڈاکٹر آصف فرخی نے بھی اردو افسانے کی تنقید میں گراں قدر اضافے کیے ہیں۔ ڈاکٹر انوار احمد کی تنقید بھی نہایت معیاری ہے۔ ہندوستان میں شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور وارث علوی افسانے کے بہت اچھے نقاد ہیں۔ ان دنوں میں وارث علوی کے مضامین کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ مجھے ان کی اپروچ درست اور انداز تحریر بہت اچھا اور دلچسپ لگتا ہے۔

سوال: ادبی جرائد دم توڑتے جا رہے ہیں اور سرکاری جرائد کا کوئی معیار نہیں، ایسی صورت حال میں ادب کے فروغ کے لیے کیا اقدامات ہونی چاہیے؟

جواب: ادبی جرائد کہاں دم توڑ رہے ہیں؟ میں تو سمجھتا ہوں آئے دن بہت سے نئے، معیاری اور اچھے رسائل کا اجرا ہو رہا ہے۔ ٹھیک ہے نقوش اب پہلے جیسا نہیں رہا بلکہ پتہ نہیں، ہے بھی کہ نہیں اور اوراق بھی دیر سے آتا ہے اور کچھ دبلا بھی ہو گیا ہے مگر فنون، سیپ، سویرا، معاصر، ادب عالیہ، قومی زبان، بادبان، مکالمہ، ادبیات، دنیا زاد، ارتکاز، بیاض، آج، تشکیل، آئندہ، روشنائی، ادب و ثقافت، ماہ نو، کتاب، جدید ادب، تادیب،

الماس (خیر پور یونیورسٹی) ، قرطاس (گوجر انوالہ) ، نیرنگ خیال، ادراک (گوجرانوالہ)، آفاق (راولپنڈی)، سورج، الحمرا، نوادارد، ادب لطیف، تخلیقی ادب وغیر کتنے ہی ادبی رسالے شائع ہو رہے ہیں۔ ہندوستان میں ادب کی چالیس سال تک مسلسل خدمت کرنے کے بعد ''شب خون'' بند ہو رہا ہے مگر اس کا دو حصوں پر مشتمل آخری شمارہ جو تقریباً دو ہزار صفحات پر مشتمل ہوگا عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ اس کے علاوہ ذہن جدید، استعارہ، شاعر، شعر و حکمت، نیا سفر، نیا ورق، ادب ساز، سبق اردو وغیرہ بہت سے معیاری ادبی رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ پھر اس کے علاوہ انٹرنیٹ پر جدید ادب اور بہت سے دوسرے اردو رسالے موجود ہیں۔ ان اتنے بہت سے رسائل کی موجودگی میں آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ادبی جرائد دم توڑ رہے ہیں۔ مجھے ادبیات کی حد تک آپ کی اس بات سے بھی اتفاق نہیں ہے کہ سرکاری جرائد کا کوئی معیار ہی نہیں۔ ماہ نو کو البتہ توجہ کی زیادہ ضرورت ہے۔

سوال: افسانے کے علاوہ اور کس صنف میں دلچسپی ہے؟

جواب: ناول کے علاوہ ''یادیں'' کے نام سے یادداشتیں لکھ رہا ہوں۔ ریڈیو اور ٹی۔وی۔ کے لیے ڈرامے اور سیریل بھی لکھ چکا ہوں۔ اخبار میں کالم بھی جاری ہے اور حسب ضرورت مضامین بھی لکھتا رہتا ہوں۔

سوال: کس دور کو آپ اردو افسانے کا سنہرا دور کہہ سکتے ہیں؟

جواب: اردو افسانے کا سنہرا دور تو وہی ایک ہے جب منٹو، بیدی، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، غلام عباس، مرزا ادیب، اشفاق احمد، اوپندر ناتھ اشک، شوکت صدیقی، عزیز احمد، انور عظیم، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، غیاث احمد گدی، قاضی عبدالستار، آغا بابر، بانو قدسیہ، اے حمید، رام لعل، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین ایک ساتھ افسانہ لکھ رہے تھے۔ البتہ جدید افسانے پر انیس سو ساٹھ ستر کی دہائی میں ایک بار خوب جوبن آیا تھا آپ اسے سنہری نہیں تو نقرئی دور تو ضرور کہہ سکتا ہیں جب انتظار حسین، سریندر پرکاش، انور سجاد، جوگندر پال، بلراج مینرا، احمد ہمیش، وقار بن الٰہی، خالدہ حسین، رشید امجد، اعجاز راہی، سمیع

آہوجا، مظہرالاسلام، اسد محمد خاں، احمد داؤد، مرزا حامد بیگ، احمد جاوید، غلام الثقلین نقوی، رتن سنگھ، محمد عمر میمن، قمر احسن، نیر مسعود، احمد یوسف، سلام بن رزاق، کلام حیدری، شوکت حیات، انور عظیم، آغا سہیل، محمود احمد قاضی، انور زاہدی، ناصر بغدادی اور بہت سے افسانہ نگار نئی حسیت کے ساتھ ابھرے (چاہیں تو مجھے بھی ان میں شامل کر لیں)۔ اسی طرح افسانے کا تیسرا اور موجودہ دور بھی کم اہم نہیں ہے۔ لیکن یہ ابھی جاری ہے۔

سوال: کیا آج ہمارے یہاں معیاری افسانہ لکھا جا رہا ہے؟

جواب: جی ہاں۔ ہمارے یہاں ہر دور میں عمدہ افسانے لکھے جاتے رہے ہیں۔ اب بھی برصغیر میں بہت اچھے لکھنے والے موجود ہیں اور معیاری افسانے لکھ رہے ہیں۔ نئی نسل کے افسانہ نگاروں کے پیش نظر افسانے کا وہ سارے فنی اور فکری سفر اور تجربات ہیں جن میں کامیابیاں ہی نہیں ناکامیاں بھی تھیں۔ مگر یہ کامیابیاں اور ناکامیاں نئے راستے متعین کرنے میں ان کی معاونت کر رہی ہیں۔ اس نسل میں محمد حمید شاہد، آصف فرخی، عبد الوحید، اسلم سراج الدین، نگہت سلیم، سلیم آغا زقزلباش، نیلوفر اقبال اور شبانہ حبیب جیسے با صلاحیت افسانہ نگار شامل ہیں۔

سوال: اردو میں نئے تنقیدی نظریات مثلاً ساختیات وغیرہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ کیا اس سے افسانے کی تفہیم ممکن ہے؟

جواب: جس طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ادبی اصناف میں نئے اسالیب اور رجحانات کا اضافہ ہوتا رہتا ہے اسی طرح تنقید میں بھی نئے نئے نظریات سامنے آتے رہتے ہیں۔ ساختیات وغیرہ کا نظریہ بھی اپنی جگہ کچھ نہ کچھ اہمیت ضرور رکھتا ہے اور کسی حد تک افسانے کی تفہیم میں مددگار ثابت بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن پوری تفہیم نہیں کر سکتا۔

سوال: آپ کے کتنے اردو اور پنجابی ڈرامے ٹیلی ویژن پر پیش کیے گئے؟

جواب: میرے بہت سے افسانوں کی ریڈیو اور ٹی۔ وی۔ کے لیے ڈرامائی تشکیل ہو چکی ہے۔ پنجابی میں کم، اردو میں زیادہ۔ طبع زاد ڈرامے بھی لکھے۔ جیسے ''کچے پکے رنگ'' اور ''ذرا نم

ہوتو'' وغیرہ۔ ٹی۔وی۔ سیریلوں میں جنون، بندھن، راہیں، پورے چاند کی رات، آواز (ابھی ٹیلی کاسٹ نہیں ہوا) اور رنگ وفا (زیرتحریر) شامل ہیں۔ان میں راہیں پر سال کے بہترین اسکرپٹ کا پی۔ٹی وی نیشنل ایوارڈ بھی ملا تھا۔

•••

احمد یوسف سے آخری گفتگو

جناب احمد یوسف مرحوم سے یہ گفتگو مارچ 2008 کی دو تاریخوں (15,13) میں ان کی رہائش گاہ پر ہوئی تھی۔ مرحوم ان دنوں علیل تھے لیکن دو دنوں کی لمبی لمبی نشستوں کے دوران انھوں نے ایک دفعہ بھی اپنی علالت کا ذکر نہیں کیا۔ پوری دلچسپی سے سوالوں کے جواب دیتے رہے۔ درمیان میں ہنستے بھی رہے، پُر مزاح فقرے بھی ادا کرتے رہے۔ لیکن اچھے لوگوں سے ہوئی جاتی ہے دنیا خالی خدا انھیں غریق رحمت کرے۔ آمین۔ پیش ہیں اس طویل انٹرویو کے کچھ خاص حصے۔

سوال: محترم احمد یوسف صاحب ہمیں اپنے ابتدائی احوال سے آگاہ فرمائیں۔

جواب: میں 1930 میں پٹنہ سٹی (صدر گلی) میں پیدا ہوا۔ 1934 میں زلزلہ آیا۔ زلزلے کی لائی ہوئی تباہی اور بربادی کے بعد میرے والد سید محمد یوسف اپنے خاندان کے ساتھ کلکتہ منتقل ہو گئے۔ وہاں انھوں نے سائیکل ایکسپورٹ امپورٹ کا بزنس شروع کیا۔ میرے والد بزنس کے ساتھ ساتھ کلکتہ ہائی کورٹ میں وکالت بھی کیا کرتے تھے۔

سوال: کچھ اپنے تعلیمی سلسلے میں فرمائیں؟

جواب: 1935 میں میرا داخلہ مدرسہ عالیہ (کلکتہ) میں ہوا۔ ہم ڈاکٹر لین میں رہتے تھے۔ یہاں سے مدرسہ بہت قریب تھا۔ وہاں 1935 سے 1939 تک زیر تعلیم رہا۔ میرے دادا اور دادی پٹنہ میں ہی تھے۔ جب میری دادی کا انتقال ہوا تو دادا نے ہمیں واپس پٹنہ بلا لیا۔ پٹنہ میں میری اسکولی تعلیم محمڈن اینگلو عربک ہائی اسکول میں ہوئی۔ اس وقت ہائی اسکول کی ڈگری بھی یونیورسٹی سے ہی ملتی تھی۔ 1943 میں میں نے گیارھویں جماعت پاس کی۔ اس کے بعد میرا داخلہ 1944 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوا۔ وہاں سے میں نے I.Sc. B.Sc کیا۔ اس کے بعد پٹنہ واپس آ گیا اور بہار ہی سے ایم۔اے (اردو) اور پی۔ایچ۔ڈی۔ کیا۔

سوال: جب آپ علی گڑھ میں تھے، اسی زمانے میں ملک تقسیم ہو گیا۔ تقسیم کے وقت یونیورسٹی کا ماحول کیسا تھا؟

جواب: تقسیم کے اثرات جس طرح ملک کے دوسرے شہروں اور قصبوں پر پڑے ویسے حالات یونیورسٹی کیمپس میں نہیں تھے۔ ملک میں جو خونیں واقعات ہو رہے تھے، ان کی خبریں ملتی تھیں۔ کبھی کبھی سراسیمگی کا ماحول بھی بن جاتا تھا لیکن یونیورسٹی انتظامیہ ہمہ وقت ماحول کو بگڑنے سے بچانے کے جتن کرتی رہتی تھی۔ 1948 میں گاندھی جی کے قتل کے بعد کافی ہنگامہ برپا ہوا۔ پورے ملک کی طرح علی گڑھ بھی مغموم تھا۔ یونیورسٹی کی طرف سے آنجہانی کو 31 سائرن کی سلامی دی گئی۔ لیکن تقسیم کے بعد بہت کچھ بدل گیا۔ جو لڑکے ملک کے ان حصوں سے تعلق رکھتے تھے جو پاکستان میں چلے گئے تھے، وہ اپنے نئے ملک کو واپس ہو گئے۔ دوسرے لڑکے بھی لگتا تھا بھاگ کھڑے ہوئے ہیں۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا جو برسوں بعد ختم ہوا۔

سوال: معروف شاعر حسن نعیم مرحوم آپ کے نسبتی بھائی تھے، کچھ ان کے متعلق فرمائیں۔

جواب: دیکھیے جناب! وہ شاعر آدمی تھے۔ دنیاداری کے معاملات میں بالکل کورے۔ جب پٹنہ میں ہمارا کاروبار ٹھپ ہونے لگا تو میں 1973 میں دہلی چلا گیا اور حسن نعیم صاحب کو بزنس میں شریک کیا۔ ابتدا میں تو ٹھیک ٹھاک رہا لیکن ان کی عدم دلچسپی کے سبب بزنس ختم ہو گیا۔ اس کے بعد پلاسٹک انڈسٹری شروع کی گئی لیکن اس کا بھی حشر حسب سابق ہوا۔ یعنی آپ

طرف ایک فکشن نگار اور دوسری طرف ایک سرتاپا شاعر! نتیجہ ظاہر ہے جو ہونا تھا ہوا۔

سوال: آپ کی زندگی کا ایک طویل حصہ خدا بخش لائبریری میں گزرا۔ وہاں آپ نے کون کون سی اہم ذمے داریاں نبھائیں؟

جواب: 1984 میں اس وقت کے ڈائرکٹر عابد رضا بیدار صاحب کی نظر انتخاب مجھ پر پڑی۔ انھوں نے مجھے ایک پروجیکٹ دیا کہ اخبارات سے ایسے محاورے یکجا کیے جائیں جو خالصتاً بہاری ہوں اور سند کے ساتھ ہوں۔ میں نے کافی چھان بین کے بعد 3500 محاورے جمع کیے جو آگے چل کر ''بہار اردو لغت'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ میں نے ترجمے کے بہت سے کام کیے۔ صلاح الدین خدا بخش، راج موہن گاندھی، سروائی، سروجنی نائیڈو اور کملا پرساد کی کتابوں کے اردو ترجمے کیے۔ کچھ شائع ہوئے، کچھ ہنوز التوا میں ہیں۔

سوال: آپ کی افسانہ نگاری کا آغاز کیسے اور کن حالات میں ہوا؟

جواب: میں علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں رشید احمد صدیقی سے بہت متاثر تھا۔ ان کی نثر مجھے بہت اپیل کرتی تھی۔ یہ 1946 کی بات ہے۔ میں کوشش کرتا تھا کہ ان کی طرح انشا کی خوبیوں سے بھرپور نثر لکھنا مجھے بھی آجائے لیکن ان کا اتباع آسان کام نہ تھا۔ ان دنوں احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر اور بیدی کی افسانہ نگاری کا کافی شہرہ تھا۔ میں ان سے بھی متاثر تھا۔ میں نے 1948 سے باضابطہ لکھنا شروع کیا۔ میری پہلی کہانی کلام حیدری کے ماہانہ رسالے ''آہنگ'' (گیا) میں ''عبدالرحیم ٹی اسٹال'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ کہانی کا بہت چرچا ہوا۔ افسانہ نگاروں اور نقادوں کی توجہ میری طرف ہوئی۔ تب سے لے کر آج تک میں برابر افسانے لکھتا رہا۔ میرے چار افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

سوال: کلام حیدری کے ذکر پر خیال آیا کہ وہ آپ کے مداح تھے اور یہ بات غیاث احمد گدی کو پسند نہ تھی۔

جواب: اس میں کوئی شک نہیں کہ غیاث ایک بہت بڑے فن کار تھے اور اپنے ہم عصروں میں لیڈنگ افسانہ نگار۔ کلام حیدری کے معترف تھے۔ وہ جن افسانہ نگاروں کو ''آہنگ'' کے

ذریعے پروموٹ کرتے تھے ان میں غیاث احمد گدی بھی تھے، الیاس احمد گدی بھی تھے، میں بھی تھا اور دوسرے بھی کئی تھے۔ لیکن غیاث احمد گدی complex کا شکار تھے۔ وہ دوسروں کی شہرت پسند نہیں کرتے تھے۔

سوال: یوسف صاحب! آپ ترقی پسند تحریک کے زمانے میں بہت فعال رہے۔ بعد میں جدیدیت کے بھی حامی ہو گئے۔ آخر ادب کے تئیں آپ کا بنیادی رجحان کیا ہے؟

جواب: یہاں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کسی بھی تخلیقی فنکار کو ایک بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ وہ آرٹسٹ ہے اور سچا آرٹسٹ کبھی بھی کسی رجحان یا نظریے کا قیدی بن کر نہیں رہ سکتا۔ میں نے کبھی وہ راستہ نہیں اپنایا جو مجھے افسانہ نگار سے مبلغ اور پرچارک بنا دے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں فن پاروں میں، حقیقی زندگی کو اس کے ہر رنگ میں دیکھنا پسند کرتا ہوں۔

سوال: آپ کے معاصرین میں کون کون سے افسانہ نگار تھے جنھیں آپ پسند کرتے تھے یا جن سے آپ کے روابط رہے؟

جواب: میرے ساتھ کے لکھنے والوں میں رام لعل تھے، الیاس احمد گدی تھے، جوگندر پال، اقبال متین بھی تھے۔ پال اور اقبال متین نے مجھے بہت متاثر کیا۔ وہ اپنے ہم عصروں سے مختلف تھے۔ نیا اسلوب اختیار کرتے تھے، تجربے کرتے تھے۔ رام لعل کے یہاں story value زیادہ ہونے کے سبب قارئین اور ناقدین کا ایک طبقہ ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اقبال متین کے افسانوں کی فضا الگ ہے۔ زبان بہت ستھری ہے۔ جیلانی بانو کے یہاں مقامی رنگ زیادہ ہے۔ قرۃ العین نے جو تجربے کیے وہ ان سے مخصوص ہیں۔ ان جیسا وژن کسی کے پاس نہیں تھا۔ وہ بہت وسیع النظر اور وسیع المطالعہ تھیں۔ ان کا کینواس شاید سب سے بڑا تھا۔

سوال: یوسف صاحب! کچھ اپنے بعد کے افسانہ نگاروں کے متعلق بھی فرمائیں۔

جواب: میرے بعد آنے والوں میں حسین الحق، شوکت حیات، عبدالصمد، انور خاں، شفق، ساجد رشید، عبید قمر، شموئل احمد، غضنفر، انیس رفیع، علی امام نقوی، پیغام آفاقی، سید محمد اشرف، مشتاق احمد نوری، طارق چھتاری، قاسم خورشید، مشرف عالم ذوقی، شاہد اختر، بیگ احساس، محمد

ذاکر اور کئی دوسرے لوگ ہیں۔ بعض لوگ بہت سنجیدہ اور پختہ ہیں لیکن کچھ لوگوں کی تحریریں اپیل نہیں کرتیں۔ شموئل احمد چونکا دینے کے ارادے سے لکھتے ہیں۔ یہ چیزیں بہت دنوں تک نہیں چل پاتیں۔ سطح زمین پر آنا ہی پڑتا ہے۔ اب منٹو، عصمت والی دنیا یکسر بدل گئی ہے۔ اب حالات کے تقاضے کچھ اور ہیں۔

سوال: محترم! یہ تو افسانہ نگاروں کی بات ہوئی۔ اب افسانے کی تنقید کی بابت بھی کچھ فرمائیں۔ عام طور سے فکشن کی تنقید سے بے اطمینانی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ کچھ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اردو میں فکشن کی تنقید لکھی ہی نہیں گئی۔

جواب: دیکھیے صاحب! برا نہ مانیے گا۔ فکشن جسے کہتے ہیں وہ خود اردو میں ایک نئی چیز ہے اس لیے اس کی تنقید بھی نئی ہے۔ شاعری کی تنقید سے اس کا تقابل قبل از وقت ہے، پھر بھی یہ صحیح ہے کہ آج فکشن کے نقاد کھل کر بات نہیں کرنا چاہتے۔ ڈھیر ساری تھیوریز کے حوالے دیتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے زمانے میں کچھ باتیں ہوتی تھیں، فہرست سازی بھی ہوتی تھی۔ بہار میں 50 اور 60 کے درمیان جو لوگ آئے ان پر کسی نے بھرپور طریقے سے نہیں لکھا۔ عام طور پر نقاد فکشن کو نظر انداز کرتے رہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ فکشن کو دل جمعی کے ساتھ پہلے پڑھا جائے، تب لکھنے کا راستہ ملے گا۔ آج تو لوگ پڑھنا ہی نہیں چاہتے۔ شعر پڑھنے اور فکشن پڑھنے میں بہت فرق ہے۔

سوال: تمام نامساعد حالات کے باوجود کیا نئی نسل کے نقادوں میں آپ امکانات محسوس کرتے ہیں؟

جواب: دیکھیے جناب! نہ میں زبان و ادب سے مایوس ہوں اور نہ کسی کو لعن طعن کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے پوری امید ہے کہ آنے والے وقتوں میں ہمارے نئے لوگ، ہمارے نئے نقاد بہتر طور پر ادب کی افہام و تفہیم کی راہ روشن کریں گے۔ بہت سے نئے لوگوں کی تحریروں سے میں یہ امیدیں رکھتا ہوں۔ ان لوگوں کے یہاں امکانات ہیں لیکن انھیں عصبیت اور تحفظات سے اپنے آپ کو دور رکھنا ہوگا۔ گروپ بندی اور گروہ سازی سے الگ اپنی دنیا پیدا کرنی ہوگی۔ تبھی بات بنے گی۔

ملاقاتی: آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ناسازیٔ طبع کے باوجود اپنا قیمتی وقت دیا اور اپنے خیالات سے استفادے کا موقع فراہم کیا۔

یوسف صاحب: میں بھی آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے میرے جیسے کم تر ادیب کے لیے دو دنوں تک خود کو مصروف رکھا۔ شکریہ

•••

اقبال مجید سے بات چیت

اقبال مجید کا شمار عہد حاضر کے کامیاب افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔انھوں نے اپنی فکری وفنی بصیرت کے سبب جدید افسانہ نگاروں میں اپنی منفرد شناخت بنائی ہے۔ افسانے کے علاوہ انھوں نے ڈرامہ، ناول اور الیکٹرانک میڈیا میں بھی اپنی تخلیقی کاوش کے جوہر دکھائے ہیں۔ ساتھ ہی ہدایت کار کی حیثیت سے بھی معروف ہیں ۔لیکن اقبال مجید کی شناخت اردو ادب میں افسانوی ادب کے حوالے سے ہے۔ان کی ادبی زندگی کا آغاز اس دور میں ہوا جب ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی اور اکثر وبیشتر فنکار اس تحریک کے زیر اثر ادب تخلیق کر رہے تھے۔لہٰذا اقبال مجید ابتدا میں سماجی حقیقت نگاری کے قائل تھے جس کی بھرپور عکاسی ان کے ابتدائی دور کے افسانوں میں ہوئی ہے۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ بعد کے زمانے میں انھوں نے یہ روش ترک کر دی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ادب میں داخل ہونے والے ہر نئے رجحان کو اپنے زمانے اور ادب کا تقاضہ سمجھ کر قبول کیا۔اب تک ان کے چار افسانوی مجموعے ''دو بھیگے ہوئے لوگ''، ''ایک حلفیہ بیان''، ''شہر بدنصیب'' اور ''تماش گھر'' منظر عام پر آچکے ہیں۔

سوال: آپ کی ادبی زندگی کا آغاز کس صنف سے ہوا؟

جواب: میری ادبی زندگی کا آغاز افسانہ سے ہوا۔ میں نے اپنا پہلا افسانہ ''دو بھیگے ہوئے لوگ'' 1955 میں لکھا۔ اس وقت میں طالب علم تھا۔

سوال: پہلا افسانہ جس سے آپ کو خاص پہچان ملی؟

جواب: ''عذ و چچا'' جو'شاہ راہ' دہلی میں چھپا۔ ان دنوں اس کے ایڈیٹر ظ۔ انصاری تھے۔

سوال: آپ نے ناول افسانہ اور ڈرامہ تینوں ہی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اپنے تخلیقی وسیلۂ اظہار کے طرح ان میں سے کس صنف کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں؟

جواب: اس بات کا تعین موضوع کرتا ہے کہ وہ افسانے میں پناہ لے گا تو زیادہ صحت مند ہوگا یا ناول کے کینوس میں ڈھلے گا تو زیادہ صحت مند ہوگا۔ میری سمجھ میں افسانہ، ناول یا ڈرامہ ساری اصناف اپنی اپنی جگہ پر اہم ہیں اور ان کا اپنا اپنا ایک رول ہے۔

سوال: وہ کون سے درپیش مسائل ہیں جو آپ کو چیلنج کرتے ہیں۔ مثلاً فرقہ پرستی، دہشت گردی وغیرہ؟

جواب: ہر عہد اور ہر زمانہ اپنے مسائل کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اور کشمکش سے گذرتا ہے۔ مصنف اپنے زمانے کے سارے مسائل سے پنجہ لڑاتا ہے، اپنے خیالات کے ساتھ ان سے الجھتا ہے، ان میں جیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ مسئلے کو وہ اس حل کی طرف لے جائے جس پر اس کا اپنا یقین و اعتماد ہے۔ وہ چاہے کوئی حل نہ بتائے لیکن اشارہ ضرور کرتا ہے۔ میرے خیال میں کسی بھی تخلیقی عمل کا پہلا کام ہے کہ وہ فکر کے دریچے کھولے۔

سوال: آپ ترقی پسند تحریک کے پیرو ہیں یا اس کے نظریات کی محض حمایت کرتے ہیں؟

جواب: ہم نے جس زمانے میں آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا اس وقت ترقی پسند تحریک اپنے شباب پر تھی۔ اور ہمارا حلقہ بھی اس تحریک سے وابستہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ذہنی وفکری طور پر ہم نے ادب کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا وہ درست تھا۔ ادب کو انسانی قدروں سے جوڑنا بہت ضروری ہے اور جو سماجی حالات ہیں انھیں ایک صحیح سمت دینے کے لیے ادب کی رہ نمائی لازمی ہے۔ ہم نے ترقی پسند تحریک کو ایک نئے ادبی رجحان کے طور پر قبول کیا کسی سیاسی تنظیم کے طور پر نہیں۔

سوال: گویا آپ تحریک کا حصہ نہیں ہے؟

جواب: نہیں۔ بالکل نہیں۔

سوال: قاری، ادیب سے کیا چاہتا ہے؟ کیا قاری اور ادیب ایک دوسرے کے لیے لازم ہیں؟

جواب: میں سمجھتا ہوں کسی بھی ادبی تخلیق میں قاری برابر کا شریک ہوتا ہے۔ ادیب کو اپنی بات کہنے کی آزادی ہوتی ہے اور قاری کو اپنی رائے دینے کی آزادی حاصل ہے قاری کو کسی ادیب کی تحریر کو رد کرنے کی پوری چھوٹ ہوتی ہے۔ اسی طرح ادیب کو بحیثیت مصنف یہ حق حاصل ہے کہ وہ قاری سے کہے کہ جو تم پسند کر رہے ہو وہ میں نہیں لکھوں گا یا میں نہیں لکھ سکتا۔ بصورت دیگر دونوں پر جبر ہوگا۔ اگر کوئی قاری لکھنے والے پر جبر کر رہا ہے جیسے حکومتیں کرتی ہیں کہ آپ نہیں لکھ سکتے تو یہ میرے لیے ناقابل قبول ہے۔

سوال: آپ نے علامتی افسانے بھی تخلیق کیے ہیں۔ اس نوعیت کے افسانوں میں علامتوں کا استعمال کس ضرورت کے پیش نظر کیا ہے؟

جواب: میں نے اپنے افسانوں میں علامتوں کا استعمال موضوع کو طاقت دینے کے لئے ایک ٹول (Tool) کی طرح کیا ہے۔ تاکہ اس کا اچھا لنک (Link) ہو سکے، اس میں دھار پیدا ہو سکے۔

سوال: جب علامتی رجحان عام ہوا تو اردو افسانے میں ''کہانی پن'' کی بحث چھڑی۔ عہد حاضر میں ایک بار پھر افسانہ نگار کہانی پن کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ آپ کے نزدیک افسانے میں ''کہانی پن'' کی اہمیت کیا ہے؟

جواب: جس طرح سے ایک شیروانی ہوتی ہے تو ہم کہتے ہیں شیروانی، کوٹ ہوتا ہے تو کوٹ، ان دونوں کی اپنی اپنی پہچان ہے ہم کوٹ کو شیروانی اور شیروانی کو کوٹ نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح افسانے کی بھی کچھ خصوصیات ہیں جو اسے دوسری تحریر سے الگ کرتی ہیں۔

سوال: کیا آپ یہ بتانے کی زحمت کریں گے کہ بیانیہ اور علامتی میں کون سی طرز تخلیقی وسیلۂ اظہار کے لیے زیادہ مناسب ہے، جس سے افسانے میں کہانی پن برقرار رہے؟

جواب: اس میں کسی بندھے ٹکے اصول کو نہیں اپنایا جاسکتا ہے۔ بلکہ ادیب بندھے ٹکے اصولوں کو توڑتا ہے اورنئی زمین، نئے راستے ہموار کرتا ہے۔اور دکھاتا ہے کہ ''دیکھو اس طرح سے بھی یہ کام ہوسکتا ہے۔'' کچھ چیزیں ایسی ضرور ہیں جوافسانے کو کسی اخبار کی رپورٹ یا کسی ڈرامے کے منظر سے الگ کرتی ہیں۔ میری نظر میں بیانیہ فن میں ترقی تو ہوگی لیکن کچھ حدود کے اندر رہ کر ہی ممکن ہے۔ جیسے کہ مالی پودوں کو تراش خراش کر جو بھی شکل بناتا ہے اس سے اصل پودے کی شناخت ختم نہیں ہوتی۔ فرض کیجئے کہ پودوں کو کاٹ چھانٹ کر بطخ یا طوطا بنادیا گیا ہے لیکن جن پودوں پر یہ اشکال بنائے گئے ہیں وہ تو وہی ہیں۔ جہاں تک افسانے کی بات ہے تو مجھے یہ نہیں لگتا کہ بیانیہ اور علامت ایک دوسرے کے مخالف ہیں بلکہ افسانے کے لیے یہ دونوں ایک دوسرے کے مددگار ثابت ہوسکتے ہیں۔ ایک اچھے افسانے میں ہم اچھابیان بھی پاتے ہیں اور علامتی طرز بھی دیکھتے ہیں۔

سوال: جدیدیت سے آپ کس حدتک متاثر ہیں؟

جواب: میں نے جدیدیت کو ترقی پسندی کی ضد کے طور پر قبول نہیں کیا بلکہ یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ یہ رجحان اپنے پیش رو رجحانات کے مقابلے میں کن کن Areas یا علاقوں میں تازہ دم اور Relevant ہے اور ادب کو جس نئے Value System کی روشنی میں آنک رہا ہے وہ ہماری ادبی روایت کو صحت مند طور پر آگے بڑھانے میں کہاں تک مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ میں جدیدیت سے صرف اس حدتک متاثر ہوا جس حدتک وہ ہمارے تہذیبی ورثے اور سماجی حقیقتوں کا احترام کرنے کی حالت میں رہی اور ہماری فکشن کی روایت جس کی غالب صفت حقیقت نگاری تھی، دوست بن کر نہ سہی اس کی حریف بن کر بھی نہیں کھڑی ہوئی۔

سوال: اس رجحان نے اردو افسانے کو کس طرح متاثر کیا؟

جواب: اس رجحان کے مثبت اور منفی دونوں اثرات اردو افسانے پر پڑے ہیں۔ مثبت اثرات تو نمایاں طور پر موضوعات کے انتخاب میں دیکھے جاسکتے ہیں جہاں انسان کو نئے زاویوں سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ علامتی پیرایۂ اظہار کو تخلیقی طور پر برتنے کی شعوری کوشش یہاں واضح طور پر نظر آتی ہے، تجریدیت کو فروغ دیا گیا، زبان کو چست بنایا گیا، فرد اور

اس کی آزادی کوتلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ وجودیت کی فکر کو نئے ادب میں پہنچنے کی راہ ملی اور انسان کی لاچاری کے بنیادی پہلو نمایاں کیے گئے۔ اس تحریک کے مضر پہلو یہ ہیں کہ اس نے ادب کی نشاط انگیزی اور سرشاری چھین لی۔ ایسا لگنے لگا کہ سارے افسانے صرف دو تین لوگ مختلف ناموں سے لکھ رہے ہیں۔ جس آزادیٔ اظہار کا اس تحریک نے پرچم اٹھایا تھا وہ ایک طرح کی یک رنگی اور Monotony میں بدل گئی۔ افسانے کی صنف ایک اکتا دینے والی شے بن کر بالآخر اپنے قارئین سے بالکل ہی کٹ کر رہ گئی یہاں تک افسانوی ادب قاری کے لیے نہیں صرف چند لکھنے والوں کے لیے وقف ہو کر رہ گیا۔ وہ ہی پڑھتے اور وہ ہی سمجھتے تھے۔

سوال: پچھلے پچاس برسوں میں اردو افسانے میں کون سی تبدیلیاں رونما ہوئیں؟

جواب: افسانے کے موضوعات میں تنوع پیدا ہوا۔ خارجیت کے ساتھ داخلیت پر توجہ دی گئی اور دروں بینی کی کوششیں ہوئی، ذات کے کرب اور اس کے المیے کو افسانے کا موضوع بنایا گیا۔ اسلوب، تکنیک، زبان علامتی اور تجریدی پیرایۂ اظہار میں تجربے کیے گئے۔ زبان کے تخلیقی استعمال پر زور دیتے ہوئے اختصار سے کام لیا گیا، زبان کے استعمال میں سکہ بند اور کلاسیکی رویّے کے بجائے توڑ پھوڑ ہوئی۔ اس کے ساتھ کچھ منفی اثرات بھی آئے، مغربی ادب سے ادھار لیے ہوئے مسائل جیسے فرد کی تنہائی اور وجودی افکار کی بدہضمی کے نمونے بھی دیکھنے کو ملے۔ کیونکہ اردو میں آنے والے ادبی رجحانات اکثر دیر تک رہتے ہیں۔ اس لیے ہندی افسانے کے مقابلے میں اردو فکشن میں یہ Hang Over کافی دیر تک قائم رہا۔ ان پچاس برسوں میں کم سے کم 25 برس اندھا دھند تجربوں میں گزرے، دس برس اس کے Hang Over میں پچھلے پندرہ بیس برسوں سے بدن کی ٹوٹن، انگڑائیاں لے کر دور کی جارہی ہے۔

سوال: آپ خود اپنے افسانوں میں فکر وفن اور موضوعات کی سطح پر کوئی بڑی تبدیلی محسوس کرتے ہیں؟

جواب: وہ تو ہے۔ افسانہ لکھتے ہوئے تیس پینتیس سال ہو گئے، تو تبدیلی تو ہوئی ہے۔ اب وہ تبدیلی کتنی ہے، خوشگوار ہے کہ ناخوشگوار ہے اس کا اندازہ تو ہمارے پڑھنے والے ہی صحیح لگا

سکتے ہیں۔لیکن مجھے لگتا ہے کہ موضوع کے اعتبار سے بھی اور فنی طور پر بھی تبدیلی آئی ہے۔ نئے نئے موضوعات کو چھونے کی کوشش کی ہے۔

سوال: آپ اپنے معاصرین میں خود کو کسی کے قریب پاتے ہیں یا کسی افسانہ نگار سے متاثر ہیں؟

جواب: میں نے بہت سے افسانہ نگاروں کے اثرات قبول کیے مگر میرے یہاں کسی کا مخصوص رنگ نہیں ملے گا۔

سوال: ان کے نام؟

جواب: بیدی، منٹو تو بہت خاص لوگ تھے۔بعد میں جب میں گریجویشن کر رہا تھا تو قرۃ العین حیدر اور لکھنؤ کے بہت سے افسانہ نگار مثلاً حیات اللہ انصاری اور پرانے لوگوں میں علی عباس حسینی سے متاثر ہوا۔پاکستان کے افسانہ نگاروں میں احمد ندیم قاسمی اور انتظار حسین وغیرہ بہت اچھے لگے۔

سوال: موجودہ دور میں اردو افسانے کی سمت کیا ہے؟

جواب: موجودہ افسانے نے خود کو جدیدیت کے اوڑھے ہوئے تصورات سے باہر نکالا ہے اور اپنا رشتہ براہ راست اپنے قرب و جوار کی زندگی اور اس کے مسائل سے جوڑا ہے۔وہ بیانیہ جو جدیدیت نے نکال پھینکا تھا اس کی واپسی ہو رہی ہے اور گنجلک علامت نگاری جو فیشن کے طور پر اپنائی گئی تھی اس سے پیچھا چھڑا لیا گیا ہے۔مگر اس نئی تبدیلی کو نئی راہ متعین کرنے کے لیے ترقی پسندی کی مثبت قدر یعنی نئے عہد کے انسان کے دردمند شعور سے گہری وابستگی کو ایمانداری سے قبول کرنا ہے اور جدیدیت سے زبان اور اسلوب کی تازگی لے کر علامت کے چیستان استعمال کے بجائے فکری نشاط انگیزی کے حصول کے لیے سلیقے سے اور تخلیقی طور پر اس کو برتنے کا مشکل اور صبر آزما کام نئے افسانہ نگاروں سے ہنوز متوقع ہے۔

سوال: تقسیم ہند سے اردو زبان پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟

جواب: تقسیم کے بہت برس بعد تک اردو پر یہ الزام رہا کہ اس نے ملک کو تقسیم کروایا ہے۔جس کی اردو کو کافی سزا ملی۔ہندوستان میں اردو کا وقار ہی نہیں گرا بلکہ اس کے ماضی کے بہترین

کارناموں اور جنگ آزادی کے لیے کی گئی خدمات کو بھی بھلا دیا گیا۔ پچھلے چند برسوں میں اردو کی جانب سے پرانے شکوے کم ہوئے ہیں اور اس کی زبردست پسپائی کے بعد اردو کی بحالی کے لیے کچھ مثبت اقدام بھی وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں۔

سوال: اردو زبان و ادب کے فروغ میں مختلف سرکاری اداروں کے کردار سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: جہاں تک صوبائی یا مرکزی سرکاری ایجنسیوں کی کارگزاریوں کا سوال ہے تو ان کے مقاصد، دائرۂ عمل، سرکاری مصلحتیں، محدود وسائل پھر سربراہوں کے کام کرنے کے طریقے ان کی علمی و ادبی لیاقت اور جذبۂ خدمت ان سب چیزوں کو دیکھتے ہوئے ان اداروں کی کارگزاریوں کی سطحیں بھی مختلف ہوتی ہیں لیکن ان کی کارکردگی اور سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے ساتھ یہ دیکھنا بہت ضروری ہے کہ غیر سرکاری ایجنسیاں ان کاموں کی انجام دہی میں کس حد تک مصروف ہیں یعنی غیر سرکاری انفرادی اور اجتماعی پروگراموں اور سرگرمیوں کے بغیر اس زخم خوردہ زبان کے زخموں کا اندمال ممکن نہیں ہے اور صورت حال کا یہی پہلو ابھی بھی مایوس کن ہے۔

•••

کملیشور سے گفتگو

جناب کملیشور ہندی کے ممتاز ناول نگار ہیں، حال ہی میں ان کے ناول ''کتنے پاکستان'' پر انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ہے۔ جناب کملیشور کا انٹرویو بشکریہ'' عالمی سہارا'' دہلی 24 جنوری 2004 قارئین کی نذر ہے۔

سوال: ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملنے کے بعد آپ کیسا محسوس کرر ہے ہیں؟

جواب: میں تمام قارئین کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی وجہ سے میری حوصلہ افزائی ہوئی اور مجھے لگا کہ جو کچھ میں نے لکھا اسے پسند کیا گیا۔

سوال: آپ کے ناول ''کتنے پاکستان'' میں وہ کون سی خصوصیات ہیں جو قاری کو پڑھنے پر مجبور کر دیتی ہیں؟

جواب: میں اپنے قارئین کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ بھائی دیکھو ہماری جو تاریخ، جو تہذیب اور جو پوری سنسکرتی ہے اس کا لب لباب، اس کا جز و یہ ہے اور اس سچائی کو غلط تاریخ نے، غلط سیاست نے، غلط منصوبوں اور غلط ارادوں نے بہت ڈھک دیا تھا اور ڈھکے ہونے کی وجہ سے ان

کے دماغ بھی پریشان ہوتے تھے۔ اس صورت میں مجھے لگتا تھا کہ شاید یہ ناول ان کی بے چینیوں کو کم کر سکے اور انھیں یہ بتا سکے کہ دراصل سچائی اور اصلیت کیا ہے اور اس کا مطلب کیا ہے اور خود وہ اپنے نتیجے بھی نکال سکیں۔

سوال: آپ نے اپنے ناول کا نام ''کتنے پاکستان'' ہی کیوں رکھا، جبکہ ناول پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا نام تو کچھ بھی ہو سکتا تھا؟

جواب: دراصل میں نے پاکستان کو ایک Metaphor کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس کا نام ''کتنے ہندستان'' بھی ہو سکتا ہے، 'کتنے کوسوو' بھی ہو سکتا ہے، 'کتنے یوگوسلاویہ' بھی ہو سکتا ہے، اس کا نام 'کتنی تہذیبیں' بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ انسان اور انسان کے درمیان بٹوارہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ آخر کہیں تو انسان اور انسانی نسل یہ سوچنے کے لیے مجبور ہوگی کہ ہم بٹتے ہوئے کب تک چلے جائیں گے۔ موت زندگی کی اتنی بڑی سچائی ہے کہ وہ ہمارے سامنے کھڑی ہے اور ہم خود موت کا سامان پیدا کریں تو یہ ہمارا فرض نہیں ہے۔ انسان، انسان کے لیے موت کا سامان پیدا کر رہا ہے۔ اس صورت میں آخر کہاں سے انسان اپنے جینے کی شرطیں نکالے اور یہی شرطیں میں نے اپنے ناول میں نکالنے کی کوشش کی ہے۔

سوال: آپ کے ناول ''کتنے پاکستان'' کا اردو ترجمہ مکتبہ استعارہ نے شائع کیا ہے۔ اس کے مطالعے سے لسانی طور پر ہندی اور اردو میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ہندی اور اردو کی لفظیات ایک جیسی معلوم ہوتی ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: سب سے بڑی بات یہ کہ ہندی اور اردو میں فرق ہے یا نہیں ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ فرق تو اس وقت ڈالا گیا جہاں سے کہیں نہ کہیں مذہب کی بنیاد پر ان دونوں بھاشاؤں کا شدھی کرن کیا گیا۔ چاہے یہ شدھی کرن ہندی کا رہا ہو یا اردو کا۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ غلط تھا۔ ہمارے پاس جو شاہی روایت ہے یعنی جو امیر خسرو سے لے کر ہم تک آئی ہے، وہ روایت اہم ہے۔ اس کی لپی الگ ہے لیکن زبان ایک ہے۔ میرے لیے تو ہندی اور اردو دونوں ہی زبانیں ایک ہیں۔ اب چاہے اسے میں دیوناگری اسکرپٹ میں لکھوں یا چاہے اردو زبان یا فارسی رسم خط میں۔ مثلاً آپ میرا نام کسی بھی رسم خط میں لکھیے لیکن ایک ہی رہے گا نا......؟

سوال: آپ کے ہم عصر اردو اور ہندی فکشن رائٹرز جو کچھ لکھ رہے ہیں یا لکھ چکے ہیں ان میں فکر اور تکنیک کی سطح پر کیا کوئی مماثلت یا فرق دکھائی دیتا ہے؟

جواب: دیکھیے فکشن رائٹر چاہے وہ اردو کا ہو یا ہندی کا اس کی فکر، اس کا سوال، اس کی پریشانیاں اور اس کی سچائیاں ایک ہیں۔ لیکن وہ الگ الگ صنف سے دیکھ رہے ہیں۔ آج کے جیسے حالات ہیں میں نہیں سمجھتا کہ اردو، ہندی یا پنجابی فکشن میں کسی نے بھی فرقہ واریت کو یعنی فرقہ وارانہ سوچ کو صحیح ٹھہرایا ہو، کیونکہ یہ بہت بڑی چنتا ہے ہمارے لیے، اسی کے ساتھ ساتھ چاہے وہ ہندو فرقہ پرست ہو، چاہے مسلم، عیسائی، سکھ یا پنجابی فرقہ پرست ہو، تینوں زبانوں (اردو، ہندی، پنجابی) میں سبھی نے بڑی گہرائی میں جا کر ان تمام منصوبوں کو اجاگر کیا ہے اور ان پر سے پردہ اٹھایا ہے اور یہ ایک بہت بڑی سچائی کے روپ میں ہمارے سامنے بھی ہے۔

سوال: تکنیک اور اسلوب کی سطح پر فرق کی بات تو رہ ہی گئی۔

جواب: تجربات تو سب کرتے ہیں کیونکہ ہر بار بات کو الگ ڈھنگ سے کہا جاتا ہے۔ تجربات تو ہندی، اردو اور پنجابی میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بات یوں ہی نہیں یوں بھی کہی جا سکتی ہے۔ اسٹائل دراصل کنٹینٹ نہیں ہے بلکہ اس کی پوشاک ہے۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ ایوارڈ تخلیق کا میزان نہیں ہے۔ پھر بھی ایوارڈ حاصل کرنے والوں کی ایک بھیڑ لگی رہتی ہے اس کے لیے جوڑ توڑ بھی کی جاتی ہے۔ آخر ایسا کیوں؟

جواب: میں نے ایوارڈ کو کبھی نہ اچھا کہا اور نہ ہی برا۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ جن تخلیق کاروں کو اپنی تخلیق پر بھروسہ ہے انھیں کچی عمر میں ایوارڈ نہیں لینا چاہیے، کیونکہ ہمارے لکھنے کا یہ ایک ایسا دور ہوتا ہے جب ہم سچائیوں کو سمجھنے میں لگے ہوتے ہیں۔ اس وقت جو لوگ ایوارڈ دیتے ہیں وہ ہمیں سچائیوں کو اپنی طرح سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں چاہوں گا کہ اس کوشش سے سب کو بچنا چاہیے، کیونکہ خود اپنے وجود سے، اپنی آنکھ سے، اپنے جذبات اور اپنے آنسوؤں سے اگر وہ کچھ دیکھ سکے تو یہی بہتر ہوتا ہے۔ وہ ایوارڈز

جو individual ہوتے ہیں اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔ میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کا اس لیے زیادہ استقبال کرتا ہوں کہ وہ کسی ایک شخص کا دیا ہوا ایوارڈ نہیں ہے۔ انھوں نے جس کو بھی ایوارڈ دیا، میں اسے غلط نہیں مانتا بلکہ صحیح مانتا ہوں اور دیر سویر تو ہوتی رہتی ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے تو اتنی دیر سے ایوارڈ لیا ہے، لیکن جب اسے کوئی شخص دیتا ہے یا ایک آدمی کی کوئی چھوٹی موٹی تنظیم دیتی ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے وہ اپنی مخصوص سوچ کے دائرے میں ادب کو لانا چاہتا ہے۔

سوال: آپ نے ابھی کہا کہ مجھے تاخیر سے ایوارڈ ملا تو کیا اس سلسلے میں آپ کو کوئی شکایت نہیں؟

جواب: نہیں۔ میں نے ایوارڈ دیر سے ہی لینا شروع کیا تو پھر شکایت کیسی؟ اب مجھے جو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا ہے وہ خالص تخلیق پر ملا ہے، اس لیے مجھے خوشی ہے۔

سوال: نئے فن کاروں کے ٹیلینٹ کے بارے میں آپ کا کیا کہنا ہے؟

جواب: مجھے تو لگتا ہے کہ ہمارا یہ کنبہ اتنا پھلا پھولا ہے کہ جس کی کوئی مثال نہیں۔ نئے لوگوں میں مجھے جو نئے dimensions دکھائی دیتے ہیں، اس سے مجھے بہت خوشی ہوتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ میں ''پورا'' ہو رہا ہوں۔ مجھے کوئی یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ میں ان لوگوں کو نہیں پڑھتا ہوں۔ میں سب کو پڑھتا رہتا ہوں اور مجھے ان کی صلاحیتوں پر فخر ہوتا ہے۔

سوال: سید محمد اشرف کو اردو میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا ہے۔ آپ کی فکشن اور سید محمد اشرف کے فکشن میں کیا کوئی فاصلہ ہے؟ آپ انھیں کس طرح سے دیکھتے ہیں؟

جواب: دیکھیے اشرف صاحب کا جو فکشن ہے وہ انتہائی سہل اور آسان ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس میں مجھے بڑی گہرائیاں نظر آتی ہیں، کیونکہ پچھلے دنوں جتنی غیر معمولی سچائیاں ہمارے سامنے آئیں ان کے درمیان اپنی سچائیوں اور اپنے دور کی سچائیوں کو سنبھالے رکھنا کوئی معمولی کام نہیں۔ انسان کو راحت دینا اور اس کے دل کی گہرائیوں میں سے کچھ ایسی چیزیں نکال کر لے آنا جسے وہ خود نہیں پہچان سکتا، مجھے لگتا ہے کہ اشرف صاحب نے یہ ایک بڑا کام کیا اور وہ بھی بہت آسان اور سہل طریقے سے۔

سوال: بحیثیت تخلیق کار آپ یہ بتائیں کہ ایک نقاد کی کیا ذمے داریاں ہوتی ہیں؟

جواب: دیکھیے! کویتا کا تجزیہ کر لینے کی تو ایک روایت رہی ہے۔ فکشن کو analyse کرنا اور اس کی گہرائیوں کو سمجھنے کی روایت واقعی ہندی اور اردو میں پروان نہیں چڑھ سکی ہے۔ یہ میں مانتا ہوں لیکن فکشن کی تنقید کو فروغ دینا تو نقادوں کی ذمے داری ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ فکشن کی تنقید قاری کو کہانی سمجھا سکتی ہے۔ اگر کہانی خود نہیں سمجھا پاتی اپنی بات تو پھر اور کون سمجھائے گا۔ ہاں نقاد کہانی کو 'دھروہر' کے طور پر مہیا کرانے کا کام ضرور کر سکتے ہیں اور آج اسی کی کمی ہے۔ مثلاً 'پنچ تنتر' اور 'ہزار داستان' یا اس طرح کی تمام داستانوں کا جز و نکال کر ہمارے سامنے نہیں رکھ دیا گیا ہوتا تو ہم اپنے بہت بڑے سرمایے سے کٹ گئے ہوتے۔ سرمایے کو بچانا اور سرمایے کی اندرونی طاقت کو بنائے رکھنا نقاد کا ایک اہم فریضہ ہے۔

سوال: مزید کوئی ایوارڈ حاصل کرنے کی آپ کی خواہش؟

جواب: (ہنستے ہوئے) دیکھیے! ہمارا ایوارڈ تو ہمارا قاری ہے۔

سوال: آج نفرت کے اس ماحول کو کس طرح سے خوش گوار بنایا جائے؟

جواب: وہی پیغام جو میں نے ''کتنے پاکستان'' میں دیا ہے۔ دیکھیے! مغرب سے ایک خیال آیا Clash of Civilization اور میں کہتا ہوں کہ co-existence of civilization، دراصل بھائی چارگی، میل ملاپ، امن اور محبت میں ہی تمام انسانیت کی بھلائی کا راستہ موجود ہے۔

•••

امرتا پریتم سے گفتگو

ساہتیہ اکادمی اور بھارتیہ گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ پدم وبھوشن محترمہ امرتا پریتم کی پیدائش پاکستان کے ضلع گجرانوالہ میں 31 اگست 1919 کو ہوئی۔ لاہور (پاکستان) میں تعلیم حاصل کی۔ ان کے والد برج بھاشا کے شاعر تھے۔ فرانس، روس، جرمنی بلغاریہ، رومانیہ، یوگوسلاویہ، چکوسلواکیہ، ہنگری، نیپال اور ماریشس جیسے ممالک نے امرتا پریتم کے شاعرانہ وقار کو دل و جان سے سراہا اور اپنی اپنی زبانوں میں ان کے تخلیقات شائع کیں۔ ''انچاس دن''، ''ناگ منی''، تیرھواں سورج''، ''پنجر'' (ان کے مشہور ناول) اور خودنوشت ''رسیدی ٹکٹ'' کو قارئین نے بے حد پسند کیا۔ امرتا پریتم مئی 1986 میں راجیہ سبھا کے لیے چنی گئیں۔ ان کی تخلیقات 95 کتابوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں نظمیں، کہانیاں، ناول اور مضامین سب شامل ہیں۔

سوال: آج کی نوجوان نسل آسانی سے سہل الحصول چیزوں کی طرف ہی متوجہ ہوتی ہے۔ اس رویے کے بارے آپ کیا کہیں گی؟

جواب: آج کی نوجوان نسل کا ذہن تجارت اور سائنس کی طرف زیادہ راغب ہو رہا ہے۔ زندگی میں صالح عالمی اقدار کی اہمیت باقی ہی نہیں رہی۔ اہمیت اب صرف جلد از جلد مال جٹا کر

ایک دم امیر ہونے کی ہے۔ لوگوں کا یہ نظریہ بن چکا ہے کہ جتنی دولت ہوگی اتنی ہی زیادہ عزت ملے گی۔ اسی لیے لوگ مال جمع کرنے کی خاطر ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ سنگ تراش چاقو، چھری اور چھینی سے بت تراشتا ہے لیکن فن کی سچی آگہی نہ ہو تو اناڑی پن کی وجہ سے بت بنتے بنتے بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ اناڑی کے پتھر تراشنے اور نوجوان نسل کی افراتفری میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہماری نوجوان نسل کو اپنے ہاتھ لمبے کرنے چاہئیں تا کہ اس میں چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی سما سکیں۔ اگر چیزیں بڑی ہوں گی تو چھوٹے ہاتھ کیا کریں گے؟

سوال: کیا آپ کو بچپن میں کبھی ایسا محسوس ہوا تھا کہ آپ کو اتنی شہرت و مقبولیت حاصل ہوگی؟

جواب: بچپن بڑا ہی پیارا اور بھولا دور ہوتا ہے، کیا کوئی بچہ ان بلندیوں کے بارے میں کبھی سوچ بھی سکتا ہے، میرا خیال ہے نہیں۔ زندگی کی امید و مسرت کے احساسات وقت کے ساتھ خود بخود سوچنے اور لکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ایسا ہوتا ہے تو ہاتھ رکتے ہی نہیں۔ آج میں پھر یہ کہنا چاہتی ہوں کہ نوجوان نسل کو طاقت سے، نام سے، دولت سے، ہنر سے اور اپنی ہمت سے اپنے کام سنبھالنے چاہئیں۔ اپنے لمبے ہاتھوں کو چھوٹا نہ ہونے دیں، اپنا کردار خود بنائیں اور اپنی اور دیش کی ترقی کے لیے مثبت سوچ پیدا کریں کیونکہ کامیابی و ترقی کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔

سوال: آپ اپنے بچپن کا کوئی ایسا واقعہ بتائیں گی، جس نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہو؟

جواب: میں بہت چھوٹی تھی اور اپنی ماں کی چارپائی کے پاس بیٹھی رو رہی تھی کیونکہ میری بیمار ماں آخری سانسیں لے رہی تھی۔ اتنے میں میری ایک سہیلی چلی آئی اور بولی، امرتا اٹھ، خدا بچوں کی دعائیں سنتا ہے۔ جا اپنی ماں کی صحت کے لیے دعا مانگ۔ میں اٹھی اور نہایت دلجمعی سے خدا کے حضور میں ہاتھ پھیلا کر دعا مانگنے لگی۔ لیکن ماں کا آخری وقت آچکا تھا اس لیے میری دعا کارگر نہیں ہوئی۔ یہ حادثہ میرے من پر ایک اَن مٹ چھاپ چھوڑ گیا۔ کسی کے بھی پوچھنے پر کہ کیا خدا ہے؟ میرا جواب بڑے یقین سے ہوتا تھا کہ 'نہیں'، کیونکہ ایشور ہوتا تو میری فریاد ضرور سنتا۔

سوال: کیا خدا کے نہ ہونے کا بچپن کا وہ نظریہ ابھی تک ویسے ہی برقرار ہے؟

جواب: نہیں۔ وہ ایک بچپنا تھا اور کم عقلی تھی جس کی بنا پر اس قسم کا غلط نظریہ قائم ہونے لگا تھا۔ کوئی بھی بچہ ایسے واقعے کے بعد ایسا ہی سوچے گا اور کرے گا جیسا کہ میں نے کیا۔

سوال: تو کیا آپ اب مانتی ہیں کہ آنے والا مستقبل، مقدر صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے؟

جواب: دیکھو بھئی (تھوڑا مسکراتے ہوئے) اللہ تعالیٰ کوئی واحد ہستی تو ہے نہیں جو بیٹھا سوچتا رہتا ہے کہ کیا کب کرنا ہے اور کیا کب نہیں کرنا۔ The Master is not a person, He is only a presence آنے والا مستقبل ایک حد تک گزرے ہوئے کل یعنی ماضی پر منحصر ہوتا ہے۔ آدمی کے اپنے ہاتھ میں ہے کہ وہ اپنے مستقبل کو اپنے ہاتھ سے بنائے سنوارے کیونکہ ماضی میں کیے ہوئے اس کے کام، اس کے آنے والے مستقبل کو بگاڑنے اور سنوارنے میں معاون ہوتے ہیں۔ ماضی مستقبل کی ایک بہت ہی اہم کڑی ہے۔

سوال: کام کرنے پر یقین، اس کی اہمیت، زندگی سے وابستگی مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں گیتا کے شلوک سن رہی ہوں۔ گیتا میں کہا گیا ہے "تمھارا فرض صرف عمل کرنا ہے۔ پھل کی پرواہ کرنا نہیں۔ نہ کبھی پھل کو اپنا مقصد بناؤ، نہ اپنے آپ کو ناکارگی کا شکار ہونے دو۔" یقیناً جہد مسلسل ہی سچی کامیابی اور کامرانی ہے۔ صحیح اور سیدھا راستہ ہی زندگی کا مقصد ہونا چاہیے۔ واقعی یہی زندگی جینے کا وہ درس ہے جو ہمیشہ ہمارے لیے خضر راہ ہونا چاہیے۔ بہر طور آپ ہمیں یہ بتائیے کہ آپ کو اس مقام تک پہنچانے میں آپ کے خاندان کا کیا رول رہا ہے۔ کیا آپ کے خاندان کا ماحول بھی ادبی تھا؟

جواب: ماں کی وفات کے بعد میں اپنے والد سے ہی متاثر رہی۔ وہ اپنے وقت کے ایک اچھے اور سلجھے ہوئے ادیب اور شاعر تھے۔ ادب سے میری دلچسپی میرے والد کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ یہ ان ہی کے طور طریقے تھے جو مجھے ملے۔ یہ ان ہی کا ڈالا ہوا بیج تھا جسے میں نے اپنے خون سے سینچا اور اپنی ذات میں جھیلا۔ میرے والد کی ذات، اُن کے احساسات ہی نے میرے جیون کو سجایا اور سنوارا ہے۔ وہ میرے گرو اور مرشد تھے۔

سوال: لیکن آپ کی شادی تو ایسے ادبی ماحول میں نہیں ہوئی تھی؟

جواب: شادی کے بعد جب مجھے ایسا ماحول نہیں ملا جو میرے ان سنسکاروں کو بڑھاوا دیتا، تو میں نے اپنے ماحول خود بنایا کیونکہ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا ضروری تھا۔ محنت، لگن، جنون کو زندہ رکھنے کے لیے جس قسم کی قربانی کی ضرورت تھی، میں نے دی۔ میں اسے کسی بھی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

سوال: وہ بیج آج، بھرپور شاخوں سے لدا سجا ایک بڑ کے پیڑ کی طرح میرے سامنے ہے۔ آپ زندگی کی کن کن دشواریوں سے گزری ہوں گی۔ ایک عورت ہونے کے ناطے میں بخوبی اس کا اندازہ کر سکتی ہوں۔ بہر طور اسی سے جڑا ایک اور سوال یہ ہے کہ آپ کے ادبی کردار کو نکھارنے میں کون سے پہلو زیادہ اہم ثابت ہوئے ہیں؟

جواب: میں سب سے زیادہ بھارت کی قدیم تاریخ اور ارسطور کی زیر بار ہوں۔ اپنشدوں نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ بچپن سے ہی میرا من گھر نتھوں کو پڑھنے اور سمجھنے میں لگتا تھا۔ صوفی واد میں کبیر، دادو، بلھے شاہ سے میں خاصی متاثر رہی۔ ہاں میرے والد کے پاس اور بھی بہت پرانے گرنتھ تھے جن کا پڑھنا ہی میری اصلی تعلیم تھی۔ وارث شاہ کے بول میرے جذبات و احساسات کو بیدار کرنے میں کافی معاون ثابت ہوئے اور اس کا اثر آج تک ہے۔ شرت چندر اپنی مثال آپ تھے، ایک دم دوسروں سے الگ۔ آج کل میں رجنیش سے متاثر ہوں۔ ہاں اپنے غیر ملکی سفر کے دوران بدیشی شاعروں کی شاعری سے بھی بہت متاثر ہوئی ہوں اور ان کی اجازت سے میں نے ان کی شاعری کا ترجمہ پنجابی اور انگریزی میں کیا ہے اور ایسا کرتے ہوئے مجھے بہت اطمینان ہوا ہے۔

سوال: آپ کی سیاست اور پارلیمانی دور!

جواب: اچھا تھا۔ پر سیاسی ٹرم کا پورا ہونا اور بھی اچھا لگا تھا کیونکہ میرے بنیادی خیالات سے اُدھر کوئی متفق نہیں تھا۔ ویدوں کا کہنا ہے کہ "جڑ کی قدر کرو ورنہ نئے پتے نہیں آئیں گے اور آنے والے نئے پتوں کی قدر بھی کرو۔" لیکن آج جمہوریت کے نام پر ووٹ یعنی سیاسی طاقت حاصل کرنا ہی ہمارے اکثر سیاست دانوں کا پہلا اور آخری مقصد ہوتا ہے۔

سوال: کیا آپ کی جوانی کے دور میں دیش کی حالت ایسی ہی تھی یا کچھ مختلف تھی؟

جواب: میں نے دیش کی تقسیم 1947 میں دیکھی ہے البتہ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ یہ حالت ختم ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ فلم ''پنجر'' 1947 میں ہوئی تقسیم ہی کی دین ہے۔

سوال: ''ایک تکیہ تیرے نام'' میں آپ نے لکھا ہے'' جیسا کہ رام نرائن نے کہا— کہتے ہیں خدا جب امرتا کا مقدر لکھنے بیٹھا تھا تو امرتا نے کہا۔ ذرا قلم مجھے دیجیے میں نوٹس تیار کر دوں اور جب قلم اس کے ہاتھ میں آ گیا تو اس نے قلم خدا کو لوٹایا ہی نہیں۔''

جواب: (ہنستے ہوئے) ارے بھئی میں تو انسان سے بھی جھوٹ نہیں بول سکتی۔ جھوٹ! توبہ توبہ۔

سوال: 1947 میں ہونے والی ملک کی تقسیم کے وقت آپ نے کیسا محسوس کیا تھا؟

جواب: میں نے اپنی نظم 'مجبور' میں اس کی عکاسی کی ہے۔ نظم ''وارث شاہ سے'' میں بھی اس الم ناک صورتِ حال کو پیش کیا گیا ہے۔

پنجاب کی ایک بیٹی روئی تھی
تو نے ایک لمبی داستان لکھی
آج لاکھوں بیٹیاں رو رہی ہیں
وارث شاہ تم سے کہہ رہے ہیں
پنجاب کی حالت دیکھو
اور عشق کی کتاب کا
کوئی نیا ورق کھولو

1947 میں جب بھارت اور پاکستان پر قہر ٹوٹ رہا تھا، ہجرت، مارکاٹ، دنگے فسادوں سے پورا ملک بدحال تھا، کس کو پتہ تھا کہ ہم سب ایک ڈال اور پات پر جینے اور مرنے والے الگ ہو جائیں گے اور ہم ہی ایک دوسرے کی عصمت لوٹیں گے۔

سوال: آپ کے ناولوں و کہانیوں میں اکثر عورت کا کردار اپنے پچھلے جنم کی کوئی حقیقت و پرچھائیاں تراشتا ہے۔ لگتا ہے پرچھائیوں کی تلاش ابھی پوری نہیں ہوئی۔ پیاس باقی ہے؟

جواب: یہ حقیقت ہے کہ محبت کا دروازہ جب دکھائی دیتا ہے تو اسے ہم ایک نام سے وابستہ کر دیتے ہیں لیکن اس نام میں کتنے نام ملے ہوئے ہوتے ہیں، کوئی نہیں جانتا۔ شاید قدرت بھی بھول چکی ہوتی ہے کہ وہ جن دھاگوں سے اس ایک نام کو بُنتی ہے وہ دھاگے کتنے رنگوں کے ہوتے ہیں۔ کتنے جنموں کے ہوتے ہیں۔ میرے لیے ایک ہی نام ہے جو روح کی آواز جیسا ہے۔ ''امروز'' میں میں نے لکھا ہے۔

ابھی ابھی دنوں میں جب لکھا
تم ملے
تو کتنے ہی جنم
نبض بن کر
میرے بدن میں دھڑکنے لگے
اب کون وید میری نبض دیکھے گا

سوال: کیا اس 'تم'' کو کوئی الگ نام دیا جا سکتا ہے؟ جن دھاگوں سے قدرت نے امروز کا نام بن دیا ان دھاگوں میں خدا بھی شامل ہے اور جب خدا ہی اس میں شامل ہو گیا تو کس کا نام باقی رہ جائے گا۔

جواب: امروز کے ہنر کی بات میں نہیں کرتی میری شاعری کو لکیروں میں اتارنا یا تو اللہ کا کام ہے یا امروز کی میرا ایک رنگ میں رنگی ہوئی اور اس کے رگ رگ میں بسنے والے کرشن کئی رنگوں میں بھیگے ہوئے ہیں۔ ارے بھئی امروز تو عنبر کا پانی ہے۔

سوال: آپ کے ناول ڈاکٹر دیو سے لے کر انچاس دن، تیرھواں سورج، آگ کے پتے، ناگ منی، پنجر اور ایک تھی سارہ، درویشوں کی مہندی، ان سب میں عشق و محبت کا ایک ہی انداز ہے جسے تیاگ کہا جا سکتا ہے۔ ہر جگہ ایک تشنگی ایک پیاس کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: اکثر یہی تو ہے ہم عام آدمیوں کی زندگی، ہماری خواہشیں کہاں پوری ہوتی ہیں؟

سوال: آپ نے اپنی کہانیوں اور ناولوں میں عورت کو اس طرح پیش کیا ہے کہ محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ہماری اپنی ہی کہانی ہے۔ جب ناول 'ڈاکٹر دیو' میں ممتا کے صاف صاف ظاہر کرنے پر

کہ اس کی ایک شادی پہلے بھی ہو چکی ہے اور اس سے ایک بچہ بھی تھا تو کس طرح اس طرح پیار کرنے والا خاوند ایک دم اس سے دور ہو جاتا ہے۔ اس کا سارا پیار نفرت میں بدل جاتا ہے۔ وہ بچے کو بھی اس کے سائے سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ سیکڑوں سال سے عورت کی حالت میں کوئی بدلاؤ نہیں آیا؟

جواب: ہم Male dominated society میں رہتے ہیں جہاں مرد کچھ بھی کرے، کوئی نہیں بولتا، لیکن عورت کی ذرا سی غلطی پر اس کو سزا کا مستحق قرار دیا جاتا ہے۔ ہم آج اکیسویں صدی میں پہنچ کر بھی وہیں کھڑے ہیں۔ عورت کو اس کا درجہ دینا مرد کے بس کی بات نہیں۔

●●●

غضنفر سے گفتگو

معروف افسانہ نگار اور ناول نویس غضنفر مرکزی حکومت کے اہم لسانی ادارے ''اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر''، لکھنؤ کے پرنسپل ہیں۔ ان کی پیدائش بہار کے گوپال گنج ضلع میں 1953 میں ہوئی۔ اب تک ان کے سات ناول ''پانی''، ''کینچلی''، ''کہانی انکل''، ''مم''، ''دویہ بانی''، ''فسوں'' اور ''وش منتھن'' شائع ہو چکے ہیں۔ پچاس سے زیادہ افسانے اور سکڑوں نظموں اور غزلوں کے علاوہ انھوں نے ''مشرقی معیار نقد'' اور ''زبان و ادب کے تدریسی پہلو'' جیسی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ حاضر خدمت ہے جناب غضنفر سے صفدر امام قادری کی یہ گفتگو۔

سوال: اردو کو عام لوگوں کے درمیان پہنچانے اور اس کی ترویج و اشاعت کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ آپ ایک تخلیقی فن کار ہونے کے ساتھ ساتھ اردو تعلیم و تدریس سے بھی براہِ راست جڑے ہوئے ہیں، اپنے تجربات کی بنیاد پر بتائیے کہ تدریسی عمل کو بہتر بنانے کے لیے کیا اقدامات کیے جانے چاہئیں؟

جواب: نئے تناظر اور تقاضوں کے تحت نصاب کی جدید کاری اور اس میں ضروری ترمیم آج سب سے پہلا کام ہے۔ پرانا نصاب ہماری ضرورتوں کا ساتھ دینے سے قاصر ہے۔ اس میں نئے رجحانات اور تازہ تبدیلیوں کی نمائندگی نہیں ہو رہی ہے۔ معاصر ادب کا تناسب موجودہ

نصاب میں کافی کم ہے جبکہ اس کا حصہ زیادہ ہونا چاہیے۔ ہماری کتابوں میں قدیم سے جدید ادبی نمونوں کا سلسلہ پڑھایا جاتا ہے جبکہ اس کی ترتیب کو بالکل الٹ دینے کی ضرورت ہے۔ پڑھنے والا چونکہ آج کی زبان سے واقف ہے، اس لیے اسے آج کی زبان پڑھانے کے بعد مرحلے وار پیچھے کی طرف لے چلنا چاہیے۔ اس سے پڑھنے والوں کو زیادہ آسانی ہوگی۔

سوال: اردو کو مقبول بنانے کے لیے اور کیا کیا جا سکتا ہے؟

جواب: اردو میں معیاری قاعدے (پرائمر) نہیں ہیں۔ اردو حروف تہجی کی تعداد اور معیار بندی کے بارے میں بھی بعض غلط فہمیاں ہیں جنھیں اب تک دور نہیں کیا جا سکا اور انھیں ہمارے پرائمر ڈھو رہے ہیں۔ اس مسئلے کے حل کے لیے اردو کے اہم ماہرین تعلیم اور دانشوروں کو مل کر ایک معیاری قاعدہ تیار کرنا چاہیے جس کی طباعت اور پیش کش بھی قومی معیار کی ہو۔ ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ کشمیر سے کنیا کماری تک اس پرائمر کے استعمال کی صورت پیدا ہو۔ اگر ہم نے سائنسی نقطۂ نظر سے تیار کیے گئے اس پرائمر کو مقبول بنالیا تو ہمارے پاس اردو پڑھنے والے طلبہ کی تعداد کئی گنا زیادہ ہو جائے گی۔ اسی کے ساتھ بچوں کے لیے کامکس اور ادب اطفال سے متعلق دوسری کتابوں کی زیادہ سے زیادہ اور دیدہ زیب طباعت عمل میں آئے تو اردو کے تئیں نوخواندہ افراد کو منعطف کرنے کا ایک بڑا ہتھیار ہمارے ہاتھ آ جائے گا۔

سوال: اردو کو روزگار سے جوڑنے کے لیے کس طرح کی تجربات کی ضرورت ہے؟

جواب: آج پروفیشنلزم کا دور ہے۔ اس لیے اس کے کندھے سے کندھا ملا کر چلے بغیر کسی زبان کی ترقی نہیں ہو سکتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو سے جوڑ کر زیادہ سے زیادہ پروفیشنل کورسیز شروع کیے جائیں۔ میڈیا کا زمانہ ہے۔ اس کی ترقی نے اردو کو سرگرم منچ فراہم کر دیا ہے۔ اردو کا اسکوپ بڑھ گیا ہے۔ پرنٹ میڈیا کے ساتھ ساتھ الیکٹرانک میڈیا میں بھی اردو جاننے والوں کو زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہو رہے ہیں۔ اینکرنگ کرنے والوں میں جنھیں اردو کی جانکاری ہے، انھیں دوسروں کے مقابلے اہمیت اور اولیت مل رہی ہے۔ صحافت سے الگ، ترجمہ کاری، اسکرپٹ رائٹنگ اور فلم کے متعدد ایسے شعبے ہیں جن میں اردو جاننے والوں کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

سوال: کیا مقابلہ جاتی امتحانات میں بھی اردو زبان وادب کے طالب علموں کے لیے بہتر مواقع ہیں؟

جواب: بہت سارے مواقع ہیں۔ میں ذاتی طور پر ایسے ایک درجن سے زیادہ لوگوں کو جانتا ہوں جنھیں صرف اردو کی بدولت ملک کی سب سے معزز نوکریاں حاصل ہوئی ہیں۔ آئی اے ایس، آئی پی ایس یا متعلقہ عہدوں کی دعوے داری اردو زبان وادب کی تعلیم حاصل کر کے بجا طور پر کی جا سکتی ہے۔ اسی کے ساتھ صوبائی مقابلہ جاتی امتحانات میں بھی اردو کے طالب علم کیوں کر کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سول سروسیز اور صوبائی امتحانات کی تیاری کے لیے کالج اور یونیورسٹی سطح پر اردو داں طالب علموں کے لیے خصوصی کوچنگ کا انتظام کیا جائے۔ اقلیتی حلقے میں کام کرنے والی تنظیموں کو آگے بڑھ کر ایسے حوصلہ مند اور باصلاحیت طلبہ کی تربیت کا معقول انتظام ہر شہر میں کرنا چاہیے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ سول سروسیز امتحانات کے لیے معیاری نصابی مواد بھی اردو میں تیار ہو جن سے فائدہ اٹھا کر ہمارے طلبہ کامیاب ہو سکیں۔

سوال: اردو کے مسائل کے حل میں کوئی نفسیاتی رکاوٹ تو نہیں؟

جواب: سب سے پہلے اردو والوں کو اپنے دماغ سے یہ بات نکال دینی چاہیے کہ اردو زبان پڑھنے لکھنے والوں کو نوکری نہیں مل سکتی۔ ہمیں اس نفسیاتی دائرے سے باہر نکلنا ہوگا۔ یہ بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ جب ہم معیار کا خیال رکھیں گے اور ہماری لیاقت کی شناخت ہو جائے گی تو حکومت یا کوئی بھی ادارہ زیادہ دنوں تک ہمیں درکنار نہیں کر سکتے۔ ہر ادارے کو 'کوالٹی' چاہیے، ایسے میں وہ ہماری صلاحیت کے استعمال کے لیے مجبور ہوں گے۔ اس لیے وہ آپ تک آئیں گے اور اردو آپ کے فروغ کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

سوال: آج کے ادب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: ہندی اور اردو دونوں میں آج بھی اسی قدر مستعدی، ایمانداری، خلوص اور خون جگر کے ساتھ ادب کی تخلیق ہو رہی ہے، جیسا ماضی کے شعرا و ادبا کرتے رہے ہیں۔ آج کی زندگی اپنی پوری آب وتاب اور تمام تر باریکی، خوبصورتی اور بدصورتی کے ساتھ ادب میں پیش ہو رہی ہے۔

افسوس اس بات کا ہے کہ آج ادب کم پڑھا جا رہا ہے۔ آج جو تخلیقات سامنے آ رہی ہیں، ان کی قدر شناسی کا کام نہیں ہو رہا ہے، جس کی وجہ سے نئے لکھنے والوں کی ادبی حیثیت کا تعین بھی نہیں ہو پا رہا ہے۔ ادب سے اس بے اعتنائی اور لا پروائی میں الیکٹرانک میڈیا اور صارفیت کا بھی بڑا ہاتھ ہے، جس کا مقابلہ ادیبوں کے ساتھ ساتھ پورے سماج کو بھی کرنا ہے۔

سوال: آپ کی نظر میں ادب کی اہمیت کیا ہے؟ اچھی تخلیق میں کون کون سی چیزیں ہونی چاہیے؟

جواب: ادب تفریح کا نام نہیں ہے۔ قدروں کی پامالی کے اس دور میں اگر حقیقی معنوں میں کوئی مرکز نگاہ یا روشنی کی کرن ہے تو وہ ادب ہی ہے۔ لیکن لفظ کی جادوگری کے بغیر کوئی آرٹ موثر نہیں بن سکتا۔ تخلیق کار اپنے خوابوں میں ایک بہترین دنیا بساتا ہے مگر بڑا ادب اس وقت سامنے آئے گا جب آپ کے لفظ تصویر بن جائیں۔ لفظ سُر بن جائیں، رنگ، پھول اور خوشبو میں بدل جائیں یہ بے جان سے لفظ۔ تب پیدا ہوگا سچا اور بڑا ادب تب سامنے آئے گی کوئی لافانی تخلیق۔

سوال: اردو اور ہندی کو قریب لانے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

جواب: جن زبانوں میں قواعدی یکسانیت ہوتی ہے انھیں الگ الگ رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اردو اور ہندی تو ایک ہی ماحول میں پیدا ہوئی زبانیں ہیں، ان کا اشتراک باہم تاریخ موجودہ عہد کے تقاضوں کا فطری نتیجہ ہے۔ دونوں زبانوں کے مشترکہ فیچرز (Features) کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ ان زبانوں میں ہندستانیت کی جو خوشبو ہے اسے اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ دونوں زبانوں کی مشترکہ اصناف پر تفصیل سے گفتگو ہونی چاہیے۔ ایسے کئی ادبی ادارے اور تنظیمیں ہیں جہاں اردو اور ہندی کے لکھنے والے جمع ہو جاتے ہیں۔ 1936 میں ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' کے قیام کے ساتھ کثیر لسانی ادبی منچ کا تصور واضح شکل لے سکا۔ یہ اشتراک ابھی تک چل رہا ہے۔ اس کے باوجود سچائی یہی ہے کہ ایسے منچ اور زیادہ نہیں بنائے جا سکے جہاں اردو اور ہندی کے لکھنے والے ایک ساتھ بیٹھنے میں کوئی پریشانی نہ محسوس کریں۔ آج جو اشتراک ہے، وہ چند منتخب اہل قلم کی لبرل اور خیر سگالی کے جذبات کی

وجہ سے ہے۔ آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے کہ اردو اور ہندی کے مشترکہ منچ کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا جائے۔ تبھی ہم اپنے لسانی تنازعات کو بھی سلجھا سکتے ہیں اور سماجی جمود اور بنیاد پرستی سے بھی مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اگر ہم نے ایسے صحت مند ماحول بنانے میں کامیابی پائی تو شاید اس ملک میں پہلی بار ادیبوں اور شاعروں کی آواز کی طاقت محسوس کی جا سکے لیکن اس کے لیے ہمیں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجدوں کو توڑنا ہوگا۔

سوال: اردو اور ہندی زبانوں میں لین دین کی موجودہ صورت حال کو آپ کس طور پر دیکھتے ہیں؟

جواب: دونوں زبانوں میں ایک دوسرے کی تخلیقات کا کثرت سے ترجمہ ہونا چاہیے۔ موجودہ صورت حال میں اس میں مزید تیزی لانے کی ضرورت ہے۔ ایک زبان میں دوسری زبان سے متعلق جن خصوصی اشاعتوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے، اسے اور مضبوط ہونا چاہیے۔ جس طرح ہندی میں اردو ادب پر مرکوز کئی رسائل کی اشاعت کا ماحول بنا ہے، اسی طرح ہندی ادب پر اردو میں کسی نئے رسالے کا تصور ناممکن نہیں، ہاں، نمائندہ ادب کو اولیت ملنی چاہیے ورنہ کچھ لوگ ہندی میں اردو کے عظیم اہل قلم معلوم ہوں گے جبکہ سچائی یہ ہے کہ انھیں اپنی اصل زبان میں ایک معمولی مقام میسر ہے۔ ترجمے کے سلسلے میں بھی ایک معیار سازی کی ضرورت ہے۔ اس میں ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ آج تک اردو اور ہندی زبانوں کو بنیاد بنا کر کوئی بڑی ڈکشنری تیار نہیں کی جا سکی۔ بازار میں جو پانچ دس لغات موجود ہیں ان میں اکثر غلط اور غیر معیاری ہیں۔ میرے ادارے ''اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر'' لکھنؤ نے اردو ہندی اور ہندی اردو لغات تیار کرنے کا کام شروع کیا ہے۔ ملک بھر سے ماہرین کی مدد لی جا رہی ہے۔ قومی اردو کونسل بھی اس جانب توجہ دے رہی ہے۔ آنے والے دنوں میں شاید یہ کمی دور ہو جائے۔

سوال: آپ کن ادیبوں سے متاثر ہوئے؟

جواب: فطرت کا قانون ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ جن لوگوں کی تخلیقات کو میں نے پڑھا، ان سے محسوس یا غیر محسوس طریقے سے متاثر ہونا فطری ہے۔ بزرگ اور عظیم لکھنے والوں نے

بلاشبہ میرے لکھنے کی صلاحیت کو جلا دی۔ اردو میں مرزا محمد ہادی رسوا، پریم چند، منٹو، بیدی، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، اقبال مجید، ہندی میں پھنیشور ناتھ رینو، منوہن راکیش، شری لال شکل، منّو بھنڈاری، راجندر یادو، اوشا پریمودا، غیر ملکی لکھنے والوں میں کافکا، گورکی، دوستوئیفسکی، ترگنیف، جیسے ادیبوں کو میں اپنی تخلیقی زندگی کے لیے رہنما تصور کرتا ہوں۔

●●●

اظہار اثر سے گفتگو

اظہار اثر کی اہمیت صرف یہ نہیں کہ وہ صحیح معنوں میں سائنس فکشن لکھنے والے اردو کے پہلے ادیب، سائنس کو شاعری کا موضوع بنانے والے پہلے صاحب کتاب شاعر، اور تقریباً 1000 جاسوسی ناول لکھنے والے اردو کے سب سے زود نویس مصنف تھے۔ ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو قارئین میں سائنسی مزاج(Scientific Temperament) پیدا کرنے اور منطق و استدلال کے ساتھ سوچنے کی عادت ڈالنے میں سب سے بڑا کردار ادا کیا۔ سائنس کے مشکل ترین موضوعات کو زود فہم بنانے میں انھیں ملکہ حاصل تھا۔ 84 سالہ اظہار اثر کی آنکھوں کی روشنی چلی گئی تھی جس کے سبب ان کا لکھنا پڑھنا تقریباً بند تھا تاہم ان کا شوق برقرار تھا اور اگر قدرت نے انھیں دوبارہ روشنی عطا کی ہوتی تو وہ ایک بار پھر اپنے قلم کا جادو بکھیرتے۔ انتقال سے صرف ایک ہفتہ پہلے دیا گیا یہ انٹرویو ان کی زندگی کا آخری انٹرویو ثابت ہوا۔ پیش ہیں اس طویل انٹرویو کے اہم اقتباس:

سوال: اظہار اثر صاحب! اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میری خواہش ہے کہ آپ اپنی مختصر سوانح خود بیان کریں۔ کیا یہ ممکن ہے؟

جواب: بالکل! جو یاد آتا جائے گا بتاتا جاؤں گا۔ میں 15 جون 1928 کو کرتپور ضلع بجنور میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی اور میٹرک کے بعد اسکولی تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔ 1942 میں لاہور کا قصد کیا اور وہاں کپڑے کی مل میں مجھے ڈافر بوائے کی نوکری ملی۔ میرا کام مشین تک بابن پہنچانا ہوتا تھا۔ ڈافر بوائے کو مشین مین بننے میں پورے ڈھائی سال لگتے ہیں لیکن میں دوسرے مہینے ہی مشین چلانے لگا تھا۔ اس کے بعد میں واپس گھر آ گیا تھا لیکن جب میں دوبارہ لاہور گیا تو وہاں ایک جوتے کی دکان پر نوکری کی۔ یہاں میں ڈبے نکال کر دیتا تھا۔ سیلز مین بننے میں کم از کم تین سال لگتے ہیں لیکن میں محض چھ ماہ میں سیلز ڈپارٹمنٹ کا انچارج ہو گیا۔ اس دوران میں اپنا پرچہ نکالنے کا خواب دیکھ رہا تھا تبھی اگست 1947 میں فسادات شروع ہو گئے اور مجھے لاہور چھوڑ کر دہلی آنا پڑا تھا۔ 1950 میں ممبئی کے لیے روانہ ہو گیا تھا جہاں میری ملاقات شوکت ہاشمی، حسرت جے پوری وغیرہ سے ہوئی تھی اس وقت وہ فلمی دنیا میں نہیں گئے تھے۔ یہ سب میرے پاس سارا سارا دن آکر بیٹھا کرتے تھے۔ اسی دوران میری والدہ نے مجھے کرتپور بلا لیا۔ میں ان دنوں نماز بہت پڑھتا تھا۔ ایک روز جب میں نماز پڑھ کر گھر میں داخل ہوا تو میری والدہ نے مجھے اپنے پاس بلا کر بٹھا لیا اور قرآن شریف اٹھا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور کہا قسم کھاؤ کہ تم میری مرضی کے بغیر شادی نہیں کرو گے۔ میں نے آج تک اس قسم کو نبھایا ہے۔ بیوی کو پسند نہ کرنے کے باوجود۔ بہت صاف بات ہے۔ اس کے بعد میں دہلی آیا اور دہلی میں چلمن اور بانو کا ایڈیٹر ہو گیا۔ کئی اور پرچے نکالے۔ آریہ ورت کا بھی ایڈیٹر ہو گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے ایک اپنا پرچہ 'انوکھا جاسوس' نکالا۔ دلچسپ بات یہ ہے اس وقت ماہنامہ شمع اور ابن صفی کے ناولوں تک کی قیمت آٹھ آنے ہوتی تھی لیکن میں نے اپنے پرچے کی قیمت بارہ آنے رکھی۔ یہ 55-1954 کی بات ہے۔ لوگوں نے کہا کہ اس قیمت پر پرچہ چلے گا نہیں لیکن میرا جواب تھا جو اظہار اثر کو پڑھے گا وہ بارہ آنے میں خرید لے گا۔ اور وہی ہوا۔ پرچہ چلا۔ میرے بعد ہی سب نے بارہ آنے قیمت کر دی تھی۔ پرچہ بہت کامیاب رہا لیکن اردو آہستہ آہستہ گرتی چلی گئی۔ سیل کم ہوتی گئی اور میں مجبور ہو گیا تھا۔

سوال: پوری اردو دنیا میں آپ کے جاسوسی ناولوں کے چرچے ہیں۔ زندگی کے 84 برس گزار دینے پر بھی آپ کے لکھنے پڑھنے کا جذبہ برقرار ہے۔ اس جذبے کو سلام کرتے ہوئے میں سوال کروں گا کہ آپ نے اپنے ادبی سفر آغاز کیسے کیا؟

جواب: میں لاہور گیا تھا۔ وہاں جانے کے بعد میرا تعلق احسان دانش صاحب سے ہو گیا۔ بعد کو میں ان کا شاعری میں شاگرد ہو گیا تھا۔ جگر صاحب سے میری ملاقات ہوئی، وہاں دیگر شعرائے کرام سے ملاقات ہوئی۔ میں 1947 تک وہاں رہا تھا۔ وہاں رہتے ہوئے میں ایک پرچہ بھی نکالنا چاہتا تھا اور وہ پرچہ شائع ہونے کے لیے بالکل تیار بھی ہو چکا تھا لیکن تبھی فسادات ہو گئے لہٰذا میں واپس آ گیا۔ تو بطور شاعر ادبی دنیا میں داخل ہونے کا یہ میرا آغاز تھا۔

سوال: یعنی ادبی زندگی کی شروعات شاعری سے کی تھی؟

جواب: یقیناً! اور اس وقت نثر لکھنے کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ یہ تو اتفاق کی بات ہے کہ جب میں دہلی آیا تو مجھے رسالہ 'چلمن' میں ایڈیٹرشپ مل گئی اور اس طرح مجھے نثر لکھنے کا موقع مل گیا۔

سوال: ادبی سفر کا آغاز شاعری سے ہی کیوں کیا؟

جواب: شاعری کا شوق مجھے بچپن سے تھا اور یہ شوق مجھے میرے قصبہ بجنور سے ملا تھا، جب میں پانچویں درجہ میں تھا۔ میں مشاعروں میں جاتا تھا اور شاعروں کی تعریف ہوتے دیکھتا تھا تو بس میرے اندر بھی شاعر بننے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ خوش قسمتی سے میرے جو انگلش کے ٹیچر تھے وہ شاعر تھے۔ محمد صابر ایوب ان کا نام تھا۔ میں ان کا دو طرح سے احسان مند ہوں۔ ایک تو یہ کہ وہ میرے انگریزی کے استاد تھے۔ میری شاعری کے شروع کے استاد بھی وہی تھے۔ دوسری چیز جو انھوں نے مجھے دی وہ سائنس کا شوق ہے۔ وہ میرے تایا کے یہاں تاش کھیلنے کے لیے آتے تھے تو مجھ سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ پہلی مرتبہ انھوں نے مجھے بتایا کہ مریخ سیارہ پر آبادی ہو سکتی ہے۔ میں اپنے انگریزی کے استاد کا احسان مند ہوں۔ دہلی آنے کے بعد میں نے نثر لکھنی شروع کی۔

رسالوں میں ایک اشتہار بھی دیا کہ اپنے نام سے غزلیں اور افسانے لکھوایئے۔ 20 روپے فی افسانہ اور 2 روپے فی شعر۔ آپ کو حیرت ہوگی یہ سن 52 کی بات ہے کہ میں ایک مہینے میں تین چار سو روپے کما لیتا تھا۔ اس زمانہ میں مجھے پارٹ ٹائم میں 40 روپے مل جاتے تھے اور تین چار سو روپے میں اس طرح کما لیتا تھا۔ تو اس طرح مجھے افسانے لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ نثر میں افسانہ لکھنا شروع کیا۔ تبھی آر یہ ورت ایک پرچہ نکلنا شروع ہوا۔ میرا پہلا افسانہ اسی میں چھپا جس پر کیس بھی چلا تھا۔ اس کے جو مدیر تھے وہ میرے پاس آئے اور بولے کہ میرے پرچے کو آپ ایڈٹ کر دیجیے۔ میں نے کہا کر دوں گا اور میں ان کے اس پرچہ کو ایڈٹ کرنے لگا۔ اسی دوران میں نے ایک فلم 'بادل' دیکھی۔ اس میں ایک ہیروئن تھی جو کہ سانپ کے شکل کا نیکلیس پہنے ہوئی تھی۔ اس کردار کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک ناول 'ناگن' لکھنے کا خیال آیا۔ مگر پہلے میں نے اس کا افسانہ لکھا۔ آر یہ ورت کے دفتر گیا تو وہاں افسانہ پسند کیا گیا اور کہا گیا کہ یہ بہت اچھا افسانہ ہے اس کو آپ ناول بنا دیجیے۔ تو میں نے اس کو ناول بنا دیا جو کہ قسط وار چھپا تھا۔ وہ ناول اتنا پاپولر ہوا کہ ایک سال میں اس کے 13 ایڈیشن چھپے۔ یعنی اردو دنیا میں اگر اظہار اثر کو کوئی چیز مقبول کرنے والی ہے تو وہ وہی ناگن ناول ہے جس کی وجہ سے آج میں قائم ہوں۔ لیکن نہ جانے کیوں بچپن سے ہی میرے ذہن میں ایک بات تھی جو میرے انگریزی کے استاد سے ملی تھی کہ مسلمان سائنس سے کیوں بھاگتے ہیں؟ میری مراد اردو والوں سے بھی ہے۔ نہ جانے کیوں سائنس والوں کو وہ ناستک (دہریہ) سمجھتے ہیں۔ مجھے بھی کہا کہ میں ناستک ہوں۔ اس پر میں نے جواب دیا کہ ناستک دنیا میں کوئی نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر میں یہ کہتا ہوں کہ خدا نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا ہے کیونکہ اگر وہ نہ ہوتا تو میں یہ کیوں کہتا کہ وہ نہیں ہے۔ تو یہ کہنا کہ تم ناستک ہو یہ نہایت بے وقوفی کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ علم حاصل کرو۔ رسول اللہ نے کہا کہ علم حاصل کرو چاہے تم کو اس کے لیے چین جانا پڑے۔ میری شروع سے یہ خواہش تھی کہ میں کوئی ایسا کام کروں کہ جس کی وجہ سے میرا نام تاریخ میں رہ جائے۔ اس کے لیے میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ میں اردو زبان میں

تاریخ میں رہ جائے۔ اس کے لیے میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ میں اردو زبان میں سائنس لکھنا شروع کروں کیونکہ اردو میں سائنس لکھنے والا کوئی ادیب نہیں ہے۔ مولوی عبدالحق نے سائنس پر کام شروع کیا تھا لیکن وہ چلا نہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اردو یا ہندی کسی نے سائنس پر توجہ نہیں دیا۔ میں پہلا شخص ہوں کہ جس نے سائنسی ادب لکھنا شروع کیا اور پاپولر سائنس اور سائنس فکشن پر بھی لکھا۔

سوال: پاپولر سائنس اور سائنس فکشن میں کیا فرق ہے؟

جواب: میں نے تقریباً 40 سائنسی ناول لکھے ہیں۔ پاپولر سائنس پر دو کتابیں آچکی ہیں اور تیسری آنے والی ہے۔ اب میں دونوں میں آپ کو فرق بتاتا ہوں۔ یہاں ہندوستان میں جاسوسی ناول چھپتے تھے تیرتھ رام فیروز پوری اور معین الدین صہبائی کے۔ پاکستان کے مشہور جاسوسی ناول نگار تھے ابن صفی۔ ان کے ناولوں کو لوگ سائنٹفک ناول کہتے تھے لیکن وہ سائنٹفک ناول نہیں ہوتے تھے۔ ایک فینٹیسی ہوتی ہے اور دوسری سائنس ہوتی ہے۔ فینٹیسی میں آپ کچھ بھی سوچ سکتے ہیں اور کسی حد تک بھی آپ جاسکتے ہیں آپ کو روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں ہوتا ہے۔ سائنس فکشن میں یہ نہیں ہے۔ سائنس فکشن میں یہ ہے کہ آپ جس سائنس کے جس موضوع پر ناول لکھتے ہیں اس میں آپ کو حدود سے باہر نہیں جانا۔ مثال کے طور پر اگر آپ کیمسٹری پر لکھ رہے ہیں۔ آپ بایولوجی پر لکھ رہے ہیں تو آپ کو اسی کی حدود میں رہنا ہے۔ اس سے آگے نہیں جانا ہے۔ اگر آپ اس کی حدود سے آگے گئے تو وہ سائنس نہیں بلکہ فینٹیسی ہو جاتی ہے۔ یہی دونوں میں فرق ہے۔ اس فرق کو کوئی نہیں جانتا لیکن میں نے اس فرق کو واضح کیا اور پھر میں نے ایسے سائنسی ناول لکھے ہیں کہ جن سے لوگوں کو کچھ حاصل ہو۔ لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہو۔ کس طرح سے جینا چاہیے۔ یہ پوری کائنات کیا ہے۔ اوکھلا سے ایک سائنس کا پرچہ نکلتا ہے۔ سائنس نامہ کے نام سے۔ شروع میں انھوں نے بہت اچھا کام کیا تھا لیکن مجھے افسوس یہ ہے کہ اب وہ بھی مذہب کے چکر میں آگئے ہیں۔ ہمارے یہاں کے جو مذہبی رہنما ہیں وہ سائنس پر توجہ دینا نہیں چاہتے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر سائنس بڑھے گی تو ہماری قدر کم ہو جائے گی۔

سوال: آپ نے اب تک ایک ہزار سے زائد ناول لکھے ہیں۔ اتنے سارے موضوعات کا انتخاب کیسے کیا؟

جواب: یہ بڑی عجیب وغریب بات ہے جس کا جواب میں نہیں دے سکتا کیوں کہ it was not my power۔ میں اس سلسلہ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ یہ خدا کی مجھ پر ایک عنایت تھی۔ یا یہ کہ اس نے مجھے ایک ایسی قوت بخشی تھی جس کا پتہ مجھے خود نہیں تھا۔ میں ایک مہینے میں تین ناول لکھتا تھا۔ سات آٹھ دن میں ایک ناول لکھ دیتا تھا۔ ناول لکھتے وقت میں نے کبھی کچھ سوچا ہی نہیں۔ یہ آپ جو پلنگ دیکھ رہے ہیں یہیں لیٹ جاتا تھا اور سوئچ آن کر دیتا تھا اور بغیر سوچے سمجھے لکھنے لگتا تھا۔ اگر میں نے پہلی لائن لکھ دی تو سمجھ لیجیے کہ ناول مکمل ہو گیا۔ خود بہ خود چیزیں آتی جاتی تھیں۔

سوال: ناول نگاری میں اسلوب پیدا کرنے کے لیے زبان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے کیا کیا؟

جواب: جہاں تک زبان کا تعلق ہے تو میں مسلم خاندان میں پیدا ہوا تھا اور میرے گھر میں ادبی ماحول تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد میرے پھوپھا تھے۔ یہ خاندانی اثر تھا جس کے سبب میں بچپن سے ہی بہتر اردو بولتا تھا۔

سوال: جب آپ نے جاسوسی ناول لکھنا شروع کیا، اس وقت ابن صفی جاسوسی ناولوں میں بہت مشہور تھے۔ تب آپ کس طرح جاسوسی دنیا میں ایک نئی راہ نکال پائے؟

جواب: میں بتاتا ہوں۔ جب ابن صفی یہاں بہت مشہور ہو گئے تو ایک بار میں کراچی پاکستان گیا تھا جہاں ایک پبلشر نے میری ان سے ملاقات کرائی تھی۔ ابن صفی نے خود مجھ سے کہا کہ اظہار صاحب میں پورے ہندوستان اور پاکستان میں صرف آپ کی عزت کرتا ہوں کیونکہ آپ نے کبھی میری کاپی نہیں کی، لیکن جتنے قلم کار ہیں سب نے میری کاپی کی ہے۔ جب ناول لکھنے شروع کیے تو میں نے سوچا تھا کہ اس سے بچوں کس طرح کہ ابن صفی کی کاپی نہ ہو۔ کہیں نہ کہیں تو ٹکر ہو جائے گی۔ تو میں نے یہ کیا کہ ابن صفی کے جو جاسوس تھے وہ سرکاری تھے اس لیے میں نے اپنے جاسوس پرائیویٹ بنائے۔ جس کی وجہ سے دونوں کی ورکنگ میں

فرق آ گیا اس لیے ٹکرانے کی گنجائش ہی ختم ہوگئی تھی)۔اچھا! ابن صفی کا جو اصل کردار تھا عمران وہ طلسم ہوش ربا کے عمر عیار سے لیا گیا تھا۔ گزشتہ دنوں کناڈا سے ایک لڑکی ہندوستان آئی ہوئی تھی جو کہ ابن صفی پر ریسرچ کر رہی تھی۔ تو میں نے اس سے کہا کہ ابن صفی جاسوسی ناول نگار نہیں تھا۔ میں نے یہ بات بہت ہی صاف طور پر اس سے کہی تھی۔ اس کی زبان اتنی خوبصورت تھی کہ وہ لوگوں کو موہ لیتا تھا۔ جاسوسی افسانے کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ پہلی لائن پڑھنے کے بعد آپ پوری طرح سے اس ناول کی گرفت میں آ جائیں۔ جب تک آپ اسے ختم نہ کر دیں اسے چھوڑیں نہیں۔ جاسوسی ناول نگار اور افسانہ نگار آرتھر کانن ڈائل تھا، اگا تھا کرسٹی تھی۔ اگا تھا کرسٹی کے 73 ناول دنیا کی ہر زبان میں چھپ چکے ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق اب سے 20 سال پہلے انگریزی میں بائبل کے بعد شیکسپیئر سب سے زیادہ چھپتا تھا لیکن آج بائبل کے بعد اگا تھا سب سے زیادہ چھپتی ہے۔ یہ اس کے جاسوسی ناول نگار ہونے کی خوبی ہے۔ ابن صفی کی زبان اتنی خوبصورت تھی کہ وہ کچھ بھی لکھتا تو لوگ اسے پڑھتے تھے۔ ابن صفی پہلے دوسرے نام سے مزاحیہ لکھتا تھا۔ مزاح جو تھا وہی اس کو اچھا بناتا تھا۔ ابن صفی کی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے مزاح سے لوگوں کو ہنساتا تھا اور لوگ اس کو مزالے کر پڑھتے تھے۔ دلچسپ بات میں آپ کو بتاؤں کہ ابن صفی کے ناولوں کی شہرت کی وجہ ایک اور بھی تھی۔ ماہنامہ جاسوسی دنیا کے مالک کے ایک عزیز ڈاکٹر حیدر، اے ایچ وہیلرز کے جنرل منیجر تھے جس کی وجہ سے 13 ہزار ناول پہلی بار میں ریلوے اسٹیشنوں پر گیا تھا۔ کسی ریلوے ایجنٹ نے واپس نہیں کیا چونکہ جنرل منیجر کا بھیجا ہوا ناول تھا۔ 13 ہزار پرچے کی کسی کو بیک مل جائے تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ مقبول ہوگا یا نہیں۔ پھر ابن صفی کی تحریر بہت عمدہ تھی۔

سوال: ہند، پاک کی نئی نسل میں آج آپ کو کوئی نظر آ رہا ہے جو جاسوسی ناول، افسانہ لکھ رہا ہو اور اس کا مستقبل روشن ہو؟

جواب: میں نے تو اس پر کئی مضامین لکھے ہیں کہ آج کے زمانے میں ناول لکھا نہیں جا رہا ہے بلکہ گڑھا جا رہا ہے۔ اس کے اندر رائٹر کو یہ خوب خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ہمیں کم تر نہ سمجھ لیا جائے اس لیے وہ معیار کی تلاش میں رہتا ہے، وہ اصلیت کو تلاش ہی نہیں کرتا کہ اسے کیا لکھنا

ہے،عوام کو کیا دینا ہے۔آج جتنے ناول اور افسانے چھپ رہے ہیں ان کو ایک عام آدمی کو دیجیے تو وہ اس کا مطلب نہیں بتا پائے گا۔مطلب یہ ہے کہ اگر میں ایک افسانہ لکھتا ہوں تو اس سے میں آپ کو کچھ دینا چاہتا ہوں۔اگر آپ اس کو پڑھیں تو اس سے کچھ تاثر لیں۔آپ کے ذہن میں وہ بات رہ جائے۔اصل چیز تو وہ ہے۔آج جدیدیت کے نام پر جو لکھا جا رہا ہے وہ کچھ بھی نہیں ہے اسے میں کچھ بھی نہیں مانتا۔

سوال: کیا جاسوسی فکشن پر داستانوں کا کچھ اثر رہا ہے؟

جواب: ہاں !بہت اثر ہے۔ داستان نے ترقی کر کے کہانی کی شکل اختیار کی۔قصہ چہار درویش، الف لیلیٰ۔یہی کہانی آگے چل کر افسانہ میں تبدیل ہوگئی۔کہانی اور افسانہ کیسے بنے یہ بڑی عجیب بات ہے۔دنیا کا پہلا افسانہ نگار ایڈگر ایلن پو کو مانا جاتا ہے۔یہ بہت ہی غمگین اور بدنصیب قسم کا شخص تھا۔پہلا افسانہ اسی نے لکھا تھا اور جاسوسی افسانے کی ابتدا بھی اسی نے کی تھی۔تو میں جو بتا رہا تھا کہ افسانہ اور کہانی میں صرف ایک ہی فرق ہے کہ کہانی آپ شروع کرتے ہیں تو اس کو آخر تک پہنچاتے ہیں اور قاری کو سمجھاتے ہیں، بتاتے ہیں کہ انجام یہ ہوا کہ مرکزی کردار کے چھ بچے ہوئے۔افسانہ میں یہ نہیں ہوتا۔افسانہ نگار افسانہ کو وہاں پر چھوڑتا ہے کہ قاری اس کا مطلب خود تلاش کرے۔وہی اچھا اور کامیاب افسانہ ہوتا ہے۔

سوال: ایک ناول آپ کتنے دنوں میں مکمل کر لیتے تھے؟

جواب: ایک ناول لکھنے میں مجھے زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کا وقت لگتا تھا۔ہر ناول سوا سو صفحات کا ہوتا تھا۔

سوال: شہرت کے عروج کا زمانہ آپ کے خیال میں کون سا تھا۔

جواب: میں ہمیشہ پاپولر رہا ہوں۔شروع سے مجھے مقبولیت حاصل ہوتی رہی ہے۔سن 1976 میں میرا پہلا انٹرویو ٹی وی پر آیا تھا۔اس وقت تک ٹی وی کلر نہیں ہوا تھا۔میرے پاس لوگ سیریل لکھوانے کے لیے آتے تھے۔میں نے کئی سیریل لکھے ہیں۔بہت سے لوگ سیریل داخل کرتے تھے لیکن ان کے سیریل منظور نہیں ہوتے تھے۔ایسے لوگوں کے میں ڈیڑھ سے دو لاکھ روپے کھائے بیٹھا ہوں۔چونکہ میں پیسے لیتا تھا اور لوگ پیسے دے کر جاتے تھے۔

سوال: آپ کہہ رہے تھے کہ فلموں میں بھی آپ نے کام کیا ہے؟

جواب: جی ہاں! میں نے فلموں میں بھی کام کیا ہے۔ ایک میرے جاننے والے تھے ان کو تاج محل میں شوٹنگ کرنی تھی لیکن شوٹنگ کرنے پر پابندی لگ گئی تھی۔ تو جب وہ میرے پاس آئے تو اس بات کا ذکر کیا اور کہا کہ تاج محل کی شوٹنگ نہیں ہو پارہی ہے میں کیا کروں۔ اس پر میں نے کہا کہ یہ کون سی بڑی بات ہے، چلو! تاج محل کا انچارج میرا دوست تھا۔ میں نے اس کو فون کیا کہ یار تاج محل میں مجھے ایک شوٹنگ کرنی ہے۔ اس پر اس نے کہا کہ شور نہ مچانا، کیمرے پر پردہ ڈال کر لے آنا میں کرادوں گا۔ تو اس طرح میں نے وہاں شوٹنگ کرادی۔ اگلے دن چشتی کے مزار پر ایک قوالی ہونی تھی۔ تو جو ایکٹر تھا اور جس کو لیڈ کرنا تھا وہ نہیں آیا۔ ڈائریکٹر پریشان ہوا کہ اتنا سب کچھ خرچ ہو گیا اور وہ نہیں آیا، میں کیا کروں؟ اس پر میں نے کہا کہ میں لیڈ کر دیتا ہوں۔ تب میں پہلی مرتبہ کیمرے کے سامنے آیا۔ اس پر ڈائریکٹر بولے خاں صاحب مٹھائی منگائیے۔ میں نے پوچھا کیوں؟ وہ بولے آپ پہلے آدمی ہیں جو کیمرے کے سامنے شرمائے نہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو معلوم نہیں کہ میں کون ہوں؟ میں نے کہا کہ میں ڈانسر ہوں۔ واقعی! میں نے دس سال کلب میں ڈانس سیکھا ہے اور کالجوں اور اسکولوں میں سکھایا بھی ہے۔ یہاں اردو کا شفیق میموریل اسکول ہے۔ اس کی حالت یہ ہوگئی تھی کہ لوگوں کو 6 ماہ کی تنخواہ نہیں ملی تھی۔ اس میں یہ ہوتا تھا کہ پہلے کچھ پیسے جمع کرنے پڑتے تھے پھر گورنمنٹ ایڈ بھیجتی تھی۔ یہ پریشانی مجھ سے بتائی گئی تو میں نے کہا کہ میں ڈانس کی پرفارمنس دیتا ہوں اس کی جو بھی آمدنی ہوگی آپ لے لینا۔ تو دلی کالج میں میں نے ڈانس کی پرفارمنس دی تھی اور اس سے جو بھی پیسے ملے تھے وہ سارے پیسے میں نے اسکول انتظامیہ کو دے دیے تھے۔ یہ بات تو شائع ہو چکی ہے۔ چونکہ ڈانسر تھا، اسٹیج پر کام کرتا تھا، ڈراموں میں بھی کام کرتا تھا۔ اسٹیج ڈرامے لکھے بھی اور اسٹیج پرفارم بھی کیا۔ مجھے مختلف قسم کے شوق تھے اور اللہ کے فضل سے ہر شوق میں میں کامیاب رہا ہوں۔

سوال: آپ نے کتنے رسالوں کو ایڈٹ کیا ہوگا؟

جواب: یہ تو یاد نہیں ہے کہ کتنے رسالوں کو ایڈٹ کیا ہوگا لیکن سن 55 اور 56 کے دنوں میں یہ بات مشہور تھی کہ دہلی سے جو بھی رسالہ نکلتا ہے اس کی ادارت اظہار اثر صاحب کرتے ہیں۔ تقسیم کے بعد دہلی میں اردو رسالے رہ ہی کہاں گئے تھے۔

سوال: شمع اور آریہ ورت کی بات آپ کر رہے تھے؟

جواب: شمع ان دنوں 21 ہزار چھپتا تھا اور آریہ ورت 18 ہزار، جس کی میں ادارت کرتا تھا۔ پھر شمع ایک لاکھ تک چھپنے لگا۔ معمہ چھاپتے تھے اور انھوں نے یہ طے کیا تھا کہ ایمانداری سے انعام تقسیم کریں گے۔ چونکہ وہ پیسے والے لوگ تھے۔ وہی ایمانداری ان کو لے ڈوبی۔ بعد میں انھوں نے انعام دینے بند کر دیے تو وہ سب بند ہو گیا۔ سب ختم ہو گیا۔ اب عالم یہ ہے کہ سب الگ ہو گئے، مکان فروخت ہو گیا ہے۔ کچھ نہیں بچا۔

سوال: ایک ناول لکھنے کے اس وقت آپ کو کتنے پیسے ملتے تھے؟

جواب: ایمانداری کی بات یہ ہے کہ شروع میں میں پچاس روپے لیتا تھا۔

سوال: اور سب سے زیادہ؟

جواب: بیس ہزار، پچیس ہزار۔ مگر اردو میں نہیں۔ ہندی میں جب لکھتا تھا تو بیس سے پچیس ہزار لیتا تھا۔ یہ ناول کئی کئی ہزار چھپتے تھے۔ اب تو ناول بکنا ہی بند ہو گیا۔ مجھے یہ گمان تھا کہ میں کبھی بھوکا نہیں مروں گا۔ پاپولر ہوں کتابیں لکھوں گا لیکن اب معاملہ یہ ہے کہ کتاب کوئی خریدتا ہی نہیں ہے۔ جو پبلشر مجھے ایک ناول کے بیس ہزار روپے دیتا تھا وہ اب دو ہزار روپے نہیں دے سکتا۔

سوال: پاپولر ناولوں کا زوال کیوں ہوا، اس کی آپ کیا وجہ سمجھتے ہیں؟

جواب: دیکھیے یہ اس لیے ہوا کہ ناول دس سے پندرہ روپے کا ہوتا تھا اور ٹی وی پر اب کچھ نہیں دینا پڑتا۔ عام طور پر ناول اس قسم کے ہوتے تھے کہ عورتیں جو ہیں وہ صبح اپنے شوہر کو دفتر اور بچوں کو اسکول بھیج کر اور دوپہر کا کھانا وانا پکا کر آرام سے لیٹ کر ناول پڑھتی تھیں۔ اب ٹی وی ہے تو پیسے کیوں خرچ کریں۔ ٹی وی کھلا ہو ٹائم پاس ہو رہا ہے تو اس طرح ناولوں کی فروخت

بند ہوگئی۔اب رسائل ہی کہاں ملتے ہیں۔شمع جو کبھی ایک لاکھ ڈیڑھ لاکھ چھپتا تھا،دس ہزار پر بند ہوا ہے۔ بھائی! کیا بتاؤں،اب پڑھنے والے لوگ نہیں رہے ہیں۔یہاں تو خیر اردو قومی زبان نہیں ہے لیکن پاکستان میں اردو قومی زبان ہونے کے باوجود کچھ بھی نہیں ہے۔

سوال: آپ کے کچھ ایسے ناول ضرور ہوں گے کہ جو کسی بھی زبان سے متاثر ہو کر نہ لکھے گئے ہوں؟ بلکہ وہ آپ کی اپنی سوچ کا نتیجہ رہے ہوں؟

جواب: ایک دو نہیں بلکہ کئی ایسے ناول ہیں جو میری اپنی فکر کا نتیجہ ہیں۔ایک تو یہ کہ جتنی بھی ایجادات ہوئی ہیں ان پر میں نے ہمیشہ ناول لکھا ہے۔سن 53-52 میں پہلی بار کارنیا کا آپریشن شروع ہوا تھا۔اس کا جب پہلا آپریشن ہوا تھا تو وہ اخبار میں شائع ہوا۔تو میں نے اس پر ناول لکھا دو آنکھیں۔وہ ناول طوائف کے موضوع پر ہے۔ایک طوائف ہوتی ہے،اس کی لڑکی ہوتی ہے۔تو وہ اپنی آنکھوں کو قربان کر دیتی ہے اس کو دے دیتی ہے۔اسی زمانہ میں قاضی عبدالغفار خاں کا ناول مجنوں کی ڈائری اور لیلیٰ کے خطوط چھپے تھے۔تو ایک لڑکی نے مجھے لکھا کہ قاضی عبدالغفار خاں کا ناول پڑھا اور آپ کا ناول بھی پڑھا۔تو آپ ایسی طوائفوں کو کیوں لیتے ہیں کہ جو کسی شریف گھر سے گئی ہو۔اصل میں جو نسلی اعتبار سے طوائف ہوتی ہیں ان کی نفسیات کیا ہوتی ہے آپ وہ لکھیں۔تو پھر میں نے ایک ناول لکھا تھا مہرباں کیسے کیسے۔ بات یہ ہوئی کہ پنڈت نہرو کی چچی گومتی کا میشوری نہرو کے نام سے تھیں۔انھوں نے ایک سوسائٹی شروع کی تھی کہ جتنی طوائفیں ہیں ان کو آرٹسٹ بنایا جائے۔سنگر ڈانسر ہوں،طوائفیں نہ ہوں۔اس میں تمام بڑے بڑے لوگ شامل تھے اور میں بھی اس کا ایک حصہ تھا۔مجھ سے کہا گیا کہ آپ طوائفوں کا انٹرویو لے کر کچھ لکھیے۔تو پھر میں نے انٹرویو لیا تھا اور یہ ناول لکھا تھا مہرباں کیسے کیسے۔جب ناول چھپ کر آیا تو کئی طوائفوں نے یہ بات کہی کہ اظہار صاحب آج تک ہم نے ایسا ناول نہیں پڑھا۔

سوال: اردو کے ناقدین نے آپ کے ناولوں کی طرف توجہ نہیں دی؟ آپ اس کی کیا وجہ سمجھتے ہیں؟

جواب: اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں کسی کی خوشامد نہیں کرتا تھا۔آج کا ماحول یہ ہو گیا ہے کہ ایک مضمون آپ میری تعریف میں لکھ دیں اور ایک میں آپ کی تعریف میں لکھ دوں۔شوکت

حیات ایک روز مل گیا مجھے اور کہنے لگا کہ اظہار بھائی آپ میرے لیے کچھ نہیں لکھتے لیکن میں نے آپ کے لیے لکھا ہے۔ میں نے پوچھا بھائی کہاں لکھا ہے۔ کہا فلاں رسالہ میں۔ میں نے وہ رسالہ نکال کر پڑھا۔ اس میں اس نے پچاس افسانہ نگاروں کا ذکر کیا تھا کہ یہ اردو میں افسانے لکھتے ہیں اور ایک نام میرا بھی تھا، بس۔ میں نے آج تک کسی سے یہ نہیں کہا کہ آپ میرے لیے کچھ لکھیے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ تمام بڑے رائٹروں سے میں نے سائنس کے لیے کہا کہ کم از کم آپ سائنس کے لیے میرا ساتھ دیجیے لیکن دو تین آدمیوں کے علاوہ کسی نے نہیں لکھا۔ سید حامد جو کہ علی گڑھ کے فارمر وائس چانسلر ہیں اور آج کل ہمدرد کے چانسلر ہیں اور ڈاکٹر محمد حسن۔ تو ان دو آدمیوں نے لکھا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس تک نہیں لکھ سکے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ سائنس کے بارے میں کچھ جانتے ہی نہیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب آپ سائنس کے بارے میں جانتے نہیں ہیں تو لکھیں گے کیا؟ ایک بات اور ہے کہ ناول اور افسانے کو میں نے کبھی بھی اپنا طرۂ امتیاز نہیں سمجھا ہے۔ اس کو میں اپنا ذریعہ معاش سمجھتا تھا۔ اگر میں اپنا کچھ سمجھتا ہوں تو وہ غزلیں ہیں جن کی لوگوں نے تعریفیں بھی کی ہیں۔ ایک تجربہ میں نے اور کیا ہے۔ سائنسی نظمیں لکھنے کا تجربہ جو مجھ سے پہلے اردو شاعری میں کبھی نہیں ہوا۔ میں نے خلا، بلیک ہول، دم دار ستارا، شہاب ثاقب، شمسی توانائی، کائنات، کشش ثقل، کلون، ہمزاد اور ان جیسے متعدد سائنسی موضوعات کو ایک شاعر کی نظر سے دیکھنے اور ان کی شاعرانہ اور جمالیاتی توضیح کرنے والی نظمیں کہی ہیں جو میرے سائنسی نظموں کے مجموعے 'لاشریک' میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ میں نے ادبی اصطلاحوں کی سائنسی تفہیم پر بھی متعدد مضامین لکھے ہیں۔ میری فکر یہ رہی ہے کہ میں کچھ ایسا کام کروں کہ جس کی وجہ سے مرنے کے بعد مجھے لوگ یاد کریں۔ اگر کبھی سائنسی تاریخ لکھی جاتی ہے تو مجھے پورا یقین ہے مجھے کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یہی میں چاہتا تھا۔ ایمانداری سے میری خواہش یہ تھی کہ مسلمان اور اردو والے سائنس پڑھیں۔

سوال: ان دنوں آپ کا لکھنا پڑھنا کیسا ہو رہا ہے؟

جواب: کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ میری آنکھوں کی روشنی چلی گئی ہے جس کی وجہ سے میں نے گزشتہ دو سال سے کچھ نہیں لکھا۔ یہ سائنس پر میری چوتھی کتاب ہے جسے چھپنے کے لیے پریس بھیج رہا

ہوں جسے اردو اکادمی چھاپ رہی ہے، اس کے بعد میں ایک آدمی رکھوں گا جس کو میں ڈکٹیٹ کروں گا جس کے لیے شاید مجھے چار چھ مہینے پریکٹس کرنے میں لگ جائیں گے۔ میں تو اب بس سائنس لکھنا چاہتا ہوں۔ کیمسٹری اور بایولوجی پر ابھی تک میں نے نہیں لکھا تھا۔ ان پر لکھنا ہے لیکن آنکھوں کی وجہ سے نہیں لکھ پا رہا ہوں۔

سوال: ان کو لکھنے کے لیے پڑھنا بھی ضروری ہے تو آپ کیسے کریں گے؟

جواب: جی ہاں! ان کے لیے پڑھنا بہت ضروری ہے۔ اور اب چونکہ پڑھ نہیں پا رہا ہوں تو کسی سے سنوں گا۔

سوال: معاصر ادب پر آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

جواب: اس وقت پوزیشن بہت خراب ہو گئی ہے۔ آج کے رسالے اٹھا کر دیکھ لیجے کیسے کیسے افسانے چھپ رہے ہیں۔ مجھے تو بالکل پسند نہیں آ رہے ہیں۔ اگر آپ لکھ رہے ہیں تو اس کا کچھ مقصد ہونا چاہیے جس سے دوسروں کو کچھ فائدہ پہنچے۔ آج افسانے کو معمہ بنا دیا جاتا ہے جسے آپ سمجھ نہیں سکتے۔ ایسی زبان لکھیے جو عوام کی سمجھ میں آئے۔

سوال: وہ کون سا کردار ہے جس سے آپ خود مطمئن ہوئے ہوں!

جواب: میرا ایک ناول 'مشینوں کی بغاوت' ہے۔ اس میں یہی دکھایا گیا ہے کہ ایک پلانیٹ پر انسان روبوٹ بناتے ہیں اور اس سارے پلانیٹ کو روبوٹ چلاتے ہیں۔ روبوٹ کھیتی کرتے ہیں، روبوٹ پڑھاتے ہیں، روبوٹ سب کچھ کرتے ہیں۔ روبوٹ حکومت چلاتے ہیں۔ لیکن کچھ انسان ان میں سے ایسے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ جو روبوٹ ہم نے بنائے ہیں اگر یہ ذہین بن گئے تو یہ ہمیں تباہ کر دیں گے۔ وہاں ایک آفیسر کو روبوٹ سکریٹری ملی ہوتی ہے۔ یہ ایک خوبصورت آفیسر ہے جو کہ روبوٹ سکریٹری کے ساتھ محبت سے پیش آتا ہے۔ یہ ایک روز لیٹا ہوا کوئی گیت گا رہا ہوتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کی روبوٹ سکریٹری کرسی پر بالکل بت کی مانند بیٹھی ہوئی ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ بے ہوش گئی ہے۔ یہ کہتا ہے مر گئی کیا؟ تو وہ چونک جاتی ہے اور کہتی ہے کہ کیا ہوا؟ تو وہ بولتا ہے کہ کچھ نہیں۔ روبوٹ سکریٹری کہتی ہے کہ آپ کی آواز میں نہ جانے کیا تھا کہ میرے اندر ایک عجیب قسم کا جذبہ

پیدا ہو رہا تھا جو کبھی نہیں ہوا۔ وہ سوچتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ روبوٹ انسان بن رہی ہے۔ اور اس کی ذہانت جو ہے وہ فطری ہوتی جا رہی ہے۔ میرا ایک آرٹیکل بھی اسی موضوع پر ہے مصنوعی شعور۔ آخر میں یہی ہوتا ہے کہ روبوٹ انسانوں پر حملہ کر دیتے ہیں تو یہی سائنس داں لیڈ کرتا ہے اور سارے روبوٹ کو ختم کرتا ہے اور یہ لڑکی رہ جاتی ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ کہتا ہے کہ تم میرے ساتھ چلو گی۔ اس پر وہ کہتی ہے کہ مجھے اب تم اپنے ساتھ نہ لے جاؤ کیونکہ اب میں ایک شوپیس بن کر رہ جاؤں گی۔ آپ مجھے میوزیم میں سجا دیں گے اور لوگ مجھے دیکھنے آئیں گے کہ یہ وہ روبوٹ ہے جو کہ ذہین ہے۔ میں یہ نہیں چاہتی۔ وہ کہتی ہے... پلیز اف یو لومی، ڈونٹ لک بیک، گو اینڈ لیوی... وہ چلا جاتا ہے اور کچھ دور جانے کے بعد وہ گولی کی آواز سنتا ہے، پلٹ کر دیکھتا ہے تو وہ خودکشی کر چکی ہوتی ہے۔ یہ ہے ایک کردار۔

سوال: کیا آپ اپنی زندگی سے مطمئن ہیں؟

جواب: اگر آپ ایک جملے میں جاننا چاہتے ہیں تو صرف یہ کہوں گا کہ میں نے زندگی جی بھر کر جی ہے۔ یعنی مجھے زندگی سے کبھی کوئی شکایت نہیں رہی۔ میں نے جو چاہا وہ حاصل ہوا۔ سوائے ایک تکلیف کے کہ میرے خاندان اور میرے بچوں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ چونکہ میرے بچوں کو عیش و آرام ملتے رہے، میں تو لکھنے پڑھنے میں لگا رہتا تھا۔ ماں نے کبھی توجہ نہیں دی تو انھوں نے پڑھ کر نہیں دیا۔ جہاں آپ اس وقت بیٹھے ہیں ایک دن یہاں میرے دوست ایئر مارشل تیواری بیٹھے ہوئے تھے۔ میرا بڑا بیٹا داخل ہوا۔ اس نے سلام کیا، مصافحہ کیا۔ میں نے تعارف کرایا جب وہ چلا گیا تو میرے دوست نے کہا کہ اظہار تیرے بیٹے تو بڑے کڑیل جوان ہیں۔ تو ان کو میرے پاس بھیج دے میں انھیں ایئر فورس میں لگواتا ہوں۔ اب میں کس منہ سے کہتا کہ یہ گریجویٹ بھی نہیں ہیں۔ میرے لیے تو یہ شرم کی بات تھی۔ اب دکھ مجھے صرف یہ ہے کہ میری اولاد نے مجھے فیل کر دیا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں نے اپنی زندگی میں جو حاصل کیا ہے یہ سوچ بھی نہیں سکتے۔ کوئی نہیں سوچ سکتا۔ کمایا لاکھوں روپے اور خرچ بھی اسی طرح کیا۔ ساری ساری رات کلبوں میں گزار دیتا تھا... مجھے زندگی سے کوئی شکایت نہیں۔

•••

مظہر الزماں خان سے گفتگو

مظہر الزماں خان (پیدائش 7 اپریل 1950، بیدر، کرناٹک) کا شمار ہندوستان کے اہم ترین فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ منفرد اندازِ فکر اور اپنے خاص علامتی اسلوب بیان کی بدولت الگ پہچانے جانے والے مظہر الزماں، سریندر پرکاش اور بلراج مینرا کے بعد جدیدیت کی تحریک سے متاثر اردو افسانہ نگاری کے منظر نامے کی ایک خاص شخصیت ہیں۔ وہ حیدرآباد میں مقیم ہیں اور دکن میں اردو فکشن کا نیا منظر نامہ تیار کرنے میں منہمک ہیں۔ ادب سماج زندگی اور خود اپنے بارے میں بھی جب وہ گفتگو کرتے ہیں تو اس میں بھی ان کا تخلیقی وصف اور فلسفیانہ و علامتی انداز جھلکتا ہے۔

سوال: سب سے پہلے آپ اپنی پیدائش اور اپنے خاندان پر کچھ روشنی ڈالیے۔

جواب: میری پیدائش کی تاریخ بہت لمبی ہے۔ صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے کہ میں ہر سو دو سو سال کے بعد کسی بھی زمین پر اُتارا جاتا ہوں اور صدیوں سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ اب رہا خاندان تو عرض کردوں کہ وہ پوری زمین پر پھیلا ہوا ہے۔

سوال: آپ نے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کی، کوئی ملال؟

جواب: کوئی افسوس نہیں ہے کہ جیفل، کیفل، جنظل، رمیفل اور اسفل جیسے سند یافتہ لوگوں کے بجائے میں غالب، میر، سعدی وغیرہ جیسے بے سند یافتہ لوگوں میں شامل ہوں۔

سوال: کچھ ازدواجی زندگی کے تعلق سے بھی بتایئے؟

جواب: اللہ تعالٰی کا کرم ہے کہ میری ازدواجی زندگی خوشگوار ہے میری بیگم نکہت فاطمہ آرکیٹکٹ ہیں۔ادب سے لگاؤ ہے۔میرے بچے بھی اللہ تعالٰی کے کرم سے بہت فرمانبردار ہیں۔بڑا لڑکا محمد زبیر احمد خان بی مارمیسی اور لندن سے ایم بی اے کر چکا ہے۔چھوٹے لڑکے محمد فراز احمد خان نے بی کام کیا ہے۔بیٹی مزنا فاطمہ ایم ایس سی کر رہی ہے۔سب کو ادب سے دلچسپی ہے۔

سوال: آپ نے کب سے لکھنا شروع کیا اور پہلی کہانی کون سی تھی؟

جواب: جب میں نے پہلی کہانی لکھی اُس وقت میری عمر چودہ پندرہ سال ہوگی یا اس سے کم۔میری پہلی کہانی 'کالا تاج محل' تھی لیکن کچھ لوگوں نے لکھا ہے کہ میں نے اپنی پہلی کہانی 'اداکار' لکھی۔آپ نہیں جانتے، اور مجھے بھی نہیں معلوم کہ اس معاملہ میں کون اداکار ہے اور یہ کس کی اداکاری ہے۔

سوال: ادب کے علاوہ آپ کی کوئی اور دلچسپی؟

جواب: گھومنا پھرنا۔اچھا لباس، عمدہ غذا استعمال کرنا۔رات دیر تک جاگنا۔خوب پان کھانا بہتر چائے پینا اور عمدہ کتابیں پڑھنا۔پہلے کچھ مصوری کا شوق بھی تھا۔کچھ احمقوں کی تصویریں بنایا کرتا تھا پھر مٹا دیتا تھا۔اب کچھ اداکاروں کی تصویریں خیالوں میں بناتا ہوں اور خیالوں ہی میں ان پر پانی پھیر دیتا ہوں۔ڈائری بھی لکھتا تھا اب وہ بھی نہیں لکھ رہا ہوں۔ڈائری کے کچھ اوراق 'ابرک کے سورج' کے عنوان سے چھپ بھی چکے ہیں۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ آپ کے حلقۂ احباب میں وہی لوگ زیادہ ہوتے ہیں جو ذہین ہیں۔اُن لوگوں کو آپ اپنے پاس پھٹکنے بھی نہیں دیتے جو اس زمرے میں نہیں آتے۔آپ کے اس عمل سے کچھ لوگوں کو ناگواری بھی ہوتی ہے۔آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب: پتا نہیں مشتاق صدف صاحب آپ سے یہ کس نے کہا یا آپ نے کس سے سنا، کیوں کہ میں تو زیادہ تر بیوقوفوں، نالائقوں، کند ذہنوں کے ساتھ ہی اُٹھتا بیٹھتا ہوں اور اُن کی احمقانہ

اور بے معنی باتیں سن سن کر اُنھیں داد بھی دیتا رہتا ہوں اور میری تعریف پر وہ خوش بھی ہوتے ہیں اور اس طرح میں اُنھیں بھی ناخوش نہیں کرتا۔

سوال: جدیدیت سے آپ کس حد تک متاثر ہیں۔ بلکہ کھردرے لفظوں میں کہیں تو میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا آپ خود کو جدیدیوں میں شمار کرتے ہیں؟

جواب: جدیدیے سے آپ کی کیا مراد ہے؟ کہیں آپ اُن جدیدیوں کی بات تو نہیں کررہے ہیں جو معمے حل کرتے رہتے ہیں یا کرچکے ہیں یعنی بے شکل تصویریں بناتے رہتے ہیں یا بنا چکے ہیں کہ کسی زاویے سے بھی دیکھیں تو کوئی صورت و شکل صاف نظر ہی نہیں آتی۔ گدلے پانی میں گرے ہوئے اندھے آئینے کی طرح نہ اُن کی کہانیوں میں کوئی موضوع ہوتا ہے اور نہ خیال نہ کوئی کمال اور نہ کوئی جمال اور نہ ہی کوئی فکر۔ بادل آتے ہیں بارش نہیں ہوتی۔ کتے بھونکتے ہیں آواز نہیں آتی۔ دھوپ نکلتی ہے لیکن نظر نہیں آتی۔ بہر حال میں ایسے جدیدیوں میں سے نہیں ہوں اور نہ ایسا جدیدیا ہوں۔ میری کہانیوں میں موضوع کے ساتھ خیال، فکر، حالات، موسم، ماحول اور افکار و معنی کا ایک بڑا ہجوم ہوتا ہے اور وہ اپنے انجام کو پہنچتی ہیں اور ایسے کردار ہوتے ہیں جو ہماری زمین اور آسمان کو پہچانتے ہیں اور ہر ادلتے بدلتے ہوئے منظر کو بڑی گہرائی سے دیکھتے، سمجھتے اور اُن پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ آنکھوں پر پٹی باندھ کر سوئی کے اندر دھاگا ڈالنے والے کردار اُن جدیدیوں کے یہاں ہوتے ہیں جن جدیدیوں کی کچھ لوگ باتیں کرتے ہیں اور آج بھی کررہے ہیں۔

سوال: تو کیا جدیدیت آپ کی نظر میں ختم ہوئی؟

جواب: جدیدیت تو جدیدیت ہے کہ ہر دور میں وہ جدید رہتی ہے۔ لیکن وہ جدیدیت جس پر جدیدیت کا لیبل لگایا گیا وہ ایک فریم تھا جس کے اندر زبردستی کچھ چہرے چپکا دیے گئے تھے اور اُن چپکائے ہوئے چہروں میں کوئی حرکت نہ کوئی لباس اور نہ کوئی رنگ روپ کہ وہ تو بس چپکے ہوئے تھے۔ لہٰذا ایسی جدیدیت تو اُسی وقت ختم ہوگئی تھی جب فریموں کو دیمک کھانے لگی تھی یا کھا چکی تھی۔ تاہم اُن تصویروں پر جو دیمک زدہ فریموں کے اندر موجود تھیں یا ہیں، پھول مالا چڑھانے کا سلسلہ آج تک جاری ہے اور پھول مالا چڑھانے کا کام وہی ہاتھ کر رہے

ہیں جنھوں نے فریم تیار کیے تھے لیکن اب بہت سے یا کچھ فریم توڑ کر باہر نکل گئے ہیں۔ اب رہا سوال کہ فریم والی جدیدیت کب ختم ہوئی تو عرض ہے کہ جب پروفیسر گوپی چند نارنگ نے 'کہانی کا جوہر' جیسے مضامین لکھے اور دلائل کے ساتھ لکھے اور بتایا کہ بے شکل جدیدیت کا خاتمہ ہو جانا چاہیے جس میں کوئی جوہر ہی نہ ہو ورنہ وہ صالح قدر جدیدیت کے کبھی مخالف نہیں رہے اور نہ کبھی اُنھوں نے مخالفت کی۔ اُن کا استدلال یہ تھا کہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں وہ غلط ہے اور غلط تو غلط ہی ہے چنانچہ نارنگ صاحب نے ایسی صورتِ حال کو نئے رنگ ڈھنگ سے بیان کرنے یا پیش کرنے کی بات کی۔ اُنھوں نے آتما کو نکال کر جسم کو ہینگر پر ڈالنے کے لیے کبھی نہیں کہا۔ اسی لیے انھوں نے مابعد جدیدیت کی آواز اُٹھائی اور نام نہاد جدیدیت کی مخالفت کی۔ چنانچہ اس وقت تک وہ جدیدیت کے ساتھ تھے اور خوب ساتھ تھے جب تک وہ 'آتما' کے ساتھ تھی، 'شریر' کے ساتھ تھی۔ جہاں سے وہ گولہ بنی، نارنگ صاحب نے مابعد جدیدیت کی آواز اٹھائی۔ بھائی صاحب! کیا آپ پتھر کی عورت اور پتھر کے مرد سے کوئی بات کر سکتے ہیں، کوئی توقع رکھ سکتے ہیں یا بچے پیدا کر سکتے ہیں یا زندگی گزار سکتے ہیں یا پھر کسی غار کے اندر چراغ جلا سکتے ہیں۔ لہٰذا نارنگ صاحب نے یہی کہا کہ ایسی جدیدیت جو غبار کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے مناسب نہیں ہے۔

سوال: آپ کہانی ہی کیوں لکھتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں تو کب اور کیوں لکھتے ہیں؟

جواب: مشتاق صدف صاحب میں اپنے ایک مضمون میں لکھ چکا ہوں کہ مجھے کہانیاں لکھنے کے لیے اُوپر سے اُتارا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت مجھے دی ہے سو میں کہانیاں ہی لکھتا ہوں۔ اگر ایٹم بم بنانے کی صلاحیت دی جاتی تو یہ کام کرتا اور نئے نئے قسم کے مہلک اور تباہ کن بم بنا بنا کر انسانوں کو اور زمین کو تباہ و برباد کر دیتا جیسا کہ آج کل کیا جا رہا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے پیغام دینے والا اور حال بیان کرنے والا بنا کر پیدا کیا ہے۔ سو میں بیان کر رہا ہوں۔ اب رہا سوال کہ میں کب کہانی لکھتا ہوں تو عرض ہے کہ میرے لکھنے کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں ہے جب بھی طبیعت مائل ہوتی ہے۔ اور میری طبیعت اُس وقت مائل ہوتی ہے جب زمین رونے لگتی ہے۔ جب بچے نیند میں چونک چونک کر اُٹھنے لگتے ہیں،

جب پانی رونے لگتا ہے۔ آدمیوں کے اندر سے رونے کی اور ہنسنے کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ جب ذہنی بھکاری دانشور بن جاتے ہیں۔ جب ادیب اور نقاد حمال بن جاتے ہیں۔ جب مذہبی رہنما خود کو بیچنے لگتے ہیں۔ کنکریاں پہاڑوں کو دیکھ کر ہنسنے لگتی ہیں۔ انکھوے باہر آنے سے ڈرنے لگتے ہیں۔ دھوپ جسموں کو چاٹنے لگتی ہے۔ گدھ زیتون کی شاخوں کو نوچنے لگتے ہیں اور انسانوں کی باتوں سے زنجیروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، اور عدالتوں کے دروازے بند ہو جاتے ہیں یا فاختاؤں کو ہلاک کیا جاتا ہے، کہانی مجھ پر اترنے لگتی ہے۔ ورنہ میرا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ بعض وقت تو ایک دن میں الگ الگ موضوع پر دو دو کہانیاں لکھ چکا ہوں۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ جب تک کہانی کا موضوع وسیع نہیں ہوتا میں کہانی لکھتا ہی نہیں۔ وسیع موضوع پر ہی میں قلم اُٹھاتا ہوں یہ اور بات ہے کہ میری لکھی کہانیوں کے موضوعات پر کچھ لوگوں کی پوری نظر نہیں جاتی یا نہیں پہنچتی۔ اگر میری کہانی کسی پر پوری طرح کھل جائے تو موضوع اور امکانات کا اندازہ ہو جائے گا۔

سوال: 80 کے بعد لکھنے والوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: دیکھیے صاحب! ادب کو دہائیوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا خصوصاً اچھا ادب ایک دو تین چار دہائیوں میں نہیں، بلکہ صدیوں پر محیط ہوتا ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے وہ پھیلتا جاتا ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے ہمارے یہاں کے ایک افسانہ نگار پروفیسر صاحب نے کہا تھا کہ ہر بیس برس کے بعد ادب میں تبدیلی آتی ہے یہ ایسی ہی بات ہے جیسے ہر بوڑھا بچہ بن کر دودھ چوسنے لگتا ہے۔ جب ایک افسانہ نگار اچھے افسانے نہیں لکھ سکتا تو وہ تنقید کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور ایسی ہی اُلٹ پلٹ تنقیدیں کرنے لگتا ہے تا کہ کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی شکل میں وہ باقی رہے۔ اس سے کچھ ہوتا جاتا نہیں صرف وقتی طور پر اُس کا نام رسائل یا اخبارات میں آ جاتا ہے۔ بعد میں اُس کی کہی ہوئی باتیں دھوبی کی کاپی بن کر رہ جاتی ہیں۔ مولانا رومی، حافظ شیرازی، غالب، اقبال وغیرہ کو آپ کیا کسی بھی فریم میں قید کر سکتے ہیں۔ یہ ساری باتیں بچوں کی سی ہیں اور بچوں کی باتیں گلی، محلہ یا گھروں میں ہی اچھی لگتی ہیں ادب میں نہیں۔ ادب آفاقیت چاہتا ہے۔

سوال: آج آپ کن لوگوں کی کہانیاں پسند کرتے ہیں؟ کچھ اہم نام بتایئے۔؟
جواب: میں نام لے کر یا کہانیوں کے نام لکھ کر اپنے مخالفین میں مزید اضافہ کرنا نہیں چاہتا۔ پہلے ہی میرے باطنی مخالفین بہت سے موجود ہیں جو میرے روبرو ہوتے ہیں تو میرے ساتھ مریدوں کا طریقہ استعمال کرتے ہیں۔ مجھ سے اپنے جسموں پر دم کرانے لگتے ہیں۔
سوال: آپ کی بیشتر کہانیاں علامتی ہوتی ہیں۔ کیا آپ بھی اندھیرے میں تیر تلاش کرنے کے قائل ہیں؟
جواب: نہیں، بالکل نہیں۔ میری کہانیاں بلاشبہ علامتی ہیں۔ ان میں اشارے استعارے موجود ہوتے ہیں لیکن ان کہانیوں میں ہوائی علامتیں یا اشارے موجود نہیں ہوتے جیسا کہ کچھ جدید لکھنے والوں کے یہاں ہوتے ہیں کہ وہ اتھاہ گہرے اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں اور پھر تیر کدھر گیا اُنھیں کچھ پتا ہی نہیں چلتا۔ تاہم وہ اندھیرے میں تیر تلاش کرنے لگ جاتے ہیں اور وہ اُنہیں جب کہیں نظر نہیں آتا تو اپنی ہی آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاتے ہیں چنانچہ پروفیسر نارنگ نے یہی کہا کہ کہانی لکھنے والے جدیدیے تاریکی میں تیر چلا رہے ہیں اور شور مچا رہے ہیں اور اُن کے حوارین اُن کی پیٹھ ٹھونک رہے ہیں۔
سوال: آپ پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ آپ جو پہلے تھے وہی آج بھی ہیں۔ آپ نے خود کو نہیں بدلا۔ آپ جن موضوعات پر کہانیاں لکھتے ہیں اب اُن کے موضوعات تنگ ہونے لگے ہیں۔ آپ کو کیا لگتا ہے؟
جواب: بالکل نہیں کیوں کہ میری ہر کہانی کا موضوع الگ ہوتا ہے کہ میری ہر کہانی ایک نئی کائنات ہوتی ہے۔ اس کی علامتیں، اشارے، استعارے، موسم اور حالات الگ ہوتے ہیں کہ موضوع کے حساب سے کہانیوں کے تقاضے پورے کرتا ہوں۔ آپ پڑھیے یا ایسا کہنے والوں کو غور سے پڑھنے کے لیے کہیے۔ ان سے پوچھیے کہ کون سی کہانی میں اُنھوں نے ایسا محسوس کیا یا یکسانیت کو محسوس کیا۔ ہاں میری کہانیاں کچھ مشکل ضرور ہوتی ہیں کہ اُن میں علامتوں اشاروں اور افکار کا ہجوم ہوتا ہے۔ تہہ در تہہ معنویت اور اسلوب میری کہانیوں کو روشن کرتے ہیں اور امکانات کو وسیع کرتے ہیں۔ یہی میری کہانیوں کی خوبی ہے۔ لفظ اپنے مختلف معنی کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔

سوال: آپ پر کچھ اہم نقادوں نے لکھا ہے۔ جبکہ دوسرے بڑے نقادوں نے بہت کم لکھا ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ جتنا آپ کی کہانیاں پڑھی گئی ہیں اس مناسبت سے آپ کے فن پر نہیں لکھا گیا۔ آپ کو کوئی شکایت؟

جواب: یہ میرے لیے اہم بات ہے کہ مجھ پر اہم نقادوں نے لکھا ہے۔ عرض کردوں کہ جنھوں نے میری کہانیوں کو سمجھا اور محسوس کیا اُنھوں نے لکھا اور جن لوگوں نے نہیں سمجھا ہوگا نہیں لکھا۔ جب سمجھیں گے اور میری کہانیاں اُن پر عیاں ہو جائیں گی یا کھلیں گی تو شاید وہ لکھیں گے۔ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ البتہ وہ کہانی نگار جو زبردستی نقاد بن گئے ہیں شاید وہ نہیں لکھیں گے، کیوں نہیں لکھیں گے یہ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آپ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ کچھ پھل ایسے ہوتے ہیں جو بظاہر اور دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں لیکن بہ باطن کڑ دے ہوتے ہیں۔ وہ چپہ ٔ ابر میں خشکی اور آنکھوں میں پانی دیکھتے ہیں۔

سوال: دورِ حاضر کے ادیبوں کے تعلق سے کیا آپ کچھ کہنا پسند کریں گے؟

جواب: ہر ایک کا اپنا عاشور خانہ ہے اور ہر ایک ماتم کر رہا ہے اور ماتم کرنے والوں میں سب سے زیادہ پیش پیش وہی لوگ ہیں جن کے سینوں میں کوئی درد موجود نہیں ہے۔ تاہم سینہ کوبی کر رہے ہیں اور اُن کے درد سے عاری ماتم پر کچھ لوگ عش عش بھی کر رہے ہیں۔

سوال: کیا آپ کو آج کے افسانہ نگاروں، شاعروں، نقادوں، مذہبی رہنماؤں اور سیاست دانوں کے یہاں قوم کا درد محسوس ہوتا ہے؟

جواب: آج نہ کوئی کسی قوم کا ہمدرد ہے اور نہ کوئی قوم کسی کی ہمدرد ہے۔ تاہم سب کے سب اپنے آپ کو ایک دوسرے کے ہمدرد، غمگسار اور نیک سمجھ رہے ہیں کہ ہر فرد آج اپنے تئیں پارسا ہے۔

سوال: آج کے تخلیق کار ادب تخلیق کرنے کے بجائے اپنا زیادہ تر وقت کن چیزوں پر صرف کر رہے ہیں؟

جواب: ہمارے عہد کے بیشتر کہانی کار، شاعر، نقاد یا کسی بھی قسم کے ادیب اپنا زیادہ تر وقت اپنے آپ کو نمایاں کرنے میں لگا رہے ہیں۔ سب چاہتے ہیں کہ اُن کی جو کچھ اور جیسی بھی لکھائی

ہے، اچھی یا بری اُس کو کسی طرح سے نمایاں کیا جائے اور اُن کی شہرت میں کتنے اور کیسے چاند سورج لگائیں جائیں۔ کس طرح انعام واکرام حاصل کیے جائیں اور اس کے لیے وہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ انعامات واعزازات حاصل کرنے کے لیے اپنی انا اور خودداری کو دریابرد کر رہے ہیں اور اس میں وقتی طور پر کامیاب بھی ہو رہے ہیں کیوں کہ انھیں معلوم نہیں ہے کہ وقت کی مٹھی میں ربڑ یا انک ریموور بھی ہوتا ہے جو اُن کی لکھائی کو ختم کر دیتا ہے۔ میں نے کئی سال پہلے ایک کہانی 'سورج کی بینائی' لکھی تھی۔ میں نے اس کہانی میں یہ بتایا تھا کہ ایک بہت بڑا کیڑا جس کا سر سمندر اور آنکھ سورج ہوتی ہے وہ کتب خانہ میں داخل ہوتا ہے اور پھر ساری ساکت کتابوں کو چاٹ جاتا ہے اور اُن کتابوں کو چھوڑ دیتا ہے جو سانسیں لے رہی تھیں۔ اس کہانی کا انگریزی ترجمہ پروفیسر کمار صاحب نے کیا تھا۔

سوال: عمر کی اس منزل میں آپ کی کوئی خواہش جو پوری نہ ہو سکی؟

جواب: میری دلی خواہش ہے کہ میں سارے عالم کے تمام مجرموں کو لے جا کر ایسی جگہ بند کر دوں جہاں سے اُن کے نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہ ہو۔

•••

رتن سنگھ سے گفتگو

اردو میں جن تخلیق کاروں کو جدید فکشن کی آبرو مانا جاتا ہے ان میں ایک جانا پہچانا نام رتن سنگھ کا ہے جو 15 نومبر 1927 کو مغربی پنجاب (پاکستان) کے گاؤں داؤد، تحصیل نارووال میں پیدا ہوئے۔ وہیں مڈل اسکول کی تعلیم حاصل کی اور ڈیرہ بابا نانک سے 1945 میں آپ نے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ تقسیم کے بعد ہندستان آ گئے، پنجاب یونیورسٹی سے انٹر کرنے کے بعد 1960 میں لکھنؤ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ لکھنؤ کے ریلوے ہیڈ آفس میں 1962 تک کلرک رہے۔ ملک کے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں پر اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر کی خدمات انجام دی اور ریڈیو کشمیر سری نگر میں بحیثیت ڈائریکٹر سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ رتن سنگھ کا قیام لکھنؤ میں کافی رہا جہاں ان کی ملاقات پروفیسر احتشام حسین، کمال احمد صدیقی، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس، رام لعل، اقبال مجید، سبط اختر اور دوسرے نوجوانوں سے ہوئی۔ یہیں سے رتن سنگھ کا ادبی سفر شروع ہوتا ہے۔ آپ ترقی پسند ادیبوں کے جلسوں میں شرکت کرنے لگے۔ رتن سنگھ کی پہلی کہانی ماہنامہ 'راہی' میں 1953 میں شائع ہوئی۔ آپ کے افسانوں کے مجموعے، پہلی آواز، پنجرے کا آدمی، کاٹھ کا گھوڑا اور پناہ گاہ کے ناموں سے

شائع ہوئے ہیں۔ دو ناول در بدری اور سانسوں کا سمندر منظر عام پر آ کر اس صنف میں بھی ان کے تخلیقی ہنر کو ثابت کر چکے ہیں۔ رتن کی شاہکار کہانیاں ملک اور بیرون ممالک کی یونیورسٹیوں کے تعلیمی نصاب میں شامل ہیں۔ آپ کی حیات اور کارناموں پر کئی یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی اور ایم فل کے مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ رتن سنگھ کو کئی اہم انعامات اور ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا جا چکا ہے۔ رتن سنگھ کا تخلیقی اور ادبی سفر ابھی تک جاری و ساری ہے۔

سوال: آپ نے اپنے ادبی اور افسانوی سفر کی شروعات کیسے کی اور آپ کا یہ سفر کیسا رہا؟

جواب: میں نے اپنی پہلی کہانی 1953 میں لکھی تھی۔ بہت ہی معمولی کہانی تھی 'ممی تم ایک دیوار ہو'۔ کہانی کی طرف آنے کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ میں تو پنجابی میں شاعری کر رہا تھا۔ وہ تو اتفاق یہ ہوا کہ رام لال صاحب اس وقت ریڈیو میں تھے اور میں بھی ریڈیو میں تھا۔ ان سے میری ایک بار ملاقات ہوئی تو میں نے انھیں پنجابی میں اپنی ایک نظم سنائی۔ وہ نظم کیا تھی، دراصل تقسیم کے بعد کی، میرے گاؤں کی درد بھری کہانی تھی۔ اس کو سننے کے بعد رام لال جی نے کہا کہ یہ تو اپنے آپ میں ایک مکمل کہانی ہے۔ تو آپ اردو میں کہانیاں کیوں نہیں لکھتے؟ میں نے کہا کہ رام لال جی میری اردو کی تعلیم زیادہ نہیں ہے۔ میں اردو آٹھویں، دسویں درجے تک پڑھا ہوں۔ اس پر انھوں نے کہا کہ اردو تو عام بول چال کی زبان ہے اور وہ مجھے ترقی پسند مصنفین کے جلسہ میں لے گئے۔ مجھے یاد ہے کہ کمال احمد صدیقی کے یہاں ترقی پسند مصنفین کا لکھنؤ میں وہ جلسہ ہوا تھا۔ وہاں جانے کے بعد مجھے لگا کہ جیسے میں نئی دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ یا یہ کہ میں اپنی زندگی میں چلنے کے لیے جس راستہ کی تلاش میں تھا وہ مجھے مل گیا ہے۔ اس لیے میں نے وہ پہلی کہانی لکھی تھی۔ اس کے بعد پھر میں نے پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا۔

سوال: جس دور کی بات آپ کر رہے ہیں وہ آپ کی نظر میں کیسا تھا؟

جواب: یہ وہ دور ہے جب لکھنؤ ادبی طور پر بہت امیر تھا۔ ادبی نقطۂ نظر سے یہاں کا ماحول بہت ہی صحت مند تھا۔ احتشام حسین صاحب اور آل احمد سرور صاحب کے یہاں جلسے ہوتے

تھے۔ ایک آدمی کہانی سناتا تھا۔ ایک دو نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ جلسے میں سنائی گئی دس پندرہ منٹ کی کہانی پر ڈیڑھ سے دو گھنٹے تک بحث ہوتی تھی اور وہ بحث وہیں پر ختم نہیں ہو جاتی تھی۔ وہاں پر کہانی کاروں کی ایک پوری نسل تھی جو کہانی کار بننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اقبال مجید، عابد سہیل، رام لعل، رضیہ سجاد ظہیر، قاضی عبدالستار، شمیم نکہت جو کہ پاکستان چلے گئے تھے، آغا سہیل...اور بھی بہت سے دوست تھے۔ تو جب ہم لوگ کافی ہاؤس میں بیٹھتے تھے، وہاں بھی اسی کہانی پر باتیں ہوتی رہتی تھیں اور یہ باتیں اس وقت تک ہوتی رہتی تھیں جب تک اگلا جلسہ نہیں ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد بہر حال کہانی کار پر منحصر تھا کہ اس میں جو خوبیاں سامنے آئی ہیں ان کو وہ اپنے اندر کیسے نکھار سکتا ہے یا یہ کہ جو خامیاں سامنے آئی ہیں ان کو وہ کیسے دور کر سکتا ہے۔ میرے لیے وہ جلسے جو تھے ایک طرح سے درسگاہ تھے۔

سوال: ان جلسوں کے ماحول کے بارے میں کچھ بتائیے۔ شریک ہونے والوں کا رویہ کس طرح کا ہوتا تھا؟

جواب: جلسوں میں وہاں ڈاکٹر محمد حسن آتے تھے، ڈاکٹر قمر رئیس، قاضی عبدالستار آتے تھے، اور سب ایک دوسرے کی ترقی کے خواہاں رہتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ محمد حسن صاحب نے ایک بار مجھ سے پوچھا کہ کچھ لکھا؟ میں نے جواب دیا کہ نہیں! میں نے تو کچھ نہیں لکھا۔ اس پر انھوں نے کہا کہ پڑھنا شروع کرو۔ خوراک کم ہو رہی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ میٹنگ میں طے ہو گیا ہے کہ اگلے ہفتہ آپ کو جلسہ میں کہانی پڑھنی ہے۔ اچھا! وہ تو کہہ کر چلے گئے تھے۔ اب ہمیں ایک ہفتہ کے اندر اندر کہانی لکھنی ہی لکھنی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ پچیس تیس لوگ میرا انتظار کر رہے ہیں اور میں اپنے آپ کو وہاں غیر حاضر نہیں پا سکتا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جب جدیدیت کا دور چلا ہے، اس وقت محمد حسن صاحب نے البرٹو راویہ کی کتنی ہی کہانیاں، خاص طور سے نشان لگا کر پڑھنے کے لیے لا کر مجھے دی تھیں۔ نہ صرف یہ کہ کہانیوں کے ٹائٹل پر نشان بلکہ کہانیوں کے سچویشن پر نشان لگا کر دیتے

تھے اور کہتے تھے کہ نوٹ کرو کہ جدید زندگی کو ایک اتنا بڑا کہانی کار کس طرح سے کہانی میں ڈھال رہا ہے۔ تو یہ وہ باتیں ہیں جن سے دوستوں کے رویہ کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے اور یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ اس دور کا ادبی ماحول کیا تھا۔

سوال: جس وقت آپ نے لکھنا شروع کیا تھا اس وقت افسانوی ادب میں قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، منٹو، بیدی، کرشن چندر جیسے بڑے نام ابھر کر سامنے آ گئے تھے، ایسے میں آپ کو کیا لگ رہا تھا کہ اگر آپ افسانوی ادب میں جائیں گے تو کوئی الگ راستہ بنا سکیں گے؟

جواب: میں سمجھتا ہوں کہ ان سب کی موجودگی ہم سب کے لیے ایک طرح سے اچھی بات تھی۔ ہمیں معلوم ہے کہ بہت سے ہمارے سینئر ہیں اور ان کی موجودگی میں الگ پہچان بنانا ایک مشکل ترین کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی کہانیوں کو دوسروں کی کہانیوں سے الگ کرنے کے لیے اپنی کہانی میں اختصار سے کام لیا۔ اقبال مجید نے اپنی کہانی میں ڈرامائی انداز کو شامل کر کے اپنے کو تھوڑا الگ کیا۔ عابد سہیل نے حقیقت پسندی کا سہارا لیا۔ اسی طرح قیصر تمکین اور آغا سہیل نے اپنا الگ راستہ بنانے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ خود رام لعل صاحب نے پی ڈبلیو اے میں آنے کے بعد اپنا ایک الگ راستہ تلاش کیا تھا۔ پی ڈبلیو اے سے پہلے ان کا انداز کچھ اور تھا لیکن اس میں شامل ہونے کے بعد انھوں نے اپنے اندر ایک نئے رام لعل کو تلاش کیا تھا۔

سوال: ترقی پسند ناقدین کا خیال ہے کہ جدیدیت کے رجحان نے افسانوی ادب کو کافی نقصان پہنچایا، اس سلسلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: دیکھیے! نقصان جن لوگوں کو پہنچا ان کی بات میں نہیں کرتا۔ ہم لوگوں نے اس کو سمجھا اور اس سے بچے رہے۔ میں آپ کو ایک واقعہ بتا سکتا ہوں۔ مجھے یاد ہے! ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے کہا کہ مجھے میرے پرچے 'شب خون' کے لیے اپنی ایک کہانی دیجیے اور ساتھ میں وہ یہ بھی کہتے تھے کہ مجھے وہ کہانی بھی بھیج دو جو چھ جگہوں سے واپس آ گئی ہو۔ میں نے کبھی نہیں دی۔ تو ہم نے اس طرح جدیدیت کے حملوں سے اپنے کو محفوظ رکھا اور میں نے جتنے نام لیے ہیں ان سب نے اپنے آپ کو محفوظ رکھا۔

سوال: ناقدین کا یہ بھی خیال ہے کہ جدیدیت کے دور میں کہانی پن، یا کہانی درمیان سے غائب ہو گئی تھی۔ اس بات میں کس حد تک صداقت ہے؟

جواب: مجھے معلوم ہے، اس میں بہت سے لوگ ختم ہو گئے تھے۔ بھائی بلراج مینرا نے پچیس سال سے آج تک کوئی کہانی نہیں لکھی، آخر کیا وجہ ہے؟ سریندر پرکاش کی پہچان آخر کار اس وقت بنی جب اس نے 'بجوکا' کہانی لکھی۔ اس طرح سے کئی لوگ ہیں جو میدان سے غائب ہی ہو گئے۔

سوال: جدیدیت پر یہ بھی الزام ہے کہ اس رجحان کے آنے پر کہانیوں سے گاؤں غائب ہونے لگے تھے۔ کہانیوں میں گاؤں کی جو منظر کشی ہوتی تھی وہ غائب ہونے لگی تھی، اس کے کیا اسباب تھے؟

جواب: اس کے لیے جدیدیت ذمہ دار نہیں ہے۔ دراصل ہمارے یہاں جتنے کہانی کار ہیں، ان سب کا تعلق شہری زندگی سے ہے۔ اس دور کی بدقسمتی ہے کہ ہمارے یہاں سے کوئی ایسا کہانی کار نہیں ہے جس نے اپنے یہاں گاؤں کے گھروں کو قائم رکھا ہو اور گاؤں کے ماحول کو شامل کرنے کی کوشش کی ہو۔ مثال کے طور پر میں کہوں کہ میں نے کہانیاں تو گاؤں کی سنی ہیں لیکن میرے تصور میں میرا وہ گاؤں ہے جو میں پاکستان میں چھوڑ آیا تھا۔ وہ زندگی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں آج بھی پنجاب کے گاؤں میں جاؤں تو شاید وہ تہذیب، وہ کلچر، وہ ماحول جس کا میں پروردہ تھا، یا جس کو میں پیش کرنا چاہتا ہوں وہ آ جائے۔ میرا خیال ہے اب وہ ماحول نہیں ہے۔ اسی لیے بلونت سنگھ کے یہاں گاؤں ملتا ہے لیکن اس پر اعتراض ہوتا تھا کہ آپ جس پنجاب کے گاؤں کو پیش کر رہے ہو وہ تو ابھی ہے نہیں، اس اعتراض پر وہ کہتا تھا کہ اسی لیے میں جو ختم ہو رہا ہے اسے اپنی کہانیوں میں زندہ رکھ رہا ہوں۔ ہمارے یہاں ایک قاضی عبدالستار کے یہاں گاؤں ملتا ہے لیکن بدقسمتی کیا ہے کہ عملی طور پر گاؤں کا ماحول تو ہے لیکن ایک خاص زمیندارانہ ماحول سے بندھی ہوئی کہانیاں ہیں۔ اس میں پورے گاؤں کی جو عکاسی ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہو پائی ہے۔

سوال: رتن صاحب بچپن کے دور میں اور آج کے دور میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

جواب: قدریں! انسانی قدریں! میں جس ماحول میں پیدا ہوا ہوں، وہاں گھر میں آنے والی بھنگن اگر وہ چھوٹی عمر کی ہے تو بہن ہے، اگر وہ بڑی عمر کی ہے تو ماں ہے، بوا ہے، اور اگر اس سے بڑی عمر کی ہے تو دادی ہے، نانی ہے۔ گھر میں آنے والے کسان جو ہمارے کھیتوں میں کام کیا کرتے تھے وہ ہمارے نوکر نہیں تھے، وہ ہمارے لیے چاچا، دادا، بابا تھے۔ وہ احترام جو ہمارے اندر بچپن میں پیدا ہوا تھا، وہی جب ہم باہر سماج میں آئے تو آج ہم وہی احترام ان لوگوں کو دیتے ہیں جو ہمیں اپنے عمر سے چھوٹے یا بڑے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ احترام ہمارے مزاج کا، ہمارے کردار کا حصہ بن چکا ہے۔ وہ چیز اب نہیں رہی۔

سوال: ادبی ماحول میں آپ اب کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

جواب: فرق صرف یہ ہے کہ جیسے میں نے آپ کو شروع میں بتایا کہ میرا کہانی کار بننے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن اس طرح کا ماحول تھا کہ جس نے مجھے اس طرح ایڈوپٹ کر لیا، اور مجھے لگا کہ جیسے وہ لوگ دل سے چاہتے ہیں کہ میں اس میدان میں آگے بڑھوں۔ ایک مجھے ہی نہیں، اس ماحول نے ایک پوری نسل کو تیار کیا اور یہ صرف اردو کی بات نہیں ہے، ٹوٹل ماحول کی بات کر رہا ہوں۔ میں آپ کو بتاؤں کہ یشپال جی ہندی کے کہانی کار ہیں، میں ان کے پاس گیا اور کہا کہ مجھے ریڈیو میں ملازمت ملی ہے، میں اسے جوائن کرنا چاہتا ہوں۔ ان کا ایک جملہ میری زندگی کا سرمایہ ہے۔ کہنے لگے بیٹا ایک شرط پر اجازت دیتا ہوں کہ ریڈیو میں جاؤ تو افسر بن کر مت رہ جانا۔ تمہارے اندر کا کہانی کار زندہ رہنا چاہیے۔ بھگوتی شرن ورما اتنے مہربان تھے۔ اسی طرح امرت لال ناگر بلایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ''آؤ! بھنگ پلا دوں میں۔'' وہ شام کو بھنگ پیا کرتے تھے۔ مطلب صرف ان لوگوں کا اپنا پن دکھانا تھا۔ محبت و شفقت دکھائی تھی۔ دوسری بات میں آپ کو بتاؤں کہ جب ہم کچھ نہیں تھے، کچھ کہانیاں چھپی تھیں، ایک روز میں ریڈیو کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ تبھی میں نے اپنے کندھے پر کچھ لمس محسوس کیا۔ پلٹ کر دیکھا تو سجاد ظہیر۔ میں نے سوچا کہ جیسے سر پر پہاڑ کھڑا ہے۔ جلدی سے میں ان کے احترام میں کھڑا ہوا۔ کہنے لگے کہ چلو تم کو ملک راج

آنند سے ملوانا ہے۔کہاں رتن سنگھ! کہاں سجاد ظہیر اور کہاں ملک راج آنند۔ وہ ماحول کیا تھا جو رتن سنگھ کو ایک سجاد ظہیر اس ملک راج آنند سے ملا رہا ہے جو بین الاقوامی شہرت یافتہ تخلیق کار اور ایک ابھی کہانی کار بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ دونوں کی کڑی ملانے کی جو کوشش ہے، وہ ماحول کہاں ہے۔ ہم لوگوں کو جس طرح آگے بڑھایا گیا۔ رضیہ آپا میرے بچے کے لیے گلی ڈنڈا لے کر آئی تھیں، تو ایک گھریلو رشتہ تھا، سب لوگ ایک رشتہ میں بندھ گئے تھے۔ وہ کہانی کار کا رشتہ نہیں تھا بلکہ ایک فیملی کا رشتہ تھا۔ یہی ایک وجہ ہے کہ اگر آج اقبال مجید، عابد سہیل، آغا سہیل، منظر سلیم، رام لال وغیرہ کے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی تو اس کی ایک وجہ وہ ماحول ہے۔ آل احمد سرور صاحب علی گڑھ میں پروفیسر ہو کر تشریف لائے وہ اقبال مجید کو، عثمان غنی کو لکھنؤ سے علی گڑھ لائے صرف اس لیے کہ ان کی جو تربیت تھی وہ کہیں ادھوری نہ رہ جائے۔ یہ اپنا پن آج کہاں ہے؟

سوال: چھوٹی کہانی، بڑی کہانی، چھوٹے کردار، بڑے کردار یہ کیا ہوتا اور اس کا تصور کہاں سے پیدا ہوا؟

جواب: دیکھیے! آپ ان جھمیلوں میں نہ پڑیے، آپ ٹوٹل امپیکٹ (اثرات) دیکھیے کہ کہانی بنی ہے یا نہیں۔ الٹی میٹلی آپ کہانی کار کو بھی بھول جائیے۔ کیونکہ کہانی کار زندہ نہیں رہے گا، کہانی زندہ رہے گی۔ آدمی بس اپنی زندگی تک ہی دوسروں کے خیال میں رہتا ہے۔ عابد سہیل جب رسالہ 'کتاب' نکال رہے تھے، میری تین کہانیوں سے میرا نام ہی اڑا دیا اور قارئین سے یہ کہا کہ ان پر بحث کیجیے اور بتائیے کہ کہانیاں کیسی ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ کوئی نام کی وجہ سے بحث نہ کرے۔ کہانی کی وجہ سے بات کرے۔ اس میں میری ایک کہانی شامل تھی جس کا نام تھا 'ہزاروں سال لمبی رات' اور اس کہانی پر جو ذاتی رائے آئی تھیں وہ دو تھیں کہ بکواس ہے، لطیفہ ہے، دوسری رائے یہ تھی کہ کلاسک اور بہترین کہانی ہے۔

سوال: آپ کے بعد کی جنریشن ہے یعنی 1980 کے بعد کی جنریشن ہے، اس کے سلسلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: یہ ذرا مشکل ترین سوال ہے۔ میں اگر صاف گوئی سے کام لوں تو جس طرح ہماری نسل نے کرشن چندر، بیدی، عصمت آپا، قرۃ العین حیدر وغیرہ کی موجودگی میں اپنی پہچان بنائی تھی... میں آپ کو بتاؤں کہ کرشن چندر سے میری پہلی ملاقات کیسے ہوئی ہے۔ رضیہ آپا نے کرشن چندر کو بلایا اور کہا ''کرشن چندر ان سے ملو یہ نئے کہانی کار رتن سنگھ ہیں''۔ کرشن چندر جی نے کہا ''آپا کئی برسوں سے ہم ان کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں پڑھتے آرہے ہیں، اور آپ انھیں نیا کہانی کار کہہ رہی ہیں۔'' کرشن چندر کی اس بات سے مجھے اتنی بڑی ہمت ملی تھی کہ اتنا بڑا قلم کار ایک رتن سنگھ کو بطور کہانی کار جانتا ہے۔ آج کی جو نئی نسل ہے وہ ساری کی ساری پچاس کے لپیٹے میں ہے خواہ وہ غضنفر ہوں، سید محمد اشرف، طارق چھتاری ہوں، یہ سب کے سب پچاس سے اوپر کے ہیں، ان کے بعد کتنی اور نسلیں آجانی چاہیے تھیں لیکن کیوں نہیں آئی ہیں؟ آپ کی عمر کے بچے کہاں ہیں، آپ سے دس سال کم عمر کے بچے کہاں ہیں؟ آپ کو معلوم ہے کہ قرۃ العین حیدر نے اپنی پہلی اور دوسری کہانی سے اپنی پہچان بنائی تھی۔

سوال: اس صورت حال کے لیے کون ذمہ دار ہے، کیا سبب ہے اس سب کا؟

جواب: دیکھو ایک تو زبان کا بھی المیہ ہے۔ مثال کے طور پر جب میری پہلی کہانی ظ انصاری نے مانگ لی تھی تو آدھا لکھنؤ مجھے مبارکباد دیتا رہا۔ جب طفیل صاحب کا خط آیا تھا کہ ہم تمہاری کہانی 'نقوش' میں چھاپ رہے ہیں، تو میں وہ خط چھ مہینے تک جیب میں ڈال کر عابد سہیل اور اقبال مجید پر رعب ڈالتا رہا کہ دیکھو میں پہنچ گیا ہوں۔ میں جو بات کہہ رہا ہوں کہ وہ صحت مند ماحول کہاں ہے؟ اقبال مجید نے کہانی لکھی اور مجھے ریلوے اسٹیشن پر واقع کافی ہاؤس لے کر گیا۔ انڈا کھلا کے اور چائے پلا کے اپنی کہانی سنائی۔ کہنے لگا کہ ہوش اڑے؟ میں نے کہا اڑے اور واقعی بہت اچھی کہانی تھی۔ چھ مہینے بعد میں نے ایک کہانی لکھی اور اسی طرح میں نے عابد سہیل کو پکڑا اور کہا کہ تمہارا جو درخت ہے نہ اس کے سارے پتے میری بکری چر گئی ہے۔ وہ کہانی ایک بکری کے بارے میں تھی۔ جب میں نے اس کہانی کو چھپنے کے لیے قمر رئیس کے پاس بھیجا تو انھوں نے صرف کہانی نہیں چھاپی بلکہ جوگیندر پال اور دوسرے لوگوں کو بلایا اور اس پر بحث کرائی اور اس بحث کے ساتھ اپنے رسالہ میں کہانی

کو چھاپا۔ تو یہ جو مثبت اور تعمیری سوچ تھی اگر وہ آج کی نسل میں ہو تو دیکھو کیا ہوتا ہے۔ ترنم ریاض سوچیں کہ نگار کو بھی آگے بڑھنا چاہیے اور نگار کو ہمت کر کے یہ کہنا چاہیے کہ ترنم ریاض یقیناً تمہاری کہانی بہت اچھی ہے۔ تب جا کر ماحول بنے گا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ چونکہ نئی نسل پیدا نہیں ہو رہی ہے۔ اس میں یونیورسٹیاں، دوسرے ادبی ادارے جہاں نئی نسل جمع ہونے کا امکان ہے، ان کو کہانیاں لکھنے کی طرف مائل کیا جانا چاہیے اور اس طرح سے ہم ایک صحت مند ادبی ماحول تیار کر سکتے ہیں۔

ملاقاتی: رتن سنگھ صاحب آپ نے گفتگو کے لیے اتنا وقت دیا اس کے لیے شکریہ۔

رتن سنگھ: آپ کا بھی بہت شکریہ

•••

ڈاکٹر رضوان احمد سے گفتگو

ڈاکٹر رضوان احمد (1947 تا 2011) ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ دنیائے اردو انھیں ایک افسانہ نگار کے طور پر تو جانتی ہی ہے۔ وہ غیر معمولی صلاحیتیں رکھنے والے اردو صحافی کے طور پر بھی مقبول تھے۔ قومی اردو کونسل سے ان کا گہرا قلبی لگاؤ تھا۔ کونسل کی ترقیاتی سرگرمیوں میں اضافے سے موصوف بے حد خوش تھے اور اپنے اخباری کالموں میں اکثر اردو کونسل کی کارکردگی پر خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ یکم جون 2011 کو شدید علالت کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ اس سے پہلے انھوں نے معروف ادیب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کو ایک انٹرویو دیا تھا جو رضوان احمد صاحب کی زندگی کا آخری انٹرویو ثابت ہوا۔ خراج عقیدت کے طور پر اُن کا غیر مطبوعہ انٹرویو ہدیۂ قارئین ہے۔

سوال: آپ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

جواب: میری پیدائش 9 ستمبر 1947 کو اتر پردیش میں ضلع بارہ بنکی کے دور افتادہ قصبہ موئی میں ہوئی تھی۔

سوال: تعلیم کی تفصیل بتائیں:

جواب: میری ابتدائی تعلیم میرے گاؤں کے مدرسہ میں ہوئی تھی۔اس کے بعد میں نے اپنے گاؤں کے پرائمری اسکول میں پانچویں درجہ تک تعلیم حاصل کی تھی۔ پھر چھٹیں، ساتویں اور آٹھویں درجے کی تعلیم کانپور کے ایک مڈل اسکول میں حاصل کی اور ہائی اسکول تک اپنے گاؤں کے قریب واقع ایک مقام رام سینگھی گھاٹ میں پڑھائی کی۔اس کے بعد میں پٹنہ چلا آیا اور پٹنہ کے قدیم اسکول مسلم ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ پٹنہ کالج سے بی اے آنرس اور پھر پٹنہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ پی ایچ ڈی کافی عرصہ کے بعد بھاگلپور یونیورسٹی سی کی۔

سوال: وہ کیا محرکات تھے جنھوں نے آپ کو ادب وصحافت کی طرف راغب کیا؟

جواب: میرا خاندان شاعروں کا خاندان کہلاتا تھا۔ میرے دادا نثار بارہ بنکوی چار زبانوں اردو، عربی، فارسی اور اودھی میں شاعری کرتے تھے۔ان تمام زبانوں میں ان کے دیوان موجود ہیں۔وہ بے حد قادرالکلام شاعر تھے۔خطوط بھی منظوم لکھتے تھے۔اسی طرح سے میرے والد مرحوم غبار بھٹی بھی کہنہ مشق اور زود گو شاعر تھے۔ان کے بھی کئی دواوین شائع ہوئے اور کافی کلام غیر مطبوعہ بھی موجود ہیں۔میرے گھرانے میں علم وادب کا چرچا تھا۔ادبی رسائل آتے تھے۔ادبی نشستیں ہوتی تھیں۔جس کا میرے ذہن پر بہت اثر ہوا۔ حالانکہ میں میٹرک تک سائنس کا طالب علم تھا۔میرے والدین مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے لیکن سائنسی مضامین کی جانب میرا ذہن راغب نہیں ہوتا تھا۔ کہانیاں میں نے ساتویں کلاس سے ہی لکھنی شروع کردی تھیں اور میری پہلی کہانی بچوں کے ایک رسالہ، جو سیالکوٹ سے شائع ہوتا تھا اس کا نام 'علم وادب' تھا، اسی میں 1957 میں شائع ہوئی تھی۔ میں نے قلمی اخبار 'اصلاح' اسی سال نکالنا شروع کردیا تھا۔ جو ہاتھ سے لکھا جاتا تھا اور اسے پڑھنے کے لیے ہم جماعتوں کے درمیان تقسیم کردیا جاتا تھا۔ اس طرح میں ادب اور صحافت کی جانب بچپن سے ہی راغب ہوگیا تھا۔

سوال: صحافت کے مبادیات کیا ہیں؟

جواب: صحافت کے مبادیات میں اولیت 'صداقت' اور 'راست گفتاری' کی ہے۔ حالانکہ یہ بہت مشکل کام ہے کہ سیاہ کو سیاہ، سفید کو سفید، اندھیرے کو اندھیرا اور اجالے کو اجالا کہہ دیا

جائے۔ یہ بڑا مشکل کام ہے۔ یہ راہ بہت کٹھن ہے۔ اس سب کے باوجود میں نے اس راستے پر قدم رکھا اور اسے بہت پرخار پایا۔

سوال: موجودہ اردو صحافت سے آپ مطمئن ہیں؟

جواب: میں بالکل مطمئن نہیں ہوں۔ آج کی صحافت ایک تڑک بھڑک اور چمک دمک والی صحافت بن کر رہ گئی ہے۔ جہاں تزئین اور آرائش زیادہ ہے۔ صوری اعتبار سے اخبارات بہت خوبصورت ہو گئے ہیں لیکن معنوی اعتبار سے بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ پہلے صحافت عبادت ہوا کرتی تھی۔ آج کل تجارت ہو کر رہ گئی ہے اور اس تجارت نے تمام اصول وضوابط کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قاری بھی آج کے اخبارات کی خبر، شذرات، مضامین یا تجزیات پر بہت زیادہ اعتماد نہیں کرتا جب کہ پہلے ان کی تحریروں پر آمنا وصدقنا کہتا تھا۔ اس میں چھپی ہوئی ہر بات پر یقین کرتا تھا۔ یقین اٹھ گیا تو سب کچھ ختم ہو گیا۔ کیوں کہ اخبار کی تو بنیاد ہی اعتماد پر ہے۔ اعتماد قائم نہیں رہا تو کچھ بھی نہیں رہا۔ اسی وجہ سے میں آج کی صحافت سے بالکل مطمئن نہیں ہوں۔

سوال: ماہنامہ 'زیور' اور ہفتہ وار 'عظیم آباد ایکسپریس' آپ نے نکالا۔ اس سے کس طرح کا تجربہ حاصل ہوا؟

جواب: دیکھیے ماہنامہ 'زیور' جو میں نے 1967 سے نکالنا شروع کیا تھا وہ میرے لیے صرف ایک تجربہ گاہ تھی۔ اس وقت میری عمر صرف 20 سال تھی اور یہ رسالہ میں نے 8 برسوں تک نکالا اور اس سے بہت سے تلخ وشیریں تجربات ہوئے۔ اس کے بعد میں نے 1974 میں ہفتہ وار اخبار 'عظیم آباد ایکسپریس' شائع کرنا شروع کیا۔ اس اخبار کے ذریعے میں نے مختلف شعبوں میں پھیلے ہوئے کرپشن کو اجاگر کیا۔ خاص طور پر تعلیم گاہوں میں بدعنوانیاں تھیں ان کو میں نے طشت از بام کیا۔ جامعات میں جس طرح سے چودھری اپنا قانون چلاتے تھے اور صلاحیتوں کو بے دردی کے ساتھ قتل کرتے تھے۔ اس کو میں نے بہت شدت سے اجاگر کیا۔ اس کے بعد تعلیم گاہوں میں کافی

تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ اس میں 'عظیم آباد ایکسپریس' کا بہت اہم کردار ہے۔ پھر یہ اخبار 1980 میں روزنامہ ہو گیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے اس کا اجرا کسی سیاست داں سے نہیں کروایا تھا بلکہ نامور ناقد پروفیسر کلیم الدین احمد پہلی کاپی کا اجرا کرنے کے لیے آئے تھے اور انھوں نے اپنی تقریر میں کہا تھا'' میں عام طور پر جلسے، جلوسوں میں نہیں جاتا ہوں لیکن رضوان احمد سچ بولنے کی کوشش کرتے ہیں اس وجہ سے میں جلسہ میں چلا آیا ہوں۔'' یہ میری تھوڑی سی خدمت کا بہت بڑا اخراج تھا۔ ویسے تو میری صحافتی تحریروں کے معترف نامور ناقدین رہے ہیں جن کی ایک بہت طویل فہرست ہے مگر میں اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ اس میں قاضی عبدالودود، کلیم الدین احمد، آل احمد سرور، گوپی چند نارنگ، سردار جعفری، عصمت چغتائی، واجدہ تبسم جیسی شخصیتیں شامل رہی ہیں۔ یہ درست ہے کہ سچ بولنا مشکل کام ہے، بہت دشوار کام ہے، اس پر خار راستے پر چلنے میں پورا جسم لہولہان ہو جاتا ہے مگر اس آشوب سے جو آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ وہ کم نہیں ہے۔ کچھ وجوہات سے مجھے 1992 میں ادارت سے علیحدہ ہونا پڑا اور اس کے بعد سے آزادانہ صحافت کا راستہ اختیار کرنا پڑا جس پر میں اب تک گامزن ہوں۔

سوال: آپ کے نزدیک جدید افسانے کی بنیادی حقیقت کیا ہے؟

جواب: 1963 سے میں نے افسانہ لکھنا شروع کر دیا تھا اور میرا افسانہ ماہنامہ 'صبح نو' پٹنہ میں 1964 میں شائع ہوا تھا۔ قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ اس افسانے کو ماہنامہ 'نقش' کراچی نے ڈائجسٹ کیا تھا۔ جو نامور ادیب اور صحافی شاہد احمد دہلوی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ یہ میرے لیے فخر کا مقام تھا۔ دوسرا افسانہ 'شاعر' ممبئی میں شائع ہوا تھا۔ پھر مختلف رسائل میں افسانے شائع ہوتے رہے۔ جدید ادب کے ترجمان کی حیثیت سے شب خون کا بہت دور دورہ تھا۔ اس میں بھی میرے افسانے چھپے۔ کتاب، تحریک، آگہی، پیکر، آہنگ وغیرہ میں میرے افسانے چھپے۔ پاکستان میں میرے افسانے اوراق، افکار، سیپ، اقدار، اردو زبان وغیرہ میں شائع ہوئے مگر میں جو کچھ لکھا اپنی فکر کے مطابق لکھا۔ کسی رسالے کے مزاج کو

سامنے رکھ کر نہیں لکھا۔ اس لیے کبھی یہ سوال میرے ذہن میں نہیں رہا کہ یہ ترقی پسند ہے، جدید ہے، مابعد جدید ہے یا جدیدیت مخالف ہے۔ جو نئی چیز ہے وہ جدید ہے لیکن 1960 کے بعد جدیدیت کے نام پر جو کچھ ہوتا رہا وہ بہت پسندیدہ نہیں تھا۔ تجربے ہر زمانے میں ہوتے ہیں۔ ہونے چاہئیں لیکن ہمارے یہاں تجریدیت یا ایبسٹریکٹ کے نام پر جو کچھ ہوا اس کے منفی نتائج ہی برآمد ہوئے۔ مثبت کچھ بھی نہیں نکلا۔ افسانہ وہی ہے جو انسان کے ذہن کو اپنی جانب راغب کرے اور کچھ دیر یا تادیر سوچنے پر مجبور کرے۔ جو ذہن کو معمہ میں الجھادے وہ افسانہ نہیں ہے۔ اس کو پہیلی یا معمہ کہا جا سکتا ہے۔

سوال: ترقی پسند افسانہ اور مابعد جدید افسانہ میں کیا فرق ہے؟

جواب: میں افسانے کو صرف افسانے کی حیثیت سے جانتا ہوں۔ میرے نزدیک ترقی پسند، جدید یا مابعد جدید افسانے کے الگ الگ مفاہیم نہیں ہیں۔ یہ درست ہے کہ ترقی پسند تحریک ایک منشور کے تحت وجود میں آئی تھی اور بہت سے ادبا اور شعرا اس کو سامنے رکھ کر اپنی تخلیق کرتے تھے۔ لیکن آج وہ تخلیقات کہاں ہیں؟ ان کی کیا حیثیت باقی رہ گئی ہے؟ انھوں نے اپنی وقعت کھودی ہے۔ یہ صورت حال جدید افسانے کی بھی ہے جو ترقی پسندی کی مخالفت میں لکھا گیا اس کے ردعمل کے تحت لکھا گیا۔ وہاں بھی اچھی تخلیقات خال ہی نظر آتی ہیں۔ مابعد جدید افسانہ پرانی روش پر واپس لوٹ آیا ہے۔ وہ زندگی سے زیادہ قریب ہے۔

سوال: کوئی افسانہ کہاں علامتی ہے اور کہاں جائز استعارے میں بدل جاتا ہے؟ اس کی طرف آپ توجہ دیتے ہیں؟

جواب: افسانہ تخلیق کرتے وقت کوئی بھی تخلیق کار ان عوامل کو ذہن میں نہیں رکھتا۔ وہ لکھتا ہے تو لکھتا چلا جاتا ہے۔ پہلے سے یہ طے کرکے نہیں چلتا کہ کہاں پر علامتیں استعمال کرنی ہیں۔ کہاں استعارہ لانا ہے اور کہاں وضاحتی زبان استعمال کرنی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ درمیان میں کئی علامتیں آتی ہیں۔ استعاروں کا بھی استعمال ہوتا ہے اور یہ سب کہانی کو زیادہ بامعنی اور وسیع بناتے ہیں۔ زیادہ نوکیلا اور تیز بنادیتے ہیں۔ اس میں نشتریت پیدا کردیتے

ہیں۔ افسانہ تخلیق کرتے وقت کوئی بھی تخلیق کار ان عوامل کو ذہن میں نہیں رکھتا۔ وہ لکھتا ہے تو لکھتا چلا جاتا ہے۔ پہلے سے یہ طے کر کے نہیں چلتا کہ کہاں پر علامتیں خاص طور پر دیو مالائی واقعات کو بیان کرنے سے افسانے میں مزید تہیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے اکثر میں نے اپنے افسانوں میں ہندو دیو مالا کا استعمال کیا ہے اور اسے پڑھنے کے بعد میں نے خود بھی محسوس کیا ہے کہ افسانہ اکہرا نہ رہ کر کافی تہہ دار ہو گیا ہے۔ اس میں ترسیل کی کوئی خامی پیدا نہیں ہوتی۔ اگر قاری ان دیو مالائی کہانیوں سے واقف ہے تو افسانے سے زیادہ محظوظ ہو سکتا ہے اگر نہیں بھی واقف ہے تو ترسیل کی ناکامی سے دوچار نہیں ہوتا۔

سوال: فن پارے کے ناقابل فہم ہونے کی وجہ صرف پیچیدگی نہیں بلکہ قاری کے ذہن کی سطح اور تربیت بھی ہو سکتی ہے۔ کیوں؟

جواب: قلم کار عام طور پر چاہتا ہے کہ اس کی تخلیق کی ترسیل آسانی سے ہو جائے۔ تخلیق ناقابل فہم نہ بنے لیکن اگر تخلیق قاری کے ذہن کی سطح سے بلند ہو گئی تو وہ ترسیل کی ناکامی کے المیے سے دوچار ہو گی۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ قاری کے ذہن کی سطح اور تربیت ہی ہو گی۔

سوال: جو افسانے اساطیر پر لکھے جاتے ہیں ان میں ترسیل کی دشواری کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ کیوں؟

جواب: ایسا نہیں ہے، جو افسانے اساطیر کی بنیاد پر لکھے جاتے ہیں ان میں مفاہیم کی فراوانی زیادہ ہوتی ہے کیونکہ افسانے کی ایک سطح تو وہ ہوتی ہے جو اوپر سے نظر آتی ہے اور اس کی ترسیل میں قطعی کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ البتہ جس سطح کا تعلق اساطیر سے ہوتا ہے اس کی فہم اس قاری میں ہوتی ہے جو اساطیر کے قصوں سے واقف ہے اور جو قاری اساطیر کی کہانیاں جانتا ہے اسے وہ افسانہ پڑھنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔ اس پر کہانی کی تہیں کھلتی چلی جاتی ہیں اور زیادہ محظوظ ہو پاتا ہے۔ ایسا بالکل نہیں ہے کہ جو اساطیر سے واقف نہیں ہے وہ اس کہانی سے محظوظ نہیں ہو سکتا۔

سوال: اردو افسانے میں جنسی جذبے کو برتنے کے رجحان سے آپ کس حد تک متفق ہیں؟

جواب: ایسا کرنا ضروری نہیں ہے، بے سبب جنسی جذبے کو پیش کرنا جذبات کو برانگیختہ کرنا ہے۔ اس کے ذریعے سطحی قاری کے جذبات کو بھڑکایا جاتا ہے اور یہ کہانیاں بھی سطحی قسم کی ہوتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر افسانہ نگار جنسی جذبات کو برتنے کا فن جانتا ہو۔ البتہ جو اس کے فن سے واقف ہیں وہ اسے آرٹ کے طور پر برتتے ہیں ان کا مقصد سطحی بالکل نہیں ہوتا اور میں اس بات سے بالکل متفق ہوں کہ وہیں ایسا کیا جانا چاہیے جہاں اس کی ضرورت ہے۔

سوال: اردو افسانے میں نسائی شعور کے ردعمل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: جہاں تک نسائی شعور کی بات ہے تو آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ ہمارے یہاں خواتین قلم کاروں کی بہت بڑی تعداد رہی ہے اور یہ آج کی بات نہیں ہے۔ سو سال قبل اردو میں خواتین نے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس لیے ہمارے یہاں نسائی شعور بہت بالغ اور بیدار رہا ہے۔ جہاں تک جنسی جذبے کے سلسلے میں نسائی شعور کی بیداری کا سوال ہے تو آپ کو علم ہے کہ عصمت چغتائی نے کئی ایسی کہانیاں لکھی تھیں جن پر شدید اعتراض ہوا تھا اور نوبت عدالتی معاملات تک آ گئی تھی۔ 'لحاف' پر عدالت میں مقدمہ چلا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے یہاں خواتین افسانہ نگاروں کی تعداد بہت اہمیت کی حامل تھی، مثلاً حجاب امتیاز علی سے لے کر عصمت چغتائی، واجدہ تبسم، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، صائمہ خیری، اور اعجاز شاہین جیسی اہم افسانہ نگار خواتین موجود تھیں۔ ان میں عصمت چغتائی اور واجدہ تبسم پر جنسی جذبات کو برانگیختہ کرنے کے الزامات لگائے جاتے رہے ہیں، مگر ان خواتین افسانہ نگاروں نے اپنی روش تبدیل نہیں کی یہاں تک کہ الزام لگانے کے ہی منہ بند ہو گئے۔ لیکن اس قسم کے الزامات لگانے سے پہلے ہمیں یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ کیا واقعی اس کا مقصد جنسی جذبات کو مشتعل کرنا ہے، یا پھر اس کی نظر میں سماج کا اصلاحی پہلو ہے، وہ جنسی لذت کو شدید کرنا چاہتا ہے یا پھر ایک سماجی برائی کو روشنی میں لانا چاہتا ہے۔ مثلاً اس قسم کے الزام آپ منٹو پر تو نہیں لگا سکتے۔

سوال: نئی نسل کے قلم کاروں میں تخلیقی اعتبار سے آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے؟

جواب: بدقسمتی سے ہمارے یہاں افسانے میں نئی نسل پیدا ہی نہیں ہو سکی۔ اب اس کے جو بھی اسباب ہوں، ہمارے یہاں تو بحث ترقی پسند ادب، جدید ادب اور مابعد جدید ادب میں الجھ

کر رہ گئی۔ 1980 کے بعد لکھنے والوں نے خود کو مابعد جدیدیت کا علمبردار کہنا شروع کر دیا۔لیکن یہ ضرور ہے کہ 1980 کے بعد لکھنے والے کچھ افسانہ نگاروں نے قلم کے وقار کو باقی رکھا ہے۔اس میں مشرف عالم ذوقی اور صغیر رحمانی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

سوال: کیا مشاعرے زبان وادب کے فروغ میں کوئی کردار ادا کرتے ہیں؟

جواب: مشاعرے کسی زمانے میں اردو ادب کے فروغ اور ترسیل کا ذریعہ رہے ہیں لیکن اب ان کی حیثیت تبدیل ہوگئی ہے کیونکہ اب ان کی حیثیت ڈرامے اور نوٹنکی جیسی ہوگئی ہے۔اس میں شعرا نہیں آتے بلکہ پرفارمنگ آرٹ کرنے والے ڈرامہ باز آتے ہیں اور انھیں ہی سامعین پسند کرتے ہیں کیونکہ یہ لوگ شعر نہیں سناتے ،اداکاری کرتے ہیں،مشاعروں میں آنے والے زیادہ تر متشاعر ہیں۔جو اشعار نہیں کہتے مگر ادائیگی ایک خاص انداز سے کرتے ہیں۔جن کا انداز دیکھ کر سامعین خوب واہ واہ کرتے ہیں۔ان متشاعروں نے اپنی ایک ناچ منڈلی سی بنا رکھی ہے جن کا اپنا نقیب بھی ہوتا ہے۔جو اپنے گروہ کے شاعروں کے خوب خوب قصیدے پڑھتا ہے جب کہ کسی مخالف گروپ کے شاعر کو قعر مذلت میں گرا دیتا ہے۔مشاعروں کا معیار بہت پست ہوگیا ہے۔اب سنجیدہ سامع اسے سننے کے لیے جانا بھی پسند نہیں کرتا۔ایسے میں بھلا مشاعرے زبان وادب کے فروغ میں کیا کردار ادا کرسکتے ہیں؟ یہ حقیقت تو اور بھی افسوس ناک ہے کہ کئی شاعرات اپنے اشعار دیوناگری رسم الخط میں لکھ کر لاتی ہے۔

سوال: اردو میں بچوں کے ادب سے آپ مطمئن ہیں؟

جواب: اردو میں بچوں کا ادب بہت سکڑتا چلا جارہا ہے،اب لکھنے والوں کی تعداد بھی محدود ہوگئی ہے،اس کا ایک سبب تو بچوں کے بیشتر رسائل کا بند ہوجانا ہے۔شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اب اردو جاننے والے بھی اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھاتے ہیں۔جب بچے اردو پڑھیں گے ہی نہیں اردو کے رسائل کا فروغ کہاں سے ہوگا۔ہمارے بچے تو اب انگریزی کے کامکس پڑھنا پسند کرتے ہیں۔اگر یہ کامکس اردو میں بھی شائع کی جائیں تو ان کی فروخت نہیں ہوسکتی کیونکہ بچوں کو اردو پڑھائی ہی نہیں جاتی۔اسکولوں میں بھی اردو کی تعلیم بہت

محدود ہوگئی ہے۔ایک طرح سے بچوں کے ادب کا مستقبل تابناک نہیں ہے۔ایک زمانہ تھا جب اردو کے تمام اہم قلم کار بچوں کے لیے بھی لکھنا پسند کرتے تھے۔لیکن آج حالات بدل گئے ہیں۔

سوال: عشق کے متعلق آپ کا نظریہ؟

جواب: عشق کے متعلق میرا نظریہ وہی ہے جو حضرت خمار بارہ بنکوی کا ہے:

یہ مصرعہ نہیں ہے وظیفہ مرا ہے
خدا ہے محبت، محبت خدا ہے

میں نے آپ کو پہلے ہی بتایا کہ میرا تعلق ضلع بارہ بنکی سے ہے۔وہاں ایک بہت بڑے صوفی بزرگ حضرت وارث علی شاہ تھے۔ان کا فرمانا تھا ''عشق میں کافر ہوئے بغیر کوئی مسلمان نہیں ہوسکتا'' اور عشق کے بارے میں میرا بھی نظریہ یہی ہے۔

سوال: اردو کا مستقبل؟

جواب: میرے نزدیک اردو کا مستقبل تابناک ہے کیونکہ اردو ادب صرف ہندوستان یا پاکستان تک محدود نہیں ہے بلکہ تیسری دنیا کے ممالک کی بھی ایک اہم زبان ہے۔آج اردو اخبارات، رسائل ہند و پاک سے ہی نہیں لندن، امریکہ، کناڈا، جرمنی، جاپان، سویڈن، دوبئی اور سعودی عرب سے بھی شائع ہورہے ہیں اور اخبارات زبان کی ترسیل و بقا کا بہت بڑا ذریعہ ہوتے ہیں۔میں اردو والوں کے رویے سے مایوس ضرور ہوں لیکن اردو زبان کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔سب سے زیادہ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں جن افراد کی روزی روٹی کا ذریعہ اردو ہے، ان اصحاب نے اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھائی ہے۔ اس کا سبب شاید ان کی احساس کمتری ہے۔

سوال: آپ کی کون کون سی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں؟

جواب: میری اب تک ایک درجن کتابیں شائع ہوچکی ہیں، سب سے پہلے 1964 میں نسیم انھونوی نے اپنے نسیم بک ڈپو سے بچوں کے لیے میری کتابیں 'یونان کی شہزادی' شائع کی تھی۔اس کے بعد سے تین افسانوی مجموعے مسدود راہوں کے مسافر، فصیل شب اور کسن

فیکون شائع ہو چکے ہیں۔ نیشنل بک ٹرسٹ نے میری ترجمہ کردہ دو کتابیں شائع کی ہیں۔ حکومت ہند کے پبلی کیشن ڈویژن نے ترجمہ کردہ ایک کتاب شائع کی۔ ساہتیہ اکادمی نے ایک مونوگراف اور ایک ترجمہ کردہ ناول شائع کیا۔ اس کے علاوہ میرے اداریوں کا مجموعہ 'مجھے بولنے دو' کے عنوان سے شائع ہو کر کافی زیر بحث رہ چکا ہے۔

ملاقاتی: شکریہ

رضوان احمد: آپ کا بھی بہت بہت شکریہ!

•••

عابد سہیل سے گفتگو

جناب عبد سہیل ہمارے بزرگ قلم کاروں میں سے ہیں۔ ان کی تحریروں خصوصاً افسانوں اور خاکوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک بار انھیں شروع کر کے آپ انھیں پورا پڑھے بغیر چین نہیں لے سکتے۔ عابد سہیل صاحب نے افسانوں اور خاکوں کے علاوہ تراجم بھی کیے ہیں اور اوائل عمری سے ہی صحافت سے وابستہ رہے ہیں۔ عابد سہیل صاحب کی پیدائش 29 نومبر 1932 کو ہوئی۔ آپ نے لکھنؤ میں یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم۔ اے۔ کیا۔ آپ 1952 سے 1961 تک روزنامہ ''قومی آواز'' سے اور 1961 سے 1986 تک انگریزی روزنامہ ''نیشنل ہیرالڈ'' سے وابستہ رہے۔ 1995 سے 1997 تک آپ نے ''پائنیر'' میں بھی کام کیا۔ آپ نے ماہنامہ ''کتاب'' 1962 میں جاری کیا جو پابندی سے 1976 تک شائع ہوا۔ آٹھ برس تک ''ٹائمس آف انڈیا'' لکھنؤ کے لیے ان کا ہفت روزہ کالم ''اردو پریس'' قارئین میں بے حد مقبول رہا۔ علاوہ ازیں انھوں نے روزنامہ ''صحافت'' کے سنڈے میگزین کی ادارت کی ذمہ داری بھی سنبھالی۔

جناب عابد سہیل کی شدہ کتابوں میں ''اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل''، ''مضامین احمد جمال پاشا''، ''سب سے چھوٹا غم'' (افسانوی مجموعہ)، ''فکشن کی تنقید- چند

مباحث'' (تنقید)''جینے والے''(افسانوی مجموعہ)،''کھلی کتابت'' (خاکے)، باغات (ترجمہ) قابلِ ذکر ہیں۔ نیا افسانوی مجموعہ''غلام گردش'' اشاعت کے مرحلے میں ہے۔'' آندھیوں کی فصل'' کے عنوان سے آپ ایک ناول بھی تحریر کررہے ہیں۔

جناب عابد سہیل کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں متعدد انعامات پیش کیے گئے ہیں جن میں غالب انسٹی ٹیوٹ کا غالب ایواڈ، یوپی اردو اکادمی انعام، بنگال اردو اکادمی انعام (جینے والے'' اور'' فکشن کی تنقید'') پر یو۔پی۔ اردو اکادمی انعام (''جینے والے'' اور سب سے چھوٹا غم'') پر بہار اردو اکادمی انعام(''جینے والے'' پر اور پچاس سالہ صحافتی خدمات کے لیے حکومت اتر پردیش کی جانب سے دیا جانے والا انعام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

سوال: افسانہ نگاری کے علاوہ آپ کو فکشن کی تنقید، خاکہ نگاری اور تراجم سے بھی دلچسپی ہے لیکن خود آپ کی نظر میں ان تینوں میں سے اولیت کس کو حاصل ہے؟

جواب: ظاہر ہے افسانہ نگاری کو۔ لیکن ادب کے حوالے سے میری پہلی محبت کتابوں سے ہے۔ میرے خیال میں دوسرے اور تیسرے درجے کا ادب تخلیق کرنے کی بجائے اول درجے کے ادب کا مطالعہ کرنا زیادہ بہتر ہے۔

سوال: اس سلسلے میں آپ سے اختلاف کرنا مشکل ہے تاہم چونکہ بطور تخلیق کار آپ کی شناخت بطور افسانہ نگار ہے، آپ نے فکشن کی تنقید پر بھی ایک فکر انگیز کتاب لکھی ہے۔آپ کی نظر میں افسانے کی سب سے بڑی خوبی کیا ہوسکتی ہے؟

جواب: یہی کہ قاری اسے پڑھنے پر مجبور ہو جائے اور اس میں زندہ رہنے کی سکت ہو۔افسانے کے سلسلے کی ساری بحثیں، خواہ وہ تکنیک سے متعلق ہوں یا واقعہ سے، کردار سے متعلق ہوں یا اسے قابل قبول بنانے سے،ان کا تعلق اسی بنیادی خوبی سے ہوتا ہے۔

سوال: کیا مقبولیت سے افسانے کے ہنر کا کوئی تعلق نہیں اور اگر ہے تو پاپولر ادب کی مقبولیت اور اچھے ادب کی مقبولیت میں کیا فرق ہوتا ہے؟

جواب: دیکھیے، مقبول دونوں ہی ہوتے ہیں بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ فوری طور پر پاپولر ادب اچھے ادب سے زیادہ مقبول ہو جائے۔ ایک افسانہ نگار نے اپنے ایک حالیہ مضمون میں لکھا کہ 1950 کے آخر میں یا اس کے چند سال بعد دہلی کے ایک ادارے نے ایک ناول کا پچاس ہزار کا ایڈیشن چھاپا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ افتخار اردو کے بڑے سے بڑے ناول کو حاصل ہوا ہو۔ چنانچہ صرف مقبولیت کو پیمانہ بنایا جائے تو پاپولر ناول ادبی شہ پارہ قرار پائے گا۔ لیکن یہ ہوتا نہیں۔ پاپولر ناول یا پاپولر ادب شعلۂ مستعجل ہوتا ہے۔ ایک بار بھڑکا اور بجھ گیا۔ اس سلسلے میں جس ناول کا ذکر کیا گیا ہے اس کا دوسرا ایڈیشن نہ اب تک شائع ہوا ہے اور نہ شاید کبھی شائع ہوگا۔ برخلاف اس کے امراؤ جان ادا، گئودان، آگ کا دریا، اداس نسلیں اور خدا کی بستی کے ایڈیشن کم سے کم ہر دوسرے سال ضرور شائع ہو جاتے ہیں اور یہ سلسلہ کئی زبانوں تک پھیلا ہوا ہے۔ چنانچہ مقبولیت تو دونوں طرح کی کتابوں میں مشترک عنصر ہے لیکن اچھے ادب میں زندہ رہنے کی سکت ہوتی ہے اور وہ پاپولر ادب کے برخلاف انسانی شعور کا حصہ بن جاتا ہے اور بار بار پڑھا جاتا ہے۔

سوال: آپ کے خیال میں افسانہ، ناولٹ اور ناول میں بنیادی فرق کیا ہوتا ہے۔ کیا اس سلسلے میں کوئی فیصلہ ضخامت کی بنیاد پر کیا جا سکتا ہے؟

جواب: جی نہیں، صفحات کی تعداد فیصلہ کن نہیں ہو سکتی۔ لیکن آگے بڑھنے سے پہلے یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ ناولٹ کی اصطلاح اب سکۂ رائج الوقت نہیں ہے۔ یہ اصطلاح بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کی ہے اور پانچویں دہائی میں مسترد کر دی گئی تھی۔ انھی دنوں کم و بیش ڈیڑھ سو صفحات کے Room At the Top کو ناول ہی قرار دیا گیا تھا۔ چنانچہ اب مقابلہ افسانے اور ناول کا ہے۔ یہ تو سب ہی تسلیم کریں گے کہ صفحات یا ضخامت کے اعتبار سے ناول طویل سے طویل افسانے سے بڑا ہوتا ہے۔ لیکن کیوں؟ دراصل افسانوی ادب میں سارا مقابلہ رشتوں کا ہوتا ہے۔ رشتہ انسان اور انسان کے درمیان، انسان اور دنیا کے درمیان اور انسان کا خود اپنے ساتھ۔ افسانے میں یہ رشتے پاس پاس ہونے کے علاوہ مقابلتاً کم مدت میں تشکیل پاتے ہیں جبکہ ناول میں ان

رشتوں کی مار دور دور تک پڑتی ہے۔ اب چونکہ ان رشتوں کا اظہار قضیوں (Proposition) کے ذریعے ہوتا ہے اس لیے ظاہر ہے دور تک پھیلے ہوئے رشتے، ان کی نفاستیں اور نزاکتیں، سماجی معاملات، گہرائیاں، الجھاوے اور سروکار زیادہ جگہ گھیرتے ہیں۔ تخلیق کی دنیا بڑی ہوگی تو ظاہر ہے وہ زیادہ جگہ بھی گھیرے گی۔ میرا خیال ہے کہ ناولٹ کی اصطلاح طویل افسانے کے متبادل کے طور پر استعمال کی جانے لگی تھی۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ ناول میں اپنی ضخامت کے سبب غیر متعلق واقعات اور معاملات کو پیش کرنے کی آزادی ہوتی ہے۔ یعنی ایسے واقعات بھی اس میں پیش کیے جاسکتے ہیں جن کا اصل کہانی سے لازمی طور پر کوئی تعلق نہ ہو؟

جواب: شاید ایسا نہیں ہے۔ یہ ہوتا تو ہم Fathers and Sons ایسے نہایت عمدہ لیکن مقابلتاً کم ضخیم ناول اور بزراف (Buzarov) ایسے کردار سے محروم رہ جاتے اور زیادہ تر، بلکہ شاید ہر ناول، غیر معمولی طور سے طویل ہوتا۔

افسانے کی طرح ناول میں بھی ہر واقعہ، ہر موڑ، ہر مکالمہ کسی نہ کسی طرح اس کے Thrust کو زیادہ معنی خیز بنانے کے علاوہ مجموعی فضا کی تشکیل میں معاون ہوتا ہے۔ چنانچہ کسی بھی ناول کے ایسے حصوں کی حیثیت جو کوئی بھی کام انجام نہیں دیتے حشو و زوائد سے زیادہ نہ ہوگی اور ان کی موجودگی کو ناول کا نقص ہی قرار دیا جائے گا۔

سوال: افسانے کی موجودہ صورت حال کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا نئی نسل کے افسانہ نگار عمدہ تخلیقات پیش کر رہے ہیں اور اگر آپ کے خیال میں ان کا تخلیقی سفر اطمینان بخش ہے تو کیا ان کی تخلیقات ان بلندیوں کو چھو سکتی ہیں جو کرشن چندر، بیدی اور عصمت چغتائی وغیرہ کے افسانوں میں ملتی ہیں؟

جواب: آج کے افسانے سے اگر ہم وہ سارے افسانے مراد لیں جو آج لکھے جا رہے ہیں، اور یقیناً ایسا ہی ہے، تو ان کے لکھنے والوں کو تین نسلوں میں تقسیم کرنا ہوگا۔ جہاں تک تعلق ادب کا ہے، وہ فکشن ہو یا شاعری، تین نسلیں ہمہ وقت تخلیق کے عمل میں مصروف، رہتی ہیں۔ یہاں ہمہ وقت سے مراد ہی ہر لمحے، ہر زمانے اور ہر دور ہے۔

ان میں سے ایک نسل وہ ہوتی ہے جو عمر کے اعتبار سے ساٹھ کے آس پاس ہوتی ہے۔ یہ نسل اپنی اقدار اور اپنے مسلمات کو تبدیل شدہ صورت سے ہم آہنگ کرنے میں مصروف نظر آتی ہے کہ ماضی سے رشتے بالکل ہی منقطع نہ ہو جائیں۔ آپ کا سوال شاید اسی نسل کے بارے میں ہے اور تیسری نسل وہ ہوتی ہے جو ادب کی دنیا میں بس ابھی داخل ہوئی ہو۔

آپ کا سوال اس نسل کے بارے میں ہے جس نے اپنا تخلیقی سفر 80-1971 کے درمیان شروع کیا تھا۔ آپ کی مراد شاید اسی نسل کے کارناموں سے ہے۔ تو جناب اس سلسلے میں میرا خیال ہے کہ مایوسی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ بات کہتے ہوئے میرے ذہن میں کئی افسانوں کے عنوان اور افسانہ نگاروں کے نام آرہے ہیں لیکن میں نام یوں نہیں لے رہا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ ہم لوگ ناولوں اور افسانوں کے عنوانات میں نہ گھر جائیں اور کچھ اصولی باتیں کرلیں۔

سوال: آج کے افسانے کو زبان کے غیر مناسب استعمال کے لیے نکتہ چینی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور یہ نکتہ چینی بالکل بے بنیاد بھی نہیں ہے لیکن اس سلسلے میں یہ بات بھی ذہن نشیں رکھنی ہوگی کہ ان افسانہ نگاروں کی خاصی بڑی تعداد ایسے علاقوں سے متعلق ہے جو اردو کے علاقے نہیں ہیں۔ اور وہ افسانہ نگار جو اردو کے علاقوں کے رہنے والے ہیں زبان کی تعلیم میں پیش آنے والی رکاوٹوں اور معیار کی پستی کے شکار ہیں۔ اعتراض کرتے وقت ہمیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی ہوگی کہ ہمارا معاشرہ روز بروز غیر اردو ہوتا جا رہا ہے۔ کیا اس صورت حال کا اثر نہیں پڑ رہا ہے؟

جواب: آپ نے جن افسانہ نگاروں کے نام لیے ہیں، کرشن چندر اور بیدی وغیرہ وہ اردو میں اس صنف کے رہنماؤں میں تھے۔ پریم چند کا سروکار بنیادی طور پر دیہی زندگی سے تھا۔ چنانچہ جس طرح کے افسانے سے آج یا پچھلے ساٹھ ستر برسوں سے ہمارا معاملہ ہے ان کی صف اول کے لوگ تو یہی ہوئے نا۔ اس کے علاوہ ان افسانہ نگاروں کی تخلیقات کو نئے پن کی کشش بھی حاصل تھی اس لیے آج کے افسانے کو ان افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے برابر

مقبولیت حاصل کرنے کے لیے بہت زیادہ نیا اور بہت زیادہ اچھا ہونا پڑے گا۔ آج کے افسانے کو اس پس منظر میں دیکھیے تو زیادہ مایوسی شاید نہ ہو۔

سوال: آپ انجمن ترقی پسند مصنفین سے بھی وابستہ تھے۔ کیا آپ کے خیال میں انجمن کی معنویت اب بھی باقی ہے؟

جواب: تنظیم نہیں نہیں، معنویت ان تصورات کی ہوتی ہے جو تنظیم کے ذریعے پیش کیے جاتے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان تصورات اور نظریات کا ایک بڑا حصہ اب بھی Relevant ہے۔ انجمن کی حیثیت اس وقت قطعاً ثانوی ہو جاتی ہے جب اس کے نظریات کو عام طور سے تسلیم کر لیا جائے۔ یہ صورت کم و بیش پچاس سال قبل ہی پیدا ہو گئی تھی اور اسی لیے انجمن کے دو بنیاد گزاروں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اب انجمن کی ضرورت نہیں رہ گئی ہے۔ میں خود کو ان کی رائے سے متفق پاتا ہوں۔

سوال: ویسے بھی انجمن کا وجود اب برائے نام ہی رہ گیا ہے۔

جواب: دیکھیے ادبی انجمنوں کا اب دور ختم ہو چکا ہے۔ یہ صورت صرف اردو میں نہیں ہر زبان میں ہے۔ پھر بھی، انجمن قائم رہتی ہے تو کوئی ایسا نقصان نہیں۔ کبھی کبھی سال میں ایک آدھ بار، کچھ ہم خیال لوگ مل بیٹھتے ہیں، اس سے ادبی سرگرمیوں میں کچھ اضافہ ہی ہوتا ہے۔

سوال: ترقی پسند تحریک کے زوال کا سبب کیا تھا، بھیمڑی (بھونڈی) کانفرنس؟

جواب: بھیمڑی کانفرنس سے ترقی پسند تحریک کو یقیناً نقصان پہنچا لیکن اس کانفرنس سے قبل ہی انجمن سے متعلق مصنفین کے ایک بڑے حصے پر، خاص طور سے ان ادیبوں پر جن کا تعلق بمبئی سے تھا، انتہا پسندانہ خیالات چھائے ہوئے تھے۔ یہ گل سیاست اور ادب کی غیر ضروری قربت نے کھلایا تھا۔ پریم چند نے کہا تھا ادب سیاست سے آگے چلتا ہے، اس وقت بلکہ کئی برس پہلے سے ادب سر جھکائے، آنکھیں بند کیے سیاست کے پیچھے چلنے لگا تھا۔ بھیمڑی کانفرنس تو ان حالات کا نقطۂ عروج تھی۔

سوال: سجاد ظہیر پاکستان نہ جاتے تو شاید صورت حال مختلف ہوتی؟

جواب: شاید نہیں۔ خود سجاد ظہیر انتہا پسندی کا شکار ہو گئے تھے۔ پارٹی نے پاکستان جانے کے لیے

جن دو تین لوگوں سے کہا تھا ان میں ڈاکٹر عبدالعلیم بھی تھے لیکن انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ ہمیں دوسروں کے پھٹے میں پیر ڈالنے کے بجائے اپنا گھر درست کرنا چاہیے۔ انھوں نے بھیمڑی میں انتہا پسندی کی مخالفت بھی کی تھی۔ ایسی صورت میں سجاد ظہیر پاکستان نہ گئے ہوتے تو بھیمڑی میں کیا ہوتا اس کا فیصلہ میں آپ ہی پر چھوڑتا ہوں۔

سوال: عابد سہیل صاحب یہ بتایئے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین، ترقی پسند تحریک یا ترقی پسند نظریات کی اردو ادب کو دین کیا ہے؟

جواب: ترقی پسند ادبی تحریک ادب کو ایک واضح سمت دینے کی ایک شعوری کوشش تھی۔ اس وقت عام طور سے ادب میں موضوع کو قابل لحاظ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ شاعری میں زیادہ توجہ ردیف و قافیہ، زبان کی نزاکت و نفاست اور بات سے بات پیدا کرنے پر دی جاتی تھی۔ صاف اور شفاف نثر بہت زیادہ پسند نہیں کی جاتی تھی اور نام نہاد ''خوبصورت نثر'' کو مقصود سمجھا جاتا تھا، موضوع کو نہیں۔ ترقی پسند ادب نے موضوع کو اہمیت دی جس کے سبب تنقید کے وزن اور وقار میں اضافہ ہوا، رپورتاژ کی ایک نئی صنف اردو میں وجود میں آئی، آزاد نظم کو اعتبار حاصل ہوا، علم اور ادب کے درمیان فاصلہ کم ہوا بلکہ علم ادب کا ہم رکاب بن گیا اور افسانے کی تو دنیا ہی بدل گئی۔

سوال: لیکن کہا جاتا ہے کہ ترقی پسندوں نے افسانے کو خاص طور سے فروغ دیا کیونکہ یہ صنف ان کے کام کی تھی؟

جواب: یہ خیال جدیدیت کے چند حامیوں کا ہے اور غلط ہے۔ اصناف کو چند لوگوں کی کوششوں سے فروغ نہیں حاصل ہوتا بلکہ ان کا عروج ان کی ضرورت کے تابع ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو مثنوی اور قصیدے کا رواج آج بھی ہوتا۔ افسانے کو عروج اس لیے حاصل ہوا کہ اس کی ضرورت تھی۔

سوال: بعض لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ افسانہ نثری نظم کے قریب آ رہا ہے؟

جواب: افسوس کسی نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ کیا نثر میں فعل اپنی کارکردگی سے بری الذمہ ہو گیا ہے۔ بات حقیقت میں یہ ہے کہ افسانہ شاعری کے قریب اس وقت تک

نہیں آ سکتا جب تک نثر اس کے لیے تیار نہ ہو۔ ہوا بس یہ تھا کہ زندگی کی بے معنویت، لفظ میں معنی کی عدم موجودگی اور ترسیل کی ناکامی پر اصرار کے سبب جدیدیت کے زیر اثر تخلیق پانے والا ادب فکری سرمائے سے بالکل ہی محروم ہو گیا تھا۔ ایک مخصوص قسم کی شاعری میں چونکہ خیال کو زیادہ اہمیت نہیں حاصل ہوئی اس لیے جدیدیت کے چند فلسفہ طرازوں کو یہ احساس ہوا کہ معنی سے عاری افسانہ شاعری کے قریب آ رہا ہے۔ بعد میں آپ نے دیکھا کہ جدیدیت کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی افسانہ اپنی پرانی ڈگر پر لوٹ آیا۔

سوال: پرانی ڈگر پر لوٹ آنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟

جواب: پرانی ڈگر سے مراد ہے کہانی اور بیانیہ کی طرف۔ علوم میں اضافہ اور زندگی کے تجربات کی گونا گونی میں زبردست وسعت کے سبب نثر کی اہمیت، ضرورت اور مقبولیت بڑھ رہی تھی۔ اس لیے افسانہ کوئی ایسی زبان قبول نہیں کر سکتا تھا جس میں فغاں کم اور انداز فغاں زیادہ ہو۔ فغاں کی اسی کمی اور انداز فغاں کی بہتات نے بھی جدیدیت کے زیر اثر لکھے جانے والے افسانے کے زوال کی راہ ہموار کی۔

سوال: آپ یہ تو نہیں کہنا چاہتے ہیں کہ آج کے افسانے نے ترقی پسندی کی ڈگر پکڑ لی ہے؟

جواب: ہرگز نہیں۔ لیکن دو ایک باتیں ضرور کہوں گا۔ ہم نظریے کے عہد میں سانس نہیں لے رہے ہیں۔ یہ اچھا ہے یا برا، یہ دوسری بات ہے۔ زندگی نے جو رخ اختیار کیا ہے اس میں کچھ دوسری چیزیں نشان منزل بن گئی ہیں۔ نظریہ اور یقین سے محرومی ایک المیہ بھی ہے۔ ان حالات میں کسی نظریے کو پوری طرح قابل قبول تسلیم نہ کرنے کے باوجود تخلیق کو بے معنویت بننے سے محفوظ رکھ کر آج کا افسانہ نگار ایک بڑا کارنامہ انجام دے رہا ہے۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں کے سامنے مقاصد تھے، آج کے افسانہ نگاروں کی متاع عزیز سروکار ہیں۔

سوال: آپ کی بنیادی شناخت بطور افسانہ نگار ہے۔ آپ کی پہلی تخلیق کب اور کہاں شائع ہوئی تھی؟

جواب: 1948 یا 1949 میں دیوان سنگھ مفتون کے ہفت روزہ ''ریاست'' کے خاص نمبر میں۔

سوال: اس نصف صدی سے زیادہ کے عرصے میں آپ کے صرف دو افسانوی مجموعے شائع ہوئے جن میں بمشکل تیس بتیس افسانے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب: افسانے میں، دیگر اصناف کی طرح ایک چیز معیار بھی ہوتی ہے۔ زندہ رکھنے کے لیے تو ایک ہی نہایت عمدہ افسانہ کافی ہوتی ہے۔ پھر عرض کردوں کہ اس دعوے کا تعلق میری افسانہ نگاری سے قطعاً نہیں ہے۔ اپنے افسانوں کی تعداد کے بارے میں یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ ہر افسانہ مجموعے میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ مصنف کو اپنی تخلیقات کو مسترد کرنے کا بھی تو حق حاصل ہے۔ اس کی تحریریں نظر ثانی کا انتظار بھی کر سکتی ہیں۔

سوال: آپ اپنے افسانوں کی کس خوبی یا کس پہلو کو زیادہ قابل قدر سمجھتے ہیں؟

جواب: یہ میرا کام نہیں۔ میں اپنے افسانوں کے بارے میں بات نہیں کرتا۔

سوال: آپ کے خاکوں کے مجموعے ''کھلی کتاب'' نے خاصی مقبولیت حاصل کی ہے اور کئی خاکے تو بار بار چھاپے بھی جارہے ہیں۔ ان کی اس کامیابی کا راز کیا ہے؟

جواب: راز اصل میں یہ ہے کہ جن لوگوں کے خاکے لکھے گئے ہیں ان میں سے بیشتر اپنے وقت کے دیوزاد تھے لیکن انھوں نے اپنی شخصیتوں پر پردے ڈال رکھے تھے۔ یہ لوگ صفوں کے پیچھے رہ کر کام کرتے تھے اور نام ونمود سے بے نیاز تھے۔ میں نے بس یہ کیا ہے کہ ان کی شخصیتوں پر سے پردے اٹھائے ہیں۔ ''کھلی کتاب'' کے خاکوں میں کوئی خوبی ہے تو بس یہ کہ ان حضرات کی عظمت اور ان کی شخصیت کے حاوی پہلو سامنے آ گئے ہیں۔ لیکن ایک افسوس بھی ہے۔ بعض خاکوں میں کم بیانی (Under Statement) سے کام لینا پڑا ہے۔ ڈر تھا کہ للّی پٹ کے باسی گلیور کو تسلیم کرنے ہی سے انکار نہ کردیں۔

سوال: نیشنل بک ٹرسٹ نے آپ کا ایک ترجمہ حال ہی میں شائع کیا ہے، لئیق فتح علی کی کتاب اردو میں ''باغات'' کے نام سے۔ یہ آپ کا پہلا ترجمہ تو معلوم نہیں ہوتا؟

جواب: ہے بھی نہیں۔ ترجمے سے میرا پہلا معاملہ بنگالی کہانیوں کے ذریعے ہوا جو انگریزی میں تھیں۔ افسانوں کا یہ انتخاب دو جلدوں میں تھا۔ میں نے تین یا چار کہانیوں کا اردو میں ترجمہ اس وقت کیا تھا جب میں کرسچین کالج سے انٹرمیڈیٹ کر رہا تھا۔ ان میں سے ایک ترجمہ پاکستان کے ''ماہ نو'' میں شائع ہوا تھا اور اس کا معاوضہ مجھے بذریعہ منی آرڈر ملا تھا۔ یعنی یہ بات 26 جنوری 1950 سے پہلے کی ہے۔ اس زمانے میں یا اس کے بعد

موپاساں، چیخوف، کیتھرائن مینسفیلڈ اور گورکی وغیرہ کی چند کہانیوں کے ترجمے کیے تھے۔ یہ سارا کام شوقیہ تھا لیکن اس کے بعد چند کتابوں کے ترجمے کرنے پڑے۔ ان میں سے صرف ایک ترجمہ میرے نام سے شائع ہوا، باقی فرضی ناموں سے لیکن اب نہ ان کتابوں کے نام یاد ہیں نہ وہ نام جو بطور مترجم یا کسی اور صورت میں ان کتابوں کی زینت بنے تھے۔ اس کو ترجمہ کہنا بھی شاید مناسب نہ ہو۔ ہوتا بس یہ تھا کہ ناشر کی فراہم کی ہوئی جاسوسی یا مہماتی ناول کے مقامات، افراد کے نام ہندوستانی رکھ کر ڈھیلا ڈھالا ترجمہ کر دیا جاتا۔

ایسے ہی ایک ناول کے سلسلے میں بڑی دلچسپ صورت حال پیدا ہو گئی۔ ناول میں چاروں طرف سے گھر جانے کے بعد ڈاکو پانی کے جہاز میں بیٹھ کر فرار ہو گئے تھے۔ میں نے مرکزی شہر کا نام لکھنؤ رکھا تھا۔ میں نے سوچا کہ نظر ثانی کے وقت ٹھیک کر دوں گا اور اس وقت ڈاکوؤں کو گومتی سے فرار ہو جانے دیا لیکن نظر ثانی کی نوبت ہی نہیں آئی چند ماہ بعد کتابی دنیا کے مالک اظہر نگرامی مرحوم کو جو اس کتاب کے ناشر تھے، ڈھاکہ سے ایک خط موصول ہوا جس میں لکھنؤ کی ترقی پر خوشی ظاہر کرتے ہوئے گومتی کے سمندر بن جانے پر مبارک باد دی گئی تھی۔ شاید یہ کتاب ''سرخ انگلیاں'' کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ بعد میں ''قومی آواز'' سے متعلق ہونے کے سبب ترجمے کی کچھ اور مشق ہو گئی۔

سوال: آپ کے زیر اشاعت افسانوی مجموعے کا نام کیا ہے؟

جواب: وہ تو میں بتا دوں گا لیکن پہلے آپ یہ بتائیے کہ یہ انٹرویو کس رسالے میں شائع کرائیں گے؟

سوال: اسے ''اردو دنیا'' میں اشاعت کے لیے دینا چاہتا ہوں۔

جواب: ''اردو دنیا'' میں تو انٹرویو تواتر سے شائع ہوتے ہیں۔ یہ ماہنامہ عمدہ بھی ہے اور مقبول بھی۔ سبب اس کا یہ ہے کہ اس نے خود کو ادب تک محدود نہیں رکھا ہے اور اس میں زبان، تعلیم، تاریخ، صحافت اور شخصیات وغیرہ پر بھی نہایت عمدہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس کا ناشر ادارہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دوسرے کاموں کے علاوہ یہ کام بھی بڑے پیمانے پر اور نہایت عمدگی سے کر رہی ہے۔

سوال: اس سلسلے میں کوئی مشورہ؟

جواب: مشورہ کیا؟ یہ خیال اکثر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اردو کتابوں کی نکاسی کے راستے روز بروز مسدود ہوتے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں کونسل کو کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔ میرے خیال میں کافی باتیں ہو گئیں۔

سوال: لیکن آپ نے مجموعے کا نام تو بتایا نہیں؟

جواب: ''غلام گردش''۔

سوال: ارادے، منصوبے؟

جواب: ہیں تو لیکن ''سامان سو برس کا پہل کی خبر نہیں'' والا معاملہ ہے۔ بس یہ سمجھیے اب کام سمیٹ رہا ہوں۔

سوال: آپ کے مشہور ماہنامے ''کتاب'' کا تو نام بھی نہیں آیا۔

جواب: پھر کبھی سہی۔

●●●

وریندر پٹواری سے گفتگو

جناب ویریندر پٹواری کا شمار عہد حاضر کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔آپ کی پیدائش گیارہ ستمبر 1940 کو سری نگر (کشمیر) میں ہوئی۔آپ پیشے سے انجینئر ہیں اور ایگزیکیوٹیو انجینئر کے عہدے سے سبک دوش ہوئے۔آپ نے 200 سے زیادہ اردو افسانے اور کوئی دو درجن کشمیری افسانے لکھے ہیں جو ملک اور بیرون ملک کے مختلف مقتدر رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔آپ کے اردو افسانوں کے مجموعے مندرجہ ذیل ہیں:

فرشتے خاموش ہیں(1981)، دوسری کرن(1986)، بے چین لمحوں کا تنہا سفر (1988)، آواز سرگوشیوں کی (1994)، ایک ادھوری کہانی (2002)اور افق(2003)۔آپ کے ڈراموں کا مجموعہ''آخری دن''(1983)اور ناولٹ''کب بھور ہوگی''(2000) کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ جناب ویریندر پٹواری نے بڑی تعداد میں ریڈیو ڈرامے، اسٹیج ڈرامے، ٹی۔وی۔ڈرامے، ٹی۔وی۔سیریل اور کے اسکرپٹ بھی تحریر کیے ہیں۔

جناب ویریندر پٹواری کی کتابوں''دوسری کرن''اور''آواز سرگوشیوں کی''پر بہار اردو اکادمی نے بالترتیب 1988 اور 1996 میں انعام بھی پیش کیا تھا۔آج کل آپ دہلی

میں قیام پذیر ہیں اور فالج کے حملے کے باوجود مسلسل علم و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ پیش خدمت ہے آپ سے کی گئی گفتگو کے اہم اقتباسات۔

سوال: آپ افسانہ نگاری کی جانب کیسے مائل ہوئے؟

جواب: ہمارے گھر میں "شاعر" اور "بیسویں صدی" جیسے بیشتر جرائد آیا کرتے تھے اور میں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی کے علاوہ اپنی ریاست کے قدر آور افسانہ نگار ٹھاکر پونچھی، پشکر ناتھ اور نور شاہ کی کہانیاں یوں پڑھا کرتا تھا گویا ایک جھیل کے کنارے بیٹھا آتی جاتی سحر انگیز لہروں کو دیکھا کرتا تھا۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہہ رہی ہوں کہ اگر لہریں دور دور سے آ کر جھیل کے کنارے کے لپٹ کر اپنا وجود کھو بیٹھتی ہیں تو کیا یہ ممکن نہیں کہ کنارے ہی آواز دے کر یوں بلا رہے ہوں۔ میں سمجھ گیا کہ کسی بھی موضوع کو مختلف زاویوں سے دیکھ کر کچھ عملی اور کچھ تصوراتی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ یعنی ایک واقعہ، حادثہ، سانحہ یا المیہ بھی ایسے حالات پیدا کرتا ہے کہ ایک ہی شخص کسی کے نقطۂ نگاہ سے شہید بن جاتا ہے اور کسی دوسرے کی نظر میں وہ غدار کہلاتا ہے۔ میں نے جب یہ محسوس کیا کہ میرا زاویہ مختلف ہے تب میں خود افسانے لکھنے لگا۔ اور یوں افسانہ نگاری کی جانب مائل ہوا۔

سوال: آپ کا پہلا افسانہ کب اور کس رسالے میں شائع ہوا؟

جواب: میرا پہلا افسانہ بعنوان "سسکیاں" 1965 میں بمبئی کے ایک جریدے "صبح امید" میں شائع ہوا تھا۔

سوال: کیا آپ کے گھر میں ادبی ماحول تھا؟

جواب: جی نہیں! میرے ابا آنجہانی پنڈت پریم ناتھ پٹواری مسرور کشمیری کو اردو زبان سے جنون کی حد تک پیار تھا۔ ان کی بزم میں شعرا اور ادبا شریک ہوا کرتے تھے۔ اس لیے ماحول شاعرانہ ہوا کرتا تھا۔ بچپن میں، میں جہاں فلمی گیت گایا کرتا تھا وہاں اپنے ابا کی نظمیں بھی گنگنایا کرتا تھا۔ حالانکہ ان کے مطلب سے قطعی ناآشنا ہوا کرتا تھا۔ خوشے کو گوشے کہنے پر

ایک زبان داں باپ نے اپنے دس سال کے بیٹے کی پٹائی کی تھی۔ پہلی اور آخری بار۔ اس کے بعد زبان اور تلفظ پر توجہ دینا بعد میں ایک ضرورت بن گئی۔

سوال: آپ پیشے سے انجینئر رہے ہیں اور مزاجاً ایک ادیب، ان دونوں میں کس طرح سے ہم آہنگی قائم رکھی ہے؟

جواب: ایک سول انجینئر اور ایک ادیب کے درمیان ایک گہری خلیج پر میں نے ایک پل بنایا تھا اور وہ میں خود تھا جس پر یک طرفہ ٹریفک کنٹرول کرنے والا بھی میں تھا۔ اس لیے کبھی کسی ذہنی تناؤ کا شکار، ٹکراؤ کی وجہ سے نہیں ہو پایا۔ ہاں مگر یہ سچ ہے کہ انجینئر مجھے ایک ادیب سمجھ کر اور ادبی حلقے مجھے ایک انجینئر ہونے کے لیے رعایتیں دیا کرتے تھے۔ مگر خدا گواہ ہے کہ میں نے رعایتوں کا بھی ناجائز فائدہ نہیں لیا۔ وہ سلسلہ اب بھی جاری ہے حالانکہ ایک حادثے کی وجہ سے میرا انجینئرنگ کیریئر ایک پتھر کی طرح گہرے پانی میں ڈوب گیا!

سوال: جس زمانے میں آپ نے افسانے لکھنے شروع کیے اس وقت کی ادبی فضا کیسی تھی اور آپ کن افسانہ نگاروں سے متاثر ہوئے؟

جواب: ترقی پسند ادب کی بہاریں پُرکیف ہوا کرتی تھیں۔ مرحوم کرشن چندر میرے پسندیدہ افسانہ نگار تھے اور اپنی ریاست کے نور شاہ کی رومانی کہانیاں مجھے تب بھی اور ابھی اچھی لگتی ہیں۔ کیونکہ ان کی ہر کہانی معاشرے کی ایم۔آر۔آئی (M.R.I.) رپورٹ ہوتی ہیں۔ احتیاط اور علاج دونوں کے لیے۔

سوال: فکر و فن کے اعتبار سے کس افسانہ نگار کی تخلیقات آپ کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہیں؟

جواب: خواجہ احمد عباس کی بامقصد کہانیاں، راجندر سنگھ بیدی کے اچھوتے موضوعات، کرشن چندر کا منفرد اسلوب، جوگندر پال کی نرالی کہانیاں جو وہ چند سطور میں بیان کرتے ہیں اور گلزار کی چونکا دینے والی ''مرد'' جیسی کہانیاں۔

سوال: آپ کے افسانوں میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے زوال کا نوحہ کثرت سے ملتا ہے۔ کیا اب آپ اس بات سے ناامید ہو گئے ہیں کہ ہندو مسلم تعلقات پھر سے خوشگوار ہو سکیں گے؟

جواب: قدرت نے حیات کے لیے صاف و شفاف پانی میسر کیا۔ ہم نے اس کو آلودہ کر دیا ہے۔

سیاست نے بھی ہندوستانی تہذیب کو آلودہ کر کے جسمانی طور پر نہیں بلکہ دیدہ دانستہ اپنی زہریلی آلودگی میں قید کر کے ہندو روبوٹ اور مسلم روبوٹ بنا دیے ہیں۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ جس دن ان روبوٹوں کو آپس میں لڑانے والوں کو ہندو مسلمان ایک کارواں بنا کر شیطانی قلعوں کو اڑا دیں گے ہجوموں میں کھوئے، اپنوں سے بچھڑے لوگ ایک ہو کر، ایک پُرسکون و خوشحال زندگی گزاریں گے۔ مجھے خوشگوار تعلقات کی دستک سنائی دے رہی ہے۔ ہاں!۔!!

سوال: مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے احیا کے لیے اقدامات کیے جانے چاہئیں؟

جواب: میل جول، تبادلۂ خیالات، ہم خیال لوگوں کی جذباتی ہم آہنگی ایک ہی راستے پر ایک ہی کارواں اور ایک ہی منزل۔ یہ سوچ کر کہ شطرنج کے ماہر کھلاڑی بساط تو بچھا سکتے ہیں مگر مہروں کے بغیر جنگ کا کھیل نہیں کھیل سکتے۔!

سوال: اپنے افسانوں کے موضوعات آپ کس طرح اور کہاں سے اخذ کرتے ہیں؟

جواب: گرد و پیش پر نظر رکھتا ہوں۔ جھیل میں مچھیرے کے پھینکے ہوئے جال کی طرح وہ سب دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں جو مچھلیوں کے انتظار میں بیٹھا مچھیرا دیکھ نہیں پاتا۔ غم اور خوشی کے واقعات سے بنے حالات کی ترجمانی کرتا ہوں۔ حالات سے ٹھونسے گئے واقعات خاص طور پر فسادات کے بارے میں کم اور ان کے زد میں آئے ہوئے لوگوں کے درد اور کرب کو خود کو محسوس کرتے ہوئے اپنا حالِ دل بیان کرنے کی سعی کرتا ہوں۔

سوال: افسانے کے اجزائے ترکیبی میں آپ سب سے زیادہ اہم کسے خیال کرتے ہیں اور کیوں؟

جواب: اپنے خیالات، احساسات، محسوسات، خدشات، صدمات کو ظاہر کر کے کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس امید کے ساتھ کچھ Convey کر پاؤں اور ایک نئی سحر کے اجلے پن کا انتظار کرتا ہوں۔

سوال: ہم عصر افسانہ نگاروں میں آپ کس سے متاثر ہیں؟

جواب: ہم خیال ہم عصروں سے متاثر ہوں۔ اپنی ہی ریاست کے دو قلم کاروں عمر مجید اور آنند لہر کی کہانیوں کو بے حد پسند کرتا ہوں۔

سوال: ہندو پاک میں موجودہ عہد میں خاصی تعداد میں افسانے لکھے جا رہے ہیں۔ آپ کے خیال میں کہاں زیادہ اچھے افسانے لکھے جا رہے ہیں؟

جواب: اگر کسوٹی انتظار حسین کے افسانے ہیں تو پاکستان میں زیادہ اچھے افسانے لکھے جا رہے ہیں اور اگر کسوٹی جوگیندر پال کے افسانے، ہیں تو ہمارے ملک کے افسانوں کا معیار بہتر ہے۔ کبھی کبھار پاکستان کے مدیران اپنے جریدے بھیجتے رہتے ہیں۔ اس لیے عام طور پر لکھے جا رہے افسانوں کے بارے میں زیادہ معلومات کا فقدان ہے۔ اگر وہاں احمد ندیم قاسمی تھے تو یہاں ان کا شاگرد گلزار ہے۔ ہاں یہ بات میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ پاکستان میں تخلیق پر اور ہمارے یہاں تحقیق پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ جو قلم کار اپنی مادری زبان میں اپنی چھاپ چھوڑے بغیر ہندی میں ایک کتاب لکھتے ہیں تو ان کو کتاب کا معیار نظر انداز کر کے ایک لاکھ روپے کا انعام ملتا ہے جبکہ اردو میں لکھنے والوں کو اعلیٰ معیار کی تخلیقات پر ایسے اعزازات سے محروم رکھا جاتا ہے۔ جانے کیوں؟

سوال: اچھے افسانے کو کن خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے؟

جواب: موضوع اچھا ہو۔ اسلوب بہتر ہو اور زبان میں روانی ہو۔ اس سے زیادہ اہم یہ کی افسانہ قارئین کے لیے ایک صفحہ بن کر ناقدین کی سوچ کے دائرے میں قید نہ رہے بلکہ قارئین کے دل کو چھو کر دماغ تک پہنچ جائے۔

سوال: آپ کے افسانوں کے کتنے مجموعے شائع ہو چکے ہیں اس کے علاوہ آپ نے ٹیلی ویژن کے لیے بہت سارے ڈرامے اور سیریل بھی لکھے ہیں آپ بحیثیت ادیب اپنی کس صنف سے مطمئن ہیں؟

جواب: میری اب تک شاعر، بیسویں صدی، آج کل، انشا، جیسے ادبی قومی اور بین الاقوامی جرائد میں 221 کہانیاں شائع ہو چکی ہیں جنھیں کافی پسند کیا گیا۔ ''فرشتے خاموش ہیں!'' ''دوسری کرن''، ''بے چین لمحوں کا تنہا سفر''، ''آواز سرگوشیوں کی''، ''ایک ادھوری کہانی'' اور ''افق'' کے عنوانات سے افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ دو اور کہانیوں کے مجموعے زیر ترتیب ہیں۔ ''بے چین لمحوں کا تنہا سفر'' پر جموں یونیورسٹی میں ایم

فل کا مقالہ بھی لکھا گیا ہے۔''آخری رات'' میرے ڈراموں کا پہلا مجموعہ ہے''انسان'' میرے ڈراموں کا دوسرا مجموعہ ہے جو جلد ہی شائع ہوگا۔ میں نے ایک ناولٹ ''کب بھور ہوگی؟'' دیوناگری میں شائع کیا تھا اس کی خوبی یہ ہے کہ ایک طویل نظم ہی ناولٹ ہے۔ میں نے ٹی۔وی کے لیے کئی ڈرامے، ٹیلی فلمیں اور کشمیری کے علاوہ اردو میں بہت سارے سیریل لکھے ہیں۔ چونکہ ٹی۔وی یا فلم میں ایک تیسرا رخ (Third Dimension) مل جاتا ہے اور فنون لطیفہ کے مختلف رنگ مثلاً'' موسیقی، سیٹس (Sets) لوکیشن کے علاوہ مکالموں کو ڈرامائی شیڈز (Shades) مل جاتے ہیں۔ ایکشن اور ری ایکشن (Action & Reaction) کی مدد سے منظر تحریر سے تصویر بن جاتا ہے اس لیے مجھے ذاتی طور پر قارئین کے لیے افسانے اور ناظرین کے لیے سیریل لکھنا اچھا لگتا ہے۔ کاش دوردرشن کا ایک اردو چینل ہوتا اور وہاں سے افسانوں کا ٹی۔وی۔روپ دیکھنے کو ملتا۔ تقریباً بیس برس پہلے مرحومہ عصمت آپا کے افسانے ''دوزخ'' کو دیکھ کر ناظرین جھوم اٹھے تھے۔

سوال: آپ نے زندگی کا اتنا بڑا حادثہ برداشت کرلیا ہے، جسمانی ناتوانی کے باوجود آپ نے لکھنا نہیں چھوڑا۔ یہ سب کیسے ممکن ہوا؟

جواب: زندہ رہنے کے لیے سانسوں کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ میرا قلم جب میرے ہاتھ میں ہوتا ہے تو بقول ناصر کاظمی:

غم ہے یا خوشی ہے تو
میری زندگی ہے تو!

سوال: ملک میں اردو کی مجموعی فضا کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: کچھ کہا بھی نہ جائے مگر چپ رہا بھی نہ جائے۔ زبان ادب کو تاثیر مسیحائی دیتی ہے۔ اردو کا کوئی چھوٹا یا بڑا قلم کار۔ اپنی پانچ سو کتابوں کے ذریعے عام قارئین تک نہیں پہنچ پاتا بلکہ ان معیاری جرائد کی بدولت بھی قارئین تک نہیں پہنچ پاتا ہے جن کی پانچ ہزار کاپیاں چھپتی ہیں۔ اس لیے اگر ایک ایسا جریدہ نکالا جائے تو بڑا کام ہوگا۔ سمینار وغیرہ میری سمجھ کے مطابق

بے اثر نہ سہی موثر نتائج نہیں دے پاتے۔"

سوال: قومی اردو کونسل نے اردو زبان اور تعلیم کے فروغ کے لیے جو اقدامات کیے ہیں ان سے متعلق آپ کی رائے ہے؟

جواب: میری نظر میں کونسل نے جو گلزار کی لکھی فلموں کے منظر نامے کتابی شکل میں شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے وہ قابل تعریف قدم ہے اور پھر مرحوم آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے کتابی شکل میں شائع کرنے کا کام میرے لیے متبرک کتابیں ہیں۔ آپ کے جریدے "اردو دنیا" میں ادبی سرگرمیوں سے متعلق "اردو خبر نامہ" سے اطلاعات ملتی رہتی ہیں۔ یہ اچھے اقدامات ہیں۔ تازہ شمارے کا خوبصورت سرورق اور اس پر شہنشاہ موسیقی نوشاد علی کی پُرکشش تصویر دیکھ کر مدیر "اردو دنیا" کے ذوق جمال کی تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ان باتوں پر ذرا زیادہ توجہ دی جائے تو ایک اجنبی بھی کسی بک اسٹال پر ایک ادبی میگزین کے خوبصورت کور کو دیکھ کر متوجہ ہو جاتا ہے۔ پھر ایک بار ہاتھ میں آجائے اور اندر دلچسپ مواد ہو تو رسالہ بار بار خریدنے کو جی چاہے گا۔ ایسے اقدامات کونسل کی مطبوعات کی فروخت میں مددگار ثابت ہوں گے۔ آپ کا جریدہ انجمن بن کر آپ کے اقدامات اور مقاصد ملک کے کونے تک بکھرے بچھڑے اردو کے قارئین کو ایک دوسرے جوڑ دے گا۔

سوال: "اردو دنیا" کے قارئین کے نام آپ کیا پیغام دیں گے؟

جواب: دنیا بھر کے اردو زبان سے پیار کرنے والو— تحقیق یا تنقید تب کی جاتی ہے جب تخلیقات سامنے ہوں۔ اس لیے تخلیقات کی آبیاری کرنے کے لیے ایک ہو جاؤ۔ ورنہ لہک رہے پودے تناور درخت بن جانے سے پہلے اپنا وجود کھو بیٹھیں گے اور پھر اردو زبان کے تازہ ترین خدوخال دیکھنے کی بجائے ہمیں اردو کی تاریخ پڑھنے کو ملے گی گویا منوہری کی عشقیہ داستان کو بھول کر لوگ موہن جوداڑو کے کھنڈرات کی تواریخ پڑھ لیں گے۔

•••

رشید امجد سے گفتگو

1960 کی دہائی میں اردو میں جدید افسانے کا ظہور ہوا۔ راولپنڈی اردو دنیا میں اس اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے کہ اس نے افسانے کی اس تبدیلی کو نہ صرف سب سے پہلے اپنایا بلکہ اس کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔ اس لیے راولپنڈی کو جدید افسانے کا شہر بھی کہا جا سکتا ہے۔ عصر حاضر میں بھی اس صنف کو قبولیت عام بخشنے میں اس شہر کا اہم کردار یہ ہے کہ یہاں منشا یاد سے لے کر حمید شاہد تک افسانہ لکھنے والوں کا ایک قبیلہ ہے جو اپنے رشحات قلم سے اردو افسانے کو باثروت بنا رہے ہیں اور معاصر ادب میں جن کی وجہ سے اردو افسانے کا اعتبار قائم ہے۔ اس قبیلے کے ایک اہم فرد ڈاکٹر رشید امجد ہیں جنھیں اردو افسانے میں اہم مقام حاصل ہے۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے ہیں اور جدید افسانے کی تعبیر و تفہیم میں اہم کردار بھی ادا کیا ہے۔ وہ 1960 سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ ان کا پہلا افسانہ بہ عنوان ''سنگم'' ''ادب لطیف'' لاہور میں شائع ہوا۔ اب تک ان کے گیارہ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد نے افسانے کے علاوہ تنقید اور تحقیق کے حوالے سے بھی متعدد کتب تصنیف کی ہیں۔ ان کی تصنیفات و تالیفات کی کل تعداد ستائیس ہے۔ ''بیزار آدم کے بیٹے'' (1974)، ''ریت پر گرفت'' (1978)، ''سہ پہر کی خزاں'' (1980)، ''پت جھڑ میں خود کلامی'' (1984)، ''بھاگے ہے بیاباں مجھ

ہے''(1988)، ''دشت نظر سے آگے'' (کلیات)(1991)اور''ست رنگے پرندے کے تعاقب میں''(2000) آپ کے افسانوی مجموعے ہیں۔

''نیا ادب'' (1969)، ''رویے اور شناختیں'' (1988)، ''یافت اور دریافت''(1989) ''شاعری کی سیاسی وفکری روایت''(1993)اور''میراجی:شخصیت و فن'' (1995) تنقیدی کتب اور ''پاکستانی ادب'(1984-1980)(چھ جلدیں)''اقبال:فکر وفن''(1984)،''تعلیم کی نظریاتی اساس''(1984)،''میرزاادیب: شخصیت وفن''(1991)،''پاکستانی ادب۔نثر''(1990,1991,1994,2001)، ''مزاحمتی ادب''(1995)اور''پاکستانی ثقافت''(1999) آپ کی مرتب کردہ کتابیں ہیں۔

2001 میں آپ کی خودنوشت ''تمنا بے تاب'' کے نام سے طبع ہوئی ہے جو اپنے اندر تخلیقی ذائقہ رکھی ہے اور جو اپنے عہد کا سیدھا اور سچا اظہاریہ بھی ہے۔

سوال: آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

جواب: میرا تعلق سری نگر سے ہے اور میں وہاں 5 مارچ 1940 کو پیدا ہوا۔

سوال: آپ نے ابتدائی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟

جواب: میں پہلی ایک دو جماعتوں تک سری نگر میں زیر تعلیم رہا، اس کے بعد 1947 میں والدین کے ساتھ پاکستان آ گیا اور ہم نے راولپنڈی میں سکونت اختیار کر لی۔ میری بعد کی تعلیم یہیں پر مکمل ہوئی۔ میں ابتدائی جماعتوں میں اپنے محلے کے ایک اسکول پاکستان گرلز ہائی اسکول میں پڑھتا رہا۔ ساتویں جماعت تک وہاں رہا۔ اس کے بعد ڈینیز ہائی اسکول میں داخلہ ہو گیا۔ یہ اس زمانے میں ایک معیاری اسکول کے حوالے سے شہرت رکھتا تھا۔ وہاں سے میٹرک کیا، پھر گورنمنٹ کالج اصغر مال میں داخلہ لے لیا۔ لیکن سلسلۂ تعلیم کچھ عرصہ بعد منقطع ہو گیا اور مجھے ملازمت کرنا پڑ گئی کیوں کہ گھر کے حالات دگرگوں تھے۔ بقیہ تعلیم میں نے بی۔اے تک پرائیویٹ حاصل کی۔ ایم۔اے اردو میں نے گورڈن کالج راولپنڈی سے کیا۔ 1990 میں پی ایچ ڈی (اردو) میں

نے اپنی ملازمت کے دوران کیا۔میرے تحقیقی مقالے کا عنوان ''میرا جی: فن و شخصیت'' تھا۔

سوال: آپ کو ادیب بننے کا خیال کیسے آیا؟

جواب: ادب سے میری ایک شناسائی تو یوں تھی کہ میرے والد شاعر تھے۔وہ ایک ماحول موجود تھا لیکن مجھے اس زمانے میں کبھی خود لکھنے کا خیال پیدا نہیں ہوا۔ ہوا یہ کہ جب ایف۔اے۔ میں اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر میں نے ملازمت (بطور کلرک) شروع کی تو اسی شعبے میں ایک اور دوست بھی ادب کا ذوق رکھتے تھے، یہ افسانہ نگار اعجاز راہی تھے۔ہم وہاں خالی وقت میں کتابیں پڑھتے رہتے تھے۔وہیں ہم دونوں میں کتابوں کا تبادلہ بھی ہوتا تھا۔وہ اس زمانے میں افسانے لکھتے تھے۔انھوں نے ایک دن مجھ سے کہا کہ میں نے ایک افسانہ لکھا ہے، آپ وہ سنیں۔ میں نے افسانہ سن کر انھیں کہا کہ یار ایسا افسانہ تو میں بھی لکھ سکتا ہوں۔تو انھوں نے کہا کہ لکھیے۔ان کے اصرار پر میں نے ایک کہانی لکھی تو انھوں نے اسے سراہا۔یہ میں نے ایک قلمی پرچے کو اشاعت کے لیے بھیج دی اور وہ اس میں چھپ گئی۔اس کے بعد میری چند اور تحریریں بھی قلمی پرچوں میں چھپیں۔یہ میری نومشقی کا زمانہ تھا۔

سوال: آپ کا پہلا افسانہ کب اور کس جریدے میں شائع ہوا؟

جواب: ابتدائی تحریروں کی اشاعت کے بعد اعجاز راہی مجھے راولپنڈی کے ادبی حلقوں میں ساتھ لے جانے لگے۔اس زمانے میں راولپنڈی میں ادیبوں کا ایک حلقہ ''بزم میر'' کے تحت ہفتہ وار اجلاس منعقد کرتا تھا۔ میں اس میں جانے لگا۔ اس کے ایک اجلاس میں، میں نے بھی ایک افسانہ سنایا۔وہاں ایک سینیر ادیب غلام رسول طارق بھی تھے۔اجلاس کے اختتام پر وہ مجھے ایک جانب لے گئے اور کہنے لگے، یہ کہانی تم نے خود لکھی ہے یا کسی سے لکھوائی ہے۔ میں نے انھیں بتایا کہ یہ میں نے خود لکھی ہے۔ وہ کہنے لگے، تم اچھا افسانہ لکھ سکتے ہو لیکن تمھاری تربیت کی ضرورت ہے۔ میں نے انھیں کہا کہ میں اس سلسلے میں کیا کروں۔ انھوں نے کہا کہ جب اگلی کہانی لکھو تو میرے پاس لانا۔ میں ایک اور کہانی لکھ کر ان کے پاس لے گیا۔اس پر انھوں نے مجھے بہت سے مشورے دیے۔اس

زمانے میں میں اپنا نام اختر رشید ناز لکھتا تھا اور اسی نام سے فلمی پرچوں میں میری چند کہانیاں چھپی تھیں۔ چند دوستوں کے ساتھ مشورے سے میں نے اپنا نام اختر رشید سے رشید امجد کر لیا۔ میرا پہلا افسانہ'' ادب لطیف'' لاہور میں ''سنگم'' کے نام سے ستمبر 1960 کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس زمانے میں میرزا ادیب ''ادب لطیف'' کے مدیر تھے۔ اس کے بعد میں مسلسل کہانیاں لکھتا رہا۔ استاد غلام رسول طارق کمال کے آدمی تھے۔ بنیادی طور پر وہ مشرقی تنقید اور مزاج کے فرد تھے۔ لفظ کی اہمیت اور اس کے استعمال پر ان کو بے حد دسترس تھی۔ چنانچہ جب بھی میں انھیں کہانی لکھ کر دکھاتا تو وہ لے کر اسے پھاڑ دیتے تھے، اس کے بعد کہتے تھے اب اس کہانی کو دوبارہ لکھیے لیکن درمیان سے اس کا آغاز کیجیے، پھر کہتے تھے اب اختتام سے اس کا آغاز کیجیے۔ اس طرح ایک ہی کہانی کو کئی مرتبہ لکھواتے تھے۔ کئی مرتبہ تو میں زچ ہو جایا کرتا تھا لیکن میری اس مشق نے بعد میں مجھے بہت فائدہ پہنچایا۔

سوال: آپ کے خیال میں کیا ادب لکھنا کل وقتی کام ہے؟

جواب: میرے خیال میں ادب لکھنا کل وقتی کام ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے یہاں ایسا نہیں ہے۔ اس وجہ سے ہمارے ادب کو کئی نقصانات پہنچے ہیں۔ مثلاً ہمارے یہاں ناول کم لکھا گیا ہے۔ ناول کے لیے جس منصوبہ بندی اور وقت کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہمارے یہاں ادیبوں کے پاس نہیں۔ زیادہ تر ادبا کوئی ملازمت کرتے ہیں اور بقیہ وقت میں ادب تخلیق کرتے ہیں۔ ادب ان کا ایک مشغلہ ہے۔ چنانچہ ادب کے لیے جس قدر سنجیدگی اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ میسر نہیں۔ کچھ اور عوامل بھی ہیں جن کے سبب ادب کل وقتی پیشہ نہیں بن پایا۔ مثلاً ادبی رسائل کے مالکان کاغذ، پرنٹنگ پریس اور کاتب کے پیسے تو فوراً ادا کر دیتے ہیں لیکن ان میں ادیب ہی ایسا مظلوم فرد ہے جسے وہ پیسے کیا، رسالہ بھی مفت دینے کے روادار نہیں ہوتے۔ اب ادیب کا کیا قصور ہے کہ وہ اکیلا ادب کے لیے قربانی دے۔ اس کے علاوہ معاشرے میں کتب بینی کی عادت بھی روبہ زوال ہے۔

سوال: آپ کا شمار جدید اردو افسانہ لکھنے والے اولین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ کیا اب جدید افسانہ دم توڑ گیا ہے؟

جواب: نہیں یہ بات نہیں ہے، بات یہ ہے کہ 1960 کی دہائی میں جو جدید افسانہ ہم نے شروع کیا تھا، اب اس میں ایک ٹھہراؤ آ گیا ہے۔ ابتدا میں جدید افسانے کا جو قاری تھا اس کی تربیت ابتدا سے کلاسیکی افسانے نے کی تھی۔ جب نیا افسانہ لکھا جانے لگا تو ابتدا میں اسے قبول نہیں کیا گیا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ نئے افسانے کے حوالے سے قاری کی تربیت ہو گئی ہے۔ اب جدید افسانہ قاری کو اجنبی نہیں لگتا اور اس میں ابہام بھی نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ کہانی کے بغیر ڈکشن کا تصور ہی نہیں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کہانی کیا ہوتی ہے۔ کیا کہانی واقعات کا ایک تسلسل ہے یا خیال کا ایک تسلسل بھی ہو سکتی ہے۔ کہانی تو بہر طور جدید افسانے میں موجود ہوتی ہے اس لیے کہ افسانہ کہانی کے بغیر لکھا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن کہانی کا concept کیا ہے۔ میرے خیال میں کہانی کی بنیاد ایک وقوعہ ہے اور ہمارے پرانے افسانے بھی وقوعہ کا تسلسل واقعات کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اب کہیں کہیں یہ بھی ہوتا ہے کہ وقوعے سے ابھرنے والا خیال بھی کہانی کی بنیاد بنتا ہے۔ اس لیے کہ بنیاد تو وقوعہ ہے، اس سے ہم نہیں نکل سکتے۔ اس لیے کہانی پن تو موجود ہے۔ اب کچھ وقت گزرنے کے بعد ہم اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ جس طرح ابتدا میں ہر نیا فیشن اجنبی ہوتا ہے لیکن جب ہم عادی ہو جاتے ہیں تو سب اس کو اپنا لیتے ہیں، کچھ ایسا ہی معاملہ جدید اردو افسانے کا بھی ہے۔ اس لیے کہ ہر جدت ایک عرصے کے بعد روایت کا حصہ بن جاتی ہے۔

سوال: ہمارے یہاں جو تنقید لکھی جا رہی ہے۔ کیا آپ اس کے معیار سے مطمئن ہیں؟

جواب: تنقید کا معاملہ ہمارے یہاں ہمیشہ متنازعہ فیہ رہا ہے اس لیے کہ من حیث القوم ہمارا مزاج تنقیدی نہیں ہے اور ہم تنقید کو برداشت ہی نہیں کرتے ہیں۔ ملوکیت کے تحت ہماری جو تربیت ہوئی ہے اس میں تنقید کی گنجائش ہی نہیں۔ ہمارے یہاں تنقیدی نظریات بھی باہر سے آئے ہیں اور ایسی تنقید جو ہماری روایات اور ادب کے اندر سے جنم لے، اس کا فقدان ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ اردو میں لکھے جانے والے ادب سے ہی تنقیدی پیمانے اخذ کر کے ان کی روشنی میں فن پارے کو جانچا جائے۔

سوال: 2001 میں آپ کی خودنوشت ''تمنا بے تاب'' شائع ہوئی۔اس کو لکھنے کا آپ کو خیال کیسے آیا؟

جواب: میں ایک ناول لکھنا چاہتا تھا اور میرے اپنے حالات میں بھی اس قدر اتار چڑھاؤ تھا کہ سوانحی ناول کی صورت بنتی تھی۔اس ارادے سے میں نے اسے شروع کیا تھا لیکن دوبار لکھنے کے بعد اس میں کچھ ایسی ثقیل چیزیں آتی گئیں کہ ناول کا خیال میرے ذہن سے نکل گیا اور میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس نظام کو بدلنے کے لیے تو عملی طور پر کچھ نہیں کر سکتا، اگر میں یہ سچائی کے ساتھ اپنی خودنوشت میں رقم کر دوں جس سے ہماری نسل کو واسطہ پڑا تو ممکن ہے کبھی کسی طور بہتری کی کوئی صورت نکل آئے، اس لیے کہ بہ حیثیت ادیب یہ میرا فرض بنتا ہے۔اس لیے میں نے جو واقعات دیکھے یا جن سے میں گزرا ان کو میں ''تمنا بے تاب'' میں ضبط تحریر میں لے آیا۔

سوال: آج کل آپ کن ادبی منصوبوں پر کام کر رہے ہیں؟

جواب: میں آج کل ویسے تو افسانے لکھتا رہتا ہوں لیکن ایک تنقیدی کتاب لکھنے کا ارادہ ہے، جس میں پاکستانی ادب کے پچاس سال کا جائزہ قلم بند کیا جائے۔اس کے کچھ مضامین تو ادبی جرائد میں چھپ چکے ہیں مثلاً پاکستانی ادب کے بنیادی رجحانات، پاکستانی غزل کے پچاس سال، ابھی نظم اور افسانے کے حوالے سے کچھ کام باقی ہے۔

•••

ڈرامہ

حبیب تنویر سے گفتگو

ہندوستانی تھیٹر سے گذشتہ سات دہائیوں سے وابستہ حبیب تنویر نے زندگی کے تمام پہلوؤں کو تھیٹر کے ذریعے اسٹیج پر پیش کیا ہے، انھوں نے اردو، ہندی، مالوی، بندیلی، اودھی، چھتیس گڑھی، انگریزی اور سنسکرت جیسی زبانوں اور بولیوں کو بھی ادائے مطلب کے لیے استعمال کیا ہے۔ 82 سال کی عمر میں حبیب تنویر نہ صرف ہندوستان کے بلکہ دنیا کے ایک ایسے ڈراما ہدایت کار ہیں جنھوں نے 55 برسوں تک ایک ہی ناٹک 'منڈلی' ایک ہی گروپ اور پیش کش کے ایک ہی اسلوب کو برقرار رکھا۔ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک حبیب تنویر ایک بہترین اداکار اور ہدایت کار ہی نہیں بلکہ ایک اچھے شاعر، نغمہ نگار، بہترین مصور اور عبقری صلاحیتوں کے مالک ہیں۔

حبیب تنویر کا نام حبیب احمد خاں اور تخلص تنویر ہے۔ وہ بچپن سے ہی فلموں میں کام کرنا چاہتے تھے۔ حالانکہ ان کے والد انھیں انڈین سول سروس (آئی سی ایس) کا افسر بنانا چاہتے تھے، حبیب تنویر نے ابتدائی دور میں کئی برسوں تک فلمی تجزیہ نگار کی حیثیت سے کام کیا۔ وہ فلم انڈیا، ٹیکسٹائل جرنل، برماشیل میگزین، باکس آفس اور کئی روزنامہ اخباروں سے بھی وابستہ رہے۔ انھیں سب سے زیادہ شہرت ناٹک ''آگرہ بازار''، ''چرن داس چور''،

''جس لاہور نہیں دیکھیا وہ جمیا ہی نہیں'' اور ''مٹی کی گاڑی'' سے ملی لیکن خود انھیں چھتیس گڑھ لوک شیلی کا ناٹک ''بہادر کلارنِ'' سب سے زیادہ پسند ہے۔ کیریئر کی شروعات میں حبیب تنویر کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ''نیا ادب'' میں شائع ہوا، اس وقت ''نیا ادب'' کے ایڈیٹر علی سردار جعفری تھے۔ انھوں نے بلراج ساہنی اور دینا پھاٹک کی ہدایت میں اداکاری کی شروعات کی۔ 1971 میں انھیں سنگیت ناٹک اکادمی کے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ 1972 میں وہ راجیہ سبھا کے ممبر منتخب ہوئے۔ حبیب تنویر نے ایم ایس ستھیو کی فلم ''گرم ہوا'' رچرڈ ایٹن برو کی ''گاندھی''، سدھیر مشرا کی ''وہ منزل تو نہیں'' گوتا دیسائی کی بچوں کی فلم ''مجھ سے دوستی کروگے'' اور نانا پاٹیکر کی ''پرہار'' میں کام کیا۔ ٹی وی سیریل ''کب تک پکاروں'' میں انھوں نے منفی کردار ادا کیا۔ آپ کے ناٹک ''چرن داس چور'' پر شیام بینیگل نے 1975 میں اسی نام سے فلم بھی بنائی۔ آپ کی شریک حیات مونکا مشرا بھی ڈراما آرٹسٹ رہی ہیں۔ آپ کی بیٹی کا نام نگین تنویر ہے۔

حبیب تنویر کی اداکاری کے سفر میں یوں تو پچاس سے زیادہ ڈراموں کے ہزاروں اسٹیج شو شامل ہیں، جنھیں ناظرین نے دل سے پسند کیا۔ ان کے ذریعے اسٹیج کیے گئے اہم ڈرامے ''شترنج کے مہرے'' (پریم چند کی کہانی) ''آگرہ بازار''، ''ٹیمنگ آف دی ٹوتھ'' (شیکسپیئر) ''سون ساگر'' (چھتیس گڑھی) ''گاؤں کا نام سسرال۔ مور کا نام داماد'' (چھتیس گڑھی) ''مٹی کی گاڑی'' (سنسکرت ناٹک مرچھ کٹکم) ''چرن داس چور'' (چھتیس گڑھی زبان میں وجے دان دیتھا کی کہانی) ''مرزا شہرت بیگ'' (اردو) برزوا جینٹلمین (مولیئر کا ایڈوپٹیشن) ''کام دیو کا اپنا بسنت رتو کا سپنا'' (اردو۔ شیکسپیئر ک مِد سمر نائٹس ڈریم کا ترجمہ) '' دی امپورٹینس آف بِگ ارنیسٹ'' (انگریزی۔ آسکر وائلڈ) ''بہادر کلارن'' (چھتیس گڑھی) ''ایک اور درونا چاریہ'' (شنکر شیش) ''موٹے رام کا ستیہ گرہ'' (پریم چند کی کہانی) ''جس لاہور نہیں دیکھیا وہ جمیا ہی نہیں'' (اصغر وجاہت) ''ایک عورت ہیپشیا بھی تھی'' (حبیب تنویر) ''پونگا پنڈت'' (چھتیس گڑھی) قابل ذکر ہیں۔ پیش خدمت ہے انٹرویو کے اہم اقتباسات۔

سوال: گذشتہ دنوں مدھیہ پردیش حکومت نے آپ کے ڈراموں کی پیش کش پر روک لگادی ہے، اور آپ کی انجمن کو ملنے والی رعایت کو بھی ختم کر دیا۔ یہ سب کچھ اچانک ہوا، اب کیا سوچتے ہیں؟

جواب: دیکھیے انھوں نے اپنا کام کیا اور ہم اپنا کام کر رہے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ حبیب تنویر اپنے ڈراموں میں مذہب اور ذات پات مخالف مناظر کو پیش کر رہے ہیں جبکہ ایسا نہیں ہے۔ ''جس لاہور نہیں دیکھایا وہ جمیا ہی نہیں'' اور ''پونگا پنڈت'' دونوں ہی ڈراموں کو لکھنے والے جدا جدا افراد ہیں۔ میں تو محض ان کا ہدایت کار ہوں— اصغر وجاہت کے ڈرامے میں، میں نے وہی منظر پیش کیا ہے جو ایک ڈراما نگار کے جذبات تھے، اسی طرح سے، ''پونگا پنڈت'' کو چھتیس گڑھ میں سابقہ 75 برسوں سے اسٹیج پر پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ ڈراما پہلی بار میں نے 1960 میں دیکھا۔ میں نے عوامی اسلوب کے اس موضوع کو عمدہ تکنیک اور سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا، یہ مذہبیت، روحانیت اور ہندوازم کے سچے اصولوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے جسے میں نے 1970 سے اب تک ''نکڑ شیلی''، ''ناٹک شیلی'' اور ڈراما اداکاری کے مختلف اسالیب اور صورتوں میں بارہا پیش کیا ہے۔ اب حکومت اس کی مخالفت میں کھڑی ہو رہی ہے، تو ہو۔ ہماری رنگ یاترا تو جاری تھی، جاری ہے اور جاری رہے گی۔

سوال: دونوں ڈراموں کو لے کر ماضی میں بھی تنازعہ ہوا ہے؟

جواب: ہم کسی کی سوچ کو باندھ کر تو نہیں رکھ سکتے۔ دنیا میں ایک ہی سوچ اور فکر کے لوگ آجائیں گے تو دنیا یا تو جنت بن جائے گی یا پھر دوزخ۔ میں نے ''پونگا پنڈت'' 1992 میں ایسے وقت میں اسٹیج کیا جب بابری مسجد کو شہید کیا گیا تھا۔ دلی کے شری رام سینٹر، جے این یو، دلی یونیورسٹی اور بعض دیگر مقامات پر ڈرامے کے کئی شو ہوئے۔ 1993 میں اس کی ایک پیش کش ایودھیا میں بھی ہوئی۔ کہیں کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اسی سال جب ہم فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے شہر گوالیر میں منعقد ایک جلسے میں ڈراما پیش کر رہے تھے تو پہلی بار سنگھ پریوار کے لوگوں نے اس پر اعتراض کیا، اس کے باوجود ہم نے ڈرامے کا شو پورا کیا۔ اب اچھے برے حالات تو ہر پیشے میں آڑے آتے ہیں۔ ضرورت ہے ان سے مقابلہ کرنے کی، نہ کہ ان سے گھبرا کر ہمت ہارنے کی۔

سوال: عصر حاضر میں اسٹیج نازک دور سے گزر رہا ہے پہلے کے مقابلے اسٹیج کی سرگرمیوں میں کمی آئی ہے،ان حالات میں ڈراما اداکاری کی کشتی کہیں ڈگمگا تو نہیں رہی ہے۔؟

جواب: یہ تو ہر دور کی حقیقت ہے لیکن واقعی آنے والا وقت بے حد چنوتیوں سے بھرا ہوا ہوگا۔ حکومت کی نظر چاہے ہر طرف ہو، لیکن ڈراما اداکاری کے لیے حکومت کے ذہن میں کوئی منصوبہ نہیں ہے۔ ڈراما اداکار تو مفلس و نادار ہوتا ہے اسے تو محض ناظرین کی قدر دانی اور حکومت کی معمولی سی نظر عنایت ہی کافی ہے۔ پھر دیکھیے چاہے کتنا بھی بڑا طوفان کیوں نہ آجائے تھیٹر کی کشتی بلند ارادوں کے ساتھ آگے ہی بڑھتی رہے گی۔

سوال: اس کے لیے پہل کون کرے گا، کیا آپ اس کے لیے کچھ کر رہے ہیں؟

جواب: ان دنوں میرا زیادہ تر وقت اسی ادھیڑ بن میں رہتا ہے کہ کوئی تو ایسا سرا پکڑ میں آئے جس سے منزل تک پہنچنا آسان ہو جائے۔ میں اسی موضوع پر لکھ رہا ہوں جس کے ذریعے میرے جذبات ان سبھی اسٹیج آرٹسٹوں تک پہنچ سکیں جن کے دلوں میں اسی طرح کے خیالات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ میں اسٹیج آرٹسٹوں کو غور وفکر اور تبادلۂ خیالات کے لیے مدعو کرنا چاہتا ہوں اور ان کے پیش نظر کچھ اہم باتیں اور سوالات رکھنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تھیٹر کے تمام پرستار متحد ہوکر اس جانب حکومت کی توجہ مرکوز کریں، تاکہ ہماری مشکلات اور پریشانیوں سے حکومت واقف ہو سکے۔

سوال: آنے والے وقت میں آپ کی کون سی تخلیق ناظرین کو دیکھنے کو ملے گی؟

جواب: اس وقت میں رونڈر ناتھ ٹیگور کی تخلیقات پر کام کر رہا ہوں، اسے میں نے ''دسر جن'' کا نام دیا ہے۔ ٹیگور کا ادب انسانی فکر کو ٹٹولنے اور سمجھنے کا مادہ رکھتا ہے۔ اس عظیم مصنف، شاعر، مفکر، ادیب، تجزیہ نگار اور محب وطن کی تحریروں میں بہت کچھ تھا۔ جلد ہی ''دسر جن'' ناظرین کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ آج کل میں اتراکھنڈ اور مغربی بنگال میں ''پونگا پنڈت'' کے اسٹیج کو شو کرنے میں مصروف ہوں۔

سوال: آپ کو اپنی ستر سالہ تھیٹر سے وابستہ زندگی میں کبھی کوئی ملال ہوا؟

جواب: 'نظیر' کا ایک شعر ہے۔

ناز اٹھانے میں جفائیں تو اٹھائیں ، لیکن
لطف بھی ایسا اٹھایا کہ جی جانتا ہے

کسی بھی تھیٹر اداکار سے پوچھیے کہ کیا اس سے تھیٹر کی لت کبھی چھوٹ سکتی ہے، تو اس کا یہی جواب ہوگا۔

لسانیات

مرزا خلیل احمد بیگ سے گفتگو (1)

پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ ماہر لسانیات ہونے کے علاوہ اردو کے ممتاز نقاد اور محقق ہیں۔ ان کی تحریروں سے ان کی تنقیدی اور تحقیقی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ خلیل بیگ صاحب کی پیدائش یکم جنوری 1945 کو گورکھپور میں ہوئی۔ بیگ صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے 1964 میں علی گڑھ آئے اور پھر یہیں کے ہو گئے۔ .B.A اور .M.A کے بعد پروفیسر مسعود حسین خاں کی نگرانی میں "Historical Grammar of Urdu of North India" کے عنوان سے تحقیقی مقالہ انگریزی میں لکھا جس پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انھیں 1975 میں پی. ایچ. ڈی. کی ڈگری تفویض کی۔ اس مقالے میں اردو زبان کی قواعد میں عہد بہ عہد رونما ہونے والی تبدیلیوں کا لسانیاتی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ بعد میں اس مقالے کو دہلی کے ایک پبلشر نے "Urdu Grammar: History and Structure" کے نام سے شائع کیا۔ پی. ایچ. ڈی. مکمل کرنے کے بعد شعبۂ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں 1973 میں لکچرر ہو گئے اور اسی شعبے سے سبک دوش ہوئے۔ بیگ صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز شعرگوئی سے ہوا، لیکن ان کی دلچسپی کا اصل میدان لسانی تنقید و تحقیق ہے۔ ''زبان، اسلوب اور اسلوبیات''

ان کی پہلی تصنیف ہے جو 1982 میں شائع ہوئی۔ خلیل بیگ صاحب خود کو علمی کاموں میں مصروف رکھتے ہیں۔ پہلے بھی تواتر کے ساتھ ان کے مضامین رسائل و جرائد میں شائع ہوتے تھے اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ انھیں کئی انعامات اور اعزازات مل چکے ہیں جن میں اتر پردیش اردو اکادمی کا انعام ''زبان، اسلوب اور اسلوبیات'' پر، بہار اردو اکادمی کا انعام ''اردو کی لسانی تشکیل'' پر، اور میر اکادمی کا انعام ''پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی'' پر شامل ہیں۔ پاکستان کا نقوش ایوارڈ ''اردو میں لسانی تحقیق'' کے حوالے سے ملا۔ حال ہی میں ان کی ایک کتاب ''ایک بھاشا... جو مسترد کر دی گئی'' کے نام سے شائع ہوئی ہے، جو کہ گیان چند جین کی متنازع فیہ تصنیف ''ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب'' کا رد ہے۔ اس کتاب میں گیان چند جین کے غلط لسانی رویوں، مفروضوں اور سوالوں کا سیر حاصل اور مدلل جواب دیا گیا ہے۔ ان سے کی گئی گفتگو کے اقتباسات پیش خدمت ہیں۔

سوال: بیگ صاحب آپ نے طویل مدت تک لسانیات کا درس دیا ہے، میں یہ جاننا چاہوں گا کہ زبان کی جامع تعریف کیا ہو سکتی ہے؟

جواب: زبان کی عام تعریف تو یہ ہے کہ زبان اظہار خیال کا ذریعہ ہے، یعنی زبان ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے توسط سے ہم اپنے جذبات، خیالات، احساسات اور محسوسات یا اپنے مافی الضمیر کو ادا کرتے ہیں۔ لیکن لسانی اعتبار سے اگر آپ زبان کو دیکھیں تو Bloch and trager نے اس کی ایک مخصوص تعریف بھی پیش کی ہے، وہ کہتا ہے:

"Language is an arbitrary vocal symbol by means of which human beings co-ordinate"

یعنی زبان صوتی علامات کا ایسا مجموعہ ہے جو اختیاری ہے اور اس کے ذریعے انسان آپس میں ترسیل خیالات کا کام لیتے ہیں۔ اس میں دو تین چیزیں واضح ہیں مثلاً ہم اسی چیز کو زبان کہیں گے جس کا استعمال انسان سماجی ماحول میں اظہار خیال کے لیے کرتا ہے۔ یعنی تہذیبی طور پر وہ زبان سیکھتا ہے اور پھر اس کا استعمال کرتا ہے۔ باقی جتنے بھی ترسیل و ابلاغ کے

طریقے ہیں وہ زبان کی تعریف میں شامل نہیں کیے جاسکتے ۔ دوسری چیز جو زبان کی تعریف میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ زبان اصوات کا مجموعہ ہے۔ یعنی جب تک کہ ہم اپنے اعضائے تکلم کو حرکت نہ دیں اور ان کے ذریعے اصوات پیدا نہ کریں اس وقت تک زبان وجود میں نہیں آسکتی۔ تو لسانیاتی اصطلاح میں زبان کی ٹھیٹھ اور کھری تعریف یہ ہے کہ ''زبان آوازوں کا مجموعہ ہے''۔

اسی طرح ہم تحریر کو زبان نہیں کہہ سکتے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''تحریر'' کیا ہے؟ تو اس کا سادہ اور آسان جواب یہ ہے کہ تحریر زبان نہیں ہے بلکہ یہ زبان کی ترجمانی کرتی ہے۔ یعنی وہ چیز جو اصوات کی ترجمانی کرتی ہے اس کا نام تحریر ہے۔ تحریر کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے جبکہ اولیت تکلمی زبان کو حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ جو لوگ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے، جنھیں ہم ان پڑھ کہتے ہیں، ان کو بھی اپنی زبان پر قدرت حاصل ہے، وہ بھی اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ ایک بچہ جس نے کہ ابھی لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا ہے، وہ بھی گفتگو کر سکتا ہے اور اپنی مادری زبان کے جملے بول سکتا ہے۔ تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ زبان نہیں جانتا، وہ زبان تو جانتا ہے لیکن اس کا اظہار تحریری شکل میں نہیں کر سکتا۔ لکھنا پڑھنا چونکہ رسمی چیزیں ہیں اور جب تک آدمی رسمی طور پر اسکول نہ جائے لکھنا اور پڑھنا نہیں سیکھ سکتا۔ لہٰذا یہی وجہ ہے کہ تحریر کو وہ حیثیت حاصل نہیں جو تکلمی زبان کو ہے۔ یعنی بنیادی حیثیت تکلمی زبان کو حاصل ہے۔

سوال: زبان کس طرح وجود میں آتی ہے؟

جواب: زبان انسانی معاشرے میں وجود میں آتی ہے یعنی جس معاشرے میں انسان آنکھ کھولتا، سانس لیتا ہے اور پروان چڑھتا ہے وہ اسی معاشرے میں زبان سیکھتا ہے۔ زبان اکتسابی (Acquired) ہے یہ موروثی نہیں ہے یعنی ایسا نہیں ہے کہ ماں باپ جو زبان بولتے ہیں بچہ بھی وہی زبان بولے بلکہ معاشرہ جو زبان بولتا ہے بچہ اسی زبان کو سیکھتا ہے۔ اس کو آپ یوں سمجھیے کہ کسی اردو بولنے والے والدین کا کوئی بچہ ہے لیکن بچے کو اس کی پیدائش کے فوراً ہی بعد اگر لندن بھیج دیا جائے تو وہ بڑا ہو کر انگریزی بولے

گا، اسی طرح اگر اس کو پیرس بھیج دیا جائے تو وہ وہیں کی زبان بولے گا یعنی وہ اردو نہیں بولے گا، جبکہ اس کے ماں باپ اردو بولتے تھے۔ تو بنیادی طور پر بچہ اسی معاشرے اور ماحول کی زبان سیکھتا ہے جس میں وہ آنکھ کھولتا ہے، اس سے قطع نظر کہ اس کے والدین کون سی زبان بولتے تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ زبان سیکھنے کی صلاحیت فطری طور پر انسان کو اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔

اسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہر انسان کے پاس قوت گویائی موجود ہے اور یہ قوت گویائی خدا کی عطا کردہ ہے۔ یہ قوت گویائی غیر بشر یعنی جانوروں کو نہیں دی گئی ہے صرف انسان کو دی گئی ہے۔ اب اس صلاحیت اور قوت گویائی کو استعمال کرتے ہوئے وہ کون سی زبان سیکھتا اور بولتا ہے اس کا پورا دارومدار اس معاشرے اور تہذیبی ماحول پر ہے جس میں وہ بچپن سے سانس لے رہا ہے۔

سوال: زبان کی کتنی قسمیں ہوسکتی ہیں؟

جواب: زبان کی کئی قسمیں کی گئی ہیں، ہیئت کے اعتبار سے، تاریخی اعتبار سے اور جغرافیائی اعتبار سے بھی قسمیں کی گئی ہیں۔

سوال: مثلاً ہم کہتے ہیں کہ اشاروں کی زبان ہوتی ہے۔

جواب: اشاروں کی زبان، تکلمی زبان کی تعریف پر پوری نہیں اترتی، اس لیے کہ اشاروں کی زبان کو ہم انسانی زبان نہیں کہیں گے۔ انسانی زبان تو صرف وہ ہے جو انسانی اعضائے تکلم کو حرکت دینے سے پیدا ہوتی ہے۔ اشاروں کی زبان کو ہم "Meta Language" کہیں گے، یعنی زبان کے پرے۔ دیکھیے، ترسیل کے کئی طریقے ہیں ان میں ایک طریقہ اشارہ بھی ہے، ایک طریقہ تحریر بھی ہے اور چند دوسری علامتیں بھی ہیں، لیکن اپنی بات کو کہنے کا سب سے مؤثر اور سب سے Delicated اور پیچیدہ طریقہ زبان ہے، باقی تمام چیزیں ثانوی ہیں اور ان کو وہ حیثیت حاصل نہیں ہے جو انسانی زبان کو حاصل ہے، مثلاً جانور بھی ایک دوسرے سے Communicate کرتے ہیں اور اس کے لیے وہ مختلف قسم کی آوازیں نکالتے ہیں۔ لیکن اس کو ہم زبان نہیں کہیں گے، ہم اس کو ترسیل کا ایک طریقہ

System of Communication کہیں گے۔ لیکن وہ پیچیدگی اور Delicacy جو انسانی زبان کے اندر ہے وہ اس System کے اندر نہیں ہے۔ لہٰذا زبان اظہار کا سب سے جامع طریقہ ہے جو صرف اور صرف انسان کو حاصل ہے۔

سوال: اگر زبان کی سطح پر بات کریں تو ایک ہی زبان کی دو مختلف شکلیں ہو جاتی ہیں یعنی ایک شکل تو عام بول چال اور کاروبار کی زبان ہوتی ہے جس سے ہم روزمرہ کے مقاصد پورے کرتے ہیں اور دوسری شکل ادبی زبان کی ہوتی ہے۔ واضح طور پر دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ ازراہِ کرم یہ بتانے کی زحمت کریں کہ آخر کس طرح عام بول چال کی زبان، ادب کی زبان میں تبدیل ہو جاتی ہے؟۔

جواب: دیکھیے، زبان مختلف مقاصد کے لیے استعمال کی جاتی ہے، زبان سے ہم بہت سے کام لیتے ہیں۔ تو وہ زبان جس کا سیدھا اور راست استعمال ہو، اسے عام بول چال کی زبان کہتے ہیں اور عام بول چال کی زبان میں ہم جو ترسیل وابلاغ کرتے ہیں اس میں کسی طرح کا ابہام نہیں ہوتا یعنی لفظ اور معنی کا رشتہ راست ہوتا ہے، یعنی لفظوں کو ہم لغوی معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ جیسے اگر ہم ''کتاب'' کہیں تو اس سے کتاب ہی مراد لی جائے گی جو چھپی ہوئی شکل میں ہوتی ہے۔ لیکن اگر شاعری کی زبان میں کتاب کا لفظ استعمال کریں تو اس کے معنی زندگی کے بھی ہو سکتے ہیں یا کسی دوسری چیز کے بھی ہو سکتے ہیں۔ تو عام بول چال کی زبان بالکل سیدھی سادی ہوتی ہے اس میں کسی طرح کا پیچ وخم نہیں ہوتا لیکن جب یہی زبان کسی ادبی مقصد کے لیے استعمال کی جاتی ہے یعنی جب شعر وشاعری کے لیے استعمال کی جاتی ہے تو اس کی نوعیت بدل جاتی ہے، اس لیے کہ شاعری میں یا ادب میں بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو ہم کھلم کھلا بیان نہیں کر سکتے اس کے لیے ہمیں کنایوں اور علامتوں کا سہارا لینا پڑتا ہے اور اچھی شاعری وہی سمجھی جاتی ہے جس میں بات علامتی انداز میں کہی گئی ہو۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ شاعری میں جو زبان استعمال کی جاتی ہے وہ راست نہیں ہوتی بلکہ ڈھکے چھپے انداز میں شاعر کوئی بات کہتا ہے اور جب بات اس طرح کہی جائے گی تو ظاہر ہے کہ زبان میں ترمیم کرنا پڑے گی یعنی اس کے نہج کو بدلنا ہوگا۔

جب ہم عام بول چال کی زبان کے Pattern کو بدلتے ہیں تو یہی زبان علامتی اور شعری زبان بن جاتی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ شاعر یا ادیب جب کوئی بات کہتا ہے تو اس کی کوشش رہتی ہے کہ اس کے اسلوب میں ایک حسن پیدا ہو، اس کا اسلوب شگفتہ اور نکھرا ہوا ہو۔ لیکن یہ تمام چیزیں زبان کو راست انداز میں استعمال کرنے سے پیدا نہیں ہو سکتی ہیں۔

سوال: اردو کے لسانیاتی مطالعے کا آغاز کب اور کس طرح ہوا؟

جواب: لسانیات تو ایک علم کا نام ہے جو زبان اور اس کے ارتقا کا ایک نظریہ پیش کرتا ہے۔ لسانیات کا ارتقا بیسویں صدی کے آغاز سے ہوتا ہے۔ Ferdinand de Saussure کا نام آپ نے سنا ہوگا یہ فرانس کا ایک مشہور دانشور تھا، اس نے اپنے طالب علموں کے سامنے کچھ لیکچر دیے۔ 1913 میں اس کا انتقال ہو گیا، اس کے انتقال کے بعد 1916 میں اس کے Lectures کا مجموعہ "Course in General Linguistics" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کتاب سے جدید لسانیات کا آغاز ہوتا ہے، اس لیے کہ اس کے افکار چونکا دینے والے تھے اور اس سے پہلے کسی نے ایسے افکار پیش نہیں کیے تھے۔ اس سے پہلے زبان کا مطالعہ تاریخی تھا، دو زبانوں کا تقابل کیا کرتے تھے اور اس کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے تھے کہ دونوں زبانوں میں گہرا رشتہ ہے اور یہ کسی ایک ماخذ سے ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ یہ گویا زبانوں کا تاریخی مطالعہ تھا۔ 18ویں اور 19ویں صدی تک یورپ کے ماہر لسانیات تاریخی لسانیات کا مطالعہ کرتے رہے، لیکن 20ویں صدی سے زبانوں کے تاریخی مطالعے کے علی الرغم زبانوں کا توضیحی مطالعہ شروع ہوا یعنی Descriptive Linguistics کا آغاز ہوا۔ تاریخی لسانیات میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ زبانوں کا ارتقا کس طرح ہوا، زبانوں میں تبدیلیاں کس طرح رونما ہوئیں، زبانیں کس طرح وجود میں آئیں اور ایک زبان کا دوسری زبان سے کیا رشتہ ہے وغیرہ۔ لیکن جب توضیحی لسانیات کا آغاز ہوا تو ماضی میں بولی جانے والی زبانوں یا مردہ زبانوں کا مطالعہ ضروری نہیں سمجھا گیا۔ بلکہ جو زندہ زبانیں ہیں ان کا مطالعہ توضیحی بنیادوں پر کیا جانے لگا۔ توضیحی سے مراد یہ ہے کہ وہ زبان ایک مخصوص دور

میں کیسی ہے زبان کب پیدا ہوئی اور مختلف زبانوں میں وہ کن کن تبدیلیوں سے گزری، بجائے اس کے ہم نے یہ دیکھنا شروع کیا کہ زبانوں کی ہیئت کیسی ہے یعنی جب زبانوں کی صوتی اور نحوی ساخت کو موضوع بنایا گیا تو، توضیحی لسانیات وجود میں آئی۔

1933 میں Bloomfield کی کتاب "Language" کے نام سے شائع ہوئی۔ اس میں Morphology, Phonology, Phonetics اور Syntax وغیرہ کی جامع تعریف بیان کی گئی ہے۔ تو گویا بیسویں صدی سے زبانوں کا جدید نقطۂ نظر سے مطالعہ شروع ہوا، اور نہ اس سے پہلے جو زبانوں کا مطالعہ تھا اس کو ہم علم السنہ یعنی Philology کہتے تھے۔ لسانیات کا نام بیسویں صدی کے آغاز سے دیا گیا۔ اردو میں لسانیات کے حوالے سے سب سے پہلا نام سید محی الدین قادری زور کا آتا ہے۔ انھوں نے دکنیات پر اپنے مطالعے کا اطلاق شروع کیا۔ انھوں نے دو کتابیں بہت اہم لکھی ہیں، ایک کتاب اردو میں ہے اور اس کا نام ہے ''ہندوستانی لسانیات'' جو 1932 میں شائع ہوئی لیکن اس سے پہلے ایک کتاب انگریزی میں "Hindustani Phonetics" کے نام سے تحریر کر چکے تھے جو 1930 میں پیرس سے شائع ہوئی۔ یہ دونوں ہی لسانیات کی کتابیں ہیں جو اردو کے حوالے سے لکھی گئی ہیں اور ان میں بہت کچھ مواد موجود ہے۔ زور صاحب کے بعد پروفیسر مسعود حسین خاں نے یورپ اور امریکا میں جا کر لسانیات جدید کی تعلیم حاصل کی اور وہاں سے آنے کے بعد مضامین لکھے اور لسانیاتی نظریے کا اطلاق اردو پر کرنا شروع کیا۔ ان کی دو کتابیں مشہور ہیں۔ پہلی کتاب انگریزی میں " A Phonetics and Phenological Study of the Word in Urdu" ہے، اس کا اردو میں ترجمہ میں نے کیا ہے جس کا نام ''اردو کا صوتیاتی اور صوتیاتی مطالعہ'' ہے۔ ان کی دوسری کتاب ''مقدمۂ تاریخ زبان اردو'' ہے جس میں انھوں نے اردو زبان کے آغاز کا نظریہ پیش کیا ہے۔ بعد میں جن لوگوں نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے ان کی ایک لمبی فہرست ہے، میں نے بھی اس موضوع پر لکھا ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

سوال: زبان اور انسانی سوچ کا تعلق چولی دامن کا ہے، موجودہ عہد میں ہماری زبان بھی دیگر زبانوں کی طرح کافی ترقی یافتہ زبان سمجھی جاتی ہے، کیا یہ زبان ہمارے اذہان کی مکمل ترجمانی کرنے میں صد فیصد کامیاب ہے یا اب بھی اس میں اصلاح وترقی کی ضرورت ہے؟

جواب: جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے یہ ایک مکمل اور ہر لحاظ سے ترقی یافتہ زبان ہے۔ادبی اعتبار سے بھی یہ نہایت متمول زبان ہے۔ 1000 کے بعد سے ہندوستان میں اس زبان کا ارتقا شروع ہوا اور جیسے جیسے یہ زبان ترقی کرتی گئی اس کا ادبی فروغ بھی ہوتا گیا۔آج یہ زبان نہ صرف یہ کہ ادبی مقاصد کے لیے استعمال کی جارہی ہے بلکہ اس زبان سے دوسرے سماجی و تہذیبی مقاصد بھی حاصل کیے جارہے ہیں، یعنی عدالتوں میں اس کا استعمال ہے، Mass Media تعلیم گاہوں اور کھیل کے میدان میں اس کا استعمال ہورہا ہے۔اس کے علاوہ مذہبی مقاصد کے لیے بھی یہ زبان استعمال کی جارہی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ادبی مقاصد یعنی شعروشاعری کے علاوہ بھی زبان کے مختلف پہلو ہیں، اور ان تمام پہلوؤں کے لیے یہ زبان یعنی اردو زبان پوری طرح مکمل ہے اور اس میں کسی طرح کی اصلاح کی ضرورت نہیں ہے۔

سوال: کیا لسانیاتی مطالعہ نسلِ انسانی کے درمیان تفاوت پیدا کرتا ہے یا انھیں ایک دوسرے کے قریب آنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے؟

جواب: بہت اچھا سوال ہے، دیکھیے، زبانیں ایک دوسرے کو جوڑتی ہیں اور جب زبانیں آپس میں جوڑنے کا کام کرتی ہیں تو اس سے دل جڑتے ہیں، تو یہ کہنا مناسب نہیں ہے کہ زبان تفاوت پیدا کرتی ہے۔ زبان تو آپس میں ملاتی ہے اور جب مختلف زبانوں کے بولنے والے ایک دوسرے کی زبان سیکھ جاتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کے دوست بن جاتے ہیں، ذہنی طور پر ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔ اگر ایک قوم ذہنی طور پر دوسری سے قریب آنا چاہتی ہے، ایک دوسرے کو جاننا چاہتی ہے تو یہ زبان کے ذریعے ہی ممکن ہوسکتا ہے۔

سوال: صوتی تغیر ایک فطری عمل ہے جو زبان میں نامعلوم طریقے سے داخل ہوتا ہے۔ لفظوں کا تلفظ صوتی تغیرات پر ہی منحصر ہے۔ کیا صوتی تغیرات زبان کو مزید فصیح بناتے ہیں یا پھر، زبان کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں؟

جواب: دیکھیے ہر زندہ زبان تبدیلی کے عمل سے گزرتی ہے، اگر کسی زبان میں تبدیلی واقع نہ ہو تو وہ زبان جامد ہو جاتی ہے، اسی کو ہم مردہ زبان یا Dead Language کہتے ہیں۔ تغیر تو ہر زبان میں لازمی ہے بلکہ تغیر تو ہر چیز میں ہوتا ہے، یہی تغیر کا عمل ترقی کا ضامن ہے جس چیز میں تغیر ہوگا وہی ترقی پائے گی، جیسے انسان کی زندگی کو لیجیے بچہ پیدا ہوا، بڑا ہوا، جوان ہوا، پھر بوڑھا ہوا، تو یہ زندگی کے مختلف مرحلے ہیں اور یہ تغیر ہی کی وجہ سے ہوئے ہیں۔ نباتات کو لیجیے، بیج بوئے، پودا نکلتا ہے، بڑا ہوتا ہے، پیڑ بنتا ہے پھر اس پر پھول اور پھل آتے ہیں، تو یہ بھی تغیر کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے جب زبانوں میں صوتی یا قواعدی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ زبان ترقی کر رہی ہے۔ آج جو ہمارے پاس اردو زبان ہے وہ بھی ایک تغیر شدہ زبان ہے۔ اگر ہم 18 ویں صدی یا 19 ویں صدی کی زبان کو دیکھیں یا میر کی زبان کو دیکھیں تو میر کی زبان میں اور آج کی زبان میں بڑا فرق ہے۔ اگر آپ فضلی کی کتاب ''کربل کتھا'' کا مطالعہ کریں تو اس میں ایک جملہ ملتا ہے ''پھوپھیاں روتیاں تھیاں'' آج ہم کہیں گے کہ ''پھوپھیاں روتی تھیں'' یعنی اس زمانے میں امدادی افعال کی بھی جمع بنائی جاتی تھی۔ اسی طرح ''رسول کیاں باتاں'' اس زمانے میں جمع کا صیغہ آتا تھا تو ''کیاں'' کہتے تھے، تو زبان میں تغیر ضروری ہے، چاہے وہ صوتی تغیر ہو یا کسی بھی نوعیت کا تغیر ہو۔

سوال: کیا اردو اور ہندی ایک ہی زبان کی دو مختلف شکلیں ہیں جن کی پرورش و پرداخت ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب میں ہوئی؟

جواب: یہ بہت ہی اہم سوال آپ نے کیا ہے۔ دیکھیے، اردو اور ہندی بول چال کی سطح پر ایک دوسرے سے بہت قریب آجاتی ہیں اور ایک زبان کا دوسری زبان پر دھوکا ہوتا ہے بلکہ ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ لیکن علمی ادبی سطح پر یہ دونوں الگ الگ زبانیں ہیں۔ تمام ماہر لسانیات اس بات پر متفق ہیں کہ ہندی اور اردو، دو الگ الگ زبانیں ہیں اگرچہ ان کا ارتقا ایک ہی ماخذ سے ہوا ہے یعنی دونوں کھڑی بولی کی پیداوار ہیں، دونوں کی عام لفظیات ایک جیسی ہیں لیکن جب ہم اصطلاحات سازی کرتے ہیں تو ہمیں ہندی سے دور ہونا پڑتا ہے یا

جب ہندی والے اصطلاح بناتے ہیں تو انھیں اردو سے دور ہونا پڑتا ہے۔ بول چال کی سطح پر دونوں زبانیں ایک دوسرے سے قریب اس وجہ سے آجاتی ہیں کہ دونوں پر پراکرت کا اثر زیادہ ہے لیکن پھر بھی دونوں زبانوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اردو میں پراکرت کے الفاظ کی تعداد زیادہ ہے اور ہندی میں پراکرت کے الفاظ کم ہیں۔ اسی طرح اردو میں عربی فارسی کے الفاظ زیادہ ہیں جبکہ ہندی میں سنسکرت الفاظ کی کثرت ہے۔ مثلاً اردو میں ہم ''رات'' کہتے ہیں، علمی اور ادبی سطح پر بھی ہم ''رات'' کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن جب علمی، ادبی و اعلیٰ سطح پر ہندی کا استعمال کیا جائے گا تو ''رات'' کی جگہ ''راتری'' کو ترجیح دی جائے گی اسی طرح ''آنکھ'' کا استعمال نہیں ہوگا ''نین'' کو ترجیح دی جائے گی۔ تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہندی کا علمی اور ادبی جھکاؤ سنسکرت کی طرف ہے اور اردو کا علمی و ادبی جھکاؤ عربی فارسی کی طرف ہے۔ لیکن پراکرت کا بے پناہ ذخیرہ اردو نے اپنے اندر سمولیا ہے۔

شبلی نے اپنی کتاب ''موازنہ انیس و دبیر'' میں انیس کے ایک شعر سے فصاحت کی مثال دی ہے:

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا

تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

وہ کہتے ہیں کہ ''اوس'' کو اگر شبنم سے بدل دیجیے تو فصاحت غارت ہو جائے گی۔ تو یہاں ''اوس'' خالص پراکرت لفظ ہے جبکہ ''شبنم'' فارسی کا لفظ ہے۔ اوس کا لفظ ہندی والے بھی استعمال کرتے ہیں۔ تو یہی بنیادی وجہ ہے کہ اردو اور ہندی میں گہری مماثلتیں ہیں اور دونوں بول چال کی سطح پر تقریباً ایک جیسی ہو جاتی ہیں۔ لیکن اعلیٰ و ادبی سطح پر، اصطلاحات سازی کی سطح پر اور رسم خط کی سطح پر یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔ ہندوستان کے دستور میں بھی ان دونوں زبانوں کی الگ الگ صراحت کی گئی ہے یعنی ہندوستان کے شیڈول (8) میں ہندی اور اردو کا الگ الگ ذکر ہے۔

سوال: بعض لوگ یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ اردو کو دیوناگری رسم خط کے ساتھ لکھنا چاہیے کیا یہ تجویز اردو کے لیے مناسب ہے؟

جواب: اردو شمالی ہندوستان کی ایک نہایت ترقی یافتہ اور قدیم زبان ہے۔ قدیم ان معنوں میں کہہ رہا ہوں کہ تقریباً ایک ہزار سال سے یہ زبان قائم ہے۔ شمالی ہندوستان میں دوسری طاقتور زبان ہندی ہے اور اس کا رسم خط دیوناگری ہے، ابھی جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ بول چال کی سطح پر ہندی اور اردو دونوں ایک ہیں، اگر اردو کا رسم خط بدل کر دیوناگری کر دیا جائے تو پھر ہندی اور اردو میں فرق کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اردو، اپنے رسم خط سے ہی پہچانی جاتی ہے۔ اردو کو اگر ناگری رسم خط کا جامہ پہنایا گیا تو اردو اور ہندی دونوں مدغم ہو جائیں گی۔ ہندی چونکہ ہندوستان کی اکثریتی زبان ہے اور اردو اقلیتی زبان ہے، اگر اردو کا رسم خط بدل دیا جائے گا تو یہ زبان بالکل معدوم ہو جائے گی، اس کا وجود ناپید ہو جائے گا۔ لہٰذا اپنی حیثیت اور اپنا تشخص برقرار رکھنے کے لیے اردو کو اپنے رسم خط کے ساتھ ہی جینا ہوگا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہم اس کا رسم خط اس لیے بھی نہیں بدل سکتے کہ اردو نہ صرف ہندوستان میں بولی جاتی ہے بلکہ ہندوستان کے باہر یعنی عرب ممالک اور یورپ اور امریکا میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے اور وہاں بھی اردو اپنے اسی رسم خط کے ساتھ پہچانی جاتی ہے۔ تو فرض کر لیجیے کہ اگر آپ ہندوستان میں اس کا رسم خط بدل دیں تو اس سے کیا فائدہ ہوگا، دوسری جگہ کے لوگ تو نہیں بدلیں گے، دوسری جگہ تو اردو اسی رسم خط کے ساتھ پہچانی جائے گی جو اس کا موجودہ رسم خط ہے تو یہ دورنگی اچھی نہیں ہوگی۔ لہٰذا اردو کی بقا کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ اردو اپنے موجودہ رسم خط کے ساتھ قائم رہے۔

سوال: اردو زبان کو اردو کے نام سے کب موسوم کیا گیا یعنی اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے۔ اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ اس زبان کو کبھی ہندی کبھی ہندوی اور کبھی ریختہ کہا گیا؟

جواب: زبان جب پیدا ہوتی ہے تو فوراً اس کا نام نہیں رکھا جاتا۔ زبان پہلے پیدا ہوتی ہے پھر عوام میں اس کا استعمال ہوتا ہے یعنی ادائے مطلب کے لیے وہ استعمال کی جاتی ہے اور پھر بہت بعد میں اس کا کوئی نام رکھا جاتا ہے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ پورے شمالی ہندوستان میں سنسکرت زبان ایک ہزار سال تک قائم رہی یعنی 1500 ق.م. سے لے کر 500 ق.م.

تک یہ زبان پھلتی پھولتی رہی لیکن اس کا نام سنسکرت نہیں پڑا، اس کا نام سنسکرت تو بعد میں رکھا گیا۔ سنسکرت زبان کا سب سے بڑا قواعد نویس ''پاننی'' جس نے پوری سنسکرت زبان کو قواعد کے اصولوں میں جکڑ دیا ہے اور اس کی کتاب ''اشٹادھیائے'' کو یورپ اور امریکا نے تسلیم کیا ہے یہ سنسکرت زبان کے قواعد کی ایک مستند کتاب ہے، اس نے اپنی زبان کو کہیں سنسکرت نہیں کہا ہے اس نے اپنی زبان کو ''بھاشا'' کہا ہے۔ اس زبان کا سنسکرت نام تو بہت بعد میں پڑتا ہے۔ اسی طرح گوتم بدھ کی زبان کا نام ''پالی'' بہت بعد میں پڑا، اگر چہ یہ زبان بہت پہلے وجود میں آ چکی تھی۔ اسی زبان میں گوتم بدھ نے اپنی مذہبی تعلیمات کی تبلیغ کی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ زبانیں پہلے بن جاتی ہیں نام ان کا بعد میں پڑتا ہے۔ اسی طرح اردو جن حالات میں پیدا ہوئی یعنی کھڑی بولی سے جو زبان پیدا ہوئی اس کا نام پہلے ہندی اور ہندوی رکھا گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان سے نسبت رکھنے والی۔ شروع شروع میں جب مسلمان شمالی ہندوستان میں آئے اور 11ویں اور 12ویں صدی میں انھوں نے اپنی سلطنت قائم کی تب انھوں نے دہلی اور نواح دہلی میں بولی جانے والی زبان کو ہندی کہہ کر پکارا۔ ہندی سے مراد ہے ''ہند'' سے نسبت رکھنے والی اور ''ہند'' کا لفظ ''سندھ'' سے بنا ہے سندھ میں ''س'' کو ''ہ'' سے بدل دیا گیا یعنی جہاں جہاں سنسکرت میں ''س'' کی آواز تھی وہاں وہاں ایرانیوں نے ''ہ'' رکھ دیا مثلاً سنسکرت میں ایک لفظ ہے ''سپت'' اس کے معنی ہیں سات، تو ''س'' کو ''ہ'' سے بدل دیا، اس طرح وہ 'ہفت' ہو گیا، اس سے ''ہفتہ' بن گیا۔ اس طرح سندھ اور شمالی ہندوستان کے میدانی علاقے کو انھوں نے ''ہند'' کہا اور یہاں کی زبان کو ''ہندی'' کہنا شروع کیا اور یہاں کی قوم کو ''ہندو'' کہا۔ تو یہ لفظ 'ہندی' اور 'ہندو' دونوں نہ تو سنسکرت لفظ ہیں نہ پراکرت لفظ ہیں اور نا ہی اپ بھرنش کے ہیں، یہ خالص ایرانی لفظ ہیں۔ اسی طرح سے نو وارد مسلمانوں نے ''ہندوی'' بھی کہنا شروع کیا۔ سب سے پہلا استعمال تو مسعود سعد سلمان کے سلسلے میں ملتا ہے کہ وہ ''ہندوی'' کے شاعر تھے، اور امیر خسرو نے اپنی مثنوی ''غرۃ الکمال'' میں ہندوی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کے بعد عوفی نے 1228 میں ایک تذکرہ ''لباب الالباب'' کے نام سے لکھا، اس میں ہندوی کا

لفظ استعمال ہوا ہے۔ تو اس زبان کو شروع میں ہندی اور ہندوی کہا گیا پھر جب اس میں شعری کاوشیں شروع ہوئیں تو اس کا نام ریختہ پڑا، یہ بھی فارسی کا لفظ ہے، پھر عرصہ دراز کے بعد اس کا نام ''زبانِ اردو معلائے شاہ جہان آباد'' رکھا گیا بعد میں ''شاہ جہان آباد'' کا لفظ ہٹ گیا تو یہ ''زبان اردوئے معلیٰ'' ہوئی، پھر ''معلیٰ'' ہٹ گیا تو یہ ''زبان اردو'' ہوئی، پھر زبان کا لفظ بھی ہٹ گیا تو یہ ''اردو'' ہوئی۔ مفرد لفظ ''اردو'' اسم لسان کے معنی میں سب سے پہلے غلام ہمدانی مصحفی نے استعمال کیا ہے اور مصحفی کا یہ شعر ہے کہ:

خدا رکھے، زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے

یہ سب سے پہلا استعمال ہے جو مصحفی نے کیا ہے اور شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے اس پر بہت تحقیق کی ہے کہ یہ نام کیسے پڑا اور اپنی کتاب ''اردو کا ابتدائی زمانہ'' میں اس پر پورا ایک باب صرف کیا ہے۔ وہ اس بات پر متفق ہیں کہ سب سے پہلے اسم لسان کے معنی میں ''اردو'' کا استعمال مصحفی کے یہاں ملتا ہے۔ انھوں نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ شعر غالباً 1772 یا 73 کا ہے یعنی 18 ویں صدی کے آخری ربع کا ہے۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو کا نام ''اردو'' 18 ویں صدی کے اواخر میں پڑا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس سے پہلے یہ زبان نہیں تھی، زبان اس سے کئی سو سال پہلے بن چکی تھی لیکن یہ دوسرے ناموں سے پکاری جاتی تھی۔ مثلاً ہندی، ہندوی اور ریختہ کے علاوہ یہ زبان، زبان دہلی، گجری، دکھنی اور زبانِ ہندوستان کے نام سے بھی جانی جاتی تھی۔

سوال: وہ کون کون سی آوازیں ہیں جو خصوصاً اردو کی اپنی ہیں اور بھی آوازیں اردو کے تشخص کی ضامن ہیں؟

جواب: اردو کی شناخت اس کی مخصوص آوازوں سے ہے جو ہندوستان کی دوسری زبانوں میں نہیں ہیں یا شاید شاذ و نادر ہیں، وہ آوازیں، خ، غ، ق، ز، ژ اور ف ہیں۔ یہ چھ آوازیں ایسی ہیں جو ہند آریائی زبانوں میں شاذ و نادر پائی جاتی ہیں۔ یہ آوازیں عربی، فارسی ماخذ سے آئی ہیں اور انھی کی وجہ سے اردو کی شناخت قائم ہے۔

سوال: دنیا کی تمام زبانوں میں مصوتوں کی تعداد کم وبیش یکساں ہے، یہ بتائیں کہ اردو میں مصوتوں کی کل تعداد کتنی ہے؟

جواب: اردو میں مصوتوں کی تعداد، دس ہے اور اس میں دو دوہرے مصوتے بھی شامل ہیں جنھیں انگریزی میں "Diphthong" کہتے ہیں یعنی ''آئی'' اور ''آؤ'' کی آوازیں دوہرے مصوتوں کی مثال ہیں۔ مثلاً ''کوا'' اس میں ''ک'' کے بعد جو مصوتہ ہے وہ دوہرا مصوتہ، یعنی Diphthong ہے اسی طرح ایک لفظ ''عیار'' ہے اس میں پہلی آواز دوہرا مصوتہ ہے، ''عیاش'' میں بھی پہلی آواز دوہرے مصوتے کی پہچان ہے۔ تو اردو میں آٹھ تو سادے مصوتے ہیں اور دو دوہرے ہیں، مصوتوں کی کل تعداد دس ہے۔

ملاقاتی: نئی نسل کے نام کوئی پیغام؟

پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ: نئی نسل کے نام میرا یہی پیغام ہے کہ ان کو اپنی زبان سے محبت کرنی چاہیے، اس کو سیکھنا چاہیے اور دوسروں کو سکھانا چاہیے۔ زبان کا تہذیب کے ساتھ گہرا رشتہ ہے۔ جب انسان کی زبان ترقی کرتی ہے تو اس کا مطلب ہے اس کی تہذیب ترقی کر رہی ہے اور انسان اپنی تہذیب سے کٹ کر الگ نہیں رہ سکتا۔ زبان اپنی شخصیت کی نمائندہ ہوتی ہے لہٰذا زبان کو اچھی طرح سیکھنا چاہیے، اس کے تلفظ پر قابو پانا چاہیے، اس کے رسم خط کو سیکھنا چاہیے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں زبان کا استعمال کرنا چاہیے۔

•••

مرزا خلیل احمد بیگ سے گفتگو (II)

سوال: مسعود حسین خاں صاحب سے آپ کی ملاقات کب کہاں اور کیسے ہوئی؟

جواب: میں 1968 سے پہلے تک مسعود صاحب کو بالکل نہیں جانتا تھا، کیونکہ ان دنوں وہ حیدر آباد میں تھے۔ لیکن جب وہ 1968 میں علی گڑھ آئے اور انھوں نے لسانیات کے پروفیسر اور شعبۂ لسانیات کے بانی صدر کی حیثیت سے اپنا عہدہ سنبھالا تو علی گڑھ میں ان کے نام کی گونج سنائی دینے لگی۔ لیکن مجھے ان سے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ مسعود صاحب سے میری پہلی ملاقات جولائی 1969 میں اس وقت ہوئی جب میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک نوتشکیل شعبے یعنی شعبۂ لسانیات میں ایم اے میں داخلہ لیا جس کے سربراہ مسعود حسین صاحب تھے۔ اسی زمانے میں لسانیات کی، جو ایک نیا علم تھا کافی دھوم مچی ہوئی تھی اور تدریس زبان اور دیگر علوم کی افہام وتفہیم میں لسانیات سے مدد اور روشنی لی جا رہی تھی۔ لسانیات کے شعبے ملک کی دیگر یونیورسٹیوں میں بھی قائم ہو رہے تھے اور لسانیات کے سمر اسکولوں کے انعقاد کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ لسانیات جدید Modern Lingustics سے واقفیت رکھنے والوں کی بیرون ملک بھی کھپت تھی چنانچہ میری مہم جو طبیعت نے لسانیات میں ایم اے کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس طرح میں مسعود صاحب کا باقاعدہ شاگرد بن گیا۔

سوال: ایم اے میں مسعود صاحب نے آپ کو کیا پڑھایا؟

جواب: ایم اے کا ہمارا دو سال کا کورس تھا جس میں چار سمیسٹرز تھے، اور ہر سمیسٹر میں چار پرچے ہوتے تھے، گویا پورا ایم اے 16 پرچوں پر مشتمل تھا۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے پہلے سمسٹر میں مسعود صاحب نے صوتیات (Phonetics) کا پرچہ پڑھایا تھا، بعد کے سمسٹر میں انھوں نے نحو (Syntex)، اسلوبیات (Slytistics)، متنی تنقید (Textual Criticism) اور عملی لسانیات (Practical Linguistics) کے پرچے پڑھائے تھے۔ آخر الذکر کو Field Linguistics بھی کہتے ہیں، جس کے پڑھانے کا طریقہ دوسرے تمام پرچوں کے پڑھانے سے مختلف تھا۔ مسعود بہت اچھے اور منجھے ہوئے استاد تھے۔ انھوں نے جدید لسانیات کی باقاعدہ تربیت یورپ اور امریکہ میں رہ کر حاصل کی تھی اور ہندوستان کی چوٹی کے ماہرین لسانیات میں شمار کیے جاتے تھے، چنانچہ جب پونا کے دکن کالج میں گذشتہ صدی کی چھٹی دہائی میں امریکہ کے راک فیلر فاؤنڈیشن کے تحت لسانیات کے سمر اسکولوں کا آغاز ہوا تو ان میں امریکی ماہرین لسانیات کے ساتھ مسعود صاحب کو بھی لسانیات کا درس دینے کے لیے مدعو کیا گیا تھا، وہ اپنے طالب علموں کو اس طرح Motivate کرتے تھے کہ ان کے اندر اس موضوع سے خصوصی دلچسپی پیدا ہو جاتی تھی۔ مسعود صاحب نے مجھے جو کچھ بھی پڑھایا وہ چالیس سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد آج بھی ذہن پر نقش ہے۔

سوال: ابھی آپ نے اسلوبیات کا ذکر کیا، تو کیا اسلوبیات اور اسلوبیاتی تنقید ایک ہی چیز کے دو نام ہیں؟

جواب: جی ہاں! اسلوبیات کو اسلوبیاتی تنقید بھی کہتے ہیں۔ اسلوبیات دراصل اطلاقی لسانیات (Applied Linguistics) کی ایک شاخ ہے جس میں ادب کا مطالعہ لسانیاتی نقطۂ نظر سے کیا جاتا ہے۔ اسلوبیات کا دائرہ کار و عمل ادبی زبان و اسلوب ہے جس کے مطالعے اور تجزیے میں لسانیات سے مدد لی جاتی ہے، اور لسانیاتی طریقۂ کار کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ لسانیاتی مطالعہ ادب معروضی اور غیر تاثراتی ہوتا ہے اور صرف ادبی فن پارے ہی کے تجزیہ و تحلیل سے نتائج برآمد کیے جاتے ہیں۔ اس نوع کے مطالعے میں مصنف کے کوائف، یا

تاریخی وتہذیبی، نیز سوانحی حوالوں سے کوئی سروکار نہیں رکھا جاتا ہے اور صرف فن پارے ہی پر اسلوبیاتی نقاد کی توجہ مرکوز ہوتی ہے۔ ماہرین لسانیات ادب کے لسانیاتی یا اسلوبیاتی مطالعے کو "اسلوبیات" کے نام سے یاد کرتے ہیں لیکن ادبی اسکالرز اسی مطالعے کو 'اسلوبیاتی تنقید' کہتے ہیں۔ یہ صرف ناموں کا فرق ہے۔ اردو کے لسانیاتی ادب میں اسلوبیات کو زیادہ تر اسلوبیاتی تنقید کے نام سے ہی یاد کیا گیا ہے۔

سوال: مسعود صاحب کو اسلوبیاتی تنقید کا بنیاد گزار کہا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی کیا خدمات ہیں؟

جواب: مسعود حسین خاں بلاشبہ اردو میں اسلوبیاتی تنقید کے بنیاد گزار ہیں۔ انھیں اس موضوع سے اس وقت دلچسپی پیدا ہوئی جب انھوں نے امریکہ میں اپنے قیام کے دوران (1959-60) ممتاز ماہر لسانیات و اسلوبیات پروفیسر آرکی بالڈ اے ہل (Archibald' A-Hill) کے لکچرز میں شرکت کی۔ پروفیسر ہل ٹیکساس یونیورسٹی میں شعبۂ انگریزی کے صدر تھے، لیکن ان کی دلچسپی کا میدان لسانیاتی اسلوبیات بھی تھا اور وہ اس کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ وہ ان دنوں ادب کے مطالعے میں لسانیات کے اطلاق سے متعلق نہ صرف لکچرز دیتے تھے بلکہ مقالات بھی قلم بند کر رہے تھے، چنانچہ مسعود صاحب نے ان کی صحبت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اور وطن واپس آنے پر اردو میں اسلوبیات/ اسلوبیاتی تنقید کو متعارف کرایا۔

اس نوع کے مضامین انھوں نے اردو میں 1960 کے بعد سے لکھنا شروع کیے۔ اس وقت اہل اردو اس موضوع سے قطعاً نابلد تھے۔ 1968 میں جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ لسانیات کا قیام عمل میں آیا اور مسعود صاحب اس کے پروفیسر اور بانی صدر مقرر ہوئے تو انھوں نے اسلوبیات کو ایک پرچے کی حیثیت سے ایم اے کے نصاب میں داخل کیا۔ اس پرچے کو مسعود صاحب نے اتنی لگن کے ساتھ اور اتنے دل نشین انداز سے پڑھایا کہ اس موضوع سے مجھے خصوصی دلچسپی پیدا ہوگئی جو آج تک قائم ہے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد میں نے اس موضوع کا اور گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا اور اس کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ میرے اسلوبیاتی مضامین کے اب تک دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جن کے نام ہیں: 'زبان، اسلوب اور اسلوبیات' (1983) اور 'تنقید اور اسلوبیاتی تنقید' (2005)۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسعود صاحب نے اپنے علمی کیریئر کی ابتدا میں چند تنقیدی مضامین لکھے تھے لیکن وہ ادبی تنقید کے داخلی اور تاثراتی انداز سے مطمئن نہ تھے۔ انھیں یہ بات بھی ناگوار معلوم ہوتی تھی کہ ادبی تنقید فن پارے یا متن پر توجہ کم اور مصنف کی ذات وصفات پر زیادہ توجہ دیتی ہے۔ چنانچہ جب انھوں نے ٹیکساس یونیورسٹی میں پروفیسر ہل (Hill) کے لکچرز اٹینڈ کیے تو انھیں تنقید میں وہ سب کچھ مل گیا جس کی انھیں تلاش تھی، اور یہیں سے انھیں اردو میں اسلوبیات کو فروغ دینے کی تحریک ملی۔ مسعود صاحب کی اسلوبیاتی خدمات پر میں نے تفصیل سے لکھا ہے۔ میرا ایک مضمون 'مسعود حسین خاں اور اسلوبیات' میرے مجموعۂ مضامین — 'تنقید اور اسلوبیاتی تنقید' میں شامل ہے۔ مسعود صاحب نے اسلوبیات کی نہ صرف نظری بنیادیں فراہم کی ہیں، بلکہ اسلوبیات یا اسلوبیاتی تنقید کے اطلاقی نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ مسعود صاحب کا اولین مضمون 'مطالعۂ شعر: صوتیاتی نقطۂ نظر سے' ایک نہایت عالمانہ مضمون ہے جس میں انھوں نے اسلوبیات کے نظری مباحث پیش کیے ہیں، یہ ان کے مجموعۂ مضامین 'شعر و زبان' (حیدرآباد 1966) میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ ان کے چند اسلوبیاتی مضامین ان کی کتاب — 'مقالاتِ مسعود' میں بھی شامل ہیں۔ رسائل میں بھی ان کے اس نوع کے مضامین بکھرے پڑے ہیں۔

مسعود حسین خاں نے غالب، اقبال، خواجہ حسن نظامی، نیاز فتحپوری اور بعض دیگر شاعروں اور ادیبوں کے حوالوں سے اسلوبیاتی مضامین قلم بند کیے ہیں، جن کا ایک نہایت قابلِ قدر مجموعہ ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

سوال: پروفیسر مسعود حسین خاں کو اردو دنیا ایک لسانی محقق اور نظریہ ساز کی حیثیت سے بھی جانتی ہے۔ اردو کے آغاز و ارتقا کے بارے میں انھوں نے کون سا نظریہ پیش کیا ہے جس کی وجہ سے انھیں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی؟

جواب: مسعود صاحب بلاشبہ ایک بلند پایہ محقق تھے۔ انھوں نے لسانی تحقیق میں کئی قابل قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔ ان کا سب سے اہم تحقیقی کام 'مقدمہ تاریخ زبان اردو' ہے، جس میں انھوں نے نہ صرف اردو زبان کی تاریخ بیان کی ہے، بلکہ اردو کے آغاز وارتقا کے بارے میں اپنا ایک مخصوص نظریہ بھی پیش کیا ہے جو سب سے قابل قبول (Most Acceptable theory) سمجھا جاتا ہے جسے نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی کوئی چیلنج نہیں کر سکا۔ مسعود صاحب کے اس نظریے کی رو سے اردو 1193 کے بعد دہلی ونواحِ دہلی میں پیدا ہوئی۔ ان کا یہ بھی نظریہ ہے کہ 'قدیم اردو کی تشکیل براہِ راست دوآبہ کی کھڑی [بولی] اور جمنا پار کی ہریانوی کے زیر اثر ہوئی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسعود صاحب پہلے اردو کی پیدائش براہِ راست ہریانوی سے بتاتے تھے جو جمنا پار کے علاقے یعنی دہلی کے شمال مغرب کی بولی ہے، وہ یہ بھی کہتے تھے کہ یہ نواحِ دہلی کی ایک دوسری بولی یعنی کھڑی بولی کی بنیادوں پر معیاری بنائی گئی ہے لیکن جب انھوں نے مقدمہ — تاریخ زبان اردو'' کا 1987 میں ساتواں ایڈیشن تیار کیا تو اس میں تھوڑی سی نظریاتی ترمیم کی جس کے مطابق اردو کی پیدائش کے سلسلے میں کھڑی بولی کو اولیت حاصل ہو گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم اردو (بشمول دکنی اردو) پر ابتدا میں ہریانوی کے گہرے اثرات پڑتے ہیں، لیکن اردو کا بنیادی ڈھانچہ اور کینڈا کھڑی بولی ہی کا ہے۔ جیسے جیسے اردو معیاری شکل اختیار کرتی گئی ہریانوی کے اثرات زائل ہوتے گئے۔ ہریانوی کے اثرات بول چال کی دکنی اردو میں آج بھی پائے جاتے ہیں۔ مسعود صاحب نے اپنے اس نظریے کی تشکیل لسانی شواہد، تاریخی دلائل اور نواحِ دہلی کی بولیوں کے تقابلی مطالعے کی بنیاد پر کی ہے اور اردو کے آغاز کے ان تمام نظریوں کو چیلنج کیا اور ان کا رد پیش کیا جو اس سے پہلے تک رائج تھے، خواہ وہ مولانا محمد حسین آزاد کا نظریہ ہو یا سید سلیمان ندوی کا یا پھر حافظ محمود خاں شیرانی کا۔

سوال: اسلوبیات اور تاریخ زبانِ اردو کے علاوہ مسعود صاحب نے لسانیات کے اور کن کن میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں؟

جواب: توضیحی لسانیات کی ایک شاخ صوتیات سے مسعود صاحب کو خصوصی دلچسپی رہی ہے۔ انھوں نے اردو لفظ کا صوتیاتی مطالعہ و تجزیہ عروضی (Prosodic) نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ یہ نقطۂ نظر مسعود صاحب نے انگلستان میں اپنے قیام کے دوران برطانوی ماہر لسانیات جے ایف فرتھ (JF Firth) سے لیا تھا، لیکن عروضی نظریے کا اردو لفظ پر اطلاق کرتے وقت انھوں نے اس میں اتنی وسعت، جامعیت اور انفرادیت پیدا کی کہ یہ ان کا اپنا نظریہ بن گیا۔ اردو لفظ کے حوالے سے اس نوع کا یہ پہلا مطالعہ ہے۔ اس تحقیقی مطالعے پر مسعود صاحب کو فرانس کی سورن بورن یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی ڈگری تفویض ہوئی تھی۔ یہ مقالہ A phonetic and phonological study of Urdu کے نام سے شائع ہوا۔ میں نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا جو 'اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجزیاتی صوتیاتی مطالعہ' کے نام سے شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے 1986 میں اشاعت پذیر ہوا۔

اس کے علاوہ مسعود صاحب کو سماجی لسانیات، لغت نگاری و لغت نویسی، متنی تنقید اور اردو رسم خط سے بھی غیر معمولی دلچسپی رہی ہے۔ اردو حروفِ تہجی کا انھوں نے بڑی باریک بینی سے تجزیہ کیا ہے اور ان کی صوتیاتی ترتیب پیش کی ہے۔ ایک زمانے میں مسعود صاحب کی سخت تنقید کی گئی تھی جب انھوں نے اردو کے ساتھ حروف: ذ، ض، ط، ظ، ث، ص، ح کے بارے میں یہ لکھ دیا تھا کہ 'یہ مردہ لاشیں ہیں، جسے اردو رسم خط اٹھائے ہوئے ہے۔ صرف اس لیے کہ ہمارا لسانی رشتہ عربی سے ثابت رہے۔

مسعود صاحب اردو تحریک کے ایک فعال قلم کار بھی رہے ہیں۔ اس کا بین ثبوت وہ اداریے اور انشائیے ہیں جو انھوں نے انجمن ترقی اردو (ہند) کے ہفتہ روزہ 'ہماری زبان' میں تحریر کیے۔ میں نے ان تحریروں کو مرتب کرکے 'اردو کا المیہ' کے نام 1973 میں شعبۂ لسانیات علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی کی جانب سے شائع کیا۔ ان صحافتی مضامین میں مسعود صاحب نے اردو کے مسائل پر بڑی بے باکی اور جرأت کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے اور اردو کے موقف کی بھرپور حمایت کی ہے۔ اردو کے حوالے سے مسعود صاحب کی

یہ تحریریں ایک لسانی المیے کی داستان بیان کرتی ہیں۔ مسعود صاحب اردو زبان کو ہماری تہذیب کا جزو لاینفک سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک زبان اور تہذیب لازم وملزوم چیزیں تھیں۔ زبان کی موت کو وہ ایک تہذیب کی موت سے تعبیر کرتے تھے۔ اور اسے ایک تہذیبی قدر اور ضرورت سمجھتے تھے جس کے بغیر ہم اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں سے عاری ہو جائیں گے۔

سوال: پروفیسر مسعود حسین کو ادبی محقق کی حیثیت سے بھی جانا جاتا ہے، لہٰذا اس ضمن میں ان کی کیا خدمات ہیں؟

جواب: مسعود صاحب ایک بلند قامت مصنف تھے۔ اس حیثیت سے ان کی شخصیت کثیر الجہات تھی۔ وہ ماہر لسانیات، نقاد، لغت نویس، شاعر، آپ بیتی نگار اور اردو تحریک کے فعال قلم کار ہونے کے علاوہ محقق بھی تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ تحقیق ان کی علمی شخصیت کا 'نمایاں ترین' پہلو تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ انھوں نے لسانیاتی تحقیق کے علاوہ ادبی تحقیق میں بھی کئی اہم کارنامے انجام دیے ہیں جن میں سب سے اہم کام تدوین متن ہے۔ مسعود صاحب نے اصول تدوین کا پوری طرح خیال رکھتے ہوئے چار مثنویاں اور ایک داستان مرتب کر کے شائع کی۔ یہ مثنویاں ہیں:

''پرت نامہ'' (فیروز بیدری)، 'بکٹ کہانی' (محمد افضل افضل)، 'ابراہیم نامہ' (عبدل دہلوی) اور 'عاشور نامہ' (روشن علی)، قصہ مہر افروز دلبر' (عیسوی خاں بہادر) ایک نثری داستان ہے جسے مسعود صاحب نے مدون کیا۔ انھیں دکنی زبان وادب سے بھی خصوصی دلچسپی رہی ہے، چنانچہ اس ضمن میں بھی ان کی خدمات لائق ستائش ہیں۔

سوال: مسعود صاحب کے شخصی وعلمی امتیازات کیا ہیں؟

جواب: مسعود صاحب کے کئی شخصی وعلمی امتیازات ہیں جن میں سے چند کا ذکر میں یہاں کرتا ہوں۔ مسعود صاحب شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پہلے پروفیسر اور صدر (بانی صدر) تھے۔ وہ پہلے اردو اسکالر تھے جنھوں نے امریکہ کی یونیورسٹیوں میں جدید لسانیات کی باقاعدہ تربیت حاصل کی تھی۔ وہ پہلے لسانی محقق تھے جنھوں نے اردو کے

آغاز و ارتقا پر لسانیاتی استدلال کے ساتھ اور نہایت سنجیدگی سے غور کیا اور سب سے قابلِ قبول (Most Acceptable) نظریۂ آغازِ زبان اردو پیش کیا۔ مسعود صاحب پہلے ادبی نقاد ہیں جنھوں نے اسلوبیاتی تنقید کو اردو میں متعارف کرایا اور اس حیثیت سے اردو میں اسلوبیاتی تنقید کے بنیاد گزار کہلائے۔ وہ پہلے غیر دکنی اسکالر تھے جنھوں نے دکنی اردو کی لغت ترتیب دی۔ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے جامعہ اردو، علی گڑھ کی بہ حیثیت شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) تقریباً پچیس سال تک اعزازی خدمات انجام دیں۔

سوال: مسعود صاحب نے طویل عمر پائی اور بھرپور زندگی گذاری۔ انھوں نے کئی علمی میدانوں میں قابلِ قدر کارنامے انجام دیے۔ وہ تمام عمر کافی Active اور سرگرمِ عمل رہے، لیکن گذشتہ چند برسوں سے وہ گوشہ نشین ہو کر رہ گئے تھے، اور انھوں نے لکھنا پڑھنا بھی غالباً بند کر دیا تھا۔ چوں کہ آپ مسعود صاحب سے بے حد قریب رہے ہیں لہٰذا آپ ان کے آخری چند برسوں کی علمی سرگرمیوں اور علالت کے بارے میں کچھ بتائیں۔

جواب: آپ نے ٹھیک کہا، پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنی پوری زندگی علمی و ادبی کاموں اور مصروفیتوں میں گذاری۔ انھوں نے جو کچھ بھی کیا اس سے وہ بے حد مطمئن تھے۔ اپنی خود نوشت سوانح حیات 'وردِ مسعود' میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

'شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم'

وفات سے چند سال قبل انھوں نے 'وردِ مسعود' پر نظرِ ثانی کی تھی اور بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے اس کا دوسرا ایڈیشن تیار کیا تھا جس میں کچھ نیا مواد بھی شامل تھا، لیکن افسوس کہ ایک ناشر کی بدعہدی اور بد دیانتی کے باعث یہ ایڈیشن شائع نہ ہو سکا۔ اگر اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو جاتا تو مسعود صاحب کی زندگی کے بعض نئے پہلوؤں پر روشنی پڑتی۔ انھی دنوں مسعود صاحب کی بینائی بہت کم زور ہو گئی تھی۔ لکھنے پڑھنے میں انھیں کافی دقت اور الجھن محسوس ہوتی تھی۔ وہ صرف اردو اور انگریزی اخبارات کی سرخیاں دیکھ لیا کرتے تھے۔ 'قومی آواز' (نئی دہلی) ان کا پسندیدہ اخبار تھا۔ گہرے مطالعے کی عادت رفتہ رفتہ

ختم ہوتی جارہی تھی۔آخری کتاب جس کا انھوں نے بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا، گیان چند جین کی 'ایک بھاشا: دولکھاوٹ، دوادب' تھی۔ یہ کتاب انھوں نے مجھ سے مستعار لے کر پڑھی تھی، اور اسے ختم کرنے میں کئی دن لگ گئے تھے۔ایک روز جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو کتاب مجھے واپس لوٹاتے ہوئے بولے کہ ''مجھ میں اب اتنی سکت باقی نہیں رہ گئی ہے کہ میں اس کے بارے میں کچھ لکھوں، یہ کام آپ کو کرنا چاہیے۔'' جین صاحب کی اس کتاب کو پڑھ کر مسعود صاحب کا دل بہت آزردہ ہوا تھا۔انھیں اس بات کا بے حد ملال تھا کہ جین صاحب نے (جن سے ان کے دوستانہ مراسم تھے) ایسی کتاب لکھی۔وہ کہتے تھے کہ ''امریکہ جا کر انھیں کیا ہوگیا ہے۔'' میں نے مسعود صاحب کے اس درد کو محسوس کرلیا تھا اور مذکورہ کتاب کے جواب/رَد میں ایک سلسلۂ مضامین شروع کردیا تھا۔ یہ تمام مضامین معاصر اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے اور ان کا مجموعہ کتابی صورت میں 'ایک بھاشا جو مسترد کردی گئی' کے نام سے ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ سے 2007ء میں شائع ہوا۔ جب سے بینائی کم زور ہوئی تھی۔مسعود صاحب پڑھتے وقت اکثر محدب شیشے کا استعمال کیا کرتے تھے۔آنکھوں کا علاج بھی بدستور جاری تھا۔مسعود صاحب کوSpondylitis کا مرض بھی لاحق تھا جس کی وجہ سے وہ اپنی گردن کو ایک ہی حالت میں دیر تک سیدھا نہیں رکھ سکتے تھے۔لکھنے کے لیے انھیں میز پر ایک خاص زاویے سے بیٹھنا اور گردن کو جھکانا پڑتا تھا جو اکثر تکلیف دہ ثابت ہوتا تھا۔ چنانچہ دھیرے دھیرے ان کی لکھنے کی عادت بھی چھوٹتی گئی۔ جہاں تک مجھے علم ہے، ان کا آخری باضابطہ مضمون ''کالی داس گپتا رضا ('شریکِ غالب')'' ہے جو غالباً 'غالب نامہ' میں شائع ہوا تھا۔مسعود صاحب نے اس مضمون کا آف پرنٹ مجھے اپنے دستخط کے ساتھ جس پر 27/فروری 2005 کی تاریخ درج ہے، ارسال کیا تھا۔اس کے بعد سے ان کا کوئی مطبوعہ مضمون میری نظر سے نہیں گذرا۔مسعود صاحب اردو کے ایک معروف شاعر بھی تھے۔ان کا مجموعۂ کلام 'دونیم' کئی بار چھپ کر مقبول ہوا۔ان کی بعض شعری تخلیقات ایسی بھی ہیں جو 'دونیم' میں شامل نہیں ہیں۔انھی میں ان کی نظم ''سخنِ واپسیں'' بھی ہے جو

ذاتی حوالوں پر مبنی ایک انتہائی حزنیہ نظم ہے۔ یہ ان کی آخری نظم ہے۔ جس کی تخلیق فروری 2007 میں عمل میں آئی تھی۔ یہ نظم اسی سال 'ہماری زبان' (نئی دہلی) اور 'سب رس' (حیدرآباد) میں خصوصی نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی۔ مسعود صاحب نے اپنی وفات سے تقریباً ڈھائی سال قبل ایک کتاب کی اشاعت کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس کتاب کا نام انھوں نے 'اردو بنام ہندی (ایک تاریخی، لسانیاتی اور تہذیبی جائزہ)' رکھا تھا۔ انھوں نے اس کتاب کا مکمل خاکہ بھی تیار کر لیا تھا لیکن وہ ضعفِ بینائی، اسپونڈ لائٹس اور روز بہ روز اپنی گرتی ہوئی صحت کے باعث اس منصوبے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ وہ اسے اپنا ''آخری Ambition'' کہتے تھے۔ مجوزہ کتاب کا خاکہ انھوں نے مجھے دے دیا تھا کہ میں ہی اس کام کو کر ڈالوں۔ یہ اب تک میرے پاس محفوظ ہے۔ یہ میری کم ہمتی ہے کہ میں مسعود صاحب کے اس ''Ambition'' کو پورا نہ کر سکا۔ انھی دنوں مسعود صاحب نے اپنی خودنوشت 'ورودِ مسعود' کا دوسرا ایڈیشن تیار کیا تھا اور ایک نئے اور آخری باب ''رخصت اے بزمِ جہاں!...'' کا اضافہ بھی کیا تھا۔ اس کا ذیلی عنوان انھوں نے 'علی گڑھ تا خدا گڑھ' رکھا تھا۔ اس آخری باب کی ایک عدد فوٹو کاپی از راہِ عنایت انھوں نے مجھے ارسال کی تھی جو میرے پاس محفوظ ہے۔ علالت کے دوران مسعود صاحب نے گھر سے نکلنا بھی بند کر دیا تھا۔ اندرونِ خانہ بھی وہ محض واکر (Walker) کی مدد سے ہی چلتے پھرتے تھے اور جہاں بیٹھ جاتے تھے، پھر بغیر کسی کے سہارے کے نہ اٹھ سکتے تھے۔ جنوری 2009 کے آخری ہفتے میں وہ علاج کے لیے دہلی گئے تھے۔ اس کے بعد وہ محترمہ شیلا دکشت (وزیرِ اعلیٰ، دہلی) کی درخواست پر 2010 کے اوائل میں دہلی اردو اکادمی کی ایوارڈ تقریب میں شریک ہوئے جہاں انھیں کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ مسعود صاحب نے جس آخری پبلک جلسے میں شرکت کی وہ غالب انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) کا تہنیتی جلسہ تھا جو علی گڑھ میں (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فیکلٹی لاؤنج میں) 20 فروری 2010 کو منعقد ہوا تھا۔ اس میں مسعود صاحب کی خدمت میں ان کی علمی و ادبی خدمات کی بنا پر ''سپاس نامہ'' پیش کیا گیا تھا۔ مسعود صاحب کو پارکنسن کے مرض

(Parkinson's disease) نے آ گھیرا تھا جس کا 1986 سے علاج جاری تھا۔ اس سلسلے میں وہ امریکہ بھی گئے تھے اور انھوں نے وہاں کے ڈاکٹروں سے بھی اس مرض سے متعلق صلاح ومشورہ کیا تھا۔ لیکن افاقے کی کوئی صورت پیدا نہ ہوسکی تھی۔ جب بھی اس بیماری کا ذکر آتا تھا ان کے چہرے سے مایوسی ظاہر ہونے لگتی تھی۔ چند سال قبل انھوں نے شدید ذہنی کرب کے عالم میں یہ شعر کہا تھا:

تو نے مٹی سے بنایا تھا مجھے
ڈھیر مٹی کا ہوا چاہتا ہوں

سوال: مسعود صاحب کے آخری سالوں کی تفصیلات آپ نے بیان کیں اور بہت سی نئی معلومات بہم پہنچائیں۔ ان کے آخری ایام کس طرح گذرے تھے، ذرا اس پر بھی آپ روشنی ڈالیں۔

جواب: مسعود حسین صاحب نے 15/اور 16/اکتوبر 2010 کی درمیانی شب میں (16/اکتوبر [بروز شنبہ] کا سورج طلوع ہونے سے کافی پہلے تقریباً ڈیڑھ بجے شب میں) اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔ سانحۂ ارتحال ان کے دولت کدے ''جاوید منزل'' (واقع جامعۂ اردو روڈ، دودھ پور، علی گڑھ) میں پیش آیا۔ رحلت کے وقت ان کی عمر 91 سال، 8 مہینے اور 17 دن تھی۔ انتقال سے 15 دن قبل انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج ہسپتال کے ICU میں داخل کیا گیا تھا، لیکن افاقہ نہ ہونے پر انھیں واپس گھر لے آیا گیا تھا۔ انتقال سے کئی روز قبل وہ کوما میں چلے گئے تھے جو روز بہ روز شدید تر ہوتا گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ اپنے اہلِ خانہ کو بھی پہچاننے سے قاصر تھے۔ انھیں پہلے چمچے سے پھر ٹیوب کے ذریعے سے غذا دی جاتی تھی۔ وفات سے تقریباً دو ماہ قبل انھوں نے بولنا بہت کم کر دیا تھا۔ ان کی آواز بھی بہت نحیف ہوگئی تھی۔ جسم بھی بہت ناتواں ہوگیا تھا حالانکہ وہ قوی الجثہ تھے۔ بینائی تو پہلے ہی سے بہت کم زور ہوگئی تھی۔ کوما میں چلے جانے کے بعد ہوش وحواس بھی جاتا رہا تھا۔ اسی عالمِ سکرو جان کنی میں انھوں نے اس جہانِ فانی کو خیر باد کہا۔ ان کے بعض قریبی اعزا کا خیال تھا کہ انھیں جامعۂ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا جائے،

لیکن پھر اتفاقِ رائے سے یہ طے پایا کہ ان کی تدفین علی گڑھ میں ہی کی جائے۔ چنانچہ 16 اکتوبر ہی کو بعدِ نمازِ ظہر تقریباً 3 بجے انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قبرستان (منٹوئی) میں سپردِ خاک کیا گیا۔

سوال: مسعود صاحب کی سیرت و شخصیت اور ان کے کردار کے بارے میں بھی آپ کچھ بتائیں۔

جواب: مسعود صاحب نہایت صاف گو، سچے، کھرے اور دیانت دار انسان تھے۔ وہ ہمیشہ حق بات کہتے تھے اور حق کی حمایت کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی ذات سے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ مفاد پرستی ان کا شیوہ نہ تھا۔ وہ بھری مجلس میں بھی (خواہ کوئی اہم میٹنگ ہو یا سلیکشن کمیٹی) ہمیشہ سچ بات ہی کہتے تھے۔ ان کی دیانت داری کا یہ عالم تھا کہ وہ جب تک جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی، نئی دہلی کے وائس چانسلر رہے کبھی انھوں نے یونیورسٹی کی آفیشیل کار کا ذاتی مقاصد کے لیے استعمال نہیں کیا۔ وہ جب تک جامعہ اردو کے وائس چانسلر رہے انھوں نے جامعہ اردو کے پیسے سے کبھی ہوائی جہاز سے سفر نہیں کیا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ نادار بچوں کا پیسہ ہے۔ جامعہ اردو کے مجلس عام کی میٹنگ ایک بار ممبئی میں منعقد ہوئی ڈاکٹر رفیق ذکریا اس وقت جامعہ اردو کے چانسلر تھے انھوں نے مسعود صاحب کو لکھا کہ آپ ہوائی جہاز سے ممبئی آجایئے، کیونکہ آپ وائس چانسلر ہیں اور آپ کو یہ مراعات حاصل ہیں، لیکن آئینی جواز اور رفیق ذکریا صاحب کے اصرار کے باوجود میرے ساتھ ٹرین سے سفر کرکے ممبئی پہنچے۔ میں اس وقت جامعہ اردو (علی گڑھ) کا اعزازی خازن تھا۔ مسعود صاحب مشرقی تہذیب و اقدار کے دل دادہ تھے۔ اکثر شیروانی اور ٹوپی زیب تن کرتے تھے، کبھی کبھی سوٹ بھی پہنتے تھے۔ مذہبی معاملات میں ان کا رویہ لچک دار تھا۔ وہ مذہبی اقدار کی دل سے قدر کرتے تھے۔ انھوں نے عمرِ طبیعی پائی اور ایک بھری پڑی زندگی گزار کر طویل العمری میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ:

'میں موت سے نہیں ڈرتا، میں مرنے سے ڈرتا ہوں' کبھی انگریزی میں یہی فقرہ دہراتے۔

I am not afraid of death, I am afraid of dying.

حق تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے (نور اللہ مرقدہ)! آمین۔

•••

پروفیسر نصیر احمد خاں سے گفتگو

پروفیسر نصیر احمد خاں نے ابتدائی تعلیم کے بعد علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے گریجویشن اور امتیاز کے ساتھ اردو ادب میں ایم اے کیا۔ بمبئی یونی ورسٹی سے سر اسکول کرنے کے بعد لسانیات میں دکن کالج سے دوسرا ایم اے کیا۔ وہ شعبۂ اردو کشمیر یونی ورسٹی، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ اور تقریباً تیس برس جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی کے ہندستانی زبانوں کے مرکز سے وابستہ رہے۔ وہ یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کے ایمرٹس فیلو بنائے گئے۔ اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونی ورسٹی (اگنو) نئی دہلی میں سینئر صلاح کار اور رابطہ کار کی حیثیت سے کام کیا اور وہاں شعبۂ اردو قائم کیا۔ سرٹی فکیٹ، ڈپلوما اور گریجویشن پروگراموں کے کورسیز ترتیب دیے اور ان کے لیے بارہ کتابیں مرتب کر کے شائع کیں۔ آج کل وہ اردو ایڈیٹر کے طور پر اگنو ہی سے وابستہ ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں اردو قواعد، ادبی اسلوبیات، اردو انشائیے، اردو لسانیات، اردو کی بولیاں اور جدید ہندی اردو لغت اہم ہیں۔ یہ اپنی نوعیت کی پہلی صوتی لغت ہے۔ وہ انگریزی میں اردو زبان و ادب کی تاریخ پر بھی کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے مادری زبان کے ذریعے ایک ووکیشنل تربیتی پروگرام بھی تیار کیا ہے۔

سوال: زیادہ تر اردو والے اپنی ذات میں کھوئے ہوئے نظر آتے ہیں۔اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: انسانی سوچ کے تین محور ہوتے ہیں: فرد، سماج اور نظریہ۔نظریہ قائم کرنا اعلیٰ ترین سوچ کہلاتی ہے۔اردو والوں کی سوچ فرد میں پھنسی ہوئی ہے۔ہم صرف فرد کے بارے میں سوچتے ہیں خواہ وہ اپنی ذات ہو یا مصلحت کے تحت کسی دوسرے کی ذات۔ ہمارے یہاں 'میں' اتنی زیادہ ہے کہ اس نے ہم اردو والوں کو بھیڑ بکریاں بنا کر رکھ دیا ہے۔زوال پزیر معاشرے کی یہی علامت ہوتی ہے۔

جواب: اردو میں تحقیق کی صورت حال پر کچھ اظہار خیال کیجیے۔

جواب: تحقیق کیا ہے؟ جو نہیں ہے وہ ہے اور اسے اس طرح کھوج نکالنا کہ اس میں صراحت، وضاحت، معروضیت اور قطعیت چاروں باتیں ایک نظام کی طابع ہو کر سامنے آجائیں۔ ہمارے یہاں لکھے جانے والے اکثر تحقیقی مقالے اس کی ضد ہیں۔کیا، کیوں، کتنا اور کیسے ان سوالوں کے گرد تحقیق گھومتی ہے اور ان کے جوابات میں کوئی نتیجہ اخذ کرتی ہے۔لیکن ہمارے یہاں کسی سوال کا صحیح جواب نہیں ہوتا۔ ہمارے اکثر تحقیقی مقالے حیات اور کارناموں میں الجھے رہتے ہیں۔یہ اُس شاعر یا ادیب پر تحقیق کا ایک موضوع تو ہوسکتا ہے جو پہلی دفعہ دریافت ہوا ہو لیکن میر، غالب، یا اقبال کو لے کر حیات اور کارنامہ تحقیق کا موضوع نہیں بن سکتا کیونکہ اِن حضرات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔اردو تحقیق میں ہم اپنے کو دہرا رہے ہیں۔بیشتر یونی ورسٹیوں میں پی ایچ ڈی نوکری حاصل کرنے کے لیے کرائی جاتی ہیں۔تحقیق میں ہماری ایک بدشعاری یہ ہے کہ ہم اب تک تحقیق کی زبان کے معیار کا تعین تک نہیں کر سکے۔تحقیق ایک بے حد سنجیدہ عمل ہے لیکن ہم اکثر شاعرانہ ڈکشن سے اُسے دیکھتے ہیں اور استعاراتی لہجے میں بات کرتے ہیں۔کلیم الدین احمد کے جملے دیکھیے: ''اردو غزل ایک نیم وحشی صنفِ سخن ہے''

یا ''اردو تنقید معشوق کی موہوم کمر ہے''۔خورشید الاسلام کے مشہور جملے یہ ہیں ''شبلی پہلے یونانی ہیں جو ہندستان میں پیدا ہوئے'' یا ''شبلی اگر شاعر نہ ہوتے تو مصور ہوتے'' یہ جملے بے حد بلیغ ہیں لیکن تحقیق کی سنجیدگی ایسے جملوں کی اجازت نہیں دیتی۔ ہمارے یہاں آل۔

احمد سرور اور محمد حسن جیسے قد آور دانشور اور تنقید نگار بھی اپنی تحریروں میں لسانی چٹخاروں سے نہ بچ سکے۔ صورت حال یہ ہے کہ سیمیناروں اور کانفرنسوں میں جب مقالے پڑھے جاتے ہیں تو بیچ بیچ میں مشاعروں جیسی داد، خیال پر نہیں، پھڑکتے ہوئے جملوں پر ملتی ہے۔ آج کل لکھے جانے والے اکثر مضامین تنقیدی انشائیے ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں غیر سنجیدگی کا یہ عالم ہے کہ سیمیناروں میں پڑھے جانے والے مضامین دورانِ سفر یا منعقد ہونے والے شہر میں دورانِ قیام رات یا صبح کے کسی حصے میں لکھے یا مکمل کیے جاتے ہیں۔ سب سے بیہودہ بات یہ ہے کہ میر پر لکھا گیا مضمون نام بدل کر فانی پر پڑھ دیا جاتا ہے اور مومن کی شاعری کا مضمون حسرت موہانی پر جبکہ ہونا یہ چاہیے کہ فیض اور مجروح کے اسالیب جو بظاہر ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں، اپنی شناختوں کے بیان میں الگ ہونے چاہیے۔ دراصل ہمارے پاس چند الفاظ، تراکیب، مرکبات اور فقرے ہوتے ہیں جنھیں ہم ایک دوسرے پر ٹھوکتے رہتے ہیں۔

سوال: یونی ورسٹیوں میں ہونے والی تحقیق پر آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: یونی ورسٹیوں میں تحقیق منصوبہ بند طریقے سے ہونی چاہیے۔ یونی ورسٹیاں ایسے موضوعات کا انتخاب کریں جو Problemetic ہوں اور ہمیں نہ صرف کسی نتیجے پر پہنچائیں بلکہ ہماری حسیت میں بھی اضافہ کریں۔ ہمارے یہاں نظریہ سازی کے لیے بڑی تحقیق اس لیے نہیں ہو پا رہی ہے کہ ہم بنیادی ریسرچ سے ہی محروم ہیں۔ میں نے اپنی چیئر مین شپ میں یہ طے کیا تھا کہ 18ویں صدی کے شعرا کو لے کر ان کی حیات، عہد اور فن پر طلبا سے ایم فل کے لیے تحقیقی مقالے لکھواؤں گا۔ نتیجتاً آج اٹھارہویں صدی کے تمام اردو شعرا پر جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی میں مواد موجود ہے۔ جس کی بنیاد پر کوئی بڑی تحقیق ہو سکتی ہے۔ NCPUL کو چاہیے کہ ہندستان کی تمام یونی ورسٹیوں کی تحقیقی سرگرمیوں کا DATA اپنے یہاں محفوظ رکھے تا کہ جانکاری کے علاوہ رابطہ کاری میں بھی آسانی ہو۔

سوال: آپ نے انگریزی زبان میں اردو زبان و ادب کی تاریخ لکھی ہے۔ اب اس تاریخ کو آپ آٹھ جلدوں میں اردو میں لکھ رہے ہیں اس کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

جواب: اوّل تو اردو میں ایسی کوئی تاریخ نہیں لکھی گئی ہے جس میں اردو زبان اور اردو ادب دونوں شامل ہوں۔ دوسرے میں نے اردو کی تاریخ ہندستان کی مشترکہ تہذیب کے پس منظر میں لکھی ہے جو غالبًا بالکل نئی Approach ہے۔ ہماری زبان اسی تہذیب کی دین ہے اور ادب بھی ایک حد تک اسی شناخت کا حصہ ہے۔ اردو کو مشترکہ تہذیب کی علامت کہا جاتا ہے۔ یہ اعزاز ہندستان کی کسی دوسری زبان کو حاصل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اردو کی مرکزی حیثیت ہے، دوسری زبانیں علاقائی کردار رکھتی ہیں۔ اردو اپنی مرکزیت کی وجہ سے نہ صرف ہندستانی بلکہ سارک ممالک میں رابطے کی زبان بن گئی ہے۔

سوال: اردو کا تعلیمی معیار بہت گر چکا ہے اس کی کیا وجہ ہے۔

جواب: اس کی بنیادی وجہ نااہل لوگوں کا تقرر ہے۔ سنا ہے یونی ورسٹیوں کی تقرریوں میں اب پیسے بھی چل رہے ہیں۔ اللہ اپنا رحم کرے۔ درس گاہیں مندروں اور مسجدوں کی طرح مقدس ہوتی ہیں۔ ایک میں حق کی تلاش ہوتی ہے اور دوسرے میں حق کی پوجا۔ یونیورسٹیاں اور کالج بھی عبادت گاہیں ہیں مسجد اور مندر کی طرح انھیں بھی بدکاروں سے بچا کر رکھنا چاہیے۔ دوسری وجہ ہمارے یہاں کمٹمنٹ کی کمی ہے اور تیسرے شاعری زدہ ذہن ہمیں آگے سوچنے ہی نہیں دیتے۔ اکثر لوگ شعر کی صحیح قرات اور فہم کو اردو دانی کی معراج سمجھتے ہیں جبکہ ''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں''۔ اردو کو مادری زبان ہونے کی وجہ سے گھر کی لونڈی سمجھنے کے بجائے دوسرے علوم کی طرح ایک ڈسپلن کے طور پر لینا چاہیے۔

سوال: ہمارے سیمینار تفریح طبع کا سامان ہو کر رہ گئے ہیں۔ زیادہ تر سیمیناروں میں سنجیدہ باتیں نہیں ہوتیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: اس پر ہم پیچھے بحث کر چکے ہیں... دراصل ہم اردو والے ذہنی قبض کا شکار ہیں اور علمی معاملات میں بالکل سنجیدہ نہیں۔ ہر شخص ہر موضوع پر اپنے کو ماہر سمجھتا ہے۔ منتظمین کو اس کی فکر رہتی ہے کہ مجمع کیسے اکٹھا ہو۔ سیمینار میں جتنے زیادہ لوگ ہوں گے اُسے اتنا ہی کامیاب سمجھا جاتا ہے۔ پچھلے دنوں میں نے اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے مسائل پر ایک سیمینار کیا تھا سیمینار میں ان حضرات کو مدعو کیا گیا تھا۔ جو موضوع پر دسترس رکھتے

ہوں۔غیر متعلق لوگوں کو بولنے کی اجازت نہیں تھی اور تماش بینوں کو ہال سے دور رکھا گیا تھا۔اس پر کافی اعتراضات ہوئے لیکن میں اپنی جگہ صحیح تھا کیونکہ ایک سنجیدہ موضوع پر سنجیدہ بحث کے لیے ماہرین کو مدعو کیا گیا تھا تا کہ بحث و مباحثے کے بعد کسی نتیجے پر پہنچ کر اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے کوئی لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ یہی سیمینار کا مقصد تھا اور بس۔

سوال: آج کل اردو میں مغربی نظریات پر کافی بحث ہوتی ہے۔ہم اپنے ادب میں مشرقی اندازِ فکر سے دور بھاگ رہے ہیں۔اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: ادب میں مغرب پسندی اچھی بات ہے کیونکہ چراغ سے ہی چراغ جلائے جاتے ہیں لیکن مغرب پرست ہو کر اپنی سوچوں پر مغربی پہرے بٹھانے کے میں خلاف ہوں۔اس سے غلامی کی بھی بو آتی ہے۔ہر نظریہ اپنے سیاق سے قائم ہوتا ہے لیکن مشرقی سیاق کو نظر انداز کر کے مغربی اصول نقد سے اردو ادب کی تفہیم و تشریح کرنا میرے خیال میں مناسب نہیں ہے۔ہم نے مغرب کی حقیقت پسندی کے تصور کے چکر میں ناول کے مقابلے میں اپنی داستانوں کو اس لیے رد کر دیا تھا کہ اس میں مافوق الفطرت عناصر ہوتے ہیں۔پھر آج پورے مغرب میں ہیری پوٹر کی دھوم کیوں ہے؟ اس کے علاوہ ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ داستانیں نہ صرف ہماری تہذیب کی عکاس ہیں بلکہ تاریخی ریکارڈ بھی۔میرا یہ بھی یقین ہے کہ داستانوں کو پڑھے اور اس کے بیانیہ کو سمجھے بغیر ہم اردو کے لسانی مزاج کو نہیں سمجھ سکتے اور نہ ہی اپنی لسانی لکنت پر قابو پا سکتے ہیں۔یہاں! مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔پچھلے دنوں جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی میں دریدا سے اس کی ادبی تھیوری پر سوال کیا گیا تھا تو اس نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ" آج آپ اس نظریے پر بحث کر رہے ہیں۔جسے میں پچاس برس پہلے ہی بھول چکا ہوں۔

سوال: اردو کے حوالے سے لسانیات کے علم پر کچھ روشنی ڈالیے؟

جواب: لسانیات زبانوں کا علم ہے۔جس زبان کو لے کر آپ یونی ورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔اگر اس کی لسانی نزاکتوں اور مزاج سے ناواقف ہیں تو بلا شبہ آپ کے علم

حاصل کرنے میں کوئی کمی ہے۔اردو کے طالب علموں کے اندر لسانی شعور نہیں ہے۔آج اس علم کی ناواقفیت کی وجہ ہی سے صورت حال اتنی بگڑ گئی ہے کہ استاد مقتوع کو مقتوع تلفظ کرتے ہوئے بھی شرم محسوس نہیں کرتے۔میرے خیال میں یونی ورسٹیوں کے شعبہ اردو میں لسانیات کا ایک استاد ضرور ہونا چاہیے تاکہ نصاب میں زبان کے حصے کو قواعد اور اسلوب کے حوالے سے قاعدے سے سمجھایا جاسکے۔

سوال: ہمارے یہاں املا کا بھی ایک مسئلہ ہے؟

جواب: اردو زبان کے تلفظ اور املا کا برا حال ہے۔اردو زبان کروڑوں لوگوں کے درمیان بولی، سمجھی، پڑھی اور لکھی جاتی ہے لیکن ہمارے پاس کوئی صوتی لغت نہیں ہے حوالہ جاتی قواعد نہیں ہے۔پہلی اور دوسری زبان پڑھانے کے فرق کو سمجھتے ہوئے زبان سکھانے کے طریقہ کار نہیں ہیں۔اس سے بڑھ کر ہماری بے حسی اور کیا ہوگی کہ ہم زبان اور بولی کی سائنٹی فک توجیح نہیں کرسکتے۔ہمارے پاس زبان کے علاقائی، سماجی اور لسانی لہجوں کو سمجھنے کا شعور بھی نہیں ہے ہم اپنے املا کی طرف بھی غیر سنجیدہ ہیں۔کچھ آوازیں تو ایسی ہیں جو املا میں اکثر لکھی ہی نہیں جاتیں۔املا میں بعض جگہوں پر حرف صحیح اور حرف علت کا فرق نہیں ہوتا، جیسے احسان اور میاں میں <اُ سے اور ی > وغیرہ۔اگر ہم < ی > آواز کو لفظ کے درمیان دونقطوں کے نیچے کھڑا الف اور اُ کے لیے واو کے اوپر الٹا پیش لگانے کو لکھنے کا لازمی حصہ بنالیں اور اس پر سختی سے عمل کریں تو بیس فیصد ہم اپنی املا کی کوتاہیوں پر قابو پاسکتے ہیں۔یہ کام NCPUL اپنے پبلیکیشن ڈویژن کو ہدایت دے کر بڑی آسانی سے کرسکتا ہے۔اس طرح پانچ پانچ سال بعد ایک ایک بے ضابطگی کو لے کر چلیں تو تیس چالیس سال میں نوے فیصد سے زیادہ رسم الخط کی کوتاہیوں پر قابو پا سکتے ہیں۔ایک زبان کے املا کو درست کرنے کے لیے یہ وقفہ کم ہے۔کیا ہم اپنے بزرگوں سے بھی گئے گزرے ہیں جنھوں نے صدیوں پہلے لسانی کوتاہیوں کو درست کیا تھا۔

سوال: اردو عربی فارسی یونی ورسٹی (لکھنو) کے آپ بانی سرپرستوں میں سے ہیں۔کیا آپ وہاں کی کارکردگیوں سے مطمئن ہیں۔

جواب: وہاں کے وائس چانسلر میرے دوست ہیں جو بے حد فعال ہیں۔ انھوں نے بہت کم وقت میں یونی ورسٹی بنا کر کھڑی کردی جس کی انھیں دل سے مبارک باد دینی چاہیے اور قوم کو ان کی قدر کرنی چاہیے۔ یونی ورسٹی کی اپنی عمارت ہے، اپنا نصاب ہے، اپنے استاد ہیں۔ درس وتدریس کے علاوہ امتحانات بھی شروع ہوگئے ہیں۔ یہ سب کام چار پانچ برسوں میں ہوا جو کمال کی بات ہے۔ میری کوششوں سے یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن سے ادارے کو ایک خطیر رقم بھی ملی ہے۔ اگنو سے ایم او یو بھی سائن ہوا ہے۔ اب میری خواہش ہے کہ وہاں روایتی تعلیم کے ساتھ ایسے ووکیشنل تربیتی مراکز بھی قائم کیے جائیں جو خصوصاً مدرسوں کے طالب علموں کو اعلیٰ تعلیم کے ساتھ روزگار کی ضمانت بھی دیں۔ ہم لوگوں نے ایگزیکیٹو کونسل سے اس پروگرام کی منظوری لے لی ہے۔ اس کے علاوہ کونسل سے مرکز برائے لسانی تحقیق کے قیام کو بھی منظور کرالیا ہے۔ یہ ہندستان میں اپنی نوعیت کا واحد مرکز ہوگا جہاں اردو زبان و قواعد اور ان سے متعلق مختلف موضوعات پر اعلیٰ تحقیق ہوگی۔

سوال: اردو زبان کی ترقی کے لیے این سی پی یو ایل کو آپ کی نظر میں اور کیا کرنا چاہیے۔

جواب: اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے آپ کا ادارہ کئی کام کر رہا ہے؛ جیسے کتابوں کی اشاعت، ترویج و اشاعت کے لیے مالی تعاون اور کمپیوٹر کورسیز وغیرہ اگر آپ حروف شناسی کو ایک مہم کے طور پر لیں اور اردو کے اپنے سرٹی فکیٹ اور ڈپلوما کورسیز درست کرلیں جس سے زیادہ ناقص کورس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تو اردو کے بہت سے مسائل حل ہوسکتے ہیں۔

سوال: آپ نے اردو کی صوتی لغت مرتب کی ہے جو شاید اپنی نوعیت کے اعتبار سے دنیا کی پہلی لغت ہے۔ اس پر کچھ اظہارِ خیال کیجیے۔

جواب: صوتی لغت چھپنے کے بعد ہی معلوم ہوگا کہ یہ آپ لوگوں کے لیے کتنی مفید ہے۔ اس کو مرتب کرتے وقت میں نے جن باتوں کو مدِنظر رکھا ہے وہ یہ ہیں:

(1) اردو زبان کے معیاری تلفظ کی نشان دہی

(2) آوازوں اور حروف کے درمیان رشتوں کی وضاحت

(3) اردو کے صوتی نظام کی تشکیل

(4) املا میں نظر انداز ہونے والی آوازوں کی پہچان

(5) تلفظ کے درمیان الفاظ کے تلفظ میں تغیر و تبدل

(6) مخارج اور طریقِ ادائگی کے اعتبار سے آوازوں کی تشریح

(7) معنوں کی ترجیح!

(8) آوازوں کی رکنوں اور رکنوں کی لفظوں میں تقسیم

(9) الفاظ کے مآخذ

(10) الفاظ کی نحوی حیثیت وغیرہ

سوال: اردو والوں کے لیے کوئی پیغام؟

جواب: اردو والوں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ مادری زبان کہنے والے تعلیم یافتہ لوگ اگر اردو لکھنا اور پڑھنا نہیں جانتے تو وہ آدھے جاہل ہیں کیونکہ تاریخ، ادب، مذہب، تہذیب اور شناخت کا ہمارا آدھا علم تو مادری زبان میں ہوتا ہے۔ اگر آپ اپنی بنیادوں سے ہی نا واقف ہوں گے تو آپ کا تعلیم یافتہ ہونا چہ معنی دارد!

•••

علی رفاد فتیحی سے گفتگو

پروفیسر علی رفاد فتیحی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات سے وابستہ ہیں۔ آپ کی پیدائش تین جنوری 1953 کو ڈوری گنج، چھپرہ (بہار) میں ہوئی۔ آپ نے ابتدائی تعلیم چھپرہ میں ہی حاصل کی بعدازاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور 1976 میں امتیازی حیثیت سے لسانیات میں ایم۔ اے۔ کیا۔ پروفیسر فتیحی نے 1989 میں کولمبیا اسکول تھیوری پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آپ 1978 سے 1992 تک سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجیز کی علاقائی شاخوں سولن، اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر لکھنؤ اور نارتھ ریجنل لینگویجز سینٹر پٹیالہ سے بطور ریسرچ اسسٹنٹ، لکچرر اور پرنسپل (انچارج) وابستہ رہے۔ 1992 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات میں ریڈر کے طور پر تقرر ہوا۔ آپ اکتوبر 2001 سے جولائی 2002 تک قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر اور کورنیل یونیورسٹی اتھاکا، نیویارک میں 2002 سے 2004 تک وزنٹنگ پروفیسر بھی رہے۔

پروفیسر علی رفاد فتیحی کی اہم تصانیف مندرجۂ ذیل ہیں۔ اسلوبیاتی تنقید (1989)، اے گرامر آف اردو (1990)، دی لینگویج آف ایڈورٹائزنگ اینڈ ٹی۔ وی۔ کمرشیل (1991) اسپیکٹس آف عربک فونولوجی (2001) اردو ان ملٹی لنگول انڈیا، پالیٹکس آف

لینگو یج! اے کیس آف اردو۔ ملک اور بیرون ملک کے مختلف مقتدر رسائل میں آپ کے تحقیقی اور لسانیاتی مضامین مسلسل شائع ہوتے رہتے ہیں۔"اردو دنیا" میں بھی اپریل سے اکتوبر 2002 کے درمیان آپ کی تجزیاتی ریاستوں کی اردو آبادی کا سماجی اور لسانیاتی جائزہ پیش کیا گیا تھا۔ یہاں پروفیسر علی رفاد فتیحی سے کی گئی گفتگو کے اہم اقتباسات پیش کئے جارہے ہیں۔

سوال: آپ لسانیات کی جانب کیسے راغب ہوئے؟

جواب: لسانیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے یوں تو میرا تعلق لسانیات کے مختلف شعبوں سے ہے۔ لیکن میری خاص دلچسپی کا موضوع لسانی تنازعہ اور لسانی کشمکش ہے۔ لسانی کشمکش اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی زبان کسی اہم زبان کو زیر کرنا یا اس کی جگہ لینا چاہتی ہے۔ یہ لسانی کشمکش آہستہ آہستہ لسانی اضطراب میں بدل جاتی ہے۔ جھارکھنڈ کی قبائلی زبانوں پر میرے ایک تحقیقی مطالعے میں لسانی اضطراب کی یہ کیفیت واضح طور پر نظر آئی۔

سوال: اردو کے آغاز وارتقا کے سلسلے میں کئی نظریات پیش کیے گئے ہیں آپ کس نظریے کو سب سے بہتر سمجھتے ہیں اور کیوں؟

جواب: اردو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے جس کی داغ بیل ہندوستان کی دیگر جدید ہند آریائی زبانوں کی طرح ہزار سنہ عیسوی کے بعد پڑی ہے۔ اردو زبان کے آغاز وارتقا کے متعلق ایسے ایسے نظریات پیش کیے گئے ہیں کہ یہ موضوع نہایت پیچیدہ اور حوصلہ شکن بن گیا ہے۔ محققین نے ایسے ایسے حقائق کا انکشاف کیا ہے کہ یہ حقائق ناقابل فہم بن گئے ہیں۔ بہرکیف پروفیسر مسعود حسین خاں کا نظریہ ان تمام نظریات میں سب سے زیادہ مستند اور معتبر نظر آتا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ لسانی تبدیلیاں نہایت خاموشی سے رونما ہوتی ہیں لہٰذا زبانوں کے آغاز وارتقا سے متعلق اظہار خیال نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ محمود شیرانی نے اپنی کتاب میں جو دلائل پیش کیے ہیں اسے صاف طور پر خارج بھی نہیں کیا جاسکتا۔

سوال: اردو رسم الخط کی بنیادی خوبیاں کیا ہیں؟

جواب: رسم الخط انسانی آوازوں کی تحریری علامت ہوتا ہے چونکہ تحریری علامتیں خود آواز نہیں ہوتیں بلکہ ان کا صرف صوتی اظہار ہوتی ہیں لہٰذا بالعلوم اصوات وحروف کا کوئی منطقی یا صوری تعلق نہیں ہوتا بلکہ استعمال عام سے ان میں خارجی تطبیق پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اردو رسم الخط میں اصوات کی بعض نمایاں خصوصیات کے اعتبار سے ہی ان کی تحریری علامتیں مقرر کی گئی ہیں۔ مثلاً طویل مصوتہ ''آ''(a:) کے لیے ''الف'' کا استعمال یا مدور طویل مصوتے ''او'' (o:) یا ''او'' (u) کے لیے حرف ''و'' کا استعمال ان مشابہتوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اس کا اطلاق معدودے چند حروف پر ہی ہو سکتا ہے۔ یہ اردو رسم الخط کی ایک ایسی بنیادی خوبی ہے جو کسی دوسرے رسم الخط میں نہیں ملتی۔ اردو رسم الخط کی ایک دوسری اہم خوبی اختصار ہے۔ حروف کی ذیلی شکلوں کی وجہ سے طویل عبارتیں بھی کم سے کم جگہ میں لکھی جا سکتی ہیں اور ان کے پڑھنے میں نسبتاً کم وقت لگتا ہے۔

سوال: رسم الخط کسی بھی زبان کا لباس ہی نہیں روح بھی ہے۔ جبکہ بعض ماہرین لسانیات رسم الخط کو زبان کا لازمی جزو تسلیم نہیں کرتے۔ آپ کا اس سلسلے میں کیا نظریہ ہے خصوصاً اردو کے حوالے سے؟

جواب: آپ کا خیال درست ہے۔ زبان اور رسم الخط کا یوں تو کوئی منطقی تعلق نہیں ہوتا لیکن استعمال عام کی وجہ سے ان میں ایک ربط پیدا ہو جاتا ہے جو نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے اور اہل زبان اس ربط سے اس قدر مانوس ہو جاتے ہیں کہ اس سے ایک جذباتی لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر معاشرے کی نفسیاتی اور ذہنی تبدیلیاں رسم الخط پر اثر انداز ہوتی ہیں اور رسم الخط کی حیثیت متعین ہوتی ہے۔ لہٰذا میرا خیال ہے کہ رسم الخط کی تبدیلی اردو کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔

سوال: بول چال کی سطح پر یوں تو اردو کو فروغ حاصل ہو رہا ہے لیکن تلفظ کا معیار خراب ہو رہا ہے۔ اس مسئلے کا کیا حل ہے؟

جواب: یوں تو اردو کے مسائل بے شمار ہیں لیکن اردو کے بنیادی مسائل میں سب سے اہم مسئلہ اس کے رسم الخط کے تحفظ اور فروغ کا ہے۔ اس زبان کی ادبی و ثقافتی روایتوں کو باقی رکھنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ اردو رسم الخط کے فروغ کے لیے کوئی ٹھوس اور مشترکہ لائحہ عمل طے کیا جائے تاکہ ملک گیر سطح پر اردو برادری اس پر عمل پیرا ہو سکے۔

جہاں تک تلفظ کے معیار کا سوال ہے تو اس کی ایک وجہ یقینی طور پر اردو رسم الخط کے چلن میں کمی ہے۔ ہم اردو والوں نے اجتماعی سطح پر کوئی عملی تحریک شروع نہیں کی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک عملی تحریک کا آغاز کیا جائے۔

سوال: اردو رسم الخط کو بہتر طور پر سکھانے اور بہتر تلفظ کی تربیت کے لیے کون سے طریقے اپنائے جا سکتے ہیں؟

جواب: احباب اردو آج بھی مشاعرے، تقریبات، اعزازات اور انعامات میں اس حد تک مصروف ہیں کہ تعمیری اور عملی تجاویز کو ہمیشہ نظر انداز کرتے ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو رسم الخط کے تحفظ کے لیے ایک مشترکہ لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ نئے تناظر اور تقاضوں کے تحت اردو حروف تہجی کی معیار بندی سب سے اہم کام ہے۔ اسی طرح تلفظ کی معیار بندی کے لیے ضروری ہے کہ اردو کے ماہرین لسانیات مل کر ایک معیاری صوتی قاعدہ (Phonetic Reader) تیار کریں۔ ادب اطفال کی معیار بندی سے بھی ان مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔

سوال: اردو کے فروغ کے لیے کیا اقدامات کیے جانے چاہئیں؟

جواب: زیادہ تر باتوں کا تو ذکر پہلے آ چکا ہے۔ اردو کے فروغ میں بچوں کا ادب نمایاں کردار ادا کر سکتا ہے۔

سوال: اردو کے فروغ کے لیے کیا اقدامات کیے جانے چاہئیں؟

جواب: زیادہ تر باتوں کا ذکر تو پہلے آ چکا ہے۔ اردو کے فروغ میں بچوں کا ادب نمایاں کردار ادا کر سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بچوں کے ادب کی معیار بندی کی جائے۔ اسی طرح

مقبول ادب(Popular Literature) کی طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مقبول ادب کی کتابیں زیادہ سے زیادہ اور دیدہ زیب طباعت میں منظر عام پر آئیں تو اردو کی طرف لوگوں کی دلچسپی یقیناً بڑھے گی۔

سوال: آپ نے ابھی ادب اطفال کا ذکر کیا۔اس ضمن میں تدریس کے جو مسائل ہیں۔خاص طور سے اردو زبان اور ادب کی تدریس کے اس حوالے سے آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: زبان بظاہر محض ایک ذریعۂ اظہار ہے مگر فی الواقع زبان ذریعۂ اظہار ہونے کے ساتھ ساتھ کسی لسانی طبقے کی روایات، اخلاقی اقدار اور تہذیب وثقافت کی آئینہ دار بھی ہوتی ہے۔لہٰذا تدریس کی زبان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس متعلقہ لسانی طبقے کی روایت وثقافت کی امین بھی ہو۔اگر کوئی تدریسی منصوبہ بندی ان خصوصیات کی حامل نہیں ہے تو وہ کسی بھی طرح کامیاب طریقۂ تدریس کا درجہ حاصل کرنے کی اہل نہیں ہے۔جب اس معیار پر ہم اردو زبان وادب کے تدریسی اصولوں کو پرکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اردو تدریس کی منصوبہ بندی میں تبدیلیوں کی بہت گنجائش ہے۔اس بحث سے قطع نظر کہ اردو کا تعلق کس مذہبی گروہ سے ہے۔یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ پچھلی دو دہائیوں میں اردو زبان کی ساجیات میں نمایاں تبدیلی آئی ہے۔آج بھی ایک عام خیال یہ ہے کہ اردو شہری اعلیٰ طبقے (Urban elite) کی زبان ہے لیکن بدلے ہوئے حالات کے زیر اثر اردو نے دیہی علاقوں میں بھی اپنی جڑیں مضبوط کی ہیں۔لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ آج اردو دیہی علاقے کے اردو داں طبقے کی پروردہ زبان ہے۔اردو کی اس نئی ساجیات کے پیش نظر ضرورت اس بات کی ہے کہ ان زمینی حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے اردو تدریس کی نئی منصوبہ بندی کی جائے تاکہ طریقۂ تدریس کو دیہی علاقے کی تہذیبی اور ثقافتی روایات کا آئینہ دار بنایا جا سکے۔ابتدائی درجات میں اردو ادب کی تدریس پر بھی یہ بات صادق آتی ہے۔مثال کے طور پر غالب اور اقبال کی بہ نسبت نظیر اکبرآبادی کی شاعری دیہی علاقے کی روایات سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔لہٰذا توقع کی جاتی ہے کہ نظیر کا شعری آہنگ مبتدی کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

سوال: ہندی والے برج، میتھلی، اودھی اور بھوجپوری وغیرہ تمام بولیوں کو ہندی کی بولیاں یا اس کی ذیلی شاخیں قرار دیتے ہیں۔ ان بولیوں پر اردو کے بھی کافی اثرات ہیں۔ کیا انھیں اردو کی بولیاں قرار دیا جا سکتا ہے؟

جواب: یقیناً۔ اردو زبان کے دائرے کو وسیع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان بولیوں کو اردو کے دائرے میں شامل کیا جائے۔ یہ ہماری بد قسمتی رہی ہے کہ ہم نے علاقائی بولیوں سے اپنے رشتے کو مستحکم نہیں کیا ہے جس کی وجہ سے ہم نے انشاء اللہ خاں کی تصنیف ''رانی کیتکی کی کہانی'' کو نہیں اپنانے کی غلطی کی۔ جب بھی علاقائی زبانوں اور اردو کے رشتے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو اہل اردو عموماً اردو کا تاریخی کردار فراموش کر دیتے ہیں اور معیاری زبان کے تصور کو اپنے مباحث میں شامل کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ''معیار بندی'' کا تصور ایک محدود تصور ہے۔ بعض اوقات علاقائی زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ میں ایسے رویوں کو بیان کرنے والے الفاظ دکھائی دیتے ہیں جو انسان کو ایک تیز رفتار اور بدلتی ہوئی دنیا سے آشنا کرتے ہوں۔ اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ علاقائی زبانیں اپنے فکری ذخائر اور اپنے زمینی تجربے کے باعث اردو کی آبیاری کے لیے نہایت ضروری ہیں۔

سوال: آج گلوبلائزیشن اور لبرلائیزیشن کے دور میں بول چال کی سطح پر ہر زبان، خصوصاً اردو اور ہندی میں نمایاں تبدیلیاں آرہی ہیں۔ اور اردو، ہندی، انگریزی لفظیات کے ذریعے ایک نئی لنگوا فرینکا معرض وجود میں آرہی ہے۔ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ ادبی سطح پر بھی ان زبانوں میں تبدیلیاں رونما ہوں گی؟

جواب: ہر زبان اپنے ارتقا کے دوران وقت اور مقام کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ زبان میں یہ تبدیلیاں یک لخت رونما نہیں ہوتیں۔ بلکہ غیر محسوس طریقے سے بتدریج وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ بالفاظ دیگر ہر زبان کا ایک لسانی تناظر ہوتا ہے جس پر دوسری زبانوں سے اخذ و اکتساب کی داستانیں رقم ہوتی ہیں۔ ہندی اور اردو کے تناظر میں بھی یہ بات صادق آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہندی اردو کی نئی آواز لسانی تکثیریت

اور مقبول عام لب و لہجے کی آواز ہے۔ ہندی اور اردو ادب کے بعض اہم تخلیق کاروں نے فرسودہ لسانی ؛ ڈھانچے کی رد تشکیل کر کے ادب کی زبان کو نئے لسانی مزاج سے ہم آہنگ کیا ہے۔

سوال: اردو اور ہندی کو قریب لانے کے لیے کیا اقدامات کیے جانے چاہئیں؟

جواب: ایسی کوششیں دونوں زبانوں کے لیے سودمند ثابت ہوں گی۔ آج ہندوستانی معاشرے میں لسانی رویوں کی equation بدل گئی ہے لہٰذا لسانی اظہار کے نئے امکانات تلاش کرنا استعمال شروع کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لسانی اظہار کے نئے امکانات تلاش کیے جا رہے ہیں۔ ان بدلے ہوئے حالات میں سماجی لسانیات کے ماہرین کو سماجی تبدیلیوں کے مطالعے کے لیے موثر طریقہ کار ڈھونڈنے ہوں گے اور اپنا پرانا راگ کہ اردو ہندی ایک زبان ہے کو ختم کرنا ہوگا۔

سوال: گریرسن نے مغربی ہندی اور مشرقی ہندی کا جو تصور پیش کیا ہے بعض ماہرین لسانیات اسے غیر سائنٹفک قرار دیتے ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: جدید ہند آریائی زبانوں کی گروہ بندی میں بہت سے اختلافات ہیں۔ گریرسن سے بہت پہلے 1880 میں ہارنلے (Hoernle) نے پہلی بار یہ نظریہ پیش کیا کہ ہندوستان میں آریہ دو گروہوں میں آئے اور اس طرح آریائی زبانوں کے دو گروہ 'بیرونی' اور 'اندرونی' ہیں۔ ان گروہوں میں 'بیرونی گروہ' قدیم ترین اور 'اندرونی گروہ' مابعد کا ہے۔ گریرسن نے ہارنلے (Hoernle) کے اس نظریے کو کچھ ترمیم کے ساتھ پیش کیا۔ مثلاً گریرسن نے 'اندرونی' اور 'بیرونی' گروہ میں 'درمیانی' گروہ کا اضافہ کیا۔ البتہ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے اس تقسیم کی زوردار تردید پیش کی۔

مغربی ہندی اور مشرقی ہندی گریرسن کے دیے ہوئے نام ہیں۔ تاریخ لسانیات کے نقطۂ نظر سے 'مغربی ہندی' شورسینی کے خاندان سے ہے جبکہ مشرقی ہندی کا تعلق 'اردھ ماگدھی' سے ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ تقسیم سائنٹفک نہیں ہے۔

سوال: اسلوبیاتی تنقید کیا ہے۔ کسی متن کا اسلوبیاتی جائزہ لیتے وقت کن امور کی طرف توجہ دینی چاہیے؟

جواب: بیسویں صدی میں لسانیات کے فروغ کے ساتھ ساتھ اس کی مختلف شاخیں بھی قائم ہوئیں جن کی بنا پر لسانیاتی نقطۂ فکر کا اطلاق مختلف مضامین کے مطالعے میں کیا جانے لگا۔ ادب کے مطالعے میں لسانیاتی نقطۂ فکر کو''اسلوبیات'' یا ''اسلوبیاتی تنقید'' کہتے ہیں۔ مزید وضاحت کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ ہر ادبی تخلیق کا بنیادی عنصر اظہار ہوتا ہے جو لسانی ہیئت کے وسیلے سے اپنا وجود پاتا ہے۔ تخلیقی تجربہ جب اپنی شناخت کرانے پر آمادہ ہوتا ہے تو اپنی مخصوص لازمی اور فطری لسانی صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ اس لسانی اظہار میں ایک خوش ترتیبی اور خوش نظمی ہوتی ہے۔ اسلوبیاتی تنقید ادبی تخلیق میں خوش ترتیبی اور خوش نظمی کو ادب کا معیار مانتی ہے۔ اپنے طرز مطالعہ اور طریق کار کی نوعیت کے اعتبار سے یہ خالص تجزیاتی تنقید ہے۔

سوال: اسلوبیات کا لسانیات سے کیا رشتہ ہے؟

جواب: اسلوبیاتی تنقید کا لسانیات سے بہت گہرا رشتہ ہے کیونکہ ''زبان'' ادب کا ذریعۂ اظہار ہے اور لسانیات کا مواد موضوع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زبان کے پر پیچ ڈھانچے کے توضیحی مطالعے میں ایک ماہر لسانیات جو معروضی نقطۂ نظر اور صریحی انداز فکر اختیار کرتا ہے وہ ادب کے تجزیے میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔

ایک عام خیال یہ ہے کہ اسلوبیاتی تنقید تخلیق کے صوتی تجزیے کا نام ہے یا پھر اس کے ذریعے فن پارے میں مستعمل اسم، فعل یا صفت کی درجہ بندی کر دیتے ہیں اور ادب کی جمالیاتی اور اسلوبیاتی قدروں کو نظر انداز کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلوبیاتی تنقید نہ صرف لسانی اصولوں کو بروئے کار لاتی ہے بلکہ ادب کی جمالیاتی قدروں کو بھی اپنی بنیاد بناتی ہے۔ اسلوبیاتی تنقید کے ذریعے تخلیق کے لسانی اور جمالیاتی خصوصیات کا بیک وقت مطالعہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

سوال: اردو کے اہم اسلوبیاتی تنقید نگار کون ہیں؟

جواب: اردو میں اسلوبیاتی تنقید کی ابتدا پروفیسر مسعود حسین خاں کے مضامین سے ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر مسعود حسین خاں نے اردو میں باقاعدہ طور پر اسلوبیاتی تنقید کی بنیاد ڈالی۔ اردو کے دوسرے اہم اسلوبیاتی نقادوں میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر مغنی تبسم اور پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ کے نام اہم ہیں۔ ان اسلوبیاتی نقادوں نے زبان اور اس کے اظہار کی گوناگوں صورتوں کے تجزیاتی مطالعے کی جانب باقاعدہ توجہ کی۔ ہر تخلیقی تجربے کی تعبیر، لسانی ساخت کی ایک نئی ترتیب پر منحصر ہوتی ہے اور اظہار کی ایک نئی ہیئت اس ترتیب سے وجود میں آتی ہے۔ لسانی ہیئت کی معنی خیزی ہمیشہ تجربے کی معنی خیزی سے مربوط ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلوبیاتی نقاد لسانی ہیئت اور تجربوں کی معنی خیزی کو معیار کے مطابق سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سلسلے میں راقم الحروف کی کتاب ''اسلوبیاتی تنقید'' کا ذکر بھی بے جانہ ہوگا۔ اس کتاب میں اسلوبیاتی تنقید کے ارتقا اور اس کے طریقۂ کار سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

سوال: چونکہ آپ نے امریکہ میں بھی کافی عرصے تک تدریس کے فرائض انجام دیے ہیں، اس حوالے سے آپ کے کیا تجربات رہے؟

جواب: کچھ عرصے کے لیے میں امریکہ ٹی۔ وی۔ لیگ یونیورسٹی میں درس و تدریس میں مشغول رہا۔ یہ تجربہ نہایت دلچسپ تھا۔ غیر ممالک میں اردو زبان و ادب کی تدریس بالعموم ثانوی زبان کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ لیکن امریکی یونیورسٹیوں میں زبانوں کی تدریس ثانوی زبان کے ساتھ ساتھ لسانی ورثے کی زبان (Heritage Language) کی حیثیت سے بھی ہوتی ہے۔ لسانی ورثے کی زبان کی حیثیت سے کسی زبان کا تدریسی طریقۂ کار قطعی مختلف ہوتا ہے۔ لسانی ورثے کی حیثیت سے تدریس زبان کا مقصد مہاجر برادری (Diasporic Community) کے آداب و اخلاق، اطوار و اسالیب، طرز کلام اور رہن سہن کے طور طریقوں کو نئی نسل تک پہنچانا ہوتا ہے۔ مثلاً آداب و القاب اور حفظ مراتب سے متعلق اردو زبان میں الفاظ کا

جتنا بڑا ذخیرہ ہے وہ یقیناً انگریزی میں نہیں ہے۔لہٰذا لسانی ورثے کی زبان کے نصاب میں ان امور پر خاص توجہ دی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کے نصاب میں ثقافت کے گہرے اثرات موجود ہوتے ہیں۔

سوال: قومی اردو کونسل نے اردو زبان وادب اور تعلیم کے فروغ کے لیے جو کوششیں کی ہیں ان کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: میرا خیال ہے کہ اپنے قیام کے بعد اس ادارے نے پورے خلوص کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیے ہیں اور اس کے قیام نے اردو آبادی کو امید کی نئی روشنی دی ہے۔اس ادارے نے اردو زبان کو جدید ٹکنالوجیکل منظرنامے سے جوڑنے کا جو کام کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔پچھلے کچھ عرصے میں قومی اردو کونسل ایک ایسے ادارے کے طور پر ابھر کر سامنے آئی جس کا مقصد اردو کو معاصر تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ہے۔اپنے مقاصد کے تحت ''اردو دنیا'' نے اردو کے نفاذ سے دلچسپی رکھنے اور اس کے لیے تدابیر اختیار کرنے والوں کے درمیان رابطے کا ایک مفید کام انجام دیا ہے۔

سوال: ''اردو دنیا'' کے قارئین کے نام آپ کیا پیغام دیں گے؟

جواب: قارئین سے میری گزارش ہے کہ اردو سے جذباتی رشتہ قائم کریں اور نئی نسل کو اردو ضرور پڑھائیں اور سکھائیں۔

•••

تنقید

محمد حسن سے گفتگو

پروفیسر محمد حسن موجودہ عہد کے ایک معتبر نقاد، محقق، افسانہ نگار اور ڈراما نگار ہیں۔ آپ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ تھے۔ حسن صاحب سے جناب جمیل اختر کی گفتگو کے اہم اقتباسات پیش خدمت ہیں۔

سوال: آپ نے لکھنے کی ابتدا کیسے کی۔ آپ کی ادبی تربیت میں کن لوگوں کا حصہ رہا؟ کن کتابوں نے متاثر کیا؟

جواب: لکھنے کی ابتدا اردو ریڈیائی ڈراموں سے ہوئی جو میں نے لکھنؤ ریڈیو بھیجے تھے اور وہاں براڈ کاسٹ ہوئے بچوں کے پرگرام میں۔ کہانیاں معروف سی تھیں جنھیں ڈرامائی شکل دے دی تھی۔ اس کے بعد ایک افسانہ ''علاج'' سعادت حسن منٹو کی ادارت میں نکلنے والے رسالے ''مصور'' ممبئی میں چھپا تھا۔ ادبی تربیت میں ان دنوں جن کتابوں نے مدد کی وہ راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر وغیرہ کے افسانوں کے مجموعے تھے یا اس دور کے ادبی رسالے۔

سوال: آپ نے اپنے ادبی سفر کی ابتدا تنقید سے کی یا تخلیق سے؟ پہلی تحریر کون سی تھی؟

جواب: میرے ادبی سفر کی ابتدا ڈراموں سے ہوئی جن میں پہلا ڈراما آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے نشر ہوا تھا 1940 میں۔ اس کے بعد کئی افسانے منٹو کی ادارت میں شائع ہونے والے ہفتہ وار ''مصور'' ممبئی میں شائع ہوئے اور بعد میں ایک افسانہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے بھی نشر کیا گیا۔ تنقیدی مضامین میں نے 1950 سے لکھنے شروع کیے۔ پہلا مضمون ''اردو مرثیہ خوانی کا اثر'' تھا جو میں نے 1950 میں لکھا تھا اور لکھنؤ یونیورسٹی کی اپنی بنائی ہوئی ادبی انجمن ''حلقۂ احباب'' کے ایک جلسے میں پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم کی صدارت میں پڑھا تھا۔ پہلا مطبوعہ تنقیدی مضمون غالباً ''ادب، زندگی اور سماج'' تھا جو عبادت بریلوی صاحب نے رسالہ ''شاہراہ'' دہلی کے لیے لکھوایا تھا اور بعد کو 1950 کے منتخب ادب میں شامل کیا گیا۔

سوال: آپ نے کہا کہ آپ نے کئی افسانے بھی لکھے ہیں۔ آپ افسانے کی طرف کیسے راغب ہوئے؟ کچھ اہم افسانوں کا ذکر کرنا پسند کریں گے؟

جواب: افسانے کی طرف رجحان تو خاصا پرانا ہے۔ ایک افسانہ تو رسالہ ''آج کل'' دہلی میں 1950 کے لگ بھگ عرش ملسیانی مرحوم نے شائع کیا تھا اور بڑی تعریف کی تھی لیکن حال میں افسانے کا رجحان اس قصے سے شروع ہوا جو مجھے لندن میں ایک ایرانی جلاوطن نے سنایا تھا۔ یہ اس ظلم وستم کی کہانی تھی جو تنگ نظری کے نام پر ایران میں ہوا تھا۔ اسے میں نے جوں کا توں لکھ کر ''مریم'' کے نام سے ''عصری ادب'' میں چھپا دیا۔ اس کے بعد کئی سچی کہانیاں ''بیسویں صدی'' اور ''نیا دور'' میں چھپیں جن میں خاص طور پر مجھے ''نیا دور'' میں چھپنے والی کہانی ''مرصع رقم'' پسند ہے (شاید یہی عنوان ہے اس کا)۔

سوال: آپ نے افسانے کے ساتھ ساتھ ناول بھی لکھے ہیں۔ ناول لکھنے کا محرک کیا تھا؟

جواب: ناول کا محرک زندگی کے واقعات تھے۔ پہلا ناول ''زلفیں زنجیریں'' جو مکتبہ اردو، لاہور سے 1950 میں چھپا دراصل یہ فرانسیسی ناول سے متاثر ہو کر لکھا گیا۔ دوسرا ناول مجاز مرحوم کی زندگی کے واقعات پر ہے جو قسط وار تو چھپ چکا ہے، کتابی شکل میں ابھی نہیں چھپا ہے۔

سوال: آپ کی تنقید میں بصیرت و بصارت اور دور اندیشی کے ساتھ ساتھ دوٹوک بات کہنے کا انداز رہا ہے۔ آپ کی تنقید میں یہ خصوصیت کن لوگوں کے زیر اثر پیدا ہوئی؟

جواب: جن خصوصیات کا آپ نے تذکرہ کیا ہے وہ مغرب کے نئے تنقیدی افکار کی دین ہے۔ میں نے ان افکار سے بہت کچھ سیکھا ہے اور ان سبھی مختلف افکار کو ملا کر اپنا تنقیدی نقطۂ نظر وضع کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں مشرقی افکار کو بھی شریک کیا ہے۔ میں تنقید کے مختلف دبستانوں کے باہمی اختلافات سے اوپر اٹھ کر ان سب کو ملا کر ایک تنقیدی نقطۂ نظر وضع کرنے کے حق میں ہوں جس میں نقاد کی ذاتی پسند و ناپسند کا بھی عمل دخل ہو اور معروضی نقاط نظر کا بھی احترام ہو۔

سوال: آپ کی تنقید کی ایک خصوصیت اختصار اور جامعیت بھی ہے جو کم ناقدوں کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے اس فن پر آپ نے کیسے قدرت حاصل کی؟

جواب: تکرار تنقید کا عیب ہے اسی لیے میں نے اختصار اور جامعیت کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ اسے ابھی اور عام ہونا چاہیے، اردو میں الفاظ کی بے جا تکرار بہت ہے اور یہ افلاسِ فکر کی نشانی ہے۔

•••

وہاب اشرفی سے گفتگو

پروفیسر وہاب اشرفی معاصر اردو تنقید کا ایک اہم نام ہے۔ان کی کتابوں میں تاریخ ادبیات عالم، قطب مشتری اور اس کا تنقیدی جائزہ، معنی کی تلاش، اردو فکشن اور تیسری آنکھ، مابعد جدیدیت مضمرات و ممکنات، شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری اور معنی سے مصافحہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ آپ رانچی یونیورسٹی میں پروفیسر کے علاوہ بہار انٹرمیڈیٹ کونسل اور بہار کالج سروس کمیشن جیسے اہم اداروں کے چیئرمین بھی رہے۔ تنقیدی و علمی خدمات کے لیے انھیں کئی اہم اور گراں قدر انعامات و اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ آج کل پٹنہ سے اردو کا ایک معیاری ادبی رسالہ سہ ماہی ''مباحثہ'' نکال رہے ہیں۔ ان سے کی گئی گفتگو کے اقتباسات قارئین کی نذر ہیں۔

سوال: آپ تنقید کی طرف کیوں اور کیسے راغب ہوئے؟ آپ کی پہلی تنقیدی تحریر کون سی تھی؟

جواب: میں ابتدا میں افسانے لکھتا تھا۔ اتنے افسانے ہو چکے تھے کہ ایک مجموعہ مرتب کیا جاتا لیکن ایک صاحب کو افسانوں کے سارے تراشے دے دیے اور وہ مشرقی پاکستان ہجرت کر گئے اور ساتھ میں وہ تراشے بھی لیتے گئے۔ بہت سے افسانے پاکستانی رسالوں میں چھپے تھے،

انھیں اب دوبارہ ڈھونڈنا میرے لیے محال ہے۔ اس حادثے کے بہت گہرے اثرات پڑے، ایک عرصے تک افسانے نہیں لکھے، آخری افسانہ اس وقت لکھا جب جدیدیت کی تحریک جڑ پکڑ چکی تھی اور اشاعت کے لیے ''شب خون'' میں بھیج دیا۔ وہ شائع تو ہوا لیکن اس رسالے کے آخری صفحات میں، ایک اور صدمہ ہوا اور مجھے ایسا لگا کہ میں اب افسانے نہیں لکھ سکتا چنانچہ افسانہ نگاری ترک کر دی۔ لیکن جہاں تک تنقید کا معاملہ ہے میں نے شاید بی اے کے زمانے میں ہی کلکتے میں تابان القادری پر ایک مضمون لکھا تھا۔ اس زمانے میں میرے دوست سلیمان ڈوگلے صاحب تابان القادری پر ایک کتاب مرتب کر رہے تھے۔ وہ تنقیدی مضمون ان کی کتاب ''نقوش تاباں'' میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ کلکتہ کالج کے میگزین میں اسی زمانے میں بے خود کلکتوی پر ایک مضمون لکھا تھا۔ ابھی ابھی کلکتے سے بیخود نمبر شائع ہوا ہے میں نے دیکھا کہ اس میں میرا مضمون شامل کیا گیا ہے۔ عرض مطلب یہ ہے کہ میں تنقید طالب علمی کے زمانے سے ہی لکھتا رہا ہوں۔

سوال: کسی فن پارے کی تنقید کرتے ہوئے آپ متن پر زیادہ توجہ دیتے ہیں یا اظہار و اسلوب بیان پر؟

جواب: متن ہی میں اظہار و بیان بھی ہوتا ہے۔ متن الفاظ سے مرتب ہوتا ہے، الفاظ خیالات کو ایک جہت دیتے ہیں۔ ظاہر ہے اگر متن پر نگاہ نہ ہو تو اظہار و بیان کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لہٰذا میں نے جہاں تنقید میں کوشش کی ہے کہ مفہوم و معنی واضح ہو جائیں وہاں فنکار کی اپنی خصوصیات جو اسلوب بیان سے سامنے آتی ہیں وہ بھی واضح ہو جائیں۔

سوال: جمالیاتی نقاد فن کی جمالیاتی اقدار پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ کیا یہ مناسب ہے؟

جواب: جمالیات یا جمالیاتی احساسات کو نظر انداز کر دینا یا رد کر دینا اچھی بات نہیں ہے۔ ہر ادیب اپنے طور پر احساس جمال رکھتا ہے پھر اس کے لکھنے کا کچھ مقصد ہوتا ہے۔ یہ دونوں ہی چیزیں جب ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتی ہیں تو ادب پارہ مرتب ہوتا ہے۔ جمالیات پر بہت زیادہ زور دینے سے آپ کی مراد اگر ادب برائے ادب کا مسئلہ ہے تو اس پر تو تسلسل سے لکھا جاتا رہا ہے۔ میرے خیال میں چند ہی لوگ ملیں گے جو اب اس موقف کو تسلیم کرتے ہیں۔

سوال: آپ نے لکھا ہے کہ ''میں ادب میں آفاقیت کا قائل ہوں'' کیا آپ ادب کی مقامی قدروں کو زیادہ اہم نہیں سمجھتے؟

جواب: آفاقیت سے میری مراد وہ تمام امور ہیں جو بہت حد تک ناگزیر بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ان سے چشم پوشی عدم آگہی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر نئے اور تازہ بکار وہ خیالات جو عالمی (global) ہیں ان کی طرف ہماری توجہ نہیں ہے تو بہت سی چیزوں سے ہم محروم رہ کر سکتے ہیں۔اس کا یہ مفہوم نہیں کہ ہم اپنے علاقائی مطالبات، تقاضے اور مقامی احوال وکوائف کو پس پشت ڈال دیں۔ادب تو اپنی ہی مٹی کی خوشبو پیش کرتا ہے یہ اور بات ہے کہ اس کی خوشبو کو مزید تیز کرنے کے لیے کچھ چیزیں کہیں نہ کہیں سے اخذ کرنی پڑتی ہیں۔

سوال: مابعد جدیدیت کے نام سے ادب میں جو رجحان شروع ہوا ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح لوگ ابتدا میں جدیدیت سے برسرِ پیکار تھے لیکن ترقی پسندی کی انتہا پسندی سے عاجز آکر آخرش اس کی طرف راغب ہو گئے لیکن جدیدیت بھی ایک منشور کے تحت تخلیق کو زنجیر میں جکڑنے کے درپے رہی جس میں منفی عناصر کا بڑا اہم رول رہا تو ایسے میں کسی نہ کسی تبدیلی کی ضرورت تھی۔مابعد جدیدیت ایسی ہی تبدیلی کا نام ہے جس میں منفی کی جگہ کتنے ہی مثبت پہلو مضمر ہیں۔اب ہوتا یہ ہے کہ جب کوئی رجحان یا تحریک سامنے آتی ہے تو اس کی اشاعت یا تفہیم کا مسئلہ نقادوں کے ہی سر ہوتا ہے اس لیے کہ عام طور سے خالق اپنی تخلیقی کاوش میں کسی بھی تحریک سے متاثر ہونے میں کافی محتاط ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔اب نقاد مابعد جدیدیت کی افہام وتفہیم کے پہلوؤں کو سامنے لانے کی سعی کر رہے ہیں۔اس ضمن میں ہندوپاک سے کئی کتابیں اردو ہی کے حوالے سے شائع ہو چکی ہیں۔ میں نے بھی اپنے طور پر ایک کتاب قلمبند کی جس کا نام ہے ''مابعد جدیدیت، ممکنات ومضمرات''۔اس کتاب میں مابعد جدیدیت کی بہت سی شقوں پر نظر ڈالی گئی ہے۔اس کے مطالعے سے تنقیدی صورت حال کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔قبل

ازیں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس موضوع پر کئی کتابیں قلمبند کی ہیں اور سب کی سب تنقیدی زمرے کی ہی چیزیں ہیں۔

سوال: ''تاریخ ادبیات عالم'' کی تدوین کا کیا مقصد ہے؟ کیا چند جلدوں میں دنیا کے جملہ ادب کی تاریخ پیش کی جاسکتی ہے؟

جواب: میں نے پہلی جلد کے پیش لفظ میں اس کا احساس دلایا تھا کہ کسی ایک زبان یا ایک ادب کی تاریخ بھی چند جلدوں میں نہیں سماسکتی چہ جائیکہ عالمی ادبیات۔ لیکن کسی نہ کسی کو دنیا کے ادبیات کی ایک جھلک تو دکھانی ہی تھی یہ کام اگر میرے ذریعے ہوگیا تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھ سکتا ہوں۔ ویسے میرا خیال ہے کہ سات جلدیں کیا اس کے لیے سات سو جلدیں بھی ناکافی ہوں گی۔ لیکن عالمی ادبیات سے محض اجمالاً متعارف کرانا ہی میرا مقصد تھا اور شاید میں اس مقصد میں کامیاب بھی ہوا ہوں۔

سوال: کیا آپ موجودہ دور میں لکھے جارہے فکشن سے مطمئن ہیں؟

جواب: دنیا کے ادب کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ شاعری کے علاوہ دوسری صنفیں ہمیشہ پیچھے پیچھے چلتی ہیں۔ شاید دنیا کی کوئی تاریخ ایسی نہ ہوگی جس میں شاعری کو دوئم درجہ دیا گیا ہو، چاہے کوئی دوسری صنف کتنی ہی ارتقا پذیر کیوں نہ ہوجائے۔ یعنی شاعری کی اہمیت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ مگر بیسویں صدی کے مسائل اس کا تقاضا کرتے تھے کہ فکشن کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔ اردو میں بھی یہی صورت ہے۔ دراصل آج کی پیچیدہ زندگی میں مسائل کی بھرمار ہے ان مسائل سے براہ راست فکشن نگار ہی ٹکراتا ہے۔ ایسے میں زندگی کے اہم مسائل کے ساتھ ساتھ اس کی ریزہ چینی بھی فکشن کے احاطے میں آ گئی ہے لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ چند کمیوں کے باوجود اردو فکشن نگاری کی روش ایسی ہے جس پر اطمینان کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔

سوال: تنقیدی سرگرمیوں سے متعلق آپ کا عام تاثر کیا ہے؟

جواب: آج کی تنقیدی سرگرمیاں مختلف جہتوں میں تقسیم ہوگئی ہیں، ایک طرف ترقی پسندی نے پھر زور پکڑا ہے۔ نئی ترقی پسندی کے حوالے سے کچھ لوگ اس تحریک میں نئی جان ڈالنا چاہتے ہیں۔ مابعد جدیدیت یہ کہتی ہے کہ بہت سے وہ پہلو جو ترقی پسندی کی میراث تھے وہ مابعد

جدیدیت کے رجحان کے مطابق تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ بہت سے مرکزی نکات میں درآئے ہیں۔ پھر جدیدیت کے بعض لوگ ہیں جو ہنوز کچھ امور پر زور دے رہے ہیں گویا آج کی تنقید کم از کم سہ سمتی ضرور ہوگئی ہے لیکن غالب حصہ وہی ہے جسے میں نے مابعد جدیدیت کا نام دیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ 1980 کے بعد کے لکھنے والے اپنی ذہنی آزادی پر زور دے رہے ہیں اور یہ احساس دلاتے ہیں کہ ان کی تخلیق کسی بھی تحریک سے متاثر نہیں اور وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں آزادانہ طور پر لکھ رہے ہیں لیکن ایسی تحریروں میں بھی بعض تحریکوں کے اثرات محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

سوال: آپ بڑی پابندی سے ''مباحثہ'' نکال رہے ہیں، کیا اس کی طویل عمر کی توقع کی جاسکتی ہے؟

جواب: میں ''مباحثہ'' سے متعلق یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں کوشش کروں گا کہ جو زندگی میری ہے اس کی بھی رہے۔ یہ میری خواہش ہے ویسے کیا ہوگا اللہ جانے۔

سوال: اردو کی موجودہ صورت حال سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: اردو کی موجودہ صورت حال پہلے سے مختلف نہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب تک وہ رویہ جو آزادی کے وقت ہندوستان میں اردو کے ساتھ روا رکھا گیا تھا وہ لازماً ختم نہیں ہوا۔ یوں تو ادارے بہت سے ہیں لیکن اکثر معطل ہیں، کارکردگی ناقص ہے۔ ایسا بھی ہے کہ آہستہ آہستہ ہندی کا غلبہ بڑھ رہا ہے، اردو گھرانوں میں خود اردو والے اپنے بچوں کو اردو پڑھانے سے تقریباً روک رہے ہیں۔ خصوصاً جن کا داخلہ انگریزی اسکولوں میں ہو جاتا ہے وہ زیادہ تر اپنے بچوں کو اردو سے الگ تھلگ رکھتے ہیں۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ مدرسے خصوصاً اسلامی مدرسوں میں چونکہ ذریعۂ تعلیم لازماً اردو ہے اس لیے وہاں سے جو بچے جیسے بھی نکل رہے ہیں ان کا رشتہ اردو سے قائم ہے۔ ایک بات اور ہے کہ کتابیں فروخت ہو رہی ہیں اس کے یہ معنی نہیں کہ اردو کے پڑھنے والوں کا حلقہ اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ نئی کتابوں کی کھپت زیادہ ہو گئی ہے۔ اشاعت کی سہولتوں نے نئی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے کو تیز کر دیا ہے۔ مجموعی طور پر اردو زبان کو زندہ رکھنے کے لیے خود اردو والوں کو زیادہ

سنجیدہ ہونا پڑے گا۔ اگر ہر گھر جس میں بچے یا جوان ہیں، میں ایک اردو رسالہ لازماً خریدا جائے تو صورت حال کچھ بدل سکتی ہے۔

سوال: کیا اردو صرف مراعات پر زندہ رہ سکتی ہے؟ یا اس کو آئینی تحفظ کی ضرورت ہے؟

جواب: مراعات بھی ملنی چاہیے اور آئینی تحفظ بھی اور خود اردو والوں کو بھی چوکس رہنا ہوگا۔

سوال: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، اردو داں طبقے کو ابھرتے ہوئے تکنیکی منظر نامے سے وابستہ کر رہی ہے اس ذیل میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: یہ اچھی بات ہے۔ اردو کی ترقی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ دوسرے علوم سے بھی اس کا رشتہ قائم کیا جائے، خصوصاً پروفیشنل کورسوں سے۔ اس سلسلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اقدامات مستحسن ہیں اور ان کی پذیرائی ہر حلقے میں ہو رہی ہے۔

سوال: فروغ اردو کے لیے قومی اردو کونسل کئی اسکیمیں بنا رہی ہے مثلاً کتاب میلہ، موبائل وین، بلک پرچیز وغیرہ کیا ان کوششوں سے آپ مطمئن ہیں؟

جواب: قومی اردو کونسل کی یہ تمام کوششیں اردو کے فروغ میں بے حد اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ قومی سطح پر یہ واحد ادارہ ہے جس کی کارکردگی نمایاں نظر آتی ہے۔ مذکورہ اسکیموں کے علاوہ زبان و ادب کی کتابوں کی اشاعت، مختلف اداروں کو مالی تعاون، اہم کتب کے ترجمے، سمینار، ورک شاپ اور مذاکروں کے انعقاد کے ذریعے قومی اردو کونسل مسلسل اردو کے ہمہ جہت فروغ کی کوششیں کر رہی ہے جو لائق صد تحسین ہے۔

سوال: ''اردو دنیا'' کے قارئین کو آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

جواب: اردو اخبارات و رسائل اور اردو زبان کے فروغ میں کسی بھی حد تک حصہ لینے کی کوشش کیجیے۔

•••

پروفیسر گوپی چند نارنگ سے کچھ سوال

اردو زبان، ادب اور تنقید کی روایتوں کے استحکام اور ارتقا سے پدم بھوشن پروفیسر گوپی چند نارنگ کا جو تعلق اور کمٹمنٹ ہے اس سے سبھی واقف ہیں۔ گزشتہ نصف صدی کے عرصے میں ان کے متعدد انٹرویو، مصاحبے اور ملاقاتوں پر مبنی مضامین برصغیر کے متعدد ادبی رسائل اور زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ بزرگ افسانہ نگار اور ادبی صحافی جناب نند کشور وکرم نے حال ہی میں ان سے اردو تنقید کے اہم معاملات پر جو انٹرویو کیا تھا یہاں اس کے کچھ اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔ اس انٹرویو سے قارئین کو نارنگ صاحب کی تخلیقی کاوشوں کے بارے میں بھی کچھ دل چسپ معلومات حاصل ہوں گی۔

سوال: ترقی پسند تحریک لگ بھگ پون صدی کے طویل عرصہ تک اردو ادب پر چھائی رہی مگر اُس کے بعد آنے والی تحریکیں جدیدیت، مابعد جدیت اور پس ساختیات وغیرہ میں سے کسی بھی تحریک کا دیرپا اثر نہیں ہوا۔ آخر کیوں؟

جواب: ترقی پسند تحریک کے اثرات کا زمانہ 1935 سے لگ بھگ 60-1955 تک ہے۔ اس کی بنیاد مارکسزم پر ہے لیکن زیادہ اثرات روس کے سوویت اشتراکی نظام کے حوالے سے تھے۔

ترقی پسند تحریک ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی ہم رکاب تھی جس کے نہایت گہرے اثرات ادب پر مرتب ہوئے اور ادب کی مقبولیت اور اثر پذیری میں اضافہ ہوا۔ سیاسی نوعیت کے سوال Quit India Movement کے زمانے ہی سے اٹھنے لگے تھے۔ ادیب کی ذہنی آزادی اور ادب کی نوعیت و ماہیت کے سوالات کا زمانہ بعد کا ہے۔ تاہم چونکہ ترقی پسندی کا ایجنڈا سماج کی فلاح و بہبود، عوام دوستی، انسان دوستی، anti imperialism اور anti colonialism پر مشتمل تھا اس ایجنڈے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ سوشلزم کی تعبیریں اور معنویتیں بدلتی رہی ہیں۔ اس سے مارکسیت کے عوام دوست جوہر کا رد لازم نہیں آتا۔ ادب اور پروپیگنڈے میں حدامتیاز قائم کرنے کے لیے جدیدیت نے آزادیِ فکر اور ادبی قدر کا سوال اٹھایا جو کم اہم نہیں ہے۔ لیکن alienation، بیگانگیت، داخلیت، ذات پرستی، اشکال پسندی، علامتیت اور ہیئت پرستی پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کی وجہ سے جدیدیت بھی بعد میں بطور تحریک بے اثر ہوتی چلی گئی۔ پھر بھی جدیدیت کا زمانہ وسط آٹھویں دہائی تک تو تسلیم کیا ہی جائے گا، ساتھ ہی یاد رہے کہ تحریکوں سے وابستہ لوگ بعد میں بھی رہتے ہیں۔ رہی پس ساختیات اور مابعد جدیدیت تو اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ دونوں سابقہ ادبی تحریکوں سے یکسر الگ ہیں۔ بنیادی طور پر ان کو تحریک سمجھنا ہی غلط ہے۔ پس ساختیات، ساختیات کے بعد کا فلسفہ ہے جس نے زبان و ادب کے علاوہ سماجی علوم کو بھی متاثر کیا۔ مابعد جدیدیت کئی ادبی فلسفوں کے مجموعے کا نام ہے اور اس کا بنیادی زور ہر طرح کے نظریے کا رد ہے کیونکہ ہر نظریہ بالآخر آمریت کا شکار ہو جاتا ہے۔ پس ساختیات اور مابعد جدیدیت میں زبان، معنی، زندگی، ذات، معاشرہ اور آئیڈیالوجی کے بارے میں بنیادی سوال اٹھائے گئے ہیں جن سے نہ صرف ادب کی دنیا بلکہ سماجی علوم اور فلسفہ بھی بنیادی طور پر متاثر ہوئے ہیں۔ معنی کی تکثیریت، یعنی معنی کا افتراقیت کا زائیدہ ہونا یا رد تشکیل، ثقافت کی مرکزیت، زبان، ادب، شعور انسانی یا شعریات، ان سب کا ثقافتی تشکیل ہونا، ادب کا کلی طور پر خودمختار یا خودکفیل نہ ہونا، بین المتونیت، تانیثیت اور سماجی سروکار کی لازمیت ایسی بصیرتیں ہیں جن سے اکثر ذی فہم ادیب استفادہ کرتے نظر آتے ہیں۔ روایتی

کاروبار چلتا ہی رہتا ہے لیکن یہ پس ساختیاتی مفکرین کی دین ہے کہ دنیا بھر کی زبانوں میں تنقید کی زبان اور رویے بدل گئے ہیں۔ آج ادب کی دنیا میں ادب اور آئیڈیالوجی کے دوطرفہ آزادانہ رشتے سے کوئی صاحبِ فہم انکار کرہی نہیں کرسکتا۔ ترقی پسندی فارمولے اور مینی فسٹو کی پابند تھی۔ مابعد جدیدیت کے زمانے میں ادیب اپنی اقداری اور آئیڈیولوجیکل ترجیح میں آزاد ہے لیکن اس کو معلوم ہے کہ بغیر اقداری اور آئیڈیولوجیکل ترجیح کے ادب ادب ہی نہیں خالی ہیئت ہے۔ جو چیز ہیئت کو معنی کی ادبی آنچ دیتی ہے وہ اس کا ثقافتی اور اقداری تشکیل ہونا ہے۔ ترقی پسندی ہو یا جدیدیت یا مابعد جدیدیت ہر فلسفہ کی ادب کو کچھ نہ کچھ دین ہے جس سے ادب مالا مال ہوتا ہے اور وہ معاصر تقاضوں کا ساتھ دینے کا اہل بنتا ہے۔ ادب دو اور دو چار کا کھیل نہیں، نہ ہی تحریکیں کلینڈر کے ساتھ بدل جاتی ہیں ان کے اثرات باقی رہتے ہیں۔

سوال: حامدی کاشمیری صاحب کا کہنا ہے کہ ہمارے ملک میں ساختیاتی تنقید کی تھیوریز گزشتہ دس پندرہ برسوں میں اس وقت متعارف ہوئیں جب 1993 میں گوپی چند نارنگ کی عہد ساز کتاب 'ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات' منظر عام پر آئی۔ کچھ محققین اسے درست نہیں مانتے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: جو درست نہیں مانتے انھوں نے ضرور کوئی دوسری کتاب لکھی ہوگی۔ کسی کے ماننے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔ فیصلہ زمانہ کرتا ہے۔ اس کتاب کے ابواب پر میں نے سنہ 1985 سے کام کرنا شروع کیا اور یہ ابواب وقتاً فوقتاً مختلف رسائل میں شائع بھی ہوتے رہے۔ میرا مقصد تھا کہ اردو میں ایک ڈسکورس بنے اور لوگ غور کریں۔ اس سے پہلے ہندوستان اور پاکستان میں اس نوع کی بحثیں عام نہ تھیں۔ میرا یہ بھی یقین ہے کہ اس نوع کی افہام وتفہیم ایک شخص سے نہیں ہوتی، اس میں دوسروں کی شرکت بھی ضروری ہے۔ دوسروں نے بھی بعد کو کتابیں لکھی ہیں۔ وقت ہر چیز کو خود طے کردیتا ہے۔ میرے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ حامدی صاحب نے یہی کہا ہے کہ جو چیز بنیادی نوعیت کی ہوگی اس پر بحث ہوگی، دوسری کتابیں بعد کی ہیں یا ان پر اتنی بحث نہیں ہوئی یا ان کو اتنی مرکزیت حاصل نہیں ہوئی۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ ساختیاتی تنقیدات کو اردو میں پیش کرنے والوں نے اسے ترجمہ یا اخذ و تلخیص کی صورت میں پیش کیا ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔

جواب: جب میں نے تھیوری پر کام کرنا شروع کیا چونکہ میری تربیت ساختیاتی لسانیات کی ہے، مجھے احساس تھا کہ فلسفے میں بنیادی ضرورت سائنسی معروضیت کی ہوتی ہے، میرے سامنے ایسے نمونے تھے جہاں لوگ بات تو فلسفے کی کرتے ہیں لیکن جلد تخئیل کے پروں سے اڑنے لگتے ہیں۔ بہت سے اصل متن سے زیادہ خود کو نمایاں کرنے میں لگ جاتے ہیں یا پھر اپنے اسلوب کا شکار ہو کر انشائیہ لکھنے لگتے ہیں۔ ایک تو اصطلاحیں نہیں تھیں دوسرے نئے فلسفیوں کا انداز ایسا پیچیدہ، معنی سے لبریز اور گنجلک ہے کہ اُسے سائنسی معروضی صحت کے ساتھ قاری تک منتقل کرنا زبردست مسئلہ ہے۔ اصل متن کی preciseness اور زور و صلابت Rigour بنائے رکھنے کے لیے بے حد ضروری ہے کہ افہام و تفہیم میں ہر ممکن وسیلے سے مدد لی جائے اور فلسفے کے ڈسپلن کی رو سے تخئیل کی رنگ آمیزی سے اور موضوعی خیال بافی سے ممکنہ حد تک بچا جائے۔ میری کتاب کے شروع کے دونوں حصے تشریحی نوعیت کے ہیں۔ مشرقی شعریات اور اختتام والے حصوں کی نوعیت بالکل دوسری ہے۔ نئے فلسفیوں اور اُن کے نظریوں اور اُن کی بصیرتوں کی افہام و تفہیم میں، میں نے اخذ و قبول سے بے دھڑک مدد لی ہے۔ جہاں ضروری تھا وہاں تلخیص اور ترجمہ بھی کیا ہے۔ بات کا زور بنائے رکھنے کے لیے اصل کے quotations بھی جگہ جگہ دینے پڑے تاکہ فلسفیانہ نکتہ یا بصیرت پوری قوت سے اردو قاری تک منتقل ہو سکے۔ ہر حصے کے ساتھ اُس کے جملہ مآخذ اور کتب حوالہ کی فہرست دی ہے اور جن کتابوں سے نسبتاً زیادہ استفادہ کیا ہے یا جن سے زیادہ مدد لی ہے، مآخذ کی فہرست میں ان ناموں پر اسٹار (*) کا نشان بنا دیا ہے۔ واضح رہے خیالات سوسیئر، لیوی سٹراس، رومن جیکب سن، لاکاں، دریدا، بارتھ، فوکو، کرسٹیوا، شکلووسکی، باختن وغیرہ کے ہیں، میرے نہیں۔ اسی لیے کتاب کا انتساب ان سب فلسفیوں اور مفکروں کے نام ہے جن کے خیالات پر کتاب مشتمل ہے۔ اس امر کی وضاحت دیباچے میں کر دی گئی ہے کہ ''خیالات اور نظریات فلسفیوں کے ہیں افہام و تفہیم اور زبان میری ہے۔'' اِن فلسفیوں کو

سمجھنا اور اُنھیں اردو میں لے آنا اور اردو میں اس طرح لے آنا کہ دوسرے بھی اس افہام و تفہیم میں شریک ہوسکیں اور جن کو اشتیاق ہو وہ چاہیں تو اصل سے بھی رجوع ہوں اور ان بصیرتوں سے آگاہ ہوسکیں، میرے لیے مفکرین کی معروضی افہام و تفہیم بہت بڑا چیلنج تھا۔ میں اس سے عہدہ برآ ہو بھی سکا یا نہیں یا اردو میں کسی دوسری کتاب یا کسی دوسرے نے یہ تاریخی ضرورت پوری کی، اس پر مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ جدیدیت کی تحریک نے ادیبوں کو بھٹکایا تھا جیسا کہ بہت سے ادیبوں نے بعد ازاں اس کا اعتراف کیا ہے...

جواب: جدیدیت بھی اپنے زمانے میں وقت کی آواز تھی۔ ادب اور سیاست میں رشتہ ہے لیکن ادب یکسر سیاست کے تابع بھی نہیں۔ جب ذہنی آزادی پر قدغن لگائی جانے لگی اور ادب میں کلیت پسندی، نعرے بازی اور پروپیگنڈہ کی لَے بہت بڑھ گئی یا ادب کی ادبیت پر اصرار کرنے والوں کو رجعت پسند یا ظلمت شعار کہہ کر ان کا بائیکاٹ کیا جانے لگا تو ادیب کی ذہنی آزادی اور ادب کی ادبیت کا تحفظ وقت کی ضرورت بن گیا۔ سیاسی آمریت اور کلیت پسندی کے خلاف آواز اٹھانا بھی ادب کا بنیادی کردار ہے بالکل جس طرح سماجی بے انصافی کے خلاف آواز اٹھانا ادب کا کردار ہے۔ تحریکیں جب انتہاپسندی کا شکار ہو جاتی ہیں تو خود اپنے ہی ہتھیاروں سے خودکشی کرتی ہیں...ادب میں عمل ور دعمل و عمل ور دعمل کا سلسلہ چلتا رہتا ہے...

سوال: ہمارے ہاں جتنی بھی تھیوریز پیش کی گئی ہیں وہ سب غیر ممالک کی دین ہیں۔ کیا ہمارے ملک کے مفکروں اور فلاسفروں کی کوئی تھیوری نہیں ہے جنھیں ہم پیش کر سکیں؟

جواب: یاد رہے کہ علم کی سرحدیں نہیں ہوتیں، علم عالمِ انسانیت کی جاگیر ہے۔ مارکس ہر چند کہ جرمن تھا لیکن مارکسیت سے ساری دنیا نے استفادہ کیا۔ فلسفہ کہیں کا ہو ہم اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ اپنا ثقافتی تشخص اور اپنی پہچان نہ کھو دیں۔ یہی معاملہ سائنٹفک دریافتوں کا ہے جن سے دنیا بھر میں استفادہ کیا جاتا ہے بغیر سوچے کہ کون سی دریافت کہاں کی ہے۔ فلسفۂ لسان اور فلسفۂ ادب کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ البتہ

مغرب کی اجارہ داری غلط ہے۔ فلسفۂ لسان میں پاننی اور بھرتری ہری کی خدمات کو صدیوں تک نظرانداز کیا گیا۔ اب کہیں جا کر کچھ اعتراف ہونے لگا ہے۔ ایڈورڈ سعید کو مغرب کی اس بات پر سخت اعتراض تھا کہ مغرب نے Orientalism کو اپنا 'غیر' بنا کر مشرق کو ہمیشہ ثقافتی طور پر حقیر سمجھا اور دبا کر رکھا جو سخت غلط ہے۔ سیاسی غلامی سے ثقافتی غلامی کم خطرناک نہیں۔ ادھر چونکہ ہم کولونیل دور سے باہر نکلے ہیں احتیاط کی ضرورت ہے۔ مگر یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ ادھر مشرق میں اور یجنل فکر بہت کم ہے ورنہ علامہ اقبال کو کیوں کہنا پڑتا 'چار سو سال سے مشرق کے ہیں مے خانے بند' عہد وسطیٰ میں بشمول سنسکرت Breakthrough قسم کی فکر بہت کم ہے البتہ حواشی پر حواشی اور بھاشیہ پر بھاشیہ لکھے جاتے رہے ہیں۔ مگر ماضی بعید میں مشرق میں قدیم فلسفے کی بنیادیں (بشمول فلسفۂ لسان وفلسفۂ ادب) اس وقت رکھی گئیں جب مغرب میں مکمل تاریکی تھی۔ ماضی کے قدیم مشرقی علوم اور مشرقی شعریات کی زبردست اہمیت ہے۔ میری کتاب 'ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات' کا تقریباً ایک تہائی حصہ اسی لیے مشرقی شعریات اور ماضی کی اسی مشرقی فکریات سے بحث کرتا ہے کیونکہ ہم اپنی جڑوں کو خود نظرانداز کرتے رہے ہیں۔ میں نے اپنے حقیر طریقے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سوسیئر نے مغرب میں اپنے فلسفۂ لسان کی ترغیب ذہنی سنسکرت کے فلسفۂ لسان سے حاصل کی۔ اسی طرح دریدا کا افتراقیت کا فلسفہ بہت کچھ دن ناگا اور ناگارجن کے 'شُنیتا' سے یا بدھ ازم کی سچائی در سچائی کے فلسفے سے ملتا جلتا ہے۔ ایڈورڈ سعید نے بحث کی ہے کہ بعض اندلسی عرب مفکرین اپنے وقت میں مغرب کے ماہرین لسانیات سے آگے تھے۔

سوال: پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر محمد حسن ہی نہیں بلکہ اردو میں اکثر ادیبوں ونقادوں نے کبھی نہ کبھی شاعری ضرور کی ہے اور بہت کم ایسے ہوں گے جنھوں نے ایک آدھ شعر نہ کہا ہو۔ آپ کی کبھی کوئی منظوم تخلیق نظر سے نہیں گزری مگر میں نے ایک بار اخبار میں پڑھا تھا کہ شروع شروع میں جب آپ امریکہ کنیڈا گئے تھے تو آپ نے کچھ اشعار سنائے تھے، کیا یہ صحیح ہے؟

جواب: آل احمد سرور باقاعدہ شاعر تھے۔ ان کے ایک دو نہیں کم سے کم تین مجموعے منظر عام پر

آئے۔ وہ آخر تک شعر کہتے رہے۔ اگر چہ ان کی شاعری زیادہ تر روایتی اور کلاسیکی ہے۔ محمد حسن نے کچھ نثری نظمیں لکھیں لیکن شاید منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے۔ مجھ سے بھی کبھی کبھار یہ گناہ سرزد ہوا ہے۔ بعض اوقات بغیر کوشش کے بھی شعر ہو جاتے ہیں۔ دراصل مجھے شروع ہی سے میرے استادِ مکرم خواجہ احمد فاروقی نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ روایتی شاعری ستا نشہ ہے۔ تنقید و تحقیق کے میدان میں کام کرنے والے کو سستے نشے سے بچنا چاہیے۔ چنانچہ اگر کبھی کچھ کہا بھی تو اس پر زیادہ توجہ نہیں کی۔ کہنے کو تو میں نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ البتہ دلی کالج میں داخلہ لینے سے پہلے بلوچستان کے زمانے سے میں افسانہ نگاری کیا کرتا تھا۔ اسکول ہی کے زمانے سے لکھنے لکھانے کا شوق تھا۔ کوئٹہ سے ایک اردو ہفتہ وار نکلا کرتا تھا 'بلوچستان سماچار'، اس میں 1946 سے پہلے میری دو تین کچی پکی کہانیاں شائع ہوئی تھیں۔ دہلی آنے کے بعد 'بیسویں صدی' اور ہفتہ وار 'ریاست' کا بہت غلغلہ تھا۔ دیوان سنگھ مفتون اور خوشتر گرامی کے کہنے پر ان رسائل و جرائد میں بھی میرے کچھ افسانے شائع ہوئے لیکن خواجہ احمد فاروقی کے زیرِ تربیت آنے کے بعد رفتہ رفتہ یہ شوق اپنے آپ پسِ پشت چلا گیا، ایسے کاغذات کو میں نے سنبھال کر بھی نہیں رکھا۔

سوال: حصولِ آزادی کے بعد اخبارات و رسائل میں، بہت سے غیر مسلم ادبا و شعرا کا نام نظر آتا تھا اور اب صورتِ حال یہ ہوگئی ہے کہ صرف کبھی کبھار ایک آدھ نام نظر آتا ہے جس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دس سال بعد تو کبھی کبھار ہی کسی غیر مسلم کا نام نظر آئے گا۔ کیا اس طرح یہ 'گنگا جمنی' زبان بنی رہے گی یا صرف مسلمانوں کی زبان بن کر رہ جائے گی؟

جواب: اردو 'گنگا جمنی' زبان ہے اور رہے گی۔ جو صورتِ حال اس وقت نظر آتی ہے وہ دو قومی نظریے کی غلط سیاسی تعبیر کے تخریبی پہلو کا افسوسناک نتیجہ ہے۔ زبانوں کو مذہب سے جوڑنا غلط ہے۔ زبانوں کا مذہب نہیں ہوتا معاشرہ ہوتا ہے۔ اردو ہندوستان کی زبان ہے، ہند آریائی زبان ہے۔ اس کی جڑ بنیاد، کھڑی بولی ہے جو اپ بھرنش ہے اور جو پراکرتوں سے نکلی ہے، گویا اردو اصل کے اعتبار سے 'انڈک' ہے البتہ اس نے عربی فارسی اور اسلامی اثرات قبول کیے ہیں، کشمیری، سندھی اور پنجابی کی طرح۔ یہ اثرات اردو کا

طرۂ امتیاز ہیں۔ جب ہم 'گنگا جمنی' زبان کہتے ہیں تو اس سے مراد یہی لسانی اور تہذیبی پیوند کاری ہے۔ اردو اسی لسانی اور تہذیبی پیوند کاری اور امتزاج سے وجود میں آئی ہے۔ یہ قوس قزح کی رنگوں کی طرح ہے جو مل کر ایک رنگ بن جاتے ہیں۔ کسی غیر مسلم کے رہنے یا نہ رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، زبانیں اپنے مزاج سے پنپتی اور پروان چڑھتی ہیں۔ اردو کو بٹوارے کے بعد ہندوستان میں شدید حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جو ثقافت کے مرکزی سوال سے جڑے ہوئے ہیں۔ کیا ہندوستان مستقبل میں یک رنگی سماج بنے گا یا تکثیری راستے پر چلتا رہے گا۔ یہ وہ سوال ہے جس نے تہذیبی کرائسس کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہ سوال پاکستان میں نہ ہو ایسا بھی نہیں ہے۔ وہاں تو اردو کا معاشرہ یک مذہبی ہے، لیکن جس طرح ہندوستان میں تکثیری سماج کو فاشزم سے خطرہ ہے اسی طرح پاکستان میں وہاں کی علاقائی اور مسلکی تکثیریت کو بنیاد پرستی سے خطرہ ہے۔ بہر حال آگے چل کر اگر ہندوستان سچی جمہوریت کے راستے پر چلتا ہے اور تکثیری سماج کے تصور کو بالادستی حاصل ہوتی ہے تو اردو کی امتزاجی اور گنگا جمنی نوعیت مستقبل کے غیر مسلموں کے لیے بھی باعث کشش بنی رہے گی اور وہ اردو جیسی خوبصورت زبان کی طرف کھنچتے رہیں گے ورنہ اردو کا نقصان تو ہوگا ہندوستانی ثقافت کا بھی نقصان ہوگا۔ قوموں کی تاریخ میں ایک آدھ صدی سے مسائل طے نہیں ہو جاتے۔ میں دعا ہی کر سکتا ہوں کہ آج کی افسوسناک صورت حال آگے بھی بنی رہے ایسا نہ ہو۔

سوال: آپ کی تاریخ ولادت 11 فروری 1931 ہے جو غالباً اسکول کے رجسٹر کے اندراج کے مطابق ہے لیکن آپ کا سنہ ولادت جیسا کہ آپ نے ایک بار بتایا تھا کہ یہ ایک سال کم لکھا ہوا ہے۔ ازراہ کرم بتائیے کہ آپ کی اصل تاریخ ولادت کیا ہے اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں عموماً ہر ہندو گھرانے میں ٹیوایا جنم پتری بنوائی جاتی ہے۔ لہٰذا اگر ہے تو اس کے مطابق تاریخ کیا ہے؟

جواب: آپ کا خیال صحیح ہے۔ جنم پتری کی رو سے یہ تاریخ ایک سال کم لکھی ہوئی ہے، یعنی اصل تاریخ ولادت 11 فروری 1930 ہے۔

سوال: پروفیسر گیان چند جین کی کتاب 'ایک بھاشا دولکھاوٹ دوادب' کونشانہ بنا کر جس طرح سے اخبارات ورسائل میں بحث ومباحثہ کیا گیا ہے اس میں زیادہ تر نقادومعترضین نے ادبی اور تحقیقی بحث ومباحثہ کے بجائے اس کوفرقہ واریت کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔آپ کیا سمجھتے ہیں؟

جواب: میں فرقہ واریت کوسب سے بڑی لعنت سمجھتا ہوں اور اس کی ہرممکن مذمت کرتا ہوں۔ افسوس کہ اب جین صاحب بھی نہیں رہے۔اس کتاب کے بارے میں میں نے اپنی رائے بالوضاحت 'نیاورق' ممبئی، شمارہ 25 میں لکھ دی ہے، اس کو وہاں دیکھا جاسکتا ہے۔

سوال: آپ اردوادب میں محقق، ماہرِ لسانیات، نقاداور بھی بہت کچھ ہیں، اگر آپ کو ان میں سے کسی ایک کوترجیح دینی ہوتو آپ کسے دیں گے؟

جواب: میں ترجیح دینے والا کون ہوتا ہوں۔ بیشک مختلف زمانوں میں میری دلچسپیاں مختلف رہی ہیں۔ میں کہا کرتا ہوں کہ جب معشوق مجموعۂ خوبی ہوتو اس کی ہرادادل کوکھینچتی ہے کہ جا این جا است۔ پچاس پچپن سال کے ادبی سفر میں مجھ سے جو کچھ ہوسکا میں کرتا رہا ہوں۔ ان میں کون سا کام اہم ہے، کون سا غیراہم، یہ وقت طے کرے گا۔ فقط اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے جو کچھ بھی کیا پورے خلوص، لگن اور دلسوزی سے کیا اور اپنی باطنی تڑپ، تجسس اور جستجو کے لیے کیا، کسی خارجی ضرورت کے لیے نہیں۔

•••

شمس الرحمٰن فاروقی سے گفتگو

شمس الرحمٰن فاروقی اردو زبان و ادب کی ان گنی چنی اہم شخصیتوں میں ایک ہیں جن کا نام ہی ان کا تعارف ہے۔ یہ نام لیتے ہی ادب کی پوری ایک تاریخ سامنے آ جاتی ہے جو اردو ادب میں جدیدیت کی تحریک کے نام سے معروف ہے۔ وہ نقاد بھی ہیں اور تخلیق کار بھی۔ معروف نقاد عزیزہ بانو نے فاروقی صاحب کے ساتھ ان کے فن اور شخصیت کے تعلق سے کئی نشستوں میں کی گئی طویل گفتگو ریکارڈ کی ہے۔ پیش ہیں اس ریکارڈنگ کے اہم اقتباس۔

سوال: آپ نے جس دور میں اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا، وہ کیسا دور تھا اور آپ کے گرد و پیش کا کیا ماحول تھا؟

جواب: میرے بچپن کے زمانے میں تین چیزیں جن کا اب تک مجھے بہت صاف تاثر ہے، ایک تو گھر کے اندر اور دو گھر کے باہر۔ جنگ آزادی اس وقت بہت سرگرم تھی۔ دو چیزیں مجھے خوب یاد ہیں ایک تو سن 1942 بہت اچھی طرح یاد ہے اور مہاتما گاندھی کا کوئٹ انڈیا موومنٹ (Quit India Movement) اور میرے ضلع اعظم گڈھ میں انگریزوں نے بہت ظلم کیا، مجھے وہ سب یاد ہے۔ لوگ آ کر میرے باپ کے پاس بتایا کرتے تھے کہ

فلاں کا گھر جلا دیا گیا فلاں پر ظلم کیا گیا۔ دوسری چیز مجھے Second World War یاد ہے۔ اور خاص کر ہٹلر کے بارے میں جو باتیں سنائی دیتی تھیں اور پڑھنے میں آتی تھیں وہ سب یاد ہے۔ یہ دو چیزیں جو گھر کے باہر کے ماحول میں تھیں۔ چوں کہ میرے ننھیال میں سب لوگ مسلم لیگ کے تھے اور ددھیال میں زیادہ تر لوگ جمیعت العلمائے اسلام یعنی کانگریس کے ساتھ تھے۔ دونوں طرح کے لوگوں کی باتیں سننے کو ملتی تھیں۔ گھر کے اندر ایک تو میرے اپنے گھر میں شاعری وغیرہ کا کوئی خاص ماحول، یعنی کوئی شاعر وغیرہ تو تھا نہیں جیسا کہ ہوتا تھا عام طور پر کہ پرانے زمانے میں شریف گھرانوں میں، کیا ہندو کیا مسلمان، تھوڑی بہت دلچسپی سبھی کو ادب سے ہوتی تھی۔ اس میں کچھ لوگ شعر گوئی بھی کر لیتے تھے۔ دادا میرے کبھی کبھی تھوڑا بہت کچھ کہہ لیتے تھے کوئی چیز۔ ننھیال کے ماحول میں زیادہ تر فارسی کے بڑے بڑے استاد تھے، میرے پرنانا تھے جو کہ اردو اور فارسی کے بڑے اچھے شاعر تھے۔ تو دونوں گھرانوں میں ادب کا، علم کا، مذہب کا چرچا ہر وقت رہتا تھا۔ اگر چہ زور اس زمانے میں اس پر ہو گیا تھا کہ دنیاوی ترقی حاصل کرنا ضروری ہے۔ دنیا میں ترقی کرو، جیسے کہ اپنے خاندانی حالات بہتر بناؤ، نام روشن کرو اپنے گھر والوں کا اپنے خاندان والوں کا، کوئی کام ایسا نہ کرو جو کہ تمہارے خاندان کے لیے شرم کا باعث ہو، جھوٹ نہ بولو.....زیادہ زور ان سب باتوں پر تھا۔ نماز پر دونوں طرف ددھیال اور ننھیال میں زور تھا۔ لیکن دونوں طرف متضاد لوگ تھے۔ ننھیال کے لوگ جیسا کہ میں نے آپ سے کہا کہ مسلم لیگی تھے۔ نانا میرے مسلم لیگ کے بہت بڑے لیڈر تھے۔ 1925 کے الیکشن میں وہ MLA بھی ہو گئے تھے۔ اور بڑے بڑے لوگوں سے ظاہر ہے کہ ان کی جان پہچان تھی اور سب لوگ بریلوی تھے۔ ہمارے دادا کے گھر میں سب لوگ دیوبندی تھے۔ اور جو لوگ سیاسی رجحان رکھتے تھے وہ جمیعت العلما کی طرف تھے۔ علم و ادب کا دونوں طرف چرچا تھا دونوں طرف ذکر تھا شاعری کا شعر پڑھنے کا، شعر سنانے کا۔ تو اس طرح سے دونوں چیزیں میں نے ایک ساتھ دیکھی تھیں۔ سیاسی سرگرمیاں بھی، سیاسی ماحول بھی۔ میں خود بھی اپنے زمانے کے عام بچوں کے مقابلے میں زیادہ باخبر تھا اس لیے مجھے 9 اگست 1942 بہت ٹھیک سے یاد ہے۔ اس

وقت میری عمر 7 سال کی تھی، یا ایک آدھ مہینہ کم رہی ہوگی۔ میرے باپ بنارس سے جہاں میرا ننیہال تھا گھبرا کر چلے لیکن اعظم گڑھ پہنچے نہیں۔ پہنچنے میں دیر لگی تو یہ سب مجھے یاد ہے۔ جب سب ہنگامہ ٹھنڈا ہو گیا تو کئی لوگ میرے باپ کے پاس آیا کرتے تھے اور یہ بتاتے تھے کہ فلاں گاؤں میں یہ ظلم ہوا، فلاں گاؤں میں یہ زیادتی ہوئی۔ اس طرح سے انگریزوں کے خلاف، سامراج کے خلاف، حاکمیت کے خلاف، غیر ملکی حاکمیت کے خلاف میرے دل میں ہمیشہ جذبہ رہا۔ ادب سے محبت، ادب سے لگاؤ، علم سے لگاؤ، اور اس بات پر زور کہ کوئی ایسا کام نہ کرو کہ جس سے تمہارے خاندان پر یا تمہارے بزرگوں پر کوئی حرف آئے۔ پڑھنے لکھنے میں اگر کمزور بھی ہوں تو یہ نہیں تھا کہ آپ نقل کر لیں گے، یا یہ کہ آپ کھیل کود میں وقت گذار دیں گے۔ بچپن میں میں نے کوئی کھیل کھیلا ہی نہیں بالکل۔ ادب کا ماحول یہ تھا کہ جب میں تھوڑا بڑا ہوا سات آٹھ برس کی عمر کا تو مجھے شعر کہنے کا لکھنے کا اتنا شوق تھا کہ میں نے اپنی طرف سے چھوٹا سا پرچہ 'گلستاں' نام کا نکالنا شروع کیا۔ نکالنے کے معنی یہ ہیں کہ پرانی کاپی کے خالی کاغذ نکال کر کاٹا کوٹا باندھ لیا اور گلستاں کا نام لکھ دیا۔ اور جیسے بھی ٹوٹے پھوٹے اشعار ہوتے یا کچھ افسانے ہوتے تھے۔ میری بڑی بہن جو پاکستان میں ہیں، ہم لوگوں میں سب سے بڑی اور بہت پیاری، وہ بھی کچھ نہ کچھ لکھتی تھیں۔ زہرہ ان کا نام ہے۔ آٹھ دس سال کی عمر میں یہ سب ہوتا تھا۔ کوئی ضروری نہیں تھا کہ پرچہ ہر ماہ نکلے۔ کبھی نکالا کبھی نہیں نکالا۔ ادب کے ماحول میں ہمارے یہاں گھر میں ایک تو اقبال کا بہت زور تھا میرے باپ اقبال کو بہت پڑھتے تھے اور اقبال کا ذکر کرتے تھے۔ ادب کی بڑی ہی دھوم تھی۔ کرشن چندر، احتشام حسین، سردار جعفری، بیدی ان سب لوگوں کا نام ہمارے کانوں میں روزانہ پڑتا تھا۔ احتشام صاحب میرے اسکول میں بھی آئے تھے۔ مجھے سب یاد ہے کہ جس شوق اور جس اشتیاق سے میرے باپ نے مجھ سے کہا کہ احتشام صاحب تمہارے اسکول میں آرہے ہیں تم ضرور سننے جانا کہ وہ کیا تقریر کریں گے۔ حالاں کہ کوئی خاص یہ نہیں کہ ترقی پسند رہے ہوں یا یہ کہ کوئی سیاسی یا ادبی مسلک رہا ہو بس یہ کہ وہ ادب کے بڑے آدمی ہیں۔ اس لیے اُن کو اور مجھ کو بھی ان سے دلچسپی تھی۔ ترقی پسند تحریک بڑی گرمی پر تھی۔ سبھی لوگ ہمارے

جانے ہوئے پہچانے ہوئے تھے۔ ساحر صاحب کا بہت سا کلام مجھے زبانی یاد تھا۔ ہمارے نانیہال میں مشاعرے ہوتے تھے کبھی کبھی تو میں بھی ان میں بیٹھتا تھا۔ وہاں کے جو بڑے نام تھے وہ بھی ہمارے کان میں پڑتے تھے، جوش صاحب، فراق صاحب، حفیظ جالندھری وغیرہ یہ سب تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ دنیا بہت بڑی اور بہت سے امکانات سے بھری پڑی ہے۔ مصروف دنیا ہے۔ مصروف اس لیے کہ اسکول جانا پڑتا ہے پڑھنا پڑتا ہے۔ انگریزی فارسی اور اردو کے علاوہ کچھ نہیں آتا تھا ہر چیز میں زیرو تھا۔ بس امتحان پاس کرنے کے لیے پڑھ لیا کرتا تھا۔ دسویں کے بعد اردو اور فارسی چھوٹ گئی۔ پھر گھر میں بیٹھ کر پڑھ لیتے تھے۔ لکھنے کا شوق کچھ ٹوٹا پھوٹا کہنے کا شوق، شعر کے ساتھ افسانہ لکھنے کا شوق۔ امکانات کی بہت وسعت تھی میرے سامنے۔ کچھ کرنا ہے کچھ کر کے دکھانا ہے۔ میرے باپ اور نانا دونوں اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ تمھیں کچھ کرنا ہے کہ تمھارے خاندان کا نام روشن ہو۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاید یہ کچھ قابل ہو یا وہ یوں ہی کہتے ہوں گے مجھے نہیں معلوم کہ ان کے کہنے کی وجہ کیا تھی۔ زیادہ تر تو وہ مجھے ڈانٹتے ہی رہتے تھے کہ تم نالائق ہو پڑھتے نہیں ہو یا یہ کہ دیر میں سو کر اٹھتے ہو اپنی چیزوں کو ٹھیک کرنا چاہیے۔ اب وہ کیوں کہتے تھے ان کے خیال میں میرے کچھ ہونہار پن کے آثار بچپن میں ہی تھے پتہ نہیں لیکن وہ یہ سب کہتے ضرور تھے۔ اور دونوں طرف کے لوگ کہتے تھے۔ اس وجہ سے میرے دل میں بھی جوش تھا کہ مجھے کچھ کر کے دکھانا ہے اور کوشش یہی کرتا تھا کہ جس میدان میں ہمارے گھر کے تمام لوگ نمایاں ہیں اور رہے ہیں اسی ادب کے علم کے میدان کو اختیار کیا جائے۔

سوال: آپ نے اپنے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے ہی کیوں کیا؟

جواب: شاعری سے ہی کیوں کیا؟ کیا بتاؤں؟ ایسا ہے کہ شعر کہنے کے لیے نہ تو قلم چاہیے نہ کاغذ بس لیٹے لیٹے شعر کہہ لو۔ اس میں آسان پڑتا ہے۔ اور کسی کو دکھانا نہیں پڑتا۔ لکھا ہوا کوئی دیکھ لے گا تو ڈانٹے گا کہ تم کیا بکواس کر رہے ہو افسانہ لکھ رہے ہو۔ تو شعر وغیرہ بچپن میں میں نے کہا۔ بہت سے لوگوں کو معلوم ہوگا کہ بچپن میں سات برس کی عمر میں میں نے جو پہلا مصرع کہا تھا وہ یہ تھا... معلوم کیا کسی کو مرا حالِ زار ہے... تو اس میں کوئی وجہ نہیں تھی کہ مجھے

شاعری ہی کرنی ہے۔ صرف یہ کہ کچھ کہنا ہے کچھ دل کا حال بیان کرنا ہے۔ جو گذر رہی ہے، جو دیکھ رہے ہیں اور یہ کہ جو عہد اور گھر کا ماحول ہے اس سے متاثر ہوئے اور اپنے تاثرات کو بیان کیا۔ چاہے وہ افسانہ ہو چاہے شاعری ہو۔

سوال: شاعری آپ کے نزدیک اس وقت سب سے آسان لگتی تھی اس لیے آپ نے ایسا کیا؟

جواب: آسان لگتی تھی۔ نہ کاغذ نہ قلم بیٹھے بیٹھے لکھ دو۔ بنیادی بات یہ تھی کہ میرے گھر میں دونوں طرف اظہار پر بڑا زور تھا کہ اپنے جذبات کا اظہار کیجیے۔ اس بات کی بڑی اہمیت تھی کہ آدمی اپنے خیالات کو ادا کرنے پر قادر ہو۔ اس لیے مجھے بھی یہ لگا کہ آسان کام یہی ہے کہ شاعری شروع کر دیجیے۔

سوال: آخر کیا وجہ ہوئی، یا کون سی ایسی بات ہوئی جس نے آپ کو اتنا متاثر کیا کہ آپ نے شاعری کے ساتھ فکشن میں بھی طبع آزمائی کی؟

جواب: کوئی تاثر نہیں، گھر کا ماحول ایسا تھا۔ ہمارے ایک چچا زاد بھائی افسانہ لکھتے تھے۔ ابھی ان کا ایک مجموعہ ان کے بیٹے نے چھپوا دیا ہے وہ بھی اچھے خاصے تھے لیکن ان کا وہی لیول تھا کہ بیسویں صدی اور اسی طرح کے دوسرے رسالوں میں چھپتے تھے۔ افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ شعر بھی کہتے تھے۔ میرے لیے اس میں کوئی فرق نہیں تھا کہ افسانہ نگار بنوں کہ شاعر بنوں کہ نقاد بنوں۔ نقادی میں بھی اسی زمانہ میں، میں نے جھک مارنی شروع کر دی تھی کہ شعر کو کیسے سمجھا جائے۔ اعظم گڑھ ہم لوگوں نے سن 48-1947 میں چھوڑا ہے گیارہ بارہ برس کی عمر میں۔ مجھے یاد ہے میں نے اس سے پہلے ایک مضمون لکھا تھا جس میں مومن کی شاعری کی خصوصیت معاملہ بندی ہے، غالب کی خصوصیت نازک خیالی ہے لکھا۔ یہ سب میرے پلے ہی نہیں پڑا بس میں نے لکھ دیا۔ لوگوں نے اور میرے بڑے باپ (تایا ابا) نے تعریف کی کہ ہاں صحیح لکھا ہے لیکن فکر یہ تھی کہ یہ ہے کیا بلا؟ نازک خیالی کسے کہتے ہیں؟ معاملہ بندی کیا ہوتی ہے؟ اس کو سمجھانے کے لیے تنقید بھی پڑھنا چاہیے اور لکھنا چاہیے۔ تو اس طرح مجھے تنقید لکھنا، افسانہ لکھنا، شعر کہنا الگ الگ کام نہیں معلوم ہوتے تھے۔ میرے لیے الگ نہیں تھا کہ میں کسی ایک میدان کو چھوڑ کر دوسرے میدان میں جا رہا ہوں۔ ہاں یہ

ضرور ہے کہ جب میں تھوڑا بڑا ہوا تو میں نے شاعری تقریباً چھوڑ دی۔ تنقید نے اور افسانے نے مجھے دیر تک مصروف رکھا۔ چھوٹا موٹا ایک ناول بھی لکھا جو کہ اب میں بھول چکا ہوں اور تمنا کرتا ہوں کہ لوگ بھی اسے بھول جائیں۔ خیر وہ اب چھپ بھی گیا ہے۔ اس سے پہلے میرٹھ سے معیار نام سے نکلنے والے پرچے میں یہ ناول چار قسطوں میں چھپ چکا تھا۔ بہر حال بنیادی بات یہ ہے کہ ادب میں کچھ کرنا چاہیے۔ اس پر کوئی پابندی نہیں ہے کہ آپ افسانہ نگار بنیں کہ نقاد بنیں کہ شاعر بنیں۔ آج کل کے زمانے میں شاید اس بات پر زور ہو گیا ہے کہ اپنے لیے ایک میدان اختیار کیا جائے۔ اور اس میں ہی طبع آزمائی کی جائے۔

سوال: اردو ادب میں شعری ادب کا کیا مقام ہے؟ کیا آج بھی شاعری کو ہی اردو ادب کہیں گے؟

جواب: نہیں، پہلے بھی نہیں کہتے تھے آج بھی نہیں کہیں گے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہمارے ادب میں شاعری کا حصہ زیادہ ہے۔ اس کی وجہ صاف ہے کہ لوگوں کو سمجھانے کے لیے، لوگوں تک اپنی بات پہنچانے کے لیے، اظہار خیال کے لیے آسان سمجھی جاتی ہے۔ تمام دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ شعر پہلے وجود میں آتا ہے۔ عام طور پر شاعری کا چلن زیادہ ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ نثر کی طرف بات بڑھتی ہے۔ ہمارے یہاں بھی ایسا ہی ہوا لیکن ایسا نہیں ہے کہ صرف شاعری ہی شاعری ہے۔ اب تو نثر بھی بہت ہے۔ پچھلے تین چار سو برس سے دکنی میں بہت نثر لکھی گئی۔ دلی کے آس پاس اور شمال کی طرف تو 1740 سے نثر لکھنا شروع ہو گئی۔ لوگ نثر لکھتے رہے۔ کچھ نہیں تو دو ڈھائی تین سو برس سے زیادہ کی تاریخ تو شمال کی ہے۔ اور کم سے کم چار سو برس سے زیادہ کی تاریخ دکن میں ہے۔ تو ایسا نہیں ہے کہ ہم نے شاعری کی اور نثر کو نظر انداز کیا ہو۔ نثر بھی لکھتے رہے۔ اب شاعری کی مقبولیت زیادہ اس لیے ہوتی ہے کہ زیادہ تر وہ یاد رہ جاتی ہے لوگوں کو، آسانی سے لوگ سن لیتے ہیں، اور عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ لوگوں تک بات پہنچانے کے لیے شاعری زیادہ اچھی ہوتی ہے۔ اس بنا پر بھی شاعری کا زور زیادہ رہا مگر ایسا نہیں ہے کہ ہمارے یہاں شاعری کو ہی ادب کہا جاتا ہو۔ اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ایسا نہیں ہے کہ وہ آدھے سے کم یا زیادہ ہو۔ مقدار کے اعتبار سے جتنی شاعری ہے اتنی ہی نثر بھی ہمارے یہاں ہوگی۔

سوال: آج یہ کہا جارہا ہے کہ اچھی تخلیقات وجود میں نہیں آرہی ہیں حالاں کہ لکھا بہت جارہا ہے۔ اس میں کتنی سچائی ہے؟ اوراس کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں؟

جواب: سچائی تو اس میں ضرور ہے لیکن ہمیشہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر عہد میں ہزاروں لکھنے والے ہوتے ہیں۔ ان میں کچھ صحیح معنوں میں اچھے اور دیر تک رکنے والے ہوتے ہیں اور پھر ان میں سے بھی کچھ رہ جاتے ہیں جن کو آئندہ کا زمانہ یاد رکھتا ہے۔ ان کا ذکر ملتا ہے اس میں کوئی عیب کی بات نہیں سمجھتا میں۔ اردو میں تقریباً ڈیڑھ سو تذکرے ہوں گے۔ ہر تذکرہ میں ڈیڑھ سو شاعروں کا ذکر ہوگا۔ ان میں جو مشترک ہوں ان کو نکال دیجیے تو سو رہ جائیں گے۔ ڈیڑھ سو تذکروں میں پندرہ ہزار شاعر۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ پچھلے پانچ سو برسوں میں ہمارے یہاں صرف پندرہ ہزار شاعر ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے زیادہ ہوئے ہیں۔ ان میں سے تم کتنوں کو جانتی ہو۔ چار، پانچ، دس کو جانتی ہوگی یہ تو عام بات ہے۔ ادب میں ایسا ہوتا ہے۔ کہنے والے، میدان میں دوڑنے والے، باغ میں پیڑ لگانے والے، عمارت کی تزئین کرنے والے، عمارت بنانے والے بہت ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کی بات بن جاتی ہے۔ اس کی وجہ کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ میں مطمئن نہیں ہوں اور مجھے ہونا بھی نہیں چاہیے کیوں کہ جو توقعات مجھے آج کے نوجوانوں سے تھی وہ پوری ہوتی نظر نہیں آرہی ہیں۔ شاید وہ لوگ کم پڑھتے ہیں یا ان کو ٹھیک سے پڑھایا نہیں جاتا ہے۔ یا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جو ہماری طبیعت اور دل میں آئے گا ہم لکھیں گے وہی اچھا ہے۔ مثلاً کوئی افسانہ نگار ہے تو اسے ضرورت نہیں کہ وہ منٹو، بیدی، یا کرشن چندر یا پھر پریم چند کو پڑھ کر افسانہ لکھے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی اور طرح سے افسانہ لکھے۔ ایسا ہوسکتا ہے۔ میں اس میں کوئی برائی اور عیب نہیں سمجھتا ہوں۔ دو چار دس ہر زمانے میں آگے نکلتے ہیں باقی سب رہ جاتے ہیں۔ اس کی کوئی ایسی وجہ بتانا مشکل ہے۔ جیسا میں نے پہلے کہا کہ اگر یہ وجہ بتاؤں کہ لوگ پڑھتے کم ہیں تو ممکن ہے غلط ہو۔ لوگ پڑھتے بہت کچھ ہوں لیکن سیکھتے نہ ہوں یا یہ کہ سیکھتے ہوں عمل نہ کرتے ہوں۔ ایک صاحب ہیں شاعر وہ شعر کہنے میں بہت محنت کرتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ اچھا کہہ تو لیتے ہیں لیکن زبان اور اظہار

پر ابھی پورا قابو نہیں ہے۔ آپ میر، سودا، غالب، داغ، اقبال کو پڑھ ڈالیے۔ تو انھوں نے کہا کہ میں ان سب کو پڑھ چکا ہوں۔ پڑھ لیا ہوگا، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ پڑھنے کے بعد بھی آپ کو زبان و بیان پر قدرت نہیں حاصل ہوئی تو آپ کا معاملہ ہے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ تو شاید لوگ پڑھتے کم ہیں یا پڑھ کر سمجھتے کم ہیں۔ جو بھی قصہ ہو۔ بہر حال ان سے کوئی شکایت نہیں ہے یہ سب تو چلتا ہی رہتا ہے۔

سوال: آج جب ہم غزل پر نظر ڈالتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ غزل کئی راستوں پر گامزن ہے۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ اصل غزل کیا ہے؟

جواب: میں یہ نہیں سمجھتا کہ کئی راستوں پر گامزن ہے۔ دیکھیے غزل کی جو بنیادی شرطیں ہیں وہ آپ کے ذہن میں ہونی چاہئیں۔ مثلاً بہت آسان شرط یہ ہے کہ غزل میں عام طور پر مطلع ضرور ہوتا ہے، مقطع بھی ہوتا ہے، کبھی کبھی نہیں بھی ہوتا ہے۔ غزل کے اشعار آپس میں مربوط نہیں ہوتے ہیں۔ غزل کے مضمون میں زیادہ تر محرومی کا، نارسائی کا، اور ناکامی کا مضمون ہوتا ہے۔ اور کسی ایک کی چاہے اس کو آپ اللہ میاں کہیں یا معشوق کہیں چاہے زمانہ کہیں کسی ایک کی سنگدلی کا ذکر ہوتا ہے۔ کوئی ایسا ہے جو آپ کی شرطوں کو یا آپ کے تقاضوں کو پورا نہیں کر رہا ہے یا جو آپ چاہتے ہیں وہ نہیں مل رہا ہے۔ یہ غزل کے بنیادی موضوعات ہیں۔ شاعر کو آزادی ہے کہ اگر جی میں آئے تو وہ سیاسی بات کہہ ڈالے سماجی بات، یا فلسفیانہ بات کہہ دے جیسے اقبال کی غزل میں عشقیہ عناصر ہیں لیکن بہت کم۔ ان کی زیادہ تر غزلیں فلسفیانہ، مفکرانہ اور سیاسی انداز کی ہیں۔ یہ سب چلا آرہا ہے۔ کوئی نئی بات تھوڑی ہو رہی ہے۔ نئے شاعر آتے ہیں تو وہ اسی بات کو اپنے انداز سے اپنے رنگ میں کہنا شروع کرتے ہیں۔ غزل کی اصل تو بدلی نہیں ہے اور نہ بدلے گی۔ کیوں کہ جب کوئی صنف بن جاتی ہے تو اس کے اصول میں تھوڑی توڑ پھوڑ تو آپ کر سکتے ہیں لیکن اس کے بنیادی عناصر میں توڑ پھوڑ نہیں کی جا سکتی ہے۔ جس طرح ہندوستان کا ایک دستور ہے۔ ہم سب کا اور سپریم کورٹ کا فیصلہ ہے کہ اس میں آپ کچھ ترمیم تو کر سکتے ہیں لیکن اس کے بنیادی اصول میں ترمیم نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے کوئی بھی پارلیمنٹ صد فی صد ووٹ کیوں نہ دے دے مگر

اس کو اختیار نہیں ہے کہ وہ اس کے بنیادی تصورات میں ترمیم کرے۔ مثلاً شخصی آزادی، مذہب کی آزادی، تعلیم کی ضرورت، یا یہ کہ انصاف پر مبنی معاشرہ ہو، یہ چیزیں ایسی ہیں جو ہمارے بنیادی تصورات یا دستور میں شامل ہیں یہ چیزیں نہیں بدلی جا سکتی ہیں۔ وہی حال غزل کا بھی ہے۔ دوسو، پانچ سو شاعر بھی کہہ دیں تو اس کے بنیادی عناصر نہیں بدلیں گے۔ اصناف کی پہچان ہوتی ہے۔ اصناف کے آس پاس کنارے کنارے تو توڑ پھوڑ ہوتی رہتی ہے۔ کچھ توڑ پھوڑ اقبال نے کی، کچھ تھوڑی بہت ترقی پسندوں نے کی، کچھ حسرت موہانی نے کی، کچھ غالب نے کی کچھ میر نے کی کچھ ولی نے کی۔ تھوری بہت توڑ پھوڑ تو لوگ کرتے رہتے ہیں اور آہستہ آہستہ وہ توڑ پھوڑ اس صنف کے دائرہ میں آتی جاتی ہے۔ اسی طرح زبان کا معاملہ ہوتا ہے زبان میں نئے نئے الفاظ آتے رہتے ہیں کچھ چل جاتے ہیں کچھ نہیں چلتے۔ جو چل جاتے ہیں وہ رکھ لیے جاتے ہیں چاہے کوئی کچھ کہتا پھرے۔ بہت سے الفاظ عربی کے عالم لوگ غلط مانتے ہیں مثلاً مفلوک بمعنی پریشان کے یعنی جو پریشانی کے عالم میں رہا ہو۔ مفلوک الحال بالکل غلط ہے لیکن اب چل گیا ہے تو اس کو کون غلط کہے گا۔ عربی کے لوگ غلط کہتے ہیں تو کہنے دیجیے۔ زبان کے اندر تو آ گیا۔ زبان کا بھی وہی معاملہ ہے کہ زبان جب بن جاتی ہے تو وہ منسوخ نہیں ہو سکتی۔ اس کے آس پاس تھوڑی بہت شورش ہوتی رہتی ہے اس کی وجہ سے گھٹ بڑھ ہو جاتی ہے۔ وہی حال غزل کا بھی ہے نظم کا بھی، تمام اصناف کا یہی عالم ہے۔ جب صنف بن جاتی ہے تو اس کے بنیادی شرائط کو آپ نہیں بدل سکتے ہیں۔ ہاں تھوڑی بہت تبدیلی آس پاس میں ہو سکتی ہے۔ مثلاً اقبال کی غزل آپ غالب کو پڑھنے کو دیتے تو وہ یہ نہ کہتے کہ غزل، غزل نہیں ہے:

ہر چیز ہے محوِ خود نمائی
ہر ذرہ شہیدِ کبریائی!

بلکہ وہ یہ کہتے کہ یہ غزل تو ہے لیکن میں ایسے نہیں کہتا ہوں۔

سوال: آج کے الیکٹرانک دور میں جب کہ مواد انٹرنیٹ پر فراہم ہو جاتا ہے خاصی تعداد میں کتابیں منظرِ عام پر آ رہی ہیں۔ کتابوں کی اہمیت کے سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: کتاب کی اہمیت تو رہے گی۔ ایک تو یہ کہ آپ دیکھیں جس زمانے میں فوٹو گرافی آئی تو لوگوں نے کہا کہ پینٹنگ Painting کا جنازہ اٹھ گیا، اب Painting کون کرے گا۔ فوٹو گرافی کے ذریعہ ایک سے ایک خوبصورت تصویریں کھنچنے لگیں۔ لیکن Painting پھر بھی قائم رہی۔ کوئی فوٹو گراف چاہے وہ کتنا ہی خوبصورت اور اچھا کیوں نہ ہو اس کو آپ دس کروڑ میں نہیں بیچ سکتے۔ ہندوستان میں حسین صاحب ہیں، رضا صاحب ہیں ان کی پینٹنگز آج بھی دس کروڑ بارہ کروڑ میں بک جاتی ہیں۔ اگر فوٹو گرافی نے پینٹنگز کو منسوخ کیا ہوتا تو یہ کیسے ہوتا۔ پھر سنیما آ گیا، لوگوں نے کہا کہ بھئی اب تو ادب کا خدا حافظ ہے کچھ نہیں ہوا، ڈرامہ کا خدا حافظ ہے وہ بھی نہیں ہوا، سنیما ترقی کرتا رہا لیکن ڈرامہ اور ادب پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ ریڈیو آیا تو لوگ اور چلانے لگے کہ ارے صاحب اب تو ریڈیو آ گیا کون پڑھے گا لوگ سن لیں گے۔ جن دنیا لوگ ممبئی سے بول رہے ہیں لندن سے بول رہے ہیں وہ بھی نہیں ہوا۔ تو انسانی مزاج جن چیزوں کو قبول کر لیتا ہے ان کو وہ ترک نہیں کر سکتا۔ جب تک اس کے سامنے کوئی بہت بڑی مجبوری نہ ہو۔ اچھا اس کو یوں دیکھو کہ کئی لوگ الیکٹرانک والے ہیں۔ کتنوں کے پاس ریڈیو، ٹی وی ہے کتنوں کے پاس کمپیوٹر ہے۔ اگر سو ریڈیو، بیس ٹی وی اور ایک کمپیوٹر ہے تو کتنے لوگ الیکٹرانک میڈیا سے پڑھ سکتے ہیں۔ سب کتابیں کمپیوٹر پر نہیں ملتیں۔ کچھ ہیں کچھ نہیں۔ اب ایک بہت بڑا منصوبہ دو ملکوں بلجیم اور فرانس میں شروع ہوا ہے۔ فرانس کا کہنا ہے کہ جتنی کتابیں چھپی ہیں وہ سب کمپیوٹرائز کر لائبریری میں ڈال دیں گے تا کہ کوئی بھی اس کو بلا پیسے کے پڑھ سکتا ہے۔ بلجیم والے بھی یہی کہہ رہے ہیں۔ ان کے یہاں دو زبانیں ہیں فرنچ اور فلیمش۔ لیکن آپ سوچئے کہ دنیا میں صرف دو زبانیں تو ہیں نہیں۔ فرنچ ہو یا فلیمش ہو یا انگریزی ہو، بہت سی زبانیں ہیں اور ہر زبان کو کمپیوٹر پر کرنا اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی لائبریری جو یو ایس اے میں ہے اس کے لیے وہاں کی گورنمنٹ ایک منصوبہ بنانے کی کوشش میں ہے کہ جتنی کتابیں ان کے یہاں چھپی ہیں ان سب کو کمپیوٹرائز کر دیا جائے تو ان زبانوں کے لیے آپ کو پروگرام چاہیے۔ کتابیں ڈھونڈنا چاہیے۔ ہمارے یہاں تو عالم یہ ہے کہ کتاب آج چھپی

کل غائب ہو جاتی ہے تو کہاں سے اس کو ڈھونڈو گی کہاں سے کمپیوٹرائز کرو گی۔ اگر یہ سب ہو جائے تب بھی مشکل ہے کہ آدمی کاغذ کا استعمال چھوڑ دے کتاب کا استعمال چھوڑ دے۔ اگر بالکل ایسا ہو جائے کہ ہم نے کہا اور آپ تک فوراً پہنچ جائے ٹیلیفون کی ضرورت نہ پڑتی ہو یا شائد ہم نے زبان سے کہا اور کمپیوٹر پر لکھ کر آ گیا تو شاید ایسا ہو جائے۔ ابھی تو کوئی وجہ ایسی نظر نہیں آتی کہ کتابوں کی اہمیت کم ہو گی یا یہ کہ کتابوں کا چھپنا کم ہو جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں ابھی یہ دونوں باتیں نہیں ہوں گی۔

سوال: دیگر زبانوں کے ادب پر بھی آپ کی نظر ہے، اردو ادب کا ان سب کے درمیان کیا مقام اور مستقبل ہے؟

جواب: معاف کیجیے گا۔ اس طرح کا سوال سبھی لوگ کرتے ہیں کوئی کہتا ہے کہ ہمارا افسانہ عالمی ہو گیا کوئی کہتا ہے کہ ہماری شاعری عالمی ہو گئی۔ ارے بھئی پہلے آپ اپنے اوپر تو مطمئن رہیے کہ آپ خود کیا ہیں؟ پہلے اپنے گھر میں دیکھا جاتا ہے کہ ہم کیسے ہیں؟ ہمارا معیار کیسا ہے؟ ہم کیسا لکھ رہے ہیں؟ امیر خسرو نے یہ بات کہی ہے جو صحیح ہے اور سونے کے حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہے انھوں نے کہا ہے کہ ''استاد وہ ہے جس کو اس کی زبان والے استاد مانیں۔'' اگر میں نہیں مانتا ہندی والے مان لیتے ہیں تو مانا کریں۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ امریکہ والے مجھ سے پوچھ کر مانتے ہیں۔ روس سے، جرمنی سے بچے پڑھنے آتے ہیں تو مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کے خیال میں ہم کو کیا پڑھنا چاہیے یہ تو نہیں کہتے کہ تمھیں کیا معلوم ہم جانتے ہیں کہ ہمیں کیا پڑھنا ہے؟ اگر وہ ایسا کہتے ہیں تو ہم کہہ دیں گے باہر نکل جاؤ۔ ہماری اپنی اہمیت ہے۔ پہلے ہم اپنے آپ کو دیکھیں کہ ہمارے ادبی معیار میں جو لوگ ہیں ہم ان کو کتنا پڑھتے ہیں کتنا پسند کرتے ہیں؟ یہ بڑی بات ہے۔ کلیم الدین صاحب نے فرمایا کہ اقبال بڑے شاعر نہیں ہیں کیوں کہ ان کی شاعری یورپ کے کورس میں نہیں ہے۔ اس کے جواب میں ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ شیکسپیر بڑے شاعر نہیں ہیں کیوں کہ ان کہ شاعری عرب اور ایران کے کورس میں نہیں ہے۔ تو یہ کون سا جواب ہوا۔ اگر آپ کی شاعری، آپ کا ادب آکسفرڈ، کیمبرج، ہارورڈ، اٹلی، کولمبیا میں نہیں پڑھایا جا رہا ہے تو آپ بڑے شاعر نہیں

ادب آکسفرڈ، کیمبرج، ہارورڈ، اٹلی، کولمبیا میں نہیں پڑھایا جارہا ہے تو آپ بڑے شاعر نہیں ہیں۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ آپ کی شاعری ہمارے یہاں نہیں پڑھائی جارہی ہے تو آپ بھی بڑے شاعر نہیں ہیں۔ ہمارے یہاں عرب میں ایران میں چین میں آپ لوگوں کو کون پڑھتا ہے، کوئی نہیں جانتا کہ آپ کون ہیں۔ یہ کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہم پہلے اپنے معیار قائم کرتے ہیں اپنا طریقہ قائم کرتے ہیں اور اس میں اپنے لوگوں کی قدر کرتے ہیں، ہم ان کو مرتبہ دیتے ہیں۔ اقبال کو پہلے بٹھاتے ہیں، جوش کو بعد میں بٹھاتے ہیں۔ اگر کوئی اعتراض کرتا ہے تو کرے۔ اقبال اقبال ہیں جوش جوش ہی رہیں گے۔ اس میں امریکہ کیا کرلے گا۔ کل مان لیجیے امریکہ سے جاپان سے یا جرمنی سے کتاب چھپ کر آجائے جس میں کہا گیا ہو کہ جوش بڑے شاعر ہیں اقبال کے مقابلے میں تو کیا آپ مان لیں گی؟

سائل: نہیں کبھی نہیں مانیں گے۔

مسئول: بس بات ختم ہو جاتی ہے۔ عام بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں کوئی کم تھوڑی ہے ابھی تمہاری (اردو ادب کی) عمر ہی کتنی ہوئی ہے۔ دیکھو ہندوستان میں جو زبانیں ہیں ان میں بھی تم سب سے کم عمر ہو پنجابی سے بھی، بنگالی سے بھی کم عمر ہو۔ تمل، تلگو اور ملیالم سے بے انتہا کم عمر ہو وہ دو، دو تین، تین ہزار برس کی ہو چکی ہیں۔ ان کے ماننے والے پانچ ہزار برس کہہ رہے ہیں۔ پانچ نہیں تین تو مانو۔ ان کی عمر تین ہزار برس تمہاری چھ سو برس کی۔ اس میں کیا پریشانی ہے۔ اس کو دیکھتے: دیئے جتنا تم لوگوں نے کیا ہے بہت ہے۔ ایک بات اور ہے جو دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملے گی۔ ہندوستان میں کوئی ایسی زبان نہیں ہے جس کے ادب میں اتنے مختلف اور متضاد عناصر کارفرما ہوں۔ اس میں اسلام کارفرما ہے، جین لوگ کارفرما ہیں، عیسائی ہیں، یہودی ہیں ان لوگوں کے تہذیبی عناصر اور اثرات اور تصورات بھی اس میں شامل ہیں۔ جس زبان کے لکھنے والے، بولنے والے، جس زبان میں کام کرنے والے اتنی طرح کے لوگ ہوں اس زبان کا کیا پوچھنا۔ اسلام کوئی ایک لڈو تو ہے نہیں کہ بانٹ لیں۔ اسلام میں کئی طرح کے حصے ہیں۔ اس میں ایران کا الگ اسلامی طریقہ ہے، عرب کا الگ اسلامی طریقہ ہے، مڈل ایسٹ کا الگ اسلامی طریقہ ہے۔

بھیجا ہے۔ بدھ اثرات دو تین طرح کے ہیں۔ پارسی لوگ الگ ہیں اور ان کے اثرات ہمارے یہاں پائے جاتے ہیں۔ ان کی روایات تلمیحات ہمارے یہاں موجود ہیں۔ بڑے بڑے پارسی شاعر بھی ہوئے ہیں۔ تو جس زبان میں اتنے بہت سے دریا آ کر ملتے ہوں اس زبان کی تہذیبی قیمت تو ایسے ہی بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے ہم اس کو Compare کریں یا نہ کریں۔ آخر دنیا کے لوگ آ کر ہم سے کیوں پوچھتے ہیں کہ ہم کیا پڑھیں؟ آپ کی شاعری اتنی اچھی کیوں ہے؟ آپ کے افسانے اتنے اچھے کیوں ہیں؟ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ ہمارے یہاں جتنا مل رہا ہے، ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کہیں نہیں ہے۔ چھ سو برس کے اندر وہ افریقہ، چین، یورپ، ہندوستان تمام جگہ پہنچ گئے لیکن عربی ادب پر ان لوگوں کا اتنا اثر نظر نہیں آتا۔ انھوں نے اور لوگوں پر اثرات ڈالے۔ خود بہت کم اثر قبول کیا۔ ہمارے یہاں معاملہ یہ ہے کہ ہم نے ہر طرف کا اثر قبول کیا۔ ہم نے عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی کے الفاظ لیے۔ ہماری زبان میں نہ جانے کتنے الفاظ فرانسیسی کے ہیں جن کو تم جانتی ہی نہیں ہو کہ یہ فرانسیسی کا ہے یا پرتگال سے آیا ہے۔ لیکن ہم لوگ ان کو بولتے ہیں، استعمال کرتے ہیں۔ جیسے گودام، نیلام، پرتگالی کے لفظ ہیں۔ کارتوس فرانس کا لفظ ہے۔ تو اس طرح ہم لوگوں نے تمام الفاظ قبول کر لیے۔ تو جو زبان اتنی وسیع النظر ہو اور اتنا وسیع ظرف رکھتی ہو اس کا کیا پوچھنا۔ ہمیں تو یہ کہنا چاہیے کہ دنیا کی زبانوں کے معاملے میں ہم لوگ غیر معمولی لوگ ہیں اس کے جیسی زبان ہے نہیں کوئی۔ اتنی کم عمر میں اتنا ادب پیدا کرنا، جو چیزیں ہمارے یہاں نہیں تھیں وہ ہم لوگوں نے اختیار کیں، ناول نہیں تھا ہم نے اختیار کیا، ڈرامہ تک ہم نے اختیار کیا حالاں کہ ڈرامہ مسلمانوں میں بہت کم ہے۔ لیکن ہم نے ڈرامہ بھی لے لیا۔ کوئی چیز ہم نے چھوڑی نہیں۔ تنقید جو نئی طرح کی تھی وہ بھی ہم نے اختیار کر لی۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو باہر سے آئی ہو اور ہم نے لے نہ لی ہو۔ نظم معریٰ ہے آزاد نظم ہے۔ جو تھا وہ تو تھا ہی جو نہیں تھا وہ ہم نے لے لیا۔ اب ہمیں اور کیا چاہیے۔

سوال: نئی نسل جو ادبی دنیا میں داخل ہو رہی ہے، اس کے سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: نئی نسل کے بارے میں میری رائے وہی ہے۔ میں ان لوگوں سے زیادہ خوش نہیں ہوں اور یہی سمجھتا ہوں کہ شاید یہ لوگ پڑھتے وڑھتے نہیں ہیں۔ جانے کیا معاملہ ہے۔ یا شاید میرا ہی دماغ کچھ کمزور ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے جیسے ہم لوگ جب نئے نئے تھے تو اپنے بزرگوں کو برا بھلا کہتے تھے کہ یہ لوگ کچھ نہیں جانتے کیا لکھیں گے؟ ہم لکھتے ہیں۔ ممکن ہے یہ لوگ بھی ایسے ہی ہوں۔ وہ سمجھتے ہوں کہ انھیں کیا لکھنا آتا ہے؟ لکھ تو ہم رہے ہیں۔

ملاقاتی: آپ قارئین 'اردو دنیا' کو کیا پیغام دیں گے؟

فاروقی صاحب: پہلا پیغام تو یہ ہے کہ اردو زبان سے محبت کیجیے، اس زبان پر فخر کیجیے، اس زبان کو دنیا کی تمام زبانوں میں بے نظیر جانیے، اس کے رسم الخط کو عظیم ترین سمجھیے، اس کی آواز کو شیریں ترین سمجھیے، اس کے ادب کی قدر کیجیے، کہیے کہ یہ ادب بھی اتنی ہی قدر و قیمت کا حامل ہے جتنا کہ کوئی اور ادب ہو سکتا ہے۔ ہم لوگ ادب، زبان کا استحصال کرنے میں بہت تیز ہیں لیکن کرتے کچھ نہیں۔ اب بھی سننے میں آتا ہے کہ رسم الخط بہت خراب ہے۔ اس میں 'ص' بھی ہے 'س' بھی ہے 'ذ' بھی ہے۔ انگریزی میں جو نہیں ہے اس کے بارے میں کوئی نہیں کہتا کہ اس میں یہ کیوں نہیں ہے۔ انگریزی میں 'س' نہیں ہے دو حروف کو ملا کر 'س' بناتے ہیں۔ ان کے یہاں 'چ' نہیں ہے تین حروف کو ملا کر 'چ' بناتے ہیں۔ تو یہ سب فضول باتیں ہیں۔ اپنے ادب سے، زبان سے محبت رکھو۔ اور اصل بات یہ ہے کہ اگر محبت ہوتی ہے تو جیسے کہا جاتا ہے کہ 'لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید' مجنوں کی آنکھ سے لیلیٰ کو دیکھو۔ مجنوں کے لیے وہی سب کچھ تھی۔ چاہنے والے کی آنکھ میں جس کو چاہا جاتا ہے اس میں کوئی خرابی نہیں ہونی چاہیے۔ ہم کو تو کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔ ہم تو اردو کی خرابیوں کو بھی سمجھتے ہیں کہ اچھی چیز ہے۔ ہم لوگ جو اردو پڑھنے بولنے والے ہیں ہم ہی اردو کو خراب کہیں گے تو دشمن کیوں نہ خراب کہے گا۔ تو اردو سے محبت کرنی چاہیے سب سے پہلی اور آخری بات یہی ہے۔

•••

شمیم حنفی سے گفتگو

پروفیسر شمیم حنفی عصر حاضر کے اہم نقاد اور ادیب ہیں۔ ان کی پیدائش 17 نومبر 1938 کو سلطانپور (اتر پردیش) میں ہوئی۔ انھوں نے پروفیسر احتشام حسین کی نگرانی میں ڈی۔ فل اور پروفیسر آل احمد سرور کی نگرانی میں ڈی۔ لٹ کیا۔ ابتدا میں آپ نے اندور یونیورسٹی کے ملحقہ ایک کالج اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ بعد ازاں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کی شعبہ اردو سے وابستہ ہو گئے۔ موصوف نے صدر شعبہ کے علاوہ ڈین فیکلٹی آف ہیومنٹیز اینڈ لینگویجز کی ذمہ داریاں بھی بحسن وخوبی انجام دیں اور 2004 میں سبک دوش ہوئے۔ ان دنوں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اکیڈمی آف تھرڈ ورلڈ اسٹڈیز میں وزیٹنگ پروفیسر ہیں۔

پروفیسر شمیم حنفی کی ادبی دلچسپیوں کا دائرہ وسیع ہے۔ انھوں نے بچوں کے لیے ادیبوں کی سوانح عمریاں اور پری کہانیاں تحریر کی ہیں۔ ان کے ڈراموں کے چار مجموعے ''مٹی کا بلاوا''، ''مجھے گھر یاد آتا ہے''، ''زندگی کی طرف''، ''بازار میں نیند'' شائع ہو چکے ہیں۔ ''جدیدیت کی فلسفیانہ اساس'' اور ''نئی شعری روایت'' ان کی تنقیدی کتابیں ہیں۔ پروفیسر شمیم حنفی نے ابوالکلام آزاد کی کتاب ''انڈیا ونس فریڈم'' کا ترجمہ اردو میں ''ہماری آزادی'' اور

پنڈت جواہر لال نہرو کی کتاب Early writings: Years of Struggle کا ترجمہ "جدوجہد کے سال" کے نام سے کیا ہے۔انھوں نے "فراق: شخص اور شاعر"، "فراق دیارشب کا مسافر" اور "سیاہ فام ادب" کے نام سے کتابیں ترتیب دی ہیں۔ پروفیسر شمیم حنفی سے کی گئی گفتگو حاضر خدمت ہے۔

سوال: موجودہ دور میں انسان کی ترجیحات بدلتی جارہی ہیں۔ایسے میں مطالعے کا شوق کس حد تک باقی رہ پائے گا؟

جواب: جس کو پڑھنا ہے وہ پڑھے گا، جس کو نہیں پڑھنا ہے وہ مختصری تحریر بھی نہیں پڑھے گا۔لیکن میرے لیے یہ مسئلہ ہے کہ آنے والی صدیوں میں ادب کا کیا حال ہوگا؟ ادب میں کس حد تک اپنا وجود برقرار رکھنے کی قوت رہ جائے گی۔جس طرح کا Infotech معاشرہ بنتا جا رہا ہے بلکہ بن چکا ہے اس میں تخلیقی لفظ کی کیا قدر و قیمت باقی رہے گی، یہ زیادہ سوچنے کی بات ہے۔

میں نے مارکیز کا ایک انٹرویو پڑھا تھا اس میں اس نے یہ کہا تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے، مشینیں چاہے جتنی ترقی کرلیں اور دنیا میں جتنے بھی تجربے کر لیے جائیں لیکن تخلیقی لفظ اور کتاب کی قدر و قیمت ہمیشہ باقی رہے گی۔یعنی کتاب پڑھنے کا جو لطف ہے اس کا کوئی بدل نہیں ہے۔آپ کوئی بھی سیریل یا فلم دیکھیں اور جب وہی چیز آپ کسی کتاب یا رسالے میں پڑھتے ہیں تو اس کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔چھپے ہوئے لفظ میں ایک عجیب و غریب جادو ہوتا ہے۔تخلیقی لفظ کے بارے میں میرا اپنا خیال ہے کہ دنیا چاہے جتنی بدل جائے لیکن جب تک تخلیقی اعتبار سے انسان کی حسیں بیدار رہیں گی تب تک ادب میں دلچسپیاں باقی رہیں گی اور ادب کا اعتراف کیا جاتا رہے گا۔ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر زمانے میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے کبھی کسی صنف کو زیادہ قبولیت مل جاتی ہے کبھی کسی خاص علاقے میں کوئی ایک صنف مقبول ہو جاتی ہے۔اس کے اپنے تہذیبی اور معاشرتی اسباب ہوتے ہیں۔

سوال: عصر حاضر میں جب ہر شے کو سود و زیاں کے میزان پر تولا جا رہا ہے کیا ایسی صورت میں ادب زندہ رہ پائے گا؟

جواب: رشید احمد صدیقی کہا کرتے تھے کہ "مہذب انسانوں کو نفع کے نقصان کے نفع کا اندازہ ہونا چاہیے۔" یہی تہذیب کی پہچان ہوتی ہے۔ آپ یہ سوچیں کہ ہمارے لیے کارآمد چیز کیا ہے؟ میں چند دنوں قبل "دی ہندو" میں آئنسٹائن کے بارے میں ایک مضمون پڑھ رہا تھا اس میں یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ ہمارے لیے Man of Value زیادہ قیمتی ہے بہ نسبت Man of Success کے ہر زمانے میں اور ہمارے زمانے میں بھی آپ کو بے شمار کامیاب لوگ نظر آ جائیں گے۔ بزنس کرنے والے لوگ کامیاب ہوتے ہیں۔ غالب اور میر اپنے زمانے کے کامیاب ترین آدمی نہیں تھے۔ آج ہمارے دور کے اچھے لکھنے والے مثلاً انتظار حسین، قرۃ العین حیدر، نیر مسعود وغیرہ ہیں۔ ان کی ذاتی زندگی پر نظر ڈالیں تو ان سے کامیاب لوگ آپ کے معاشرے میں مل جائیں گے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ ادب ہو یا زندگی کے دوسرے معاملات، ہر جگہ آخری فیصلہ اخلاقی بنیادوں پر ہوتا ہے۔

لوگوں نے ادب کو بھی کاروبار بنا دیا ہے۔ مجھے یاد ہے ایک بار میرٹ پروموشن اسکیم کے تحت اردو کے کچھ اساتذہ کی ترقی ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے بستی حضرت نظام الدین میں ایک بہت بڑا جلسہ کیا۔ گجرات کے سابق گورنر پروفیسر سروپ سنگھ جلسے کی صدارت کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہر زبان میں، ہر مضمون میں پروفیسر ہوتے ہیں لیکن کہیں جلسہ نہیں ہوتا، یہ اردو والوں کو کیا ہو گیا ہے؟ ایسا لگ رہا ہے کوئی انہونی بات ہو گئی ہے۔ اردو والوں کو کوئی چھوٹا سے چھوٹا اعزاز مل جائے تو اردو اخبارات کے صفحات اس کے ذکر سے بھرے نظر آتے ہیں۔

سوال: اردو شاعری کے ہر دور میں نمائندہ شاعر موجود رہے ہیں۔ عہد حاضر میں ایسے نام ابھر کر نہیں آ رہے ہیں۔ جنھیں ہم اس دور کے نمائندہ شاعروں کے خانے میں شامل کر سکیں۔ اس کا سبب کیا ہے؟

جواب: دیکھیے آپ کے سوال کا جواب ہاں بھی ہے اور نہیں بھی ہے۔ ایک تو آپ نے یہ کہا کہ ہر دور میں نمائندہ شاعر رہے ہیں تو ہمارے دور میں بھی ہوں گے۔ بھئی ہر دور میں خراب شاعروں کی بھیڑ رہی ہے تو ہمارے دور میں بھی ہے۔ مجھے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعری کے لیے گذشتہ زمانہ شاید زیادہ سازگار تھا۔ اب شاعری کے مقابلے میں پوری دنیا میں لوگ فکشن زیادہ توجہ سے پڑھ رہے ہیں اور فکشن زیادہ لکھا بھی جا رہا ہے۔ شاعری سے لوگوں کی دلچسپی کم ہوتی جا رہی ہے۔

لیکن ایسا نہیں کہ ہمارے زمانے میں اچھے شاعروں کی کمی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک میں اچھے شاعروں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ ایک بات میں صاف طور سے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میں ادب کے حوالے سے دونوں ملکوں کی تقسیم نہیں کرتا۔ ہمارے زمانے میں منیر نیازی ہیں، ظفر اقبال ہیں، احمد مشتاق ہیں، ساقی فاروقی ہیں، شہریار ہیں، بلراج کومل ہیں، باقر مہدی ہیں اور من موہن تلخ تھے، قاضی سلیم تھے عرفان صدیقی تھے۔ یہ سبھی اچھے شاعر ہیں۔ حال ہی میں، میں نے پاکستان کے کچھ شعری مجموعے دیکھے جن میں عرفان ستار، اکبر احمد معصوم وغیرہ کی شاعری مجھے اچھی لگی۔ اس کے علاوہ نثری نظموں میں افضال احمد سید، ذیشان ساحل، ارباب مصطفیٰ، سعید الدین ہیں۔ خواتین میں تنویر انجم، وسیم الدین ہٹی وغیرہ بہت اچھی نظمیں کہہ رہی ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں بھی شاعری کے نئے میلانات کی نمائندگی کرنے والوں اور اچھے شاعروں کی بھی کمی نہیں ہے۔ البتہ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے خراب شاعروں کا تناسب اچھے شاعروں کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔ مشفق خواجہ مرحوم کہا کرتے تھے کہ تذکروں میں ہمیں جن شعرا کا ذکر ملتا ہے ظاہر ہے بہت سے ایسے شعرا جو گمنام رہ گئے جن کا ذکر ہم تک نہیں پہنچا ان کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔

سوال: آپ نے اپنی گفتگو میں کہا کہ اس وقت پوری دنیا میں فکشن زیادہ لکھا جا رہا ہے۔ اردو میں موجودہ فکشن کی کیا صورت حال ہے؟

جواب: میرا خیال ہے کہ اردو میں بہت اچھا فکشن لکھا جا رہا ہے۔ میں عمر کے حساب سے ادیبوں کو نہیں پڑھتا۔ سید محمد اشرف، سلام بن رزاق، خالد جاوید اور طارق چھتاری وغیرہ اچھا لکھتے

ہیں۔ نیر مسعود کا ایک افسانہ ماہنامہ ''شب خون'' میں ''مسکینوں کا کمرہ'' پڑھا تھا اس کا اثر کئی دنوں تک مجھ پر رہا۔ خالد جاوید کی ایک کہانی ''تفریح کی ایک دوپہر'' پڑھی وہ مجھے اچھی لگی۔ میں اچھی تحریریں پڑھنے کا قائل ہوں اور میں نئی نسل اور پرانی نسل کو الگ الگ کر کے نہیں پڑھتا۔

سوال: اردو ڈرامے کے ساتھ ہمیشہ سے ہی سوتیلا سلوک کیا جاتا رہا ہے اور ان دنوں بھی وہی سلوک روا ہے۔ آپ اس سے کس حد تک اتفاق کرتے ہیں؟

جواب: ادب کا سوشل رول جس طرح ڈراما ادا کر سکتا ہے اس قدر ادب کی کوئی صنف ادا نہیں کر سکتی۔ لیکن ڈرامے پر ہمیں جتنی توجہ دینی چاہیے تھی اتنی نہیں دی گئی۔ مخمور سعیدی اور انیس اعظمی نے مل کر ایک کتاب ''اردو تھیٹر: کل اور آج'' ترتیب دی تھی۔ اس کو دیکھ کر یہ احساس ہوا کہ ڈرامے کا ماضی اتنا کمزور نہیں تھا جتنا عام طور سے لوگ سمجھتے ہیں۔ ہمارے یہاں ڈرامے تو بہت لکھے گئے لیکن اسٹیج اس طرح ترقی نہیں کر سکا۔ ڈرامے کی ترقی کا بہت کچھ دارومدار اسٹیج کی ترقی پر ہوتا ہے۔

حبیب تنویر اردو ڈرامے کے ہی نہیں بلکہ ہندوستانی ڈرامے کے Icon بن چکے ہیں۔ جب ہم ہندوستانی ڈرامے کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی ایک الگ سی تصویر ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ میرے دل میں ان کی غیر معمولی عزت ہے۔ ان کے بہت سارے ڈرامے مثلاً آگرہ بازار، جمعہ دارنی، مٹی کی گاڑی اور چونگا پنڈت میں نے دیکھے ہیں۔

دہلی کے اردو ڈراموں میں شاہد انور، انیس اعظمی اپنے اپنے طور پر محنت کر رہے ہیں۔ حال ہی میں شاہد انور کے ڈراموں کا ایک مجموعہ ''غیر ضروری لوگ'' کے نام سے منظر عام پر آیا ہے۔ ''غیر ضروری لوگ'' ڈراما میں نے دیکھا بھی ہے جو منٹو کے نمائندہ کرداروں کا ایک تانا بانا بن کر تحریر کیا گیا ہے۔ اس ڈرامے کو ساہتیہ کلا پریشد نے سال کے بہترین ڈرامے کے ایوارڈ سے نوازا ہے۔ عزیز قریشی کے بھی ڈرامے میں نے دیکھے ہیں۔ مغربی بنگال میں ظہیر انور اردو ڈرامے کے لیے سرگرم ہیں۔

اردو ڈراموں کو بنگلہ، مراٹھی، کنڑ، ہندی وغیرہ ڈراموں کی طرح سرپرستی حاصل نہیں رہی یہ اردو ڈرامے کے ترقی نہ کرنے کی ایک اہم وجہ ہے۔ ہماری تہذیب میں مشاعرہ بہت حاوی رہا۔اس نے باقی اصناف میں لوگوں کی دلچسپی کو کم کر دیا۔

سوال: آج جو تنقید لکھی جا رہی ہے اس کا معیار کیا ہے؟

جواب: آج بہت اچھی تنقید لکھی جا رہی ہے۔علم کا دائرہ وسیع ہوا ہے، پڑھنے پڑھانے کا شوق بڑھا ہے۔حال ہی میں، میں نے قاضی جمال حسین کے مضامین پڑھے ہیں، مجھے بہت اچھے لگے۔قاضی افضال حسین کا مضمون دریدا پر بہت اچھا لگا۔ابوالکلام قاسمی کے مضامین کو پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ ایک شخص اپنی روایت سے باخبر ہے اور آج کی دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا بھی اسے شعور ہے۔

لیکن اس طرح کی تنقیدی تحریریں بھی لکھی جا رہی ہیں جن کو پڑھنے کے بعد مجھے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ مزاحیہ ہے یا سنجیدہ ہے۔مثلاً کسی نے ایک شخصیت کا ذکر کرنا شروع کیا تو پتہ چلا کہ اس شخصیت میں ساری جہات نظر آ رہی ہیں۔ادب کی تنقید کا یہ عمل نہیں ہے۔

ہمارے زمانے کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ لوگ دعوت دے کر، فرمائش کر کے اپنے بارے میں لکھواتے ہیں اور ایسی تحریروں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔اس لیے کہ اب لوگ ڈھیٹ اور بے غیرت زیادہ ہو گئے ہیں۔ احتشام حسین اور آل احمد سرور ہمارے استاد تھے۔ان لوگوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ہم پر لکھا جائے یا کسی رسالے کا خصوصی شمارہ شائع کیا جائے۔حالی، شبلی، کلیم الدین احمد نے خاموشی سے اپنا کام کیا۔

سوال: عہد حاضر کے شاعروں اور ادیبوں میں کسی رویے، رجحان اور تحریک کا کس حد تک عمل دخل ہے؟

جواب: رویہ، رجحان اور تحریک لکھنے والا بناتا ہے کوئی نقاد نہیں بناتا۔ ہمارے زمانے کی ایک خرابی یہ بھی ہے کہ لوگ توقع کرتے ہیں کہ تنقید یہ بتائے کہ یہ لکھیں یا وہ لکھیں۔بھئی! غالب نے کس سے پوچھ کر شعر کہے تھے، اقبال نے کس نقاد سے پوچھا تھا کہ کیسی نظم کہنی چاہیے، پریم

چندر نے کس سے پوچھا تھا کہ کیسا افسانہ لکھنا چاہیے۔ رجحان ساز تو تخلیق کار ہوتا ہے۔ ایسے نقاد گنتی کے ہوئے ہیں جن سے واقعی تخلیق کاروں نے بڑا اثر قبول کیا ہو۔

سوال: آج کل یہ کہا جا رہا ہے کہ ہم مابعد جدید دور میں جی رہے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: مابعد جدید رویے تو مغرب میں بہت پہلے عام ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ہمارے یہاں کچھ دنوں سے اس کا چرچا ہو رہا ہے۔ اگر پوری دنیا کو ایک اکائی سمجھیں تو ہم مابعد جدید دور میں جی رہے ہیں۔

اصطلاحوں کے اس کھیل کا ادب سے بہت زیادہ تعلق نہیں ہے۔ جس زمانے میں جدیدیت کو ہمارے ملک میں عام کیا گیا اس کے اتنے ہی ابعاد (Dimensions) پوری دنیا میں تھے؟ ہمارے ملک میں جدیدیت کی کچھ باتوں پر زور دیا گیا اور کچھ کو نظر انداز کر دیا گیا۔ ہمارے یہاں مابعد جدید فکر والے جو بات کہتے ہیں اس کے بارے میں جدید فکر والے بہت پہلے کہہ چکے ہیں۔ میں نے اس سے پہلے بھی کہا ہے کہ سچی تخلیقی بصیرت والے لوگ یہ نہیں دیکھیں گے کہ آج کون سا رجحان چل رہا ہے۔ وہ اپنی پسند کے مطابق لکھتے ہیں۔

سوال: اردو تحقیق پر بہت کم توجہ دی جا رہی ہے۔ اس کی کیا وجوہات ہیں؟

جواب: پی۔ ایچ۔ ڈی کی تحقیق کا معیار دن بہ دن گرتا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ اسے کیریئر سے جوڑ دیا گیا ہے۔ ہر کوئی جلدی میں ہے کہ اسے ملازمت حاصل کرنی ہے۔ ایسے میں معیار کا خراب ہونا فطری ہے۔ ان دنوں طالب علموں میں پڑھنے کا شوق کم دکھائی دیتا ہے۔

جب میں طالب علم تھا تو کوئی بھی نیا رسالہ یا نئی کتاب آتی تھی تو اس کا ذکر ہمارے اساتذہ کلاس میں ضرور کرتے تھے لیکن ان دنوں ایسا نہیں ہوتا۔ دس سال پرانی کسی کتاب کا نام لیجیے تو بعض دفعہ اساتذہ بھی چونک جاتے ہیں کہ یہ کون سی کتاب ہے اور کب چھپی ہے۔

ہمارے یہاں زندہ لوگوں پر کام کرنے کا رواج بھی زور پکڑتا جا رہا ہے۔ میرا خیال ہے کسی بھی زندہ ادیب پر کام نہیں ہونا چاہیے تاوقتیکہ وہ اپنا سارا کام کر چکا ہو اور اس

کی گنجائش نہ رہ گئی ہو کہ وہ مزید کوئی کام کرے گا۔ میں نے یہاں تک سنا ہے کہ جن زندہ لوگوں پر تحقیق ہوتی ہے وہ ان ریسرچ اسکالروں کو اپنے گھروں میں ٹھہراتے ہیں، ڈکٹیٹ کرتے ہیں۔ یہ بہت ہی پست درجے کی بات ہے۔ میں نے بعض ایسے لوگوں پر بھی تحقیق کرتے ہوئے دیکھا ہے کہ ان صاحب کو ان کے محلے اور گاؤں کے لوگ تو جانتے ہیں مگر باہر کوئی نہیں جانتا۔

سوال: ان دنوں اردو میں بہت زیادہ کتابیں شائع ہو رہی ہیں مگر ادب سے قاری کا رشتہ ٹوٹتا جا رہا ہے۔ ایسا کیوں؟

جواب: اس کا ایک سبب تو مجھے یہ لگتا ہے کہ ان دنوں کثرت سے جو کتابیں چھپ رہی ہیں وہ کتابیں لوگوں کو پڑھنے سے بیزار کر رہی ہیں۔ لیکن سچائی یہ بھی ہے کہ ان دنوں جو کتابیں چھپ رہی ہیں ان میں اکثریت ان کی ہے جو نہیں پڑھی جاتیں۔ اب کتابیں مفت لینے والے بھی نہیں ملتے۔ بعض ایسی کتابیں چھپتی ہیں جن کے بارے میں مجھے معلوم نہیں کہ ان کے پڑھنے والے کہاں پائے جاتے ہیں۔

سوال: اردو زبان کے مسائل کے حل کے لیے آپ کے کیا مشورے ہیں؟

جواب: میں مشورے کسی کو نہیں دیتا۔ البتہ میں سوچتا ضرور ہوں کہ اردو کی ترقی کے لیے کون کون سے اقدامات ضروری ہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کوئی بھی زبان سرکاری سرپرستی اور روزگار سے جڑ جانے کی بنا پر ترقی نہیں کر سکتی۔ زبانیں زندہ رہتی ہیں اس زبان کے بولنے والوں کی اپنی دلچسپی اور کمٹمنٹ پر۔ میرا خیال ہے کہ کبھی ہمیں اردو کے مسئلے کو اس روشنی میں بھی دیکھنا چاہیے۔ رہی یہ بات کہ اردو کے خلاف تعصب برتا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ آزادی کے بعد سے ہی یہ سلسلہ چل رہا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اردو کو بہت ہی منصوبہ بند طریقے سے ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ رمیش تھاپر نے انگریزی رسالہ ''سیمینار'' کا ایک خصوصی گوشہ اسی پر نکالا تھا کہ زبانوں کو رفتہ رفتہ کس طرح قتل کیا جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ بھی ہے کہ اردو والوں نے اردو کے لیے کیا کیا۔ اردو کو روزگار سے نہیں جوڑا گیا جس کے سبب اردو کی ترویج و اشاعت متاثر ہوئی۔ یہ ایک وجہ ہے ساری وجوہات نہیں۔

سوال: حکومت دہلی نے حال ہی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا ہے۔ ہمیں اس قدم سے کون کون سی توقعات کرنی چاہئیں؟

جواب: حکومت دہلی نے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا ہے یہ بہت ہی خوش آئند بات ہے۔ ہمیں یہ توقع کرنی چاہیے کہ حکومت دہلی نے نہ صرف اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا ہے بلکہ وہ اردو کے ساتھ انصاف بھی کرے گی۔

سوال: آج کل آپ کون کون سے تنقیدی و تخلیقی کام کر رہے ہیں؟

جواب: حال ہی میں انجمن ترقی اردو (ہند) سے میری ایک کتاب ''ہم سفروں کے درمیان'' کے نام سے چھپی ہے جس میں معاصر ادیبوں پر مضامین ہیں۔ دوسری کتاب ''محفل ہم نفساں'' جلد ہی منظر عام پر آئے گی اور تیسری کتاب ''کارگہ شیشہ گراں'' بھی انجمن ترقی اردو (ہند) سے چھپے گی۔ تیسری کتاب میں بالکل نئے لکھنے والوں پر مضامین شامل ہیں۔ ایک چھوٹی کتاب منٹو پر لکھ رہا ہوں۔ محمد حسین آزاد پر ایک کتاب کا مسودہ میرے پاس ہے جس پر نظر ثانی کر رہا ہوں۔ غالب پر بھی ایک کتاب جلد ہی آنے والی ہے۔

سوال: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی خدمات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: اردو کے فعال اداروں میں سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان بھی ایک ہے جو اردو زبان کے لیے مصروف عمل ہے۔ لیکن کونسل کو قصبات، دیہات کے ان لوگوں کے لیے بھی کچھ کرنا چاہیے جو دور دراز کے علاقوں میں رہتے ہیں۔

•••

پروفیسر عتیق اللہ سے گفتگو

سید محمد عتیق اللہ تابش جنھیں دنیائے ادب عتیق اللہ کے نام سے جانتی، پہچانتی اور مانتی ہے، اردو کی وہ شخصیت ہیں، جس سے صرف نظر کرکے آپ خاص طور سے جدید اردو ادب کی تفہیم کے سفر پر زیادہ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ شاعری ہو یا تنقید دونوں میدانوں میں پروفیسر عتیق اللہ نے اپنی شناخت کو ممتاز کیا۔ بڑے ادیبوں کو بڑا اس لیے بھی مانا جاتا ہے کہ وہ مختلف ذرائع اور پہلوؤں سے اپنے بڑے پن کو نمایاں کرتے چلتے ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں ''پڑھنا پڑھنا اور پڑھنا، لکھنا لکھنا اور لکھنا'' ان کی سب سے بڑی مصروفیت ہے۔ اردو کے اہم ترین عصری ادیبوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ یہ انٹرویو ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے۔

سوال: سب سے پہلے آپ کی ابتدائی زندگی کے بارے میں پوچھنا چاہوں گا؟ اپنی تعلیم و تربیت اور پرورش کے بارے میں ہمارے قارئین کو کچھ بتائیں؟

جواب: اپنی زندگی کے نشیب و فراز کے بارے میں کئی مرتبہ عرض کر چکا ہوں۔ مختصراً یہ کہ 1949 میں شہر اجین (مدھیہ پردیش) میں پیدائش ہوئی۔ والد مرحوم کا تعلق ضلع مردان (پاکستان) سے تھا۔ ساتویں درجے تک وہیں فقہ کی تعلیم پائی تھی ذریعہ تعلیم فارسی تھا، پشتو مادری زبان

تھی۔ عربی زبان سے بھی خاصی واقفیت تھی۔ ان کی روزمرّہ کی زبان نے ان تینوں زبانوں سے ترکیب پائی تھی۔ چوں کہ 14-13 برس کی عمر میں اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر لاہور اور پھر دہلی اور پھر بھوپال بعد ازاں اجین میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ہم نے انھیں بے حد بے نیاز اور مستغنی پایا۔ بہت بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ ضلع ناداگئی (پاکستان) اور اس کے اطراف میں ان کے حصے میں آئی ہوئی کاشت کی زمینیں تقریباً17000 ایکڑ ہیں۔ 1954 اور پھر 1970 میں زمینوں کی تقسیم والد صاحب کی نگرانی ہی میں ہوئی تھی۔ انھوں نے یہ سارا اثاثہ ہم تینوں بہن بھائیوں کے نام کر دیا تھا۔ یہ کاغذات اس وقت بھی ہماری تحویل میں ہیں۔ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد جو سیاسی صورتِ حال میں ابتری پیدا ہوئی تھی اور جو بے یقینی کی کیفیت ہمارے ذہنوں میں جڑ پکڑ چکی تھی وہ ہنوز قائم ہے۔ یہ سارا علاقہ سوات کے تحت آتا ہے جو اپنی فطری خوبصورتی اور زرخیزی میں عدیم المثال کہلاتا ہے۔ لیکن گزشتہ دس پندرہ برسوں سے یہاں آگ برس رہی ہے۔ بالخصوص سوات کے لوگ نسلاً پٹھان ہیں لیکن نسبتاً امن پسند اور نرم خو ہیں۔ یہاں کی خاص پیداوار انگور اور چلغوزے ہے۔ والد صاحب نے اجین ہی میں حفظ کیا، امامت کی اور درس و تدریس کے فرائض بھی انجام دیے۔ کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ اتنے بڑے زمیں دار ہیں اور نہ انھیں کوئی قلق اور تأسف ہی تھا۔

والدہ کا تعلق بھوپال سے تھا۔ وہ اپنی بہن کے ساتھ 1915 میں ایک بڑے مقصد کے ساتھ اجین منتقل ہوئیں کہ یہاں تعلیم نسواں کی طرف کوئی توجہ ہی نہ تھی۔ مسلم لڑکیوں کے لیے کوئی اسکول تھا نہ کوئی ادارہ۔ ان دونوں بہنوں نے اجین میں جو اسکول کھولے تھے انھیں 1922 میں ایک معاہدے کے تحت سرکار نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ 1954 تک ایک اسکول جو اب مدار گیٹ اردو ہائر سیکنڈری اسکول کہلاتا ہے، ہمارے گھر ہی میں واقع تھا۔ بڑا معصوم اور بے نیاز تھا ہمارا خاندان، کبھی سرکار سے کرایہ بھی طلب نہیں کیا گیا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ہر صبح گھر کا سارا سامان ایک کمرے میں منتقل کر دیا جاتا تھا۔ سارا سارا دن اسکول چلتا، شام کو وہ سارا سامان واپس اپنے مقام پر رکھ دیا جاتا۔

دوسرا اسکول مرزاواڑی میں واقع تھا۔ یہ بھی والدہ ہی کا قائم کردہ تھا۔ میں بہت چھوٹا تھا۔ اسکول ہی میں کچھ عرصے کے لیے ہماری رہائش تھی وہیں کھانا بھی پکتا، وہیں رات بسر ہوتی اور وہیں کلاسیز بھی ہوتیں۔ بڑی بہن نے 1940 میں ورنا کیولر (گوالیار) سے مڈل پاس کیا تھا۔ اجین والوں کو بھی یہ علم نہیں ہوگا کہ مسلمانوں میں وہ پہلی مڈل تھیں جنھوں نے بڑنا گر اور دیواس میں جا کر لڑکیوں کے اسکول بھی کھولے تھے۔ زچگی میں 1948 میں ان کا انتقال ہو گیا۔

میں نے اجین ہی سے ایم اے (انگریزی ادبیات) اور پھر اردو میں ایم اے کیا۔ کچھ برسوں تک اجین ہی میں اسکولی سطح پر تدریس کے فرائض بھی انجام دیے۔ 1971 میں مولانا آزاد کالج اورنگ آباد میں تقرر ہو گیا۔ اورنگ آباد کو محبت آباد کہنا چاہیے۔ یہ شہر اردو زبان وادب کا بہت بڑا مرکز ہے۔ لوگ بے حد مخلص اور مہمان نواز ہیں۔ اپنی تہذیب سے جس قدر لگاؤ ہے اُسے میں نے کہیں اور نہیں دیکھا۔ یہاں کی فضاؤں میں اردو رچی بسی ہے۔ جتنے اردو اسکول یہاں واقع ہیں اتنی تعداد کسی اور شہر میں نہیں پائی۔ اردو کے جتنے طلبا کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر تعلیم پا رہے ہیں اپنے شمار میں ان کا مقابلہ کوئی اور شہر نہیں کر سکتا۔ انگریزی تعلیم کا فروغ بھی یہاں اردو کی ترقی میں مانع نہیں آسکا۔ گھروں گھر اردو اخبار پڑھے جاتے ہیں۔ کتابیں خریدی جاتی ہیں۔ پابندی کے ساتھ رسائل خریدے جاتے ہیں۔ اردو کے تئیں جو رغبت یہاں نظر آتی ہے اسے میں شوق، لگن اور دیوانگی کے علاوہ تہذیبی مشن کا نام دینا چاہوں گا۔ اورنگ آباد کے قرب وجوار میں جو اضلاع واقع ہیں وہاں بھی کم وبیش یہی صورت ہے۔ یہاں کے لوگوں نے اپنی تہذیبی وراثت کا جس طور پر تحفظ کیا ہے وہ ہمارے دوسرے نام نہاد لسانی اور تہذیبی مراکز کے لیے نمونہ بن سکتا ہے۔ اورنگ آباد میری اہلیہ کا وطن ہے اور میرے لیے وہ وطنِ ثانی کی حیثیت رکھتا ہے۔ آدھی سے زیادہ عمر عزیز کا حصہ اورنگ آباد اور دہلی میں گزر گیا۔ اجین اب محض ایک یادِ دیرینہ ہے جو اکثر خواب میں طلوع ہوتا رہتا ہے۔ اورنگ آباد ہی کو اب میں نے اپنا وطن مان لیا ہے۔ جب موقعہ ملتا ہے وہاں کی راہ لیتا ہوں اور خوب سرشار وسیراب ہو کر واپس لوٹتا ہوں۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میں نے 1976 میں وہیں سے یعنی مرہٹواڑہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل

کی تھی۔ میرے نگراں پروفیسر نعیم الدین صاحب (مرحوم) تھے۔ دہلی یونیورسٹی میں 1976 ہی سے پڑھاتا رہا لیکن باقاعدہ تقرر 1978 میں ہوا اور 2005 میں سبکدوش۔ بڑے تلخ وشیریں زمانے دیکھے۔ اُس عزت سے ہمیشہ بچتا رہا جو بڑی ذلتوں کے بعد میسر آتی ہے۔ چاپلوسوں نے جو مرتبے پائے وہ دیکھے اور نااہلوں نے جو عزت پائی وہ بھی دیکھی۔ صاحب علم کو گوشہ نشین دیکھا اوران کی ناقدری بھی دیکھی۔ دہلی اب جعلی اور مصنوعی یعنی Pseudo کا ادیبوں کا مرکز بنتی جارہی ہے۔ سیاست کے توسط سے جس نے بازی مارلی اسی کے پوبارے ہیں۔ مجموعی طور پر ہماری پوری قوم جس طرح اخلاقی زوال کی شکا رہے یہ دورِ حاضر کی بات نہیں ہے۔ صدیوں سے یہ سلسلہ جاری ہے۔

سوال: اردو کی جانب کس طرح راغب ہوئے؟ اردو ہی کیوں؟ کسی اور زبان یا سبجیکٹ کو آپ نے کیوں نہیں اپنایا؟

جواب: جس زمانے میں ہم نے اپنا تعلیمی سفر شروع کیا تھا۔ سائنس اور کامرس کی طرف عموی طور سے توجہ کم سے کم تھی۔ آزادی کے فوراً بعد ہمارا مسئلہ 'تعلیم' تھا ہی نہیں۔ پوری قوم بے یقینی کے دلدل میں پھنسی ہوئی تھی۔ بڑی بے چارگی اور عدم تحفظ کا عالم تھا۔ ہمارے مکانات کسٹوڈین کی نذر ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ نوکریوں سے بھی مستعفی ہونا پڑا تھا۔ اردو کو اسکول بدر کردیا گیا تھا۔ انتظامیہ کی نظر میں ہم مشکوک و مشتبہ تھے۔ آئے دن سی آئی ڈی ہمارے والدین کو تنگ کیا کرتے تھے۔ کبھی بھی فساد رونما ہو جاتا اور گھر جیل خانے بن جاتے۔ ایک خوف کی تلوار سروں پر لٹکی رہتی۔ ایسے ماحول میں تعلیم میں باقاعدگی کیسے آسکتی تھی۔ بھوپال بھی منتقل ہونا پڑا۔ جہاں تیسری درجے تک تعلیم پائی۔ وہاں بھی مہاجرین کا جم غفیر تھا۔ عزیزوں کے گھر کبوتروں کے کابک بن گئے تھے۔ لوگ عموماً بے روزگار تھے۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ بڑا افراتفری اور نفسا نفسی کا عالم تھا۔ ان تجربات سے ہم ہی نہیں پوری قوم گزر رہی تھی۔ وقت بدل چکا ہے لیکن حالات نہیں بدلے ہیں۔ پوری قوم خوف زدگی کے عالم میں زیست بسری پر مجبور ہے۔ کچھ روشنی کی کرنیں ان اندھیروں میں نمودار ہوتی رہتی ہیں جو ہمارے لیے تھوڑا بہت ڈھارس کا سامان ضرور مہیا کردیتی ہیں۔ دیکھیے اس جس کی

کیفیت سے کب نجات ملے۔ اتنی طویل گفتگو کا مقصد محض یہ بتانا تھا کہ کسی نہ کسی طور پر تعلیم کا سلسلہ جاری رہا اور جیسے تیسے وہ منزل سر کی جو میرے لیے اب بھی ایک خیال ایک خواب ہی ہے۔

سوال: آپ کے اشعار سے ایسا لگتا ہے کہ شاعری آپ کا پہلا عشق ہے اور بعد میں تحقیق و تنقید کی طرف آئے، کیا یہ درست ہے؟

جواب: شاعری سے سفر ضرور شروع کیا لیکن مطالعے کا شوق لڑکپن سے تھا اور وہ بھی 'نگار' جیسے رسائل کو پڑھنے کا۔ ابھی زیروکس مشین ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ میں لائبریری میں گھنٹوں نقل کیا کرتا تھا۔ بیش تر چیزیں سمجھ سے باہر تھیں لیکن سمجھنے کی تڑپ تھی۔ کریم اللغات گھر ہی میں تھی لیکن اس سے بھی کچھ مدد نہیں ملتی۔ شہر میں کوئی ایسا نہیں تھا جو میری مشکل کو آسان کرتا۔ میرے بھانجے (اقبال حیدری) جو عمر میں مجھ سے 20 برس بڑے تھے۔ کراچی منتقل ہو چکے تھے۔ مسلمانوں میں وہ پہلے طالب علم تھے جنھوں نے اجین میں کرسچن انگریزی اسکول میں تعلیم پائی تھی۔ انٹرنس پاس ہی کیا تھا کہ تقسیم وطن کا بگل بج گیا اور وہ پورے خاندان کے ساتھ پاکستان چلے گئے۔ تازہ کار ذہن رکھتے تھے، آزاد نظم اور معریٰ کی ہیئت انھیں مرغوب تھی۔ 'ساقی' میں چھپا کرتے تھے۔ پاکستان میں انھوں نے Crime and Punishment کا ترجمہ کیا تھا۔ ٹینی سن، ورڈز ورتھ اور بلیک کی نظموں کے ترجمے کیے تھے۔ 'جامِ نو' کراچی کے دس بارہ برس تک مدیر رہے۔ Economic Review جاری کیا جو اقتصادیات کے موضوع پر پاکستان سے شائع ہونے والا پہلا جریدہ کہلاتا ہے۔ اقبال حیدری کا ایک شعری مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ ایک ادھورا 'منظوم سفرنامہ' جسے انھوں نے امریکہ ہی میں لکھا تھا۔ ایملی برونٹے کے ناول Wuthering Heights اور تھامس ہارڈی کے ناول Tess of the D'Urbervilles کا ترجمہ بھی انھوں نے کیا تھا جو ادھورے پڑے رہ گئے اور نا گہانی موت نے انھیں آ دبوچا۔ ان کی شخصیت اور علم کے شوق نے مجھ پر گہرا اثر قائم کیا۔ شاعری میرے ضمیر کی آواز بن چکی تھی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ نثر کی طرف آؤں گا۔ البتہ مطالعے کے شوق نے شاعری کے شوق کو متاثر ضرور کیا۔ اگر چہ تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور چوتھا

تکلم کے نام سے جلد ہی شائع ہوگا۔ جتنی بے دردی کے ساتھ مجھے شاعری کرنی چاہیے تھی وہ نہیں کر سکا۔ اچھے شعر کا ایک خاص تصور ہے، اس معیار کا بہر وقت خیال رہتا ہے۔ بھرتی کی شاعری میرے یہاں کم سے کم ملے گی۔ بے حد بری اور پھسپھسی شاعری سے بازار گرم ہے۔ اس کی داد دینے والوں کی بھی کمی نہیں۔ میں بس حیرت کے ساتھ دیکھتا اور پڑھتا رہتا ہوں اور اپنی شاعری سے موازنہ کرتا رہتا ہوں۔

سوال: تنقید کو آپ نے زیادہ وقت دیا۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟

جواب: میں نے تنقید کو وقت نہیں دیا بلکہ تنقید نے میرا وقت لے لیا۔ دراصل کسی کالج یا یونیورسٹی میں استاد ہونے کے معنی ہیں آپ لائق اعتبار ہو گئے۔ نہ صرف لائق اعتبار بلکہ متداول اور مستعمل اصطلاح میں نقاد کا ٹھپّہ آپ کی شخصیت پر لگ گیا۔ آپ خواہ بے مغز، سرسری اور صحافتی نوعیت کی زبان لکھتے ہوں یا اِدھر اُدھر سے نقالی کر کے نوٹس بناتے ہوں۔ اردو دنیا آپ کو بہر حال دانش ور قرار دینے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتی ہے۔ سو دیکھتے دیکھتے ہم بھی نقاد بن گئے اور بعض اوقات ہمیں بھی دانش ور کی حیثیت سے خطاب کیا جاتا ہے۔ گم راہ ہونے کے لیے اس قسم کے خطاب کافی ہیں۔ ہم بھی اس چکر میں پھنس گئے۔ شاعری کی دیوی انھیں پر مائل بہ التفات ہوتی ہے جو 24 گھنٹے اسی کے نشے میں سرشار رہتے ہیں۔ خدا نے اگر آپ کو تخلیقی شعور عطا کیا ہے تو مسلسل اس کی جلا کاری ضروری ہے۔ ہزار کوشش کے باوجود تنقید سے میں چھٹکارا نہیں پا سکا۔ تنقید کا پیشہ اگر آپ نے اختیار کیا ہے تو پھر دنیا کے کسی اور کام کے لائق نہیں رہیں گے۔ تنقید مسلسل مطالعے کا تقاضہ کرتی ہے۔ آپ شاعری کرتے ہیں، کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں لیکن تنقید بڑی ذمے داری کا کام ہے۔ ایک اچھا تنقید نگار جتنی محنت کرتا ہے اس کا عوض اسے عشر عشیر بھی نہیں ملتا۔ پتہ نہیں یہ نیک کام ہے کہ نہیں تاہم تنقید لکھنا نیکی کر دریا میں ڈال کے برابر ہے۔

سوال: آپ نے کن نقادوں اور ادبی نظریوں کا اثر قبول کیا؟

جواب: میں نے یوں تو کسی کا اثر قبول نہیں کیا ہے۔ لیکن ہمارے بزرگ نقادوں جو بڑے بڑے کام کیے ہیں وہ طالب علمی کے زمانے سے مطالعے میں رہے ہیں، ان سے لاشعوری طور پر

میری بصیرت کو جلا ملی ہے۔ آل احمد سرور، احتشام حسین، کلیم الدین احمد، سید عابد علی عابد، وزیر آغا، محمد حسن، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی اور وارث علوی نے جو غیر معمولی کارنامے انجام دیے ہیں وہ تو نئی نسلوں کی توفیق سے باہر ہیں۔ ہم لوگ تو تلی زبان میں کچھ تو بھی محض گنگنار ہے ہیں اور اسی پر سینے چوڑے کر کے داد پر داد وصول کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ ہم میں سے بعض تو اپنے ہاتھ سے اپنی پیٹھ تھپتھپاتے رہتے ہیں۔ اپنا کبھی تجزیہ نہیں کرتے اور نہ تقابل۔ ہماری یونیورسٹیوں کے اساتذہ کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھیں تنقید کے نام پر لفاظی کا فن خوب آتا ہے۔ ہمارے زمانے میں جتنی بے مصرف، سطحی، بے مغز اور پھسپھسی تنقید لکھی گئی ہے وہ انھیں سے منسوب ہے۔ چوں کہ میں بھی اردو کا استاد ہوں اس لیے ان تمام چیزوں کا مجھ پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔ اسی لیے آپ سے کہتا ہوں کہ خدارا مجھے نقاد نہ کہیں۔

سوال: ہم یہ بھی جاننا چاہیں گے کہ تنقید میں آپ کا موقف کیا ہے۔ یعنی ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعدِ جدیدیت جیسے موضوعات پر آپ نے بھی کافی لکھا ہے۔ ان مباحث میں سرگرم حصہ بھی لیتے رہے ہیں تو آپ کے نزدیک کون سا تصور یا تھیوری لائقِ اعتنا ہے۔ کیا تخلیق کار کو کسی تھیوری کے تحت لکھنا چاہیے۔

جواب: پہلی بات یہ عرض کرتا چلوں کہ تخلیق کار کو نئے سے نئے ادبی اور فلسفیانہ تصورات کا علم ضرور ہونا چاہیے۔ نہ صرف یہ بلکہ جہاں تک ہو سکے مختلف علوم سے بھی واقفیت ہونی چاہیے۔ زندگی کے وسیع تر تجربات وغیرہ مل کر اُس کی ایک آگاہ شخصیت کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی تھیوری یا کسی نظریے کو رہ نما بنائے۔ ان ادیبوں نے زیادہ اہم کام کیے ہیں جو میمنہ کے چکر میں پھنسے اور نہ میسرہ کے۔ نقادوں کے اقتدار کی جنگ سے وہ لاتعلق ہی رہتے ہیں۔ میں انھیں متبادل تخلیق کار کہتا ہوں۔ جیسے ترقی پسند تحریک کے شور سے بے نیاز ہو کر منٹو، ن م راشد، اختر الایمان، مجید امجد، منیر نیازی لکھتے رہے۔ جدیدیت کی پُر زور آندھی کی زد سے قرۃ العین نے اپنے آپ کو بچایا۔ حالی اور غالب بھی اپنے عہد کے عمومی مذاق سے بے پرواہ تھے۔ اسی لیے وہ اپنے زمانوں میں متنازع رہے۔ ایسے ادیبوں کو بعد کی نسلیں ہی صحیح شکل میں پہچانتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ہمیشہ متبادل ادب پر زور دیتا

رہا ہوں جس کی آواز اپنے عہد کے شور میں سب سے علیحدہ سنائی دے۔

جہاں تک میرے تنقیدی موقف کا سوال ہے۔ میں بین العلومی تنقید کا حامی ہوں۔ ایسی تنقید محض کسی ایک تھیوری، کسی ایک نظریے، کسی ایک تصور پر اکتفا نہیں کرتی۔ ادب خود بھی بین العلومی ہوتا ہے اور وہ روزمرہ کی زندگی میں ہم خود بھی بین العلومی ہوتے ہیں۔ کبھی ہم سیاست اور معاشرتی صورتِ حال پر گفتگو کرتے ہیں۔ کبھی اپنا اور کبھی دوسرے کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں۔ کبھی ہمارا مسئلہ اقتصادی ہوتا ہے۔ کبھی چیزوں کو سمجھنے کے لیے فلسفیانہ بصیرت سے بھی کام لیتے ہیں۔ صبح کا اخبار، انٹرنیٹ اور ٹی وی نے ہمیں پہلے سے زیادہ بین العلومی بنا دیا ہے۔ زندگی کو سمجھنے کے لیے محض ایک نظر کی نہیں کئی نظروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمیں اسے کئی زاویوں سے دیکھنا پڑتا ہے۔ اس سے جوجھنا پڑتا ہے۔ ادب بلکہ تخلیقی ادب بھی ہم سے یہی تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس وژن سے کام لیں جو زندگی سے پھوٹ کر نکلا ہے۔ ہم زندگی نہیں جیتے ایک مسلسل جنگ لڑتے ہیں اور ہر تخلیق ایک جنگ ہی ہے جب تک کہنیاں نہ چھِل جائیں، ٹخنے نہ پھوٹ جائیں، ادھر اُدھر سے ہڈیاں نہ چٹخیں بڑا ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ جس کا فن شدتِ وجود یعنی Intensity of Existence کا مظہر ہے وہی زیادہ اثر گیر بھی ہوتا ہے اور وقت کی ہر قید سے ورا بھی ہوتا ہے۔ ہر بڑا ادیب، ادب لکھتا ہی نہیں، ادب جیتا بھی ہے۔ تنقید سے زیادہ ہمیں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ خود ادب کے تقاضے کیا ہیں یعنی کوئی تخلیق ہم پر کس قسم کا اثر قائم کر رہی ہے۔ اگر آپ صاحب علم ہیں اور ایک آگاہ شخصیت رکھتے ہیں تو آپ کا تاثر آپ کو دھوکہ نہیں دے گا۔ آپ اپنے تاثرات کی چھان پھٹک کر کے ہی کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ یہ نہیں ہوگا کہ پہلے تاثر ہی کو آخری تاثر کہہ کر نچنت ہو جائیں گے۔ ہر تخلیق یکے بعد دیگرے کئی قرأتوں کا تقاضا کرتی ہے۔ وہ بار بار ہمیں دھوکہ بھی دیتی ہے۔ وہ کبھی پوری برہنہ نہیں ہوتی۔ پوری برہنگی میں وہ کشش نہیں ہوتی جو چاک سے جھلک مارنے والا حصہ فراہم کرتا ہے۔ میں اپنے عملِ نقد میں اسی لیے بے حد محتاط واقع ہوا ہوں۔ کسی چیز کو سمجھنے کے لیے کافی وقت لگاتا ہوں۔ اپنے آپ سے بحث کرتا ہوں، جھگڑتا ہوں اور بہت بعد میں جا کر کوئی رائے قائم کرتا ہوں۔

سوال: تنقید کے موجودہ منظرنامے پر آپ کے کیا تاثرات ہیں؟ کلیم الدین احمد نے کہا تھا کہ اردو میں تنقید ہے ہی نہیں، آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟ تنقید پر زوال آرہا ہے جیسا کہ لوگ کہتے ہیں؟

جواب: اچھی بری تنقید سے کوئی دور خالی نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اچھی تنقید کے مقابلے میں بری تنقید کا پلڑا بھاری ہوتا ہے۔ کلیم الدین احمد نے یہ بات تقریباً 80 برس پہلے کہی تھی۔ اس وقت یقیناً تنقید کے نام پر لفاظی زیادہ تھی۔ تاثراتی نوعیت کی تحریروں کو بڑا درجہ حاصل تھا یا بعض بے حد عمدہ تدریسی نوعیت کے کام تھے، جن کی اپنی مخصوص افادیت اور حدود تھیں، کلیم الدین احمد کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے 'جرأتِ انکار' سے کام لیا۔ حالی کے بعد جرأت انکار کی یہ دوسری مثال تھی۔ کلیم الدین نے ایف آر لیوس کے عملِ نقد کو نمونہ بنایا تھا۔ ایلیٹ بھی انھیں بے حد عزیز تھا، لیکن المیہ یہ کہ کلیم الدین کی زبان تنقیدی نہیں ہے۔ وہ فلسفیانہ مغز سے عاری ہے۔ ان کے یہاں تکرار ہی تکرار ہے۔ یہاں تک کہ کہیں کہیں جذبوں میں برافروختگی کا رنگ شامل ہونے کے باعث تحریر کی متانت کو نقصان پہنچا ہے۔ انھوں نے تاثراتی تحریروں کا خوب خوب مذاق اڑایا اور خود بھی اس کی تیز رو سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکے۔ کلیم الدین کے بعد ہماری تنقید نے بڑی لمبی جست لگائی ہے۔ مغرب میں تنقید کی روایت کئی صدیوں کو محیط ہے۔ وہ بے حد علمی، فلسفیانہ، اوریجنل اور مجرد ہے۔ اس کا مقابلہ ہم اپنی تنقید کے اثاثے سے ہرگز نہیں کریں گے۔ موجودہ زمانوں میں تنقید کی کثرت دیکھ کر دماغ میں ایک ہی شبہ جگہ بنانے لگتا ہے کہ کہیں تخلیق بلکہ بہتر تخلیق کی رفتار سست تو نہیں پڑگئی۔ تنقید کو تخلیق اساس ہونا چاہیے۔ جب کہ نظری مباحث میں ہماری تنقید زیادہ الجھی ہوئی نظر آتی ہے۔ اچھی تنقید ہمیشہ بہتر تخلیق کے لیے فضا سازی کا کام انجام دیتی اور اچھے ادب کی طرف مائل کرتی ہے کہ کسی ادیب کو ہمیں پڑھنا چاہیے تو کیوں؟ اس کے پاس اس کے جواز اور دلائل ہوتے ہیں۔ بعض بزرگوں نے اس ذیل میں یقیناً بہت اعلیٰ درجے کے کام کیے ہیں۔ جن سے یہ تقویت ملتی ہے کہ مایوس ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ معشوق بھی ہے اور اس کی کمر بھی ہے۔

سوال: آپ کا اہم ترین کام ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ ہے، آپ کی نسل کے ناقدین نسبت بہتر رہے ہیں اور تنقید کو تنقید کے طور پر برتا ہے لیکن آپ کے بعد کی نسل کے ناقدین کیا تنقید کو ویسے ہی برت رہے ہیں؟ برصغیر کے تناظر میں کن نقادوں سے متاثر ہوئے ہیں؟

جواب: جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اچھی اور بری تنقید ہر دور میں لکھی جاتی رہی ہے۔ ہمارا دور بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ شمیم حنفی اور وہاب اشرفی نے کئی گراں قدر کام کیے ہیں۔ شمیم حنفی کا ذہن فلسفیانہ ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ یادداشت غیر معمولی اور بے حد حساس۔ ان کی تنقید کو میں بین العلومی کے خانے میں رکھتا ہوں۔ جس میں علم، عطر کی طرح رچا بسا ہوتا ہے۔ شمیم حنفی، دراصل، دو پاٹوں کے بیچ میں پس کر رہ گئے۔ ہم لوگ تنقید کے اُن کاموں کو اونچا مقام دیتے ہیں جن میں رعب وداب سے کام لیا گیا ہے۔ جن میں مغرب کے حوالوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ حوالوں کی بھرمار تو شمیم حنفی کے یہاں بھی ہوتی ہے لیکن یہ نظریاتی حوالے نہیں ہوتے۔ بات سے بات نکلنے کے دوران بیچ میں آدھمکتے ہیں۔ ویسے میں بتادوں، کہ اس قسم کے حوالوں سے بھی انھیں پرہیز کرنا چاہے۔ یوں بھی وہ اپنی فکر اور اپنے استدلال میں بے حد اور بجٹل واقع ہوئے ہیں۔ ضروری اور غیر ضروری حوالوں کی ٹھُسں پیٹھ یہ بھی باور کراسکتی ہے کہ لکھنے والے کو اپنے آپ پر اعتماد کم ہے۔ حوالے ضخامت بڑھانے کے لیے ٹیکے کا بھی کام کرتے ہیں۔

سوال: ممتاز شیریں، سیدہ جعفر، صغریٰ مہدی جیسے کچھ گنے چنے ناموں کے علاوہ اردو میں خواتین تنقید نگار نہیں نظر آتی ہیں بلکہ طنز و مزاح لکھنے میں بھی خواتین پیچھے ہیں۔ آپ نے اس سلسلے میں لکھا بھی ہے، ہمیں بتائیں کہ آخر اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے کہ خواتین نے طنز و مزاح اور تنقید کی جانب توجہ نہیں دی؟

جواب: ہماری بیشتر خواتین نے فکشن میں اعلیٰ درجے کی کئی مثالیں قائم کی ہیں۔ یہ سلسلہ تقسیم وطن سے قبل سے چلا آرہا ہے۔ انھوں نے مقبول عام فکشن میں بھی بڑی عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ مشرقی خاتون اور وہ بھی تخلیق کار خاتون بہ یک وقت تین ذمہ داریاں نبھاتی ہے۔

گھر اور بچوں کی ذمہ داری، ملازمت کی ذمہ داری اور ادب تخلیق کرنے کی ذمہ داری۔ تنقید نگار کو لائبریری کا کیڑا بننا پڑتا ہے۔ اسے کتابوں کے ڈھیر کے درمیان شب و روز گزارنے پڑتے ہیں۔ مختلف علوم اور نئے سے نئے ادب کو پڑھنا پڑتا ہے۔ جب کہیں وہ کچھ لکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ خاتون ادیبہ کو بقول ورجینا وولف ایک کمرہ بھی نصیب نہیں ہوتا۔ پھر بھی وہ قرۃ العین، عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، نثار عزیز بٹ، وغیرہ کی شکل میں جو ادب پیش کر چکی ہیں اور کر رہی ہیں وہ تنقید کی کارگزاری سے زیادہ قیمتی اور زندہ رہنے والا ہے۔ تنقید تو تخلیق کار کے حق میں خاموش زہر ہے۔ اِدھر اُدھر کی واہ واہ کے ڈنگرے کیا بجتے ہیں وہ اپنی پٹری سے اُتر جاتا ہے۔ یہ اچھا ہی ہے کہ ہماری خواتین محض شعر کہتی ہیں یا فکشن کی طرف راغب ہیں۔ کچھ بے حد عمدہ خودنوشتیں بھی انھوں نے لکھی ہیں۔ جہاں تک طنز و مزاح کا تعلق ہے خود مغرب میں اس کے دن لد گئے۔ سترہویں صدی کے بعد سے جو زوال شروع ہوا ہے اس کا اختتام 'مزاح کی موت' پر ہوتا ہے۔ یوں بھی عمومی طور پر طنز و مزاح کو ہم نے دوسرا درجہ دے رکھا ہے۔ ہماری سوسائٹی میں Sense of humour کی زبردست کمی ہے۔ اگر خواتین طنز و مزاح کی طرف مائل ہو گئیں تو مردوں کو طشت از بام کرنے کا مسالہ ان کے پاس وافر ہے۔ ہمارے طنز و مزاح نگاروں کے لیے 'بیوی' (ایک خاص قسم کی) بیوی ہمیشہ نشانے پر رہتی ہے جو بیوی ہی نہیں پوری عورت ذات کی نمائندگی کرتی ہے۔ خواتین نے اگر ٹیڑھی نظر کو اپنا وطیرہ بنا لیا تو یقیناً بہتوں کی خیر نہیں ہے اس لیے خواتین نے بہت سوچ سمجھ کر اس میدان میں قدم رکھنا ضروری نہیں سمجھا۔

سوال: آپ نے افسانے بھی لکھے، شاعری بھی کی اور اردو ادب کے موجودہ منظر نامے میں ایک ذہین نقاد کے طور پر جانے جاتے ہیں، یہ بتائیں کہ ادب کی کس صنف نے آپ کو زیادہ متاثر کیا؟

جواب: میں نے ایک فُل لینتھ ڈرامہ بھی لکھا ہے جو کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا ڈرامہ 'ہم سب ذلیل ہیں' اشاعت کے انتظار میں ہے۔ مجھے غزل اور نظم دونوں عزیز ہیں۔ 'نظم' نام سے میرا چوتھا مجموعہ کلام جو نظموں پر مشتمل ہے طباعت کے مرحلے میں ہے۔

شکیل الرحمٰن سے گفتگو

شکیل الرحمٰن ان نقادوں میں سے ہیں جنھوں نے تنقید کی نئی زمینوں کو دریافت کر کے ادب کو وسیع ترین آفاق عطا کیے۔ انھوں نے تنقید کی زرخیزی اور نمو کے عنصر کو تلاش کیا جس سے تنقید کا کینوس کائناتی ہوگیا۔ ان کی تنقید کی خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے وسعتوں کی جستجو کی اور اپنے ہم عصروں کی طرح محدودیت میں محصور نہیں رہے۔ انھوں نے اردو کو جمالیات کی اس لہر سے آشنا کیا جس کی بدولت اردو کو نئے افکار، اسالیب، تصورات اور تخیلات نصیب ہوئے۔ تخلیقات کی پرکھ کے نئے زاویے اور پیمانے ملے۔ تخلیق کی باطنی جمالیاتی جہتیں روشن ہوئیں۔ شکیل الرحمٰن کی تنقید بنیادی طور پر باز تخلیق ہے۔ انھوں نے تخلیق اور تنقید کے درمیان کھڑی لسانی ساخت کی دیوار کو منہدم کردیا اور اس طرح تنقید ساخت شکنی کے تجربے سے ہمکنار ہوئی۔

جمالیات شکیل الرحمٰن کا شناخت نامہ ہے اور اس دشت جنوں میں صرف یہی ایک آبلہ پا ہے جس نے ہندوستان کا نظامِ جمال (تین جلدیں) مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات۔ ہندوستانی جمالیات (تین جلدیں) اساطیر کی جمالیات، میر شناسی، منٹو شناسی، امیر خسرو کی

جمالیات،مولانا رومی کی جمالیات، جمالیات حافظ شیرازی،محمد قلی قطب شاہ کی جمالیات، تصوف کی جمالیات،فکشن کے فنکار پریم چند،راگ راگنیوں کی تصویریں اور کلاسیکی مثنویوں کی جمالیات جیسی تصانیف سے اردو تنقید کو ایک نیا منطقہ عطا کیا۔اور ایک ایسا اسلوب خلق کیا کہ جسے 'تنقید فکشن' کا نام دیا جاسکتا ہے۔

شکیل الرحمٰن اردو کے واحد ایسے ادیب ہیں جنھیں تین یونی ورسٹیوں بہار یونی ورسٹی مظفر پور، کشمیر یونی ورسٹی اور متھلا یونی ورسٹی دربھنگہ کے وائس چانسلر بننے کا شرف حاصل ہوا اور مرکزی حکومت میں کابینہ درجے کے وزیر بھی رہے۔

شکیل الرحمٰن کے شخصی اور ادبی کوائف سے ادبی حلقہ اچھی طرح آگاہ ہے کہ ان کے فن اور شخصیت پر شکیل الرحمٰن :ایک لیجینڈ (شعیب شمس)تخلیقی تنقید کا ایک منفرد دبستان (اقبال انصاری) تنقید کا ایک نیا ذہن (صدیق نقوی) شکیل الرحمٰن کی غالب شناسی (ارشد مسعود ہاشمی) شکیل الرحمٰن اور مولانا رومی کی جمالیات (صدیق نقوی) آہنگ جمالیات کے ناقد: شکیل الرحمٰن (اظہار خضر) منٹو شناسی اور شکیل الرحمٰن (کوثر مظہری) فکشن کے فنکار اور پریم چند (شیخ عقیل احمد) شکیل الرحمٰن کا جمالیاتی وجدان (حقانی القاسمی) جیسی کتابیں شائع ہوچکی ہیں اور شاعر ممبئی، روشنائی کراچی، انشا کولکاتہ کے گوشے شائع ہو چکے ہیں۔پیش ہیں شکیل صاحب سے گفتگو کے اہم اقتباس۔

سوال: اپنی زندگی کا وہ ٹکڑا بتائیں جس میں دوسروں کے لیے رشک اور روشنی کا عنصر ہو؟

جواب: میں عمر بھر کام ہی کرتا رہا۔کوشش کی کہ اپنے ملک اور قوم کی بہتر خدمت کرسکوں، اپنی زبان کی خدمت کرسکوں۔ 1952 تک پٹنہ یونی ورسٹی میں فارسی اور اردو ایک ہی شعبہ تھا۔ ڈاکٹر اقبال حسین صاحب جو فارسی کے بزرگ استاد تھے،شعبہ کے صدر تھے۔دونوں شعبوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کی جدوجہد جاری تھی۔غلام سرور صاحب جو طالب علم نہ رہے تھے، حلقہ ادب کے سربراہ کی حیثیت سے اس مہم میں پیش پیش تھے۔ میں نے 1925 میں داخلہ لیا، ترقی پسند تحریک سے وابستگی تھی۔خوب تقریریں کرتا رہتا تھا، اس وقت ڈاکٹر

سوال: اکیسویں صدی کے ادبی منظرنامے پر آپ کی کیا رائے ہے؟ فکشن اور شاعری کے حوالے سے بتائیں؟
جواب: یقیناً بہت اچھا فکشن لکھا جارہا ہے۔ بری مثالوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ ہمیں ہر وقت بیدی اور منٹو کو معیار کے طور پر اخذ نہیں کرنا چاہیے۔ البتہ ہندوستان میں اچھی شاعری کا فقدان ہے۔ موجودہ زمانوں کے شاعر مجو وقتی شاعر ہیں۔ ان کی دلچسپیاں اور ذمے داریاں کئی صیغوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ اس لیے وہ جلد از جلد کچھ کہہ کر بری الذمہ ہونے کے درپے رہتے ہیں۔ انھیں یہ فکر نہیں ہوتی کہ اپنے انفراد کو قائم کرنے کے لیے بھی پورے ایک منصوبے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مختلف علوم اور مختلف زبانوں کی شاعری کے علاوہ ہماری اپنی کلاسیکی شاعری سے بھی ان کے رشتے ڈھیلے ہیں۔ اس لیے ان کے یہاں کوئی وژن ہی نہیں ہوتا اور نہ زبان و بیان میں وہ قوت ہوتی ہے کہ فوراً اپنی طرف متوجہ کرلے اور ہم انھیں مزید پڑھنے کے لیے بے چین ہو جائیں۔

سوال: روزمرہ زندگی کی غیر ادبی مشغولیات یا دلچسپی اور شوق کے بارے میں کچھ بتائیں؟
جواب: پڑھنا، پڑھنا اور پڑھنا۔ لکھنا، لکھنا اور لکھنا۔ ٹیلی ویژن کے پروگراموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ حتیٰ کہ کبھی خبریں بھی نہیں سنتا۔ البتہ صبح کا اردو اور انگریزی اخبار میرے روزمرہ میں شامل ہے۔ ان کے بغیر میری صبح نہیں ہوتی۔ بیوی اور بچے کے لیے روز دو ڈھائی گھنٹے نکالتا ہوں۔ خوب خوش گپیاں کرتا ہوں۔ جن لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ ان کا ذکر کرتا ہوں۔ واقعات کو لطیفے کی شکل میں بیان کرکے ہنستا ہنساتا رہتا ہوں۔ میرا ذہن کھلا ہوا ہے۔ سب سے کھل کر ملتا ہوں۔ مجھے بند لوگ ہمیشہ تکلیف دہ محسوس ہوتے ہیں۔ ان سے زیادہ وہ لوگ تکلیف دہ ہیں جو اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں اور ہمیشہ دوسروں کی تعریف کے بھوکے ہوتے ہیں۔ تشہیر بازی کا زمانہ ہے جسے پبلک ریلیشنگ کا فن آتا ہے اُسے اس کی قیمت بھی ملتی ہے۔ جسے یہ فن نہیں آتا اسے کوئی صدمہ نہیں ہونا چاہیے۔ ایسے لوگوں کی بھی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔

سوال: اردو دنیا کے قارئین کے لیے کوئی پیغام...
جواب: بس اتنا ہی کہوں گا کہ زندگی بہت مختصر ہے۔ جوانی اس سے بھی مختصر تر۔ آدمی کو ہمیشہ اپنا اور اپنی صلاحیتوں کا جائزہ لینا چاہیے۔ بہت سے میدانوں میں منھ مارنے کے بجائے کوئی ایک

میدان چن لینا چاہیے۔ اگر خدا نے آپ کو تخلیق کی استعداد بخشی ہے تو اس کی قدر کرنا چاہیے۔ روز بہ روز اسے جلا بخشنے کی ضرورت ہے۔ بے دردی کے ساتھ تخلیق کے عمل کو وقت دیا تو پھر آپ کو کسی تشہیر بازی کی ضرورت نہیں، نہ کسی کی چاپلوسی اور درباداری آپ کو کوئی مستقل مقام دلا سکتی ہے۔ تحریر ہی سب سے بڑی طاقت ہے۔

سوال: اپنی پسند کے چند منتخب اشعار قارئین کی نذر کر دیں تو بڑی عنایت ہوگی:

حاضر خدمت ہے:

ہونٹوں سے ادا ہوتا ہوا لفظ ہی کب تھا
اِک سرخ گلابوں کا سماں برسرِ لب تھا
چاند اس کے آنگن میں رت جگے مناتا ہے
ڈوبنا ہے کب اس کو یہ بھی بھول جاتا ہے
عشق کے واسطے مہلت ہی کہاں ملتی ہے
سر پہ ہر وقت کوئی کارِ جہاں رہتا ہے
توڑ لے اپنے سبھی لمس کے رشتے مجھ سے
تا کہ محسوس نہ ہو عمر بہت لمبی ہے
ہم زمیں کی طرف جب آئے تھے
آسمانوں میں رہ گیا تھا کچھ
تھا سرِ جسم اِک چراغاں سا
روشنی میں نظر نہ آیا کچھ
میں آ گیا تھا خود اپنے ہی پاؤں کے نیچے
چلا گیا وہ مری بے زبانیاں لے کر

•••

شکیل الرحمٰن سے گفتگو

شکیل الرحمٰن ان نقادوں میں سے ہیں جنھوں نے تنقید کی نئی زمینوں کو دریافت کر کے ادب کو وسیع ترین آفاق عطا کیے۔ انھوں نے تنقید کی زرخیزی اور نمو کے عنصر کو تلاش کیا جس سے تنقید کا کینوس کائناتی ہو گیا۔ ان کی تنقید کی خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے وسعتوں کی جستجو کی اور اپنے ہم عصروں کی طرح محدودیت میں محصور نہیں رہے۔ انھوں نے اردو کو جمالیات کی اس لہر سے آشنا کیا جس کی بدولت اردو کو نئے افکار، اسالیب، تصورات اور تخیلات نصیب ہوئے۔ تخلیقات کی پرکھ کے نئے زاویے اور پیمانے ملے۔ تخلیق کی باطنی جمالیاتی جہتیں روشن ہوئیں۔ شکیل الرحمٰن کی تنقید بنیادی طور پر بازتخلیق ہے۔ انھوں نے تخلیق اور تنقید کے درمیان کھڑی لسانی ساخت کی دیوار کو منہدم کر دیا اور اس طرح تنقید ساخت شکنی کے تجربے سے ہمکنار ہوئی۔

جمالیات شکیل الرحمٰن کا شناخت نامہ ہے اور اس دشت جنوں میں صرف یہی ایک آبلہ پا ہے جس نے ہندوستان کا نظام جمال (تین جلدیں) مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات۔ ہندوستانی جمالیات (تین جلدیں) اساطیر کی جمالیات، میر شناسی، منٹو شناسی، امیر خسرو کی

جمالیات،مولانا رومی کی جمالیات، جمالیات حافظ شیرازی، محمد قلی قطب شاہ کی جمالیات، تصوف کی جمالیات، فکشن کے فنکار پریم چند، راگ راگنیوں کی تصویریں اور کلاسیکی مثنویوں کی جمالیات جیسی تصانیف سے اردو تنقید کو ایک نیا منطقہ عطا کیا۔ اور ایک ایسا اسلوب خلق کیا کہ جسے 'تنقید فکشن' کا نام دیا جا سکتا ہے۔

شکیل الرحمٰن اردو کے واحد ایسے ادیب ہیں جنھیں تین یونی ورسٹیوں بہار یونی ورسٹی مظفر پور، کشمیر یونی ورسٹی اور متھلا یونی ورسٹی دربھنگہ کے وائس چانسلر بننے کا شرف حاصل ہوا اور مرکزی حکومت میں کابینہ درجے کے وزیر بھی رہے۔

شکیل الرحمٰن کے شخصی اور ادبی کوائف سے ادبی حلقہ اچھی طرح آگاہ ہے کہ ان کے فن اور شخصیت پر شکیل الرحمٰن :ایک لیجینڈ (شعیب شمس) تخلیقی تنقید کا ایک منفرد دبستان (اقبال انصاری) تنقید کا ایک نیا وژن (صدیق نقوی) شکیل الرحمٰن کی غالب شناسی (ارشد مسعود ہاشمی) شکیل الرحمٰن اور مولانا رومی کی جمالیات (صدیق نقوی) آہنگ جمالیات کے ناقد: شکیل الرحمٰن (اظہار خضر) مثنوی شناسی اور شکیل الرحمٰن (کوثر مظہری) فکشن کے فنکار اور پریم چند (شیخ عقیل احمد) شکیل الرحمٰن کا جمالیاتی وجدان (حقانی القاسمی) جیسی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور شاعر ممبئی، روشنائی کراچی، انشا کولکاتہ کے گوشے شائع ہو چکے ہیں۔ پیش ہیں شکیل صاحب سے گفتگو کے اہم اقتباس۔

سوال: اپنی زندگی کا وہ ٹکڑا بتائیں جس میں دوسروں کے لیے رشک اور روشنی کا عنصر ہو؟

جواب: میں عمر بھر کام ہی کرتا رہا۔ کوشش کی کہ اپنے ملک اور قوم کی بہتر خدمت کر سکوں، اپنی زبان کی خدمت کر سکوں۔ 1952 تک پٹنہ یونی ورسٹی میں فارسی اور اردو ایک ہی شعبہ تھا۔ ڈاکٹر اقبال حسین صاحب جو فارسی کے بزرگ استاد تھے، شعبہ کے صدر تھے۔ دونوں شعبوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کی جدو جہد جاری تھی۔ غلام سرور صاحب جو طالب علم نہ رہے تھے، حلقہ ادب کے سربراہ کی حیثیت سے اس مہم میں پیش پیش تھے۔ میں نے 1925 میں داخلہ لیا، ترقی پسند تحریک سے وابستگی تھی۔ خوب تقریریں کرتا رہتا تھا، اس وقت ڈاکٹر

بھال پٹنہ یونیورسیٹی کے وائس چانسلر تھے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد دونوں شعبوں کو علیحدہ کرنے کے زبردست خواہش مند تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر بھال سے بھی گفتگو کی تھی۔ عجب اتفاق کہ انھوں نے مجھے اور سعید اختر مرحوم کو وفد کی صورت وائس چانسلر کے پاس بھیجا۔ میں نے ڈاکٹر بھال کے سامنے تقریر شروع کردی۔ یہ بری لت بعد میں نیک فال ثابت ہوئی۔ انھوں نے ہم دونوں سے کچھ سوالات کیے، ہم نے تشفی بخش جوابات دیے۔ چند دنوں کے اندر ہی شعبہ علیحدہ ہو گیا اور پروفیسر اختر اورینوی صاحب اس کے سربراہ بن گئے۔ دوسری بات جو مجھے یاد ہے وہ یہ کہ میں علی گڑھ یونی ورسٹی کے لیے سفارشات کے واسطے یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کی ایک اعلی کمیٹی میں شامل ہو کر علی گڑھ گیا۔ اس وقت شعبہ اردو میں صرف ایک پروفیسر تھے، خورشید الاسلام صاحب۔ وہ ایک اور پروفیسر شپ چاہتے تھے۔ کمیشن کا رویہ ٹھیک نہیں تھا۔ اردو اور دیگر چند شعبوں کو پروفیسر شپ دینا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے فیکلٹی آف آرٹس کی پوری ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ میں نے ایسا کیا کہ اپنی رپورٹ میں جمالیات کے ایک پروفیسر شپ کی سفارش کردی اور دس صفحات پر چیرمین کے لیے نوٹ تیار کیے۔ سفارش یہ تھی کہ اردو زبان وادب کی تعلیم کے لیے ضروری ہے کہ طلبا کو ہندوستانی جمالیات سے بھی اچھی طرح آشنا کیا جائے۔ اس طرح زبان وادب کے مطالعے کا دائرہ وسیع ہوگا۔ میری سفارش منظور ہوگئی اور شعبہ اردو میں جمالیات کے لیے پروفیسر شپ مل گئی۔ تیسرا واقعہ یہ ہے کہ میں بہار یونی ورسٹی میں وائس چانسلر ہوا تو ایک بہت پرانی جدوجہد رنگ لائی۔ وائس چانسلر کی حیثیت سے میں نے شعبہ فارسی سے شعبہ اردو کو علیحدہ کر دیا اور اس کے ایک علیحدہ سربراہ مقرر کر دیا۔ اپنی موجودگی میں شعبہ اردو کے لیے نئی عمارت میں جگہ بنوائی۔ کشمیر یونی ورسٹی کے شعبہ اردو کا وہ پہلا استاد ہوں جس نے اس شعبہ کا بنیادی پتھر رکھا۔

سوال: کیا یونیورسٹیوں میں ادبی تحقیق کی موجودہ صورت حال سے آپ مطمئن ہیں؟

جواب: میری نظر سے ڈگریوں کے لیے جانے کتنے مقالے گزرے ہیں، اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے برسوں پہلے بعض اساتذہ نے تحقیقی مقالوں کے لیے جو خاکے مرتب کر دیے ہیں، ہم اسی پر چل رہے ہیں۔ جو خاکے ٹھیک ٹھاک ہیں، ان میں ابھی تک گہرائی پیدا نہیں ہو سکی

ہے۔ مثلاً ادبی تحقیق کے لیے جس جمالیاتی فکر ونظر اور سچی تنقیدی بصیرت کی ضرورت ہے وہ موجود نہیں ہے۔ جس مصنف پہ کام ہو رہا ہے اس کی شخصیت کا تجزیہ بہت ہی کم اور ادھورا ہوتا ہے، محقق کی نظر گہرائی میں نہیں اترتی تحقیق صرف مواد سامنے رکھ دیتی ہے۔ جمالیاتی وژن اور تنقیدی بصیرت ادبی تنقید ہی عطا کر سکتی ہے تنقید تحقیق کی روح ہے۔ تحقیق سچائی تک لے جاتی ہے۔ لیکن اس سچائی کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت روایت سے اس کے رشتے کی پہچان اور وضاحت صرف بہتر جمالیاتی شعور سے ہو سکتی ہے۔

سوال: اردو کے مطالعے میں وسعت کی بات اکثر کی جاتی ہے، مگر اس کے لیے نہ تو واضح طریق کار اختیار کیا جاتا ہے اور نہ ہی کوئی حکمت عملی؟

جواب: اردو زبان جدید ہند آریائی زبان ہے اس کا رشتہ ہندوستان کے ماضی سے بہت گہرا ہے۔ یہ صرف ایک زبان ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب بھی ہے۔ پالی اور پراکرتوں سے اس کے پراسرار رشتوں پر ابھی تک نظر نہیں گئی ہے اس کا ایک بڑا سبب پالی اور پراکرتوں سے ہماری بے خبری ہے۔ ہمیں ان بولیوں کا علم حاصل نہیں ہے مطالعہ کو وسیع کرنے کے لیے ان کی جانب بھی بڑھنا ہوگا۔ اسی طرح اردو زبان وادب کا جو رشتہ ہندی عجمی روایات سے ہے ہمیں اس کی خبر بھی برائے نام ہے۔ فارسی اور ہندوی بولیوں کی جو آمیزشیں ہوتی رہی ہیں ہم نے اب تک ان پر تحقیق نہیں کی۔ تحقیق کی ہوتی تو کبیر اور جائسی وغیرہ ابھی تک اجنبی بنے نہ رہتے۔ کبیر تو اردو کے سب سے پہلے بڑے شاعر ہیں۔ کبیر اور جائسی کے کلام میں فارسی، ترکی اور ہندوی بولیوں اور پراکرتوں کے جو الفاظ اور استعارے ملتے ہیں ان سے فارسی اور ہندوی کی آمیزشوں کا علم بھی حاصل ہوتا ہے نیز اردو کی تہذیب کے تئیں بھی بیداری پیدا ہو جاتی ہے۔ اردو کی ادبی اور لسانی تحقیق نے اب تک یہ کام نہیں کیا ہے۔

سوال: آپ نے لکھا ہے کہ تنقید کا نقطۂ عروج فکشن ہے، اس کی وضاحت کی زحمت فرمائیں گے؟

جواب: تخلیق جب تک فکشن نہیں بن جاتی، بڑی اور پر عظمت نہیں ہوتی۔ مجسمہ سازی ہو، رقص ہو، فن تعمیر ہو یا شاعری سب کا نقطہ عروج یا کلائمکس فکشن ہے۔ شاعری جب تک فکشن نہیں بنتی، بڑی شاعری نہیں ہوتی۔ ہومر، گوئٹے، ملٹن، شیکسپیئر، حافظ، رومی، غالب اور اقبال، فکشن کی سحر

انگیزی ہی انھیں بلندی پر لے گئی۔ اسی طرح رقص، فن تعمیر، مجسمہ سازی کا کلائمکس فکشن ہے۔ فکشن کی سحر انگیزی تاج محل، اجنتا، نٹ راج اور گوتم بدھ کے مجسموں میں ہے۔ کتھا کلی، کتھک اور بھرت ناٹیم کی بنیاد بھی فکشن پر ہے۔ کلاسیکی رقص کا نقطۂ عروج بھی فکشن ہے۔

سوال: کیا جمالیاتی روایات کا سفر، تاریخی روایات کے سفر سے مختلف ہے؟

جواب: بڑا فن کار روایات کو اپنے انفرادی شعور اور لاشعور میں جذب کرتا ہے، پھر ادبی قدروں کا تعین کرتا ہے۔ روایتی خیالات، تصورات اور کلاسیکی روایت کے حسن کے فرق کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ بڑے شاعروں کے لاشعور میں عمدہ اور اعلیٰ روایات کا ایک پوشیدہ پارینہ خانہ (secret archive) ہوتا ہے۔ جس کا وہ استعمال کرتا رہتا ہے۔ شیکسپیئر اور غالب کی مثالیں سامنے ہیں۔ حافظ کی زبان میں جام جم اور کمھاروں کی مٹی کے فرق کو سمجھنا ضروری ہے۔ ادبی جمالیاتی روایات کا سفر عام روایات اور خصوصاً تاریخی روایات کے سفر سے مختلف ہوتا ہے۔ یہ سیدھی لکیر نہیں ہے کہ جس پر ادبی جمالیاتی روایات سفر کرتی ہیں۔ ادب کی تاریخ لکھنے والوں اور نقادوں نے اس موضوع کو جس طرح نظر انداز کیا ہے، اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ادب کی تاریخ میں ادوار کی تقسیم حد درجہ میکانکی ہوتی ہے لہٰذا روایات کے خارجی اور باطنی سفر کی جانب کوئی توجہ نہیں ہوتی۔ نقادوں کا رویہ بھی کچھ ایسا رہا کہ کبھی روایت سے بغاوت کی بات ہوئی کبھی یہ انداز رہا کہ ولی نہ ہوتے تو میر نہ ہوتے، میر نہ ہوتے تو غالب نہ ہوتے اور غالب نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ کہا جا رہا ہے کہ بابر نہ ہوتے تو ہمایوں نہ ہوتا۔ ہمایوں نہ ہوتا تو جہانگیر نہ ہوتے۔ جہانگیر نہ ہوتے تو شاہ جہاں نہ ہوتا اور شاہ جہاں نہ ہوتا تو۔ ادبی جمالیاتی روایات کا مطالعہ ہرگز ایسا ہونا نہیں چاہیے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے کہا ہے کہ ادبی روایات ہڈیوں کے اندر ہوتی ہیں۔ غالب جن روایات سے متاثر ہوئے اور انھوں نے خود جن روایات کی تشہیر کی، انہیں صرف اس طرح نہیں دیکھ سکتے کہ یگانہ چنگیزی یا کسی اور نے ان کے بعض اشعار میں فارسی کے کلاسیکی شعرا کے خیالات کی بازگشت کا ذکر کیا ہے۔ میں نے اس کا پیٹ بھر جواب غالب، بیدل اور دوسرے فارسی شعرا کے تعلق سے دے دیا ہے۔ مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کتنے سیمینار ہوتے ہیں۔ طرح طرح کے موضوعات منتخب کیے جاتے ہیں۔ ادبی روایات پر سیمینار کیوں نہیں ہوتا۔

سوال: آپ کی اہم ترین کتاب 'ہندوستان کا نظام جمال' کو خاطر خواہ پذیرائی کیوں نہیں ملی؟
جواب: ایسی کتابوں کی پذیرائی میں بہت وقت لگتا ہے انہی کے بقول اردو میں فنون لطیفہ کی
جمالیات پر یہ اپنی نوعیت کا پہلا کام ہے برسوں برسوں کی محنت کا نتیجہ ہے بدھ جمالیات سے
جمالیات غالب تک ایک بڑا کینوس ہے
سوال: آپ کی نظر میں اردو کا مستقبل کیا ہے؟
جواب: اللہ اس کا مستقبل روشن کردے بابا سائیں کی یہی دعا ہے۔

•••

سلیم اختر سے بات چیت

گذشتہ نصف صدی سے زائد پاکستانی اردو ادب کو جن ادبا، ناقدین نے اپنے رشحات قلم سے فیض یاب کیا ہے، ان میں ایک اہم نام ڈاکٹر سلیم اختر کا بھی ہے۔ ان کی متنوع موضوعات پر لکھی گئی تقریباً ستر سے زائد کتب شائع ہوئی ہیں جو جامعات سے لے کر اعلیٰ مقابلہ جاتی امتحانات تک کتب حوالہ کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔ گذشتہ دنوں ڈاکٹر صاحب سے ایک ملاقات میں ادبی موضوعات پر ان کے موقف کے حوالے سے ایک مکالمہ کیا گیا جس کی تفصیلات قارئین کی نذر ہیں۔

سوال: ڈاکٹر صاحب آپ کی پہلی کتاب کب چھپی اور اب تک کل کتنی کتب چھپ چکی ہیں؟

جواب: میں نے کم عمری ہی میں مطالعۂ کتب شروع کر دیا تھا، اسی طرح کم عمری ہی میں لکھنے کا بھی آغاز ہو گیا تھا۔ انبالہ شہر میں جب میں پانچویں یا چھٹی جماعت کا طالب علم تھا تب پہلی مرتبہ بچوں کے ایک رسالے میں میری کہانیاں چھپیں۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ 1951 تک پاکستان میں بچوں کے جتنے بھی معروف جرائد تھے ان میں میری کہانیاں مضامین اور نظمیں چھپتی رہیں۔ اسی دوران بچوں کی دو تین کتابیں بھی شائع ہو گئیں۔ ان میں سے دو کے نام

اس وقت یاد آ رہے ہیں۔ ''سانپوں کا بادشاہ'' اور ''فلم کی کہانی'' بچوں کی کہانیوں اور کتابوں سے قطع نظر پہلی مطبوعہ کتاب آرنلڈ بینٹ کی مشہور کتاب How to live on 24 hours a day کا آزاد ترجمہ 1961 میں ''صبح کرنا شام کا'' کے نام سے شائع ہوا جب کہ طبع زاد تصنیفاتی مضامین کا مجموعہ ''عورت، جنس اور جذبات'' 1964 میں شائع ہوا۔ اسے حنیف رامے نے شائع کیا تھا۔ کل کتابوں کی صحیح تعداد تو یاد نہیں عمر کی مناسبت سے ستر یا بہتر کتب تو بن جاتی ہیں۔

سوال: آپ نے اپنے آپ کو کسی ایک صنف تک محدود کیوں نہیں رکھا اور اب آپ کیا سمجھتے ہیں کہ ادب میں آپ کی پہچان کا وسیلہ کون سی صنف ہوگی؟

جواب: مجھے مختلف اصناف پر قلم اٹھاتے وقت کبھی دقت نہیں ہوتی کہ ہر نوع کا مطالعہ کر رکھا ہے اور ذہن میں اس ضمن میں خیالات واضح ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادب میں میرا ابنیادی حوالہ تنقید کا ہے اور یہی میری پہچان ہے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب جدید افسانے کا دور ختم ہو گیا، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ علامت نگاری کے رجحان نے اردو افسانے کو نقصان پہنچایا ہے اور یہ تجربہ ناکام ثابت ہوا؟

جواب: اس سوال میں جدید کا لفظ اضافی ہے۔ میری رائے میں کبھی پریم چند، یلدرم اور نیاز فتح پوری جدید تھے پھر ترقی پسند تحریک کے افسانہ نگار جدید بنے اور ان کے بعد علامت نگار۔ کل کو کسی اور انداز و اسلوب کا افسانہ جدید افسانہ کہلائے گا میں علامت نگاری کو مثبت رجحان سمجھتا ہوں اور اس کے اثرات قابل توجہ بھی ہیں۔ ہوا یہ ہے کہ بوجوہ علامت نگاری تحریک نہ بن سکی اور علامت نگاروں کا دبستان معرض وجود میں نہ آ سکا لیکن علامت کے ذریعے انسانی سائیکی کو جس طرح ایکسپلور (Explore) کیا گیا یا خارجی حقائق کی تلخیوں اور ناگفتنی کے لیے جس طرح علامت کو استعمال کیا گیا وہ قابل قدر ہے۔ لہٰذا یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ علامت نگاری کا رجحان ختم ہو گیا، یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ تجربہ ناکام ثابت ہوا۔

سوال: پاکستان میں کوئی اچھا ناول نہیں لکھا گیا اور نہ ہی ناول کی صنف نے یہاں فروغ پایا جب کہ انڈیا میں اچھے اردو ناول لکھے جا رہے ہیں؟

جواب: ہمارے ادبی خمیر میں غزل کی ریزہ خیالی شامل ہے۔ غالباً اسی لیے ناول سے ہمیں طبعی مناسبت نہیں۔ بڑا ناول لکھنے کے لیے بڑی تخلیقی شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم دوستو فسکی، گورکی، ٹالسٹائی، سارتر اور مارلیز کہاں سے لائیں لہٰذا جو دال دلیہ میسر ہے اس کو غنیمت جانیے۔ انڈیا میں بھی قراۃ العین حیدر ہی نظر آتی ہیں وہاں بھی اردو کے مقابلے میں ہندی اور بنگلہ میں زیادہ بہتر ناول لکھے گئے ہیں۔

سوال: کیا ادب میں یہ نقاد کی اجارہ داری کا دور ہے اور معیاری ادب اردو میں تخلیق نہیں ہو رہا؟

جواب: دونوں باتوں کا آپس میں تعلق نہیں۔ نقاد کی اجارہ داری کبھی کسی بھی دور میں نہیں رہی۔ مزید یہ کہ معیاری ادب کی تخلیق کا نقاد کے قلم سے کوئی تعلق نہیں۔ تنقید اور تخلیق آزادانہ اور خود کار عمل ہیں۔ پہلے ادب تخلیق ہوتا ہے۔ اس کے بعد تنقید اس کی تحسین و تشریح کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔

سوال: کیا مغرب سے درآمد تنقیدی نظریات اور تصورات سے ہمارے ادب کی تفہیم ممکن ہے؟

جواب: ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہماری تنقید کی بنیاد ہی مغربی تصورات پر استوار ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی کے ''مقدمہ شعر و شاعری'' (1893) سے اس رویّے کا آغاز ہوتا ہے۔ علوم کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ نت نئے تصورات نقد سے استفادہ کرنے کا رجحان قوی سے قوی تر ہوتا گیا۔ جب تک ہم اپنے ادب کے لیے خود اپنی بوطیقا کی تشکیل نہیں کرتے، ہم مغرب سے نظریات و تصورات کے اخذ و قبول پر مجبور ہیں۔ البتہ اس ضمن میں اتنی احتیاط لازم ہے کہ درآمدہ نظریات کو اندھے کی لاٹھی نہ بنایا جائے۔

سوال: کیا ادب کے تعین قدر کے لیے صرف نفسیاتی دبستان تنقید کافی ہے یا آپ کسی اور دبستان کے ذریعے ادب پارے کی تفہیم و تشریح کو اولیت دیں گے؟

جواب: جی نہیں! نفسیاتی دبستان تنقید سونٹھ کی گانٹھ نہیں۔ میں نے ادب پاروں کی تفہیم و تشریح کے ضمن میں نفسیات کی حدود اور امکانات کو مدِ نظر رکھا۔ نفسیات سے اس وقت کام لیا جب تک وہ کام کی ثابت ہو سکتی تھی۔ جدید علوم اور ادب و نقد کے نظریات میں بہت وسعت اور تنوع ہے اور میں بقدر ہمت سب سے استفادے کا قائل ہوں۔ ذاتی طور پر نفسیاتی دبستان

کے بعد مجھے مارکسی دبستان پسند ہے اور میں نے اس سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔عمرانی، تاریخی اور بعض دیگر علوم کا بھی اس ضمن میں نام لیا جاسکتا ہے۔نقاد کی سب پر نگاہ ہونی چاہیے اور اسے لچک دار رویے کا حامل ہونا چاہیے کہ جسے بہتر خیال کرے اُسے بروئے کار لائے۔

سوال: ادب اور تنقید لکھتے لکھتے آپ نے بنیاد پرستی کے موضوع پر ایک کتاب لکھ ڈالی، اس کے کیا محرکات تھے؟

جواب: یہ کتاب سب ہی کے لیے اچنبھا ثابت ہوئی کہ نفسیاتی تنقید اور جنسی افسانے لکھنے والا سلیم اختر بنیاد پرستی پر ایک تحقیقی کتاب بھی لکھ سکتا ہے۔ جہاں تک خیالات کا تعلق ہے تو میرے ہمیشہ سے یہی خیالات رہے ہیں اور علامہ اقبال پر لکھتے ہوئے میرے بعض مقالات میں ان کا اظہار ہو چکا تھا۔ایک کانفرنس کے لیے بنیاد پرستی پر یہی مقالہ لکھتے ہوئے اندازہ ہوا کہ ضرورت اس موضوع پر ایک کتاب کی ہے۔اس کتاب کے لیے میں نے کتنی ہی کتابیں خریدیں اور کتنی توانائی اور محنت صرف کی یہ میں ہی جانتا ہوں لیکن اس کی پذیرائی میری توقع سے بڑھ کر ہوئی اور یوں میری محنت ٹھکانے لگی۔

سوال: کیا پاکستانی ادب کی الگ سے شناخت ممکن ہے اور اس کے اصل عناصر کیا ہیں؟

جواب: ذاتی طور پر میں پاکستانی ادب، اسلامی ادب، قومی ادب، ملی ادب، مقامی ادب، جیسی اصطلاحات کو درست تسلیم نہیں کرتا۔ ادب ادب ہوتا ہے اور بس۔اسے ہوا بند ڈبوں میں پیک نہیں کیا جاسکتا۔ ہر بڑی تخلیق اور تخلیق کار جغرافیائی حدود بلکہ زمانی حدود سے بھی ماورا ہوتا ہے اگر ایسا نہ ہوتو ہم غیر ملکی ادیبوں کا مطالعہ بھی نہ کرتے۔دوستوفسکی کو روسی، سارتر کو فرانسیسی اور ہمنگوے کو امریکی قرار دینے سے ان کی اہمیت کم ہوتی ہے اضافہ نہیں ہوتا۔

سوال: ڈاکٹر صاحب آپ نے اب تک جو تحقیقی کام کیا ہے اس کے بارے میں کچھ تفصیل بتائیں؟

جواب: ایمان داری کی بات یہ ہے کہ میں خود کو محقق نہیں سمجھتا اور نہ ہی میں نے ایسا دعویٰ کیا ہے۔ تاہم تحقیق کے نقطۂ نظر سے میرے کام کا جائزہ لیں تو ''اردو میں تنقید کا نفسیاتی دبستان'' جو میرے ڈاکٹریٹ کے تحقیقی مقالے کا موضوع ہے، یہ بعد میں دو حصوں میں چھپا۔ پہلا حصہ

نفسیاتی اور دوسرا حصہ ''مغرب میں نفسیاتی تنقید'' اس کے علاوہ میرے کچھ مقالات بھی تحقیقی اہمیت کے حامل ہیں۔ مثلاً ''تخلیق اور لاشعوری محرکات'' ''زیوس سے امیر حمزہ تک'' ''ادب میں نرگسیت'' جب کہ بہت سی تحریریں ایسی بھی ہیں، جن میں تحقیقی حوالوں سے مواد جمع کیا گیا ہے۔

سوال: اردو تنقید کے معیار اور رفتار کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: ہمارے ہاں تنقید میں تیز رفتاری نظر نہیں آتی بلکہ رفتار بے حد سست ہے۔ جہاں تک معاملہ ہے معیار کا تو یہ اب کلیشے بن گیا ہے کہ تنقید زوال پذیر ہے۔ کوئی ادیب یا شاعر نظر نہیں آتا جس کا انٹرویو شائع ہوا ہو اور اس نے ناقدین کو برا بھلا نہ کہا ہو اور ایسے الزامات نہ لگائے ہوں کہ ادب میں گروہ بندی ہے، مضافات کے ادیبوں کو پوچھا نہیں جاتا۔ میرا کہنا یہ ہے کہ ایسے شخص سے یہ پوچھا جائے کہ کیا تم نے پچھلے سال میں جو تنقید لکھی گئی ہے، وہ تمام پڑھی ہے اور اس کے اہم رجحانات کا علم ہے۔ اکثر کی ذہنی اوقات یہ ہوتی ہے کہ وہ ان باتوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ جب کوئی یہ کہتا ہے کہ تنقید کا معیار گر گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خود اس پر تنقیدی مقالات نہیں لکھے جا رہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں نقاد کا یہ کام سمجھ لیا گیا ہے کہ وہ کتابوں کی تقاریب میں توصیفی مقالے پڑھے، اگر صرف اس پر مقالات لکھے جائیں تو تنقید کا معیار اونچا ہے وگرنہ نہیں۔ اگر آپ یہ نہیں کرتے یا سچ بولتے اور لکھتے ہیں تو آپ کی خیر نہیں۔ یہ ادب میں غنڈہ گردی کا دور ہے۔ میں لاہور میں رہتا ہوں، سب کی علمی اوقات جانتا ہوں، آپ کسی کے بارے میں سچ لکھ دیں تو لوگ گریبان پکڑنے تک آ جاتے ہیں۔ ٹیلی فون پر گالیاں دی جاتی ہیں اور دھمکی آمیز خطوط ملتے ہیں۔ میں ان تمام مرحلوں سے گزر چکا ہوں۔ معاصرین پر جو لکھتا ہے وہ تو گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال کر بیٹھ جاتا ہے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب زندگی کیا ہے اور اگر یہ آپ کو دوبارہ ملے تو اسے کیسے بسر کرنا چاہیں گے؟

جواب: پاکستان کے منافق، کرپٹ، پرآلائش، خود غرض اور بے بنیاد معاشرے میں صاف ستھری زندگی بسر کرنا نائٹ میئر کے مترادف ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی میں نے خود کو نائٹ میئر میں پایا اور اب بھی یہی عالم ہے۔ میں خوب صورت خواب دیکھنے والا ٹین ایجر تھا۔ اس

معاشرے نے مجھے قنوطی بنا کر میری سوچ کو منفی بنا دیا۔ اس معاشرے نے مجھ سے میرے خواب چھین لیے ہیں۔ دو افراد کی چند سیکنڈ کی لذت جس تیسرے فرد کو جنم دیتی ہے وہ بالعموم خسارے کی زیست بسر کرتا ہے۔ جنم پر اختیار نہ موت پر۔ فانی نے درست کہا تھا:

زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

اور سارتر نے کہا تھا: "Hell is other people" میرا بھی یہی حال ہے میں introvert تو تھا ہی اب مردم بے زار بھی ہو چکا ہوں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میرے احباب اسے کبھی نہ تسلیم کریں گے۔

سوال: بہ حیثیت ادیب و دانشور آپ پاکستان کے مستقبل کو کیسا دیکھتے ہیں؟

جواب: میں جین ڈکسن تو نہیں کہ مستقبل کی تصویر دیکھ سکوں لیکن میری کامن سنس مجھے یہ سمجھاتی ہے کہ پاکستان کا مستقبل بھی اس کے ماضی جیسا ہی ہوگا۔ وائٹ ہاؤس کے احکام کی باجبر واکراہ تعمیل، فوجی آمریت، فرعون صفت بیورو کریسی، عدل نا آشنا نظام، طالع آزما لیڈر، کھانے پینے والے سیاستداں، رشوت، کرپشن، اقربا نوازی، امارت اور غربت کے مابین خلیج، جمہوریت کی قبا میں آمریت، مذہبی تفرقہ اور تشدد، جی خوش ہوا یا مزید بھی کچھ کہوں۔

سوال: پاکستان میں اقبال شناسی کے حوالے سے کیے گئے کام کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: تشریحی انداز، کلاس نوٹس، تکرار، توارد براہ راست مطالعے کے بغیر مغربی فلاسفروں کے حوالے، بے جان اسلوب ذاتی رائے کے اظہار سے عمومی اجتناب، کلیشے، تازہ نگاہی کا فقدان، مجاوریت۔

سوال: کیا سرکاری سطح پر قائم ادبی ادارے اپنے فرائض احسن طریقے سے انجام دے رہے ہیں؟

جواب: سرکاری اداروں کے مقاصد خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں بالآخر وہ کتابیں چھاپتے ہیں۔ یقیناً یہ تو ہو ہی رہا ہے۔ میرا ایک دو اداروں سے تعلق رہا ہے۔ میں اپنے تجربے کی روشنی میں کہہ

سکتا ہوں کہ اگر ادارہ فعال نہیں تو اس کا سبب اس کا سرکاری ہونا ہے۔ کلرک نے فائل دبالی، متعلقہ سکریٹری نے گرانٹ میں کٹوتی کرلی۔ گرانٹ کا وقت پر نہ ملنا اس طرح کے ان اداروں کے متعدد مسائل ہوتے ہیں۔ مجھے تو اس پر تعجب ہے کہ نامساعد حالات میں بھی یہ ادارے کچھ کام کر لیتے ہیں۔

•••

تحقیق

خلیق انجم سے ملاقات

ڈاکٹر خلیق انجم اردو زبان وادب کی سب سے فعال شخصیتوں میں سے ایک ہیں اور برصغیر ہند و پاکستان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو تحقیق و تدوین کے شعبے میں اُن کی علمی و فنی استعداد و صلاحیت کا مقابلہ یا برابری کر سکے۔ زیرِ نظر انٹرویو میں خلیق انجم صاحب نے تفصیل سے بتایا ہے کہ تنقید کے مقابلے میں انھوں نے تحقیق و تدوین پر کیوں زیادہ توجہ دی ہے۔ اس کے علاوہ یہ انٹرویو اُن کی گھریلو زندگی اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو بھی سامنے لاتا ہے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! سب سے پہلے گزرے وقتوں کی باتیں کرتے ہیں۔ آپ اپنے آباواجداد اور خود اپنے بارے میں کچھ بتائیں۔

جواب: ہمارے خاندان میں ایک شجرۂ نسب تھا جس کے بارے میں سنا تھا کہ اس شجرۂ نسب کو وہ بڑی احتیاط سے رکھتے تھے اور اس شجرہ پر انھیں بہت فخر تھا۔ یہ شجرہ ہمارے تایا سے والد کو ملا۔ شجرہ اور خاندان سے متعلق بہت سی دستاویزات ایک بڑے سے ٹین کے صندوق میں رکھے رہتے تھے۔ سن 47 کے فسادات میں یہ پورا ٹین کا صندوق ضائع ہوگیا۔ میں نے اپنے آباواجداد کے بارے میں خاص طور سے اپنی سب سے بڑی پھوپھی سے سنا تھا۔ اس کی رو سے ہم

روہیلے پٹھان ہیں۔ اچھی طرح یاد ہے کہ میرے بچپن میں کچھ مہمان افغانستان سے آتے تھے اور ہمارے گھر میں پندرہ۔بیس دن رہتے تھے۔ یہ لوگ شلوار قمیض اور انگریزی انداز کا کوٹ پہنتے تھے۔ سر پر ان کے پگڑی ہوتی تھی۔ والد کے انتقال کے بعد ان میں سے ہمارے رشتہ داروں میں صرف ایک صاحب ایک دفعہ ہمارے یہاں آئے غالباً پُرسے کے لیے آئے تھے۔ پھر اس کے بعد ہم نے کبھی ان لوگوں کی شکل نہیں دیکھی۔ میری سب سے بڑی پھوپھی کو میرے آباؤ اجداد کے حالات کا خاصا علم تھا۔ پھوپھی کی زبانی سنا تھا کہ ہمارے خاندان کے ایک بزرگ ہندوستان آئے تھے۔ ہندوستان آ کر وہ شاہی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ غالباً کسی بڑے عہدے پر فائز نہیں ہوئے تھے۔ خاندان کے کچھ لوگ لاہور میں رنجیت سنگھ کے ملازم ہو گئے تھے۔ ہمارے پردادا ثمر خاں کے بارے میں روایت ہے کہ وہ بہت بہادر اور جری سپاہی تھے۔ اپنے چچا، تایا اور بڑی پھوپھی سے سنا تھا کہ ثمر خاں صاحب پڑھے لکھے تو تھے لیکن زیادہ نہیں۔ ہمارے دادا کا نام اصغر خاں تھا۔ ان کے ایک بھائی رامپور میں مقیم تھے۔ یہ دونوں بھائی صاحبِ حیثیت تھے۔ کسی بات پر دونوں بھائیوں میں اختلاف ہوا اور ہمارے دادا اصغر خاں رامپور میں ساری جائیداد چھوڑ کر دہلی آ گئے تھے اور پھر کبھی رامپور نہیں گئے۔ ہماری پھوپھی نے بتایا تھا ہمارے خاندان کے لوگ رامپور میں گھیر مُلا غیرت خاں میں رہتے تھے۔ میں اپنی پی ایچ ڈی کے سلسلے میں اکثر رضا لائبریری رامپور جاتا تھا۔ بہت کوشش کی کہ اپنے خاندان کے لوگوں سے ملاقات کر سکوں لیکن ان میں سے کسی کا پتا نہیں چلا۔

سوال: کچھ اپنے والد کے بارے میں بتائیے۔

جواب: میرے والد خاندان کے سب سے زیادہ پڑھے لکھے آدمی تھے۔ مگر ان کے پاس کیا ڈگریاں تھی۔ اس کا مجھے علم نہیں ہو سکا۔ وہ ریلوے میں انجینئر تھے۔ پتا نہیں کہاں تک صحیح ہے لیکن خاندانی روایت کے مطابق شملے میں جب پہاڑوں پر ریل کی پٹری بچھائی جا رہی تھی تو والد مرحوم پر بھی اس کام کی ذمے داری تھی۔ والد بہت اچھے آرٹسٹ بھی تھے اور عام طور سے وہ اشتہاروں کے لیے اسکیچ بناتے تھے۔ وہ دولت مند تو نہیں تھے لیکن اتنی آمدنی ضرور تھی کہ زندگی آرام سے گزر رہی تھی۔ ہمارے نانا پروفیسر عزیز الرحمٰن انگریزوں کو اردو پڑھاتے

تھے۔ دہلی کے لال قلعے میں انگریزوں کو اردو کی تعلیم دینے کے لیے ایک کالج بنایا گیا تھا۔ایک اطلاع کے مطابق میرے نانا پروفیسر عزیز الرحمٰن اس کالج کے پرنسپل تھے۔ فارسی اردو کے معلم تھے اور انگریزی پر انھیں بہت اچھی قدرت حاصل تھی۔ پروفیسر عزیز الرحمٰن نے سات جلدوں میں علم مجلسی کے نام سے اردو شعروں کی ڈکشنری مرتب کی تھی۔ میرے لڑکپن میں اس کتاب کے بار بار اڈیشن شائع ہوتے تھے۔انھوں نے انگریزوں کو اردو پڑھانے کے لیے کئی نصابی کتابیں لکھی تھیں ان کتابوں میں انگریزی فقروں کا اردو ترجمہ رومن میں لکھا گیا تھا۔

سوال: میں نے سنا ہے کہ آپ کے نانا مرحوم نے انگریزی میں بھی کتابیں لکھی تھیں۔

جواب: نانا مرحوم نے دہلی کی جامع مسجد پر انگریزی میں بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ جس میں جامع مسجد کی مستند تاریخ بیان کی گئی تھی۔ اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے تھے۔ میری والدہ قیصر سلطانہ صاحبہ غیر معمولی صلاحیتوں کی خاتون تھیں۔ چوں کہ نانا مرحوم انگریزوں کے ساتھ رہتے تھے۔ اس لیے وہ عورتوں کی تعلیم کے بہت حامی تھے۔ انھوں نے اپنے تمام لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کو بھی باقاعدہ تعلیم دلائی۔ میری والدہ مرحومہ نے دہلی کے ایک پبلک اسکول فرانسیسی گرلز ہائی اسکول میں تعلیم پائی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمان لڑکی کا تعلیم کے لیے گھر سے باہر جانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ والدہ نے مڈل کا امتحان پاس کیا تھا کہ ان کی شادی طے ہوگئی اور تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ہمارے بچپن میں والد اور والدہ انگریزی میں بے تکلف بات کرتے تھے اور والد کی وفات کے بعد کوئی ایسا نہیں رہا جس سے والدہ انگریزی میں بات کر سکیں۔ اس لیے انھیں انگریزی بولنے کی مشق نہیں رہی۔ ہماری والدہ کوئی بہت بڑی ادیب تو نہیں تھیں لیکن مجھے ان کے دس بارہ مضامین یاد ہیں جو ان کے زمانے میں کئی اردو رسالوں میں شائع ہوئے تھے۔ یہ مضامین عورتوں کے سماجی مسائل پر تھے۔ والدہ مرحومہ قیصر سلطانہ عزیزی کے نام سے لکھتی تھیں۔ والد کا 35-30 سال کی عمر میں تقریباً ایک سال کی بیماری کے بعد انتقال ہوگیا۔ جو تھوڑا بہت اثاثہ گھر میں تھا جس میں والد مرحوم کا پروویڈنٹ فنڈ بھی تھا سب ڈاکٹروں کی نذر ہوگیا۔ والد صاحب کا انتقال ہوا ہے

تو ہم پانچ بھائی بہن تھے یعنی ایک لڑکا (میں) اور چار لڑکیاں۔ والدہ مرحومہ نے پڑوسن کی ایک بچی کو گود لے لیا تھا۔ اپنے اور بچوں کی طرح اس بچی کو بھی اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ والد کی وفات کے بعد ہمارے خاندان پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ والدہ مرحومہ کی خودداری یہ گوارہ نہیں کرسکتی تھی کہ وہ کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرتیں۔ ایک صاحبِ ثروت خاندان میں ناز ونعمت سے پلی ہوئی ایک لڑکی نے سلائی کا کام شروع کیا۔ گھروں پر جاکر ٹیوشن کیے اور اس کے ساتھ ہی دوبارہ اپنی تعلیم بھی جاری کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے پرائیویٹ امتحان دینے شروع کیے جب انھوں نے بی اے کا امتحان پاس کرلیا تو اساتذہ کی تربیت حاصل کرلی اور بالآخر اس قابل ہوگئیں کہ ملازمت کرسکیں۔ والدہ مرحومہ خاندان کی پہلی خاتون تھیں جنھوں نے ملازمت کے لیے گھر سے باہر قدم رکھا تھا۔

سوال: بتائیے کہ آپ کی صحیح تاریخ پیدائش کیا ہے اور یہ بھی کہ اس پر اختلاف کیوں پایا جاتا ہے؟

جواب: دیکھیے! ایک زمانہ تھا جب لوگ تاریخ پیدائش کے سلسلے میں بہت احتیاط سے کام نہیں لیتے تھے۔ آپ اردو ادب کی پوری تاریخ اُٹھا کر دیکھیے 70-60 فیصدی ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ ولادت پر اختلاف ہے۔ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا۔ مجھے ایک پرائیویٹ اسکول میں داخلہ کرانے خاندان کے ایک بزرگ لے گئے تھے اور جو تاریخ پیدائش ان کی سمجھ میں آئی وہ انھوں نے لکھوا دی۔ یہ ایک لمبا قصہ ہے۔ میرے دشمن ہمیشہ یہ ثابت کرنے میں لگے رہے کہ اسکول کے سرٹیفیکٹ میں جو میری تاریخ ولادت دی گئی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ میری عمر اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ایک روایت کے مطابق 22 دسمبر 1935 کو اور بقول پھوپھی کے 22 دسمبر 1938 کو میں پیدا ہوا تھا۔

سوال: آپ اپنی تعلیم کے بارے میں بھی تو کچھ بتائیے؟

جواب: میرے لڑکپن میں اینگلو عربک اسکول کی چار شاخیں تھیں۔ تین لڑکوں کے لیے اور ایک لڑکیوں کے لیے۔ میں دریا گنج شاخ میں پڑھتا تھا۔ ساتویں کلاس میں تھا جب 1947 کے ہنگامے ہوگئے اور اسکول بند ہوگیا۔ 6 مہینے بعد اینگلو عربک اسکول کی اجمیری گیٹ شاخ کھل گئی۔ میں اس اسکول میں داخلے کے لیے گیا۔ چوں کہ اس وقت نویں کلاس میں

طلبا کی تعداد بہت کم تھی۔ اس لیے پرنسپل صاحب نے چند سیدھے سادھے اور معمولی سے سوال جواب کے بعد مجھے نویں کلاس میں داخل کرلیا۔ اس اسکول میں پہلے ہی دن میری ملاقات ڈاکٹر اسلم پرویز (محمد اسلم خاں) سے ہوئی۔ اسلم پرویز صاحب سے میری دوستی ایسی ہوئی کہ چالیس پچاس سال گزرنے کے باوجود آج بھی ہم ایک دوسرے کے بہترین دوست ہیں۔ ہماری دوستی کی اصل بنیاد ادب میں دل چسپی تھی۔ میں ناول اور افسانوں کا مطالعہ کرتا تھا اور اسلم صاحب کے زیرِ مطالعہ شاعری کے مجموعے زیادہ رہتے تھے۔ رہبر پرتاپ گڑھی صاحب نام کے ایک بزرگ اسکول میں ہمارے اردو کے استاد تھے۔ وہ آج کل کے اساتذہ کی طرح طالب علموں کی تعلیم سے لاپرواہ نہیں رہتے تھے۔ وہ بہت اچھے شاعر تھے اور زبان پر انھیں پوری قدرت حاصل تھی۔ ادب میں دل چسپی رکھنے والے طلبا پر بہت مہربان رہتے تھے۔ اس لیے مجھے اور اسلم پرویز کو ان سے بہت قربت حاصل ہوگئی۔ وہ غالب کے بہت عاشق تھے۔ غالب کے بیشتر اشعار انھیں یاد تھے اور موقع بہ موقع غالب کے اشعار سناتے رہتے تھے۔ ہماری چھٹی 12 بجے ہو جاتی۔ چھٹی کے بعد اسکول کے کھیل کے میدان میں ایک درخت کے نیچے محفل جمتی۔ رہبر صاحب میرِ محفل ہوتے اور حاضرین میں پانچ چھ طلبا۔ رہبر صاحب اکثر غالب کے شعر سناتے۔ ان کا تفصیل سے مطلب بیان کرتے۔ پھر وہ غالب کا کوئی شعر سنا کر اس کا مطلب معلوم کرتے۔ اگر کوئی طالب علم صحیح مطلب بتا دیتا تو اسے جیب سے نکال کر گڑ کی ایک ڈلی دیتے۔ اکثر یہ گڑ کی ڈلی مجھے ملتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اردو بازار سے غالب کے دیوان کی شرح خرید لی تھی۔ میں نے عرصے تک یہ راز اپنے عزیز ترین دوست اسلم صاحب کو بھی نہیں بتایا تھا۔ کبھی کبھی صورت بہت دل چسپ ہو جاتی۔ میں شعر کا مطلب تو صحیح بتا دیتا لیکن لفظوں کا مطلب غلط ہوتا۔ بہت عرصے بعد رہبر صاحب پر میری اس شرحِ دیوانِ غالب کا راز کھلا۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ مجھ پر ناراض نہیں ہوئے۔ بلکہ انھوں نے ہنس کر یہ کہا کہ چلو اس بہانے تم نے غالب کے اتنے سارے اشعار کا مطلب تو سمجھ لیا۔

سوال: میں نے سنا ہے کہ آپ کا اصل نام خلیق احمد خاں ہے بعد میں اسے بدل کر خلیق انجم کیا ہے۔ اس کا کیا راز ہے؟

جواب: بچپن میں میرا نام غلام احمد خاں تھا۔ اسکول کے لڑکے مجھے غلام کہہ کر چھیڑتے تھے۔ میں نے اپنی والدہ سے اس کی شکایت کی تو انھوں نے میرا نام خلیق احمد خاں کر دیا۔ ادب میں جب میری دل چسپی بڑھی تو میں نے پہلے خلیق اقبال اور پھر اسلم پرویز کے مشورے سے خلیق انجم رکھ لیا۔

سوال: کچھ حالات اپنے بہن بھائیوں کی بھی بتائیے۔

جواب: میری والدہ جب ریٹائر ہوئیں ہیں تو وہ ایک اسکول کی ہیڈ مسٹریس تھیں۔ ان کی پوری کوشش تھی کہ ان کے تمام بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ ان کا کہنا تھا کہ میں اپنے لڑکے اور لڑکیوں کو اتنی تعلیم دینا چاہتی ہوں کہ وہ بُرے حالات میں کسی کے محتاج نہ رہیں۔ میری دو بہنیں کینیڈا میں ہیں جہاں وہ دونوں لائبریری میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہی ہیں اور دو بہنیں دہلی میں ہیں۔ میری بڑی بہن طلعت سعید ذاکر حسین کالج کی اسسٹنٹ لائبریرین کی حیثیت سے ریٹائر ہوئیں۔ ثریا دہلی کے ایک گورنمنٹ اسکول میں پڑھاتی تھیں اور اب وہ بھی ریٹائر ہو گئی ہیں۔ سب سے چھوٹی بہن عذرا کراچی میں ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔

سوال: اردو میں آپ تحقیق و تنقید کی طرف کیوں راغب ہوئے؟ تخلیق کے میدان میں آپ نے قدم کیوں نہیں رکھا؟

جواب: بات یہ ہے کہ کس ادیب کو کس صنفِ سخن میں دل چسپی ہوتی ہے اور کس صنفِ سخن میں وہ اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے متعلق تفصیل سے کچھ بتانا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ در اصل قدرت کی دین ہوتی ہے۔

سوال: پہلے آپ شعر بھی کہتے تھے۔ ویسے بھی آپ کا تخلص 'انجم' اسی کا غماز ہے۔

جواب: جی! آپ صحیح فرماتے ہیں۔ پہلے تو میں یہ بتا دوں کہ تنقید میں مجھے زیادہ دل چسپی نہیں رہی۔ یہ کہاں تک صحیح ہے کہاں تک غلط یہ میرے لیے بتانا مشکل ہے۔ میرے سینئر پارٹنر خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم جو ادب کے میدان میں میری ذہنی تربیت کے ذمے دار تھے۔

انھوں نے مختلف موقعوں پر مجھ سے کہا کہ آپ تنقید میں مت آیئے۔ کیوں کہ اردو میں تنقید کا کام صرف مغربی ادب کو اردو میں منتقل کرنے کا نام ہے۔ آپ اگر شروع ہی سے اس کاروبار میں پڑ گئے تو پھر کوئی بڑا کام نہیں کر سکتے۔ ان کی یہ بات میرے دل کو لگ گئی۔

سوال: آپ کے بارے میں کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ نے تحقیق میں کوئی بنیادی کام نہیں کیا ہے۔ آپ کے بڑے کاموں میں سرسید کی تحقیقی کتاب آثار الصنادید اور غالب کے خطوط ہیں۔ یہ کام تو پہلے بھی ہو گئے تھے۔ آپ نے تو صرف ان کاموں کو اَپ ٹو ڈیٹ کیا ہے؟

جواب: یہ باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جنھیں تحقیق کا ذرہ بھر شعور نہیں ہے یا جو بنیادی طور پر میرے مخالف ہیں۔ میں آپ سے صرف یہ عرض کروں گا کہ کلاسیکی ادب کو کس طرح ایڈٹ کیا جاتا ہے۔ اس پر متنی تنقید کے نام سے اردو میں میری پہلی کتاب ہے۔ یہ کتاب 1967 میں شائع ہوئی تھی اور مجھے خوشی ہے کہ اس کا دوسرا ضخیم ایڈیشن دو تین سال پہلے ہی شائع ہوا ہے۔ یہ کتاب ہندوستان اور پاکستان کی بیشتر یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ میں نے صرف ترتیب و تدوین کا کام ہی نہیں کیا ہے۔ کچھ ایسی کتابیں بھی لکھی ہیں جو میرے نقطۂ نظر سے اہم ہیں۔ مثلاً پہلی کتاب متنی تنقید، دوسری میری نظر سے اہم کتاب 'غالب کا سفر کلکتہ'، ایک کتاب اور 'غالب اور شاہانِ تیموریہ'۔ میں نے دلّی کی عمارتوں پر دو طبع زاد کتابیں لکھی ہیں ایک تو 'دلّی کی درگاہ شاہِ مرداں' اور دوسرے 'دلّی کے آثارِ قدیمہ'۔ میری مطبوعہ اہم کتابوں میں مرزا محمد رفیع سودا پر بھی ایک کتاب ہے جو ہندوستان اور پاکستان کی بیشتر یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ حسرت موہانی میری تدوینی کتاب نہیں تحقیقی کتاب ہے۔ میں نے کربل کتھا کا لسانی مطالعہ کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو خلیق اور نارنگ کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب بھی تدوین کا کام نہیں ہے۔ اس کے علاوہ میری اور بھی بہت سی کتابیں ہیں مثلاً پروفیسر 'خواجہ احمد فاروقی'، 'مجھے سب یاد ہے ذرا ذرا' خاکوں کا مجموعہ ہے۔ میری کل کتابوں کی تعداد 67-66 ہے۔ جن میں طبع زاد کتابوں کی تعداد 16-15 کے قریب ہے۔ اگر آپ تحقیق اور تدوین کو دوسرے درجے کا کام سمجھتے ہیں تو اردو میں تحقیقی کام ابھی شروع ہی نہیں ہوا۔ حافظ محمود شیرانی، مولانا امتیاز علی عرشی، قاضی

عبدالودود وغیرہ کے کام معرکتہ الآرا ہیں۔ ہندوستانی ادب میں اتنا اعلیٰ درجے کا کام کسی اور نے نہیں کیا۔ اگر مجھ پر یہ الزام ہے کہ میں نے کوئی معقول کام نہیں کیے تو یہ الزام ان بزرگوں پر بھی عاید ہوتا ہے۔ سرسید کی آثار الصنادید تو میں نے ترتیب دی تھی اور اگر آپ اس کتاب پر غور کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا یہ کتاب ایک جلد میں تھی اور میں نے اسے تین جلدوں میں مرتب کیا۔ دو جلدوں میں اس کے حواشی لکھے ہیں۔ غالب کے خطوط کا یہ معاملہ ہے کہ اس کا متن تیار کرنے میں مجھے خون پسینہ ایک کرنا پڑا ہے۔ یہ آسان کام نہیں ہے۔ یہ پانچ جلدوں میں کام ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ غالب کا کوئی اردو خط ان جلدوں سے باہر نہ رہ جائے۔ اس میں مجھے مزا بھی بہت آیا۔ دراصل، جیسا کہ میں نے عرض کیا، تحقیق کی طرف مجھے راغب کرنے میں خلیل الرحمٰن اعظمی کا زیادہ ہاتھ ہے۔ انھوں نے میرے علم اور صلاحیتوں کا بہت اچھا جائزہ لے کر مشورہ دیا تھا کہ تم تحقیق کرو۔ کیوں کہ تحقیق پِتّا مارنے کا کام ہے اور یہ صلاحیت تم میں ہے۔

سوال: آپ نے شاعری بھی کی ہے؟

جواب: جی ہاں کی ہے۔ بس اس کا ایک دلچسپ قصہ سن لیجئے۔ رہبر پرتاپ گڑھی مرحوم نے ایک دفعہ مجھے اور ڈاکٹر اسلم پرویز کو مصرع طرح دے کر یہ کہا کہ دو چار دن میں اس طرح پر غزل لکھ کر لاؤ۔ میں نے اور اسلم پرویز دونوں نے اس مصرعے پر غزل کہی۔ میرا خیال تھا کہ میری غزل اسلم پرویز کی غزل سے بہتر ہوگی۔ اس لیے میں نے پہلے اپنی غزل رہبر پرتاپ صاحب کی خدمت میں پہلے پیش کی۔ مرحوم نے میری غزل پڑھی اور اسے ایک طرف رکھ دیا اور پھر اسلم کی غزل پڑھنی شروع کی۔ کچھ دیر بعد انھوں نے میری غزل پھر اُٹھائی اور مجھے یقین ہوگیا کہ میری غزل رہبر صاحب کو زیادہ پسند آئی ہے۔ آخر میں رہبر صاحب نے میری غزل مجھے واپس کرتے ہوئے کہا کہ آپ اردو شاعری پر رحم فرمایئے۔ نثر میں طبع آزمائی کیجئے۔ شاعری آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس واقعے کے بعد میں نے کبھی شاعری نہیں کی۔

سوال: آپ نے اردو ادب میں جعلی تحریروں پر بھی تحقیقی کام کیا ہے۔ اس کے بارے میں بھی کچھ بتایئے اور یہ بھی بتایئے کہ آپ اس کام کو کیوں اہم سمجھتے ہیں؟

جواب: آپ نے سوال کیا کہ جعلی تحریروں پر توجہ دی ہے۔ اس موضوع پر ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ میں یہاں صرف ایک مثال دینا چاہتا ہوں سید محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی نے نادر خطوط غالب کے نام سے ایک کتاب مرتب کی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کتاب میں 27 خطوط ہیں جن میں صرف ایک اصلی ہے باقی سب جعلی ہیں۔ کیا آپ کے خیال سے ان جعلی خطوط کی نشاندہی نہیں کرنی چاہیے۔ تمام محققین اس پر متفق ہیں کہ ان جعلی خطوط کی نشاندہی ضروری ہے۔ تحقیق کا ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ جعلی الحاقی تحریروں کی نشاندہی کرے اور یہ بھی بتائے کہ کون سی تحریریں ایسی ہیں جن پر سرقہ اور توارد کا الزام لگایا جاتا ہے۔ رحمانی صاحب یہ اردو اور فارسی ہی میں نہیں دنیا کے بڑے ادب میں بھی محققوں کی کوشش رہی ہے کہ اس طرح کی تحریروں کی نشاندہی کر سکیں۔ ہمارے یہاں بعض نقادوں نے کچھ ایسی تحریروں پر بڑے لمبے لمبے مضامین لکھے ہیں۔ جن کا ان مصنفین سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ جیسے نقاد نے بیان کیا ہے۔ اگر آپ کسی بھی نقاد کے فکری رویّوں کو سمجھنا چاہتے ہیں تو پہلے آپ کو یہ بتانا ہوگا کہ وہ کون سی تحریریں ہیں جن کا تعلق ان شاعروں اور ادیبوں سے نہیں ہیں، جن پر آپ مقالہ لکھ رہے ہیں۔

سوال: اردو میں جو تحقیقی کام ہوا ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: آپ تو تدوین کے کام کو بہت معمولی درجے کا کام سمجھتے ہیں۔ جب کہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے کلاسیکی ادب کی بنیاد تدوین کے ہی کام پر ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے مرتبہ دیوانِ غالب کی اردو میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ہمارے متنی نقادوں نے اپنی تدوین کے ذریعے بہت سے اہم متون مرتب کر کے ان کی اصل شکل بتانے کی کوشش کی ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اردو میں اگر رشید حسن خاں مرحوم نہ ہوتے تو باغ و بہار، جعفر زٹلی، مثنویاتِ شوق، گلزارِ نسیم، سحر البیان، فسانۂ عجائب، ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی، دہلی کی آخری شمع، مصطلحاتِ ٹھگی، کلاسیکی ادب کی فرہنگ وغیرہ جیسی اہم تخلیقات کا متن ہمیشہ کی طرح بے شمار غلطیوں سے لبریز رہتا۔ کیا آپ ہندوستان اور پاکستان میں کوئی ایسی یونیورسٹی بتا سکتے ہیں جس کے نصاب میں رشید حسن خاں کی کتابیں شامل نہ ہوں۔

سوال: آپ کے پی ایچ ڈی کا موضوع کیا تھا؟

جواب: یہ لمبی کہانی ہے۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی میرے استاد تھے جب پی ایچ ڈی کا موضوع منتخب کرنے کا وقت آیا تو انھوں نے مجھے مرزا مظہر جانِ جاناں پر تحقیقی مقالہ لکھنے کا مشورہ دیا۔ مجھے یہ موضوع پسند نہیں تھا لیکن خواجہ صاحب کے اصرار پر مجھے اس موضوع پر کام کرنا پڑا۔ مگر میں نے ایک ترکیب نکالی جب میں مرزا مظہر جان جاناں کے تحقیق کے سلسلے میں رامپور، پٹنہ، حیدرآباد اور دوسرے شہروں کی بڑی لائبریریوں سے استفادہ کے لیے جاتا تو مرزا محمد رفیع سودا پر بھی تحقیقی مواد جمع کرتا رہتا۔ پی ایچ ڈی کا مقالہ یونی ورسٹی میں پیش کرنے کے بعد میں نے تقریباً 6 مہینے میں مرزا محمد رفیع سودا پر اپنی کتاب تحریر کردی اور خدا کا شکر ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں اس کتاب کی بہت پذیرائی ہوئی۔

سوال: اپنے ہم عصروں میں آپ کس کے تحقیقی کام سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں یا کس سے آپ کوئی بڑا کام کرنے کی توقع رکھتے ہیں؟

جواب: تحقیق اور متنی تنقید کے کام قاضی عبدالودود، حافظ محمود شیرانی، رشید حسن خاں، پروفیسر گیان چند جین اور آج کے متنی نقادوں میں حنیف نقوی اور کاظم علی خاں وغیرہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے تحقیق اور متنی تنقید کے میدان میں بہت اچھے کام کیے ہیں اور جن سے ہمیں اعلا درجے کی متنی تنقید کی امیدیں ہیں۔

سوال: سرکاری اردو اداروں، مثلاً قومی اردو کونسل اور ریاستی اکادمیوں کی کارکردگی سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں۔ خاص طور سے قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں میں اچانک جو غیر معمولی اضافہ ہوا ہے اسے آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب: میں تمام اردو اکیڈمیوں کی کارکردگیوں سے پوری طرح تو مطمئن نہیں ہوں لیکن بعض اکیڈمیوں نے یقیناً کچھ اچھے کام کیے ہیں۔ اکیڈمی کے اچھے یا بُرے کام کا انحصار اکیڈمی کے سربراہ پر ہوتا ہے۔ اب رہا سوال قومی کونسل کا تو میں بہت پہلے 'ہماری زبان' میں قومی کونسل کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرچکا ہوں۔ مجھے دلی مسرت ہے کہ اس کے ڈائریکٹر ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ نے جو پچھلے برسوں میں کام کیے وہ قومی کونسل میں اس سے پہلے کبھی نہیں

ہوئے۔ کام کرنے والوں کی ہمیشہ مخالفت ہوتی ہے۔ چناں چہ بھٹ صاحب کی بھی مخالفت ہوئی۔ میرا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ جولوگ بہت اچھا کام کریں گے ان کی مخالفت ضرور ہوگی۔ بھٹ صاحب نے پورے ہندوستان میں اردو کو ایک نئی زندگی دی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ابھی تک ان کے مخالفین نے ان کی تاریخ ولادت کی تلاش شروع نہیں کی ہے۔ بھٹ صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کی صلاحیتوں کے ادیبوں کی تلاش میں رہتے ہیں اور پھر ان کو کونسل میں لا کر اپنی رہنمائی میں ان سے غیر معمولی کام لیتے ہیں۔ آزادی کے بعد بھٹ صاحب نے اردو والوں کو پہلی بار یہ احساس دلایا ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ ہماری اردو زندہ ہے اور کسی بھی طرح کی مخالفت اسے ختم نہیں کر سکتی۔

سوال: آج کل آپ کی ادبی مصروفیات کیا ہیں؟

جواب: میں آج کل مولانا الطاف حسین حالی پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔ یہ کتاب آدھی سے زیادہ لکھی جا چکی ہے۔ اس کے علاوہ میں غالب کی متفرق اردو تحریریں مرتب کر رہا ہوں۔ یہ کام بھی آدھے سے زیادہ ہو چکا ہے۔

سوال: تحقیق و تنقید میں آپ کی خدمات تو لائق صد ستائش ہیں ہی یہ امر بھی قابل رشک ہے کہ عمر کے اس حصے میں بھی آپ ان کاموں میں پوری طرح سرگرم ہیں۔ یہ بتایئے کہ تھوڑا بہت فرصت کا جو وقت آپ کو ملتا ہوگا اس میں آپ کے تفریحی مشاغل کیا رہتے ہیں اور آپ کی غیر ادبی دلچسپیاں کیا کیا ہیں؟

جواب: مجھے فرصت کا وقت بہت کم ملتا ہے اور میری ایک مشکل یہ ہے کہ میرے دو بچے ہیں۔ ایک لڑکا اور لڑکی۔ لڑکا تو کینیڈا میں کینیڈین بینک میں فائننشل ایڈوائزر ہے اور میری بیٹی دہلی پبلک اسکول میں انگریزی پڑھاتی ہے۔ میرے فرصت کے اوقات کتابیں پڑھنے یا پھر بیوی کے ساتھ وقت گزارنے میں صرف ہوتا ہے۔ ہاں پہلے میں بہت سے ایسے کام کرتا تھا جو اب نہیں کر پاتا ہوں۔ مثلاً مجھے فوٹوگرافی کا بہت شوق تھا۔ آثار الصنادید میں جو فوٹوگراف شامل ہیں وہ سب میرے کھینچے ہوئے ہیں۔ مجھے کار کی مرمّت کرنے کا بھی بہت شوق تھا اور میں اپنی کار کی مرمّت خود کرتا تھا۔ بس ان ہی حماقتوں میں وقت گزر گیا اور ایسا لگتا ہے کہ

میں اپنے کام سے مطمئن نہیں ہوں۔ پاکستان میں کچھ عرصے پہلے ایک پینل انٹرویو ہوا تھا تبھی 5-6 صحافیوں نے میرا انٹرویو لیا تھا۔ ایک صحافی نے مجھ سے سوال کیا کہ اگر خدا آپ کو ایک نئی زندگی اور دے تو آپ کیا کام کرنا چاہتے ہیں۔ تو میرا برجستہ جواب یہی تھا کہ وہ نئی زندگی غالب پر تحقیق اور تدوین میں صرف کرنا چاہوں گا۔

سوال: آپ نے اپنے خاندان کے بیشتر افراد کے بارے میں گفتگو کی لیکن اپنی شریک حیات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

جواب: میری بیوی سوشیولوجسٹ ہیں۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں سوشولوجی کی پروفیسر تھیں۔ اسی یونی ورسٹی میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھیں۔ میری طرح وہ بھی علمی اور ادبی کاموں میں مصروف رہتی ہیں۔ اُن کا بنیادی کام عورتوں کے مسائل پر ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے انگلینڈ، کینیڈا اور امریکہ وغیرہ میں رہ کر تحقیقی کام کیا ہے۔

سوال: یہ ملاقات بہت اچھی رہی۔ آپ نے اپنا قیمتی وقت اس انٹرویو کے لیے دیا اس کے لیے میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔

جواب: میں آپ کا بھی شکر گزار ہوں۔ میں اپنے دوستوں اور دشمنوں کا سب کا ہر حال میں شکریہ کرتا ہوں کیوں کہ میرا خیال ہے کہ دشمنوں ہی کی وجہ سے ہم میں کام کرنے کا جذبہ اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے کسی ہم عصر سے حسد نہیں کرتا اور اسی لیے میں ان کے بارے میں کبھی کوئی ٹیڑھا تر چھا بھی فقرہ نہیں لکھتا۔

•••

تنویر احمد علوی سے گفتگو

ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا شمار برصغیر کے جید عالموں اور محققین میں ہوتا ہے۔ آپ کی پیدائش 16 جولائی 1927 کو کیرانہ، ضلع مظفر نگر، میں ہوئی۔ آپ کی ہائی اسکول سے ایم۔ اے تک کی تعلیم میرٹھ یو۔پی۔ میں ہوئی۔ 1960 میں آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اسی سال دہلی کالج میں لکچرر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ بعدازاں جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے بحیثیت صدر وابستہ رہے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا اسلامیات، تصوف، تاریخ اور ہندستانی تہذیب وثقافت کا وسیع مطالعہ ہے اور اسی تناظر میں آپ کے متعدد تحقیقی وتنقیدی مضامین اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

آپ تقریباً تیس کتابوں کے مصنف ہیں جو مختلف موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔ غالب، عہد غالب اور معاصرین غالب پر آپ کی کتابیں اور بے شمار مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ غالب کے فارسی خطوط کا ترجمہ ''اوراق معانی'' کے نام سے بھی شائع ہوا۔

ملک اور بیرون ملک میں آپ نے مختلف موضوعات پر توسیعی خطبے دیے ہیں اور سیمناروں میں شرکت کی ہے۔ آپ کو دہلی اردو اکادمی ایوارڈ، یوپی اردو اکادمی ایوارڈ کے

علاوہ ہریانہ اردو اکادمی کے سب سے بڑے اعزاز (حالی ایوارڈ) سے بھی نوازا جا چکا ہے۔حال ہی میں آپ کو اردو اکادمی، دہلی کے سب سے بڑے ادبی انعام بہادر شاہ ظفر ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔آپ کی چند معروف تصانیف وتالیفات درج ذیل ہیں:

1-انتخاب مثنویات اردو (1961)، 2-انتخاب قصائد اردو (1961)، 3۔ذوق سوانح اور انتقاد(1963)، 4۔کلیات ذوق (دو جلدیں)(1967)، 5۔تاریخ محمود (1967) 6۔کلیات شاہ نصیر (تین جلدیں)(1976-1971)، 7۔صحیفۂ ابرار(1976)، 8۔اصول تحقیق و ترتیب متن(1978)، 9۔اردو میں بارہ ماسے کی روایت(1988)، 10۔اوراق معانی(1993)، 11۔رقص لمحات (1998)، 12۔جنوب مغربی ایشیا۔

سوال: ادبی تحقیق کے گرتے ہوئے معیار پر آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: ہمارے یہاں تحقیق کی کمزوری کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ بیشتر نئے طلبہ عربی، فارسی، ہندی اور دیگر علاقائی زبانوں سے بالکل واقفیت نہیں رکھتے جس کے باعث ان کی نظر دور تک نہیں جاتی۔اب کوئی بھی صنف شعر وادب ہو جب تک آپ اپنے ماحول میں قریب اور دور یہ تلاش نہیں کریں گے کہ اس کے نمونے کہاں کہاں دستیاب ہیں اور کس کس شکل میں ہیں، اس وقت تک آپ صحیح نتائج تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔دوسری بات یہ کہ اگر آپ کو زبان پر قدرت نہیں ہے تو اگر آپ تحقیق کر بھی لیں گے تو اس کو صحیح طور پر بیان نہیں کر سکتے۔ایک محقق کے پیرایۂ زبان اور ایک انشا پرداز کے اسلوب میں جو فرق ہوتا ہے، اسے بعض لوگ ملحوظ نہیں رکھتے۔

سوال: تحقیق کی بنیادی شرط کیا ہے اور اس کی زبان کیسی ہونی چاہیے؟

جواب: سب سے اہم یہ ہے کہ کسی طالب علم کو کوئی وضوع دینے سے پہلے اسے تقابلی مطالعے کے معنی اچھی طرح سمجھا دیے جائیں۔اس لیے کہ اخذ نتائج میں تقابلی مطالعہ بہت مدد کرتا ہے۔طالب علم کو یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ جذباتی انداز نظر تحقیق میں کام نہیں دے گا۔آپ کو جو کچھ بھی کہنا ہے اس میں سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا ہے۔ایک بات جو مجھے بہت

بری لگتی ہے وہ یہ کہ آپ کسی کا بھی ذکر کرتے وقت Superlative کیوں استعمال کرتے ہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، مناسب الفاظ رکھیے۔ اس کا طرز عظیم الشان ہے کہ جگہ آپ یہ کیوں نہ کہیں کہ اس کے طرز میں کشش ہے، ایک طرح کی بلند آہنگی ہے، پُر شکوہ انداز ہے۔ اب فرض کیجیے اگر بات کسی ایسے شخص کی ہے، ایسی کتاب کی ہے جس میں ایک سے زیادہ اسالیب ملتے ہیں تو پھر ایک ہی طرز اظہار پر آخری Comment نہ دیجیے۔

سوال: آپ کی نظر میں ہندستان میں اردو تحقیق کا مستقبل کیا ہے؟

جواب: آنے والی نسل کس طرح کی ہوگی، محنت پسند کرے گی یا نہیں، ایک سے زیادہ زبانوں کو اپنے لیے ضروری سمجھے گی یا نہیں، نئے حقائق تک پہنچنا اس کی دلچسپی کا سبب ہوگا کہ نہیں۔ یہ تو اس پر منحصر ہے۔ میرے زمانے سے پہلے پروفیسر حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود اور دوسرے اسکالرز نے جو معیار قائم کیا تھا، میرے زمانے کے محققین نے اس میں ایک طرح کا نکھار پیدا کیا۔ میں تحقیق کا ایک معمولی طالب علم ہوں لیکن میں نے اصولیاتِ تحقیق پر بنیادی کتاب لکھی اور اس کا دوسرا حصہ جواب لکھا گیا ہے، باقی مسائل سے متعلق ہے یہ کام گویا پہلی نسل کے بعد ہوا۔ اب ہمارے بعد کی جو نسل ہے، آنے والوں کی جو نسل ہے یہ تو اس کے Attitude پر ہے۔ کتابوں کی کمی نہیں ہے۔ اساتذہ بھی مل جائیں گے لیکن اگر نئی نسل محنت ہی نہ کرنا چاہے تو کوئی بات وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن یہ سوچا جا سکتا ہے کہ جب تک ہم اندازِ فکر نہیں بدلیں گے، تحقیق کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔

سوال: پاکستان میں تحقیق کی کیا صورت حال ہے؟

جواب: پاکستان میں تحقیق کی صورت حال یہاں سے زیادہ بہتر نہیں ہے۔ یہ ہے کہ وہاں اردو، سرکاری زبان ہے، اس لیے وہاں اسکالرز زیادہ ملتے ہیں اور بعض اسکالر بہت ممتاز ہیں جیسے وحید قریشی، مشفق خواجہ، جمیل جالبی، فرمان فتح پوری وغیرہ۔ مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ بہت آگے نکل گئے ہیں۔ پاکستان میں مشفق خواجہ نے اپنی پوری زندگی تحقیق کے لیے وقف کر دی تو اس کے نتائج تو بہر حال ہیں مگر وہ شخصی ہیں۔ ہمارے یہاں بھی اس طرح کے نتائج الگ الگ شخصیات میں مل سکتے ہیں۔

سوال: ان دنوں آپ کوئی تحقیقی کام کر رہے ہیں؟

جواب: ان دنوں تو میں کئی تحقیقی کام کر رہا ہوں۔ ایک تو یہ کہ اردو شاعری کے روایتی ادارے، کردار، علامتیں اور ان کے معنی کیا ہیں۔ دوسرا وہی جس کی طرف میں نے اشارہ کیا کہ اصولیات تحقیق پر نئی کتاب لکھ چکا ہوں اس کا تکمیلی حصہ باقی ہے۔ اس کے علاوہ غالب پر جو کام ہوا ہے اس کا جائزہ لے رہا ہوں کہ وہ کس نوعیت کا ہے۔ اس کے ایک باب میں غالب کے سوانح نگاروں کا جائزہ لیا ہے، تجزیہ بھی کیا ہے اور ان سے اختلاف بھی کیا ہے۔ میں نے مختلف ابواب میں غالب کے محققین، ناقدین اور شارحین کو سامنے رکھا ہے۔ اس طرح میرے تحقیقی کام کے کئی دائرے ہیں جو پانی کے دائروں کی طرح متحرک ہیں اور آگے بڑھ رہے ہیں۔

سوال: آپ نے بتایا کہ آپ غالب پر کام کر رہے ہیں، نئی نسل کو غالب پر کام کرتے وقت کن باتوں پر توجہ دینی چاہیے؟

جواب: سب سے پہلے تو وہ ان چیزوں کا ایک ناقدانہ جائزہ لے جو اب تک سامنے آئی ہیں۔ یہ دیکھے کہ اور کون کون سے نئے پہلو نکلتے ہیں۔ غالب کے فارسی خطوط کے ترجمے کے بعد کیا حقائق سامنے آئے۔ وہ نئے حقائق پھر کس طرح سے آئندہ Interpret ہو سکتے ہیں۔ کمال احمد صدیقی نے مجھے ایک ملاقات میں یہ بتایا کہ غالب نے اپنے بارے میں جو بیانات دیے ہیں تاریخ ان کی گواہی نہیں دیتی۔

غالب فارسی کو بہت ترجیح دیتے ہیں، کیا واقعتاً انھوں نے فارسی میں قصائد حمد و نعت و منقبت کے ماسوا جو قصائد لکھے ہیں وہ اسی درجے کے ہیں کہ ان کو دوسروں سے فائق قرار دیا جائے۔ غالب کی سوانح، غالب کی سیرت، غالب کے ماحول اور غالب پر اس کے زمانے کے اثرات، ان سب کا تجزیہ نئی نسل اپنے طور پر کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ غالب کی لغات کو دیکھنا ہوگا۔ اس سے میری مراد غالب کی تشبیہات، استعارات، لفظی ترکیبیں وغیرہ ہیں۔ ان پر وہ کام نہیں ہوا ہے جو ہونا چاہیے۔

سوال: ایسا کوئی تحقیقی کام جسے آپ نے بہت پہلے سوچا ہو لیکن اسے اب تک نہیں کر پائے ہوں؟

جواب: اس طرح کے بہت سے موضوع ہیں۔ مثال کے طور پر ہم نے ہندوی شاعری کو جو اپنی طرف سے نذرانے پیش کیے ہیں اردو میں ہندوی اصناف کے تجربے ان پر ہم نے کوئی کام نہیں کیا۔ ہم نے لوک گیتوں، لوک کتھاؤں پر کوئی تحقیقی کام نہیں کیا جو بے حد ضروری تھا۔ ہم نے اردو شاعری کی تشبیہات واستعارات کی اہمیت، انفرادیت اور لسانی ضرورتوں پر بھی گفتگو کم کی ہے۔

سوال: آپ اردو کے کن کن شاعروں پر تحقیق زیادہ ضروری سمجھتے ہیں؟

جواب: میں سمجھتا ہوں کہ ہر دور کے اہم شاعروں پر کام ہونا چاہیے۔ قدیم دکنی شاعری کا مطالعہ ہونا چاہیے جو نہیں ہو پایا ہے۔ سودا کے علاوہ دوسرے شعرا خاص طور پر میر کی نفسیات اور تاریخی حسیت پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔

سوال: آپ نے کہا کہ میر کی نفسیات اور تاریخی حسیت پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے ''شعر شور انگیز'' کے نام سے جو کام کیا ہے کیا وہ آپ کی نظر سے گزرا ہے؟

جواب: شمس الرحمٰن فاروقی کے کام کی نوعیت دوسری ہے۔ میرا کہنا یہ تھا کہ میر کی تاریخی حسیت کیا ہے، کن حوالوں سے وہ بات کرتے ہیں اور ان حوالوں کا ہمارے ذہن کو بدلنے، بنانے، تعمیر وتخریب میں کیا حصہ ہے۔ یہ مطلب تھا۔ فاروقی صاحب کا کام تو اپنی جگہ ہے۔ میر پر خواجہ احمد فاروقی نے اور نثار احمد فاروقی نے اس سے پہلے کام کیا تھا۔ لیکن میر کی شخصیت کو تاریخ کے وسیع تر اور گہرے تناظر میں دیکھنے کی مزید ضرورت ہے۔

سوال: یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ آپ نے طبابت بھی کی ہے۔ حکمت سے تحقیق کی طرف آپ کس طرح آئے؟

جواب: میں شروع ہی سے مطالعے کا عادی رہا۔ اس زمانے میں جب میں طب کی تعلیم حاصل کر رہا تھا، تب بھی تحقیقی نقطۂ نظر سے چیزوں کو دیکھتا تھا۔ تحقیق میری ضرورت نہیں تھی۔ ہوا یوں کہ ایک کتاب پڑھی تو پتہ چلا کہ دوسری کتاب میں بہت سی باتیں ہیں، تیسری میں اور نئے پہلو ہیں تو میں پڑھتا ہی چلا گیا۔ آج بھی پڑھتا رہتا ہوں۔ مطالعے کے شوق کے علاوہ تحقیق کے لیے مجھے کسی محرک کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

سوال: اب طبابت سے آپ کا تعلق کہاں تک رہ گیا ہے؟

جواب: میرے والد حکیم تھے۔ ان کی کتابیں شروع ہی میں، میں نے پڑھ لیں جوانھوں نے پڑھی تھیں۔ میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ بیمار لوگوں کو صحت کی طرف لانا بہت بڑی نیکی ہے تو میں طب کی طرف مزید متوجہ ہوا۔ طب کے امتحان میں میں نے پٹیالہ طبیہ کالج کا رکارڈ توڑا۔ ایک دن اچانک میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ اگر میں فنِ طب کو عملاً اختیار کروں گا تو مجھے مریضوں سے پیسے لینے پڑیں گے یہ میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں آج بھی کسی شخص سے، شخصی طور پر کچھ بھی نہیں لیتا کوئی معاوضہ کسی خدمت کا، کسی کام کا نہیں۔ صرف سرکاری اداروں سے جو معاوضہ تھوڑا بہت مل جاتا ہے وہ لے لیتا ہوں۔ اس لیے میں نے طب کو بہ طور پیشہ اختیار کرنے کا خیال چھوڑ دیا۔

سوال: ویسے تو ہماری زندگی واقعات سے بھری ہوتی ہے لیکن آپ اپنی زندگی کا ایسا کوئی واقعہ سنائیں، جس کو آپ بھول نہیں سکے۔

جواب: شخصیات مجھے بہت زیادہ متاثر کرتی ہیں۔ ان کی گفتگو کے اچھے جملے، ان کی صحیح Approach مجھے یاد رہتی ہے۔ جب میں ریسرچ کرنے علی گڑھ گیا تھا تو پروفیسر سرور مرحوم نے میری کس طرح مدد کی تھی، مجھے یہ یاد ہے۔ میرا Viva لینے کے لیے پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب آئے تھے اور مجھ سے متاثر ہو کر گئے تھے۔ مولانا غلام رسول مہر میرے لیے امتیاز علی تاج سے کچھ نہ کچھ کہا کرتے تھے اور جب میں نے مولانا کی خدمت میں حاضری دی تو اپنے کانوں سے سنا He speaks superlative about me اب یہ بھول جانے والی چیز نہیں ہے۔ انھوں نے میرے ترتیب کردہ کلیاتِ ذوق پر جو مقدمہ لکھا، آج بھی اس کو پڑھ کر فخر کرتا ہوں اور رو پڑتا ہوں کہ ایک اتنا بڑا عالم مجھ پر اتنا مہربان تھا۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے "آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ" جب دوبارہ نئے ایڈیشن کے طور پر مرتب کیا تو اس میں میری معلومات کو شامل کیا۔ اب یہ معمولی واقعہ تو ہے نہیں کہ کوئی اتنا بڑا محقق اپنے طالب علم کی معلومات کو اپنی کتاب میں جگہ دے۔ یہ سب باتیں میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

سوال: آپ شاعری بھی کرتے ہیں۔ ایک شاعر اور محقق تنویر احمد علوی میں کیا فرق ہے؟

جواب: اصل میں ذہن کے کئی رخ ہوتے ہیں مثلاً ایک شخص محقق ہونے یا اصولیات تحقیق کا آدمی ہونے کے باوجود جذباتی رشتے بھی تو رکھتا ہے، حسیاتی رشتے بھی تو رکھتا ہے۔ یہ رشتے افراد کے ساتھ ہیں، ادوار کے ساتھ ہیں ان پر گفتگو بغیر شاعری کے نہیں ہوسکتی۔ شاعری، تحقیق کرنے والے کے لیے یہ نہ کوئی بری بات ہے نہ کوئی بڑی بات ہے بلکہ اس کی شخصیت کا ایک عکس ہے۔

سوال: اپنی تازہ غزل کے چند اشعار ''اردو دنیا'' کے قارئین کو سنانا پسند کریں گے؟

جواب: تین شعر سناتا ہوں:

غمِ جاں کا وہ چارہ ساز بھی ہے — دل شکن بھی ہے دل نواز بھی ہے
آتش رنگ اور حنا کی طرح — دل کی ٹھنڈک، جگر گداز بھی ہے
حسن تخلیق شیشہ گر بھی ہے — دست فن کار شیشہ باز بھی ہے

سوال: تحقیق اور شاعری کے علاوہ آپ کی کیا دلچسپی ہے؟

جواب: مجھے تہذیبی مطالعے سے بہت دلچسپی ہے۔ اس پر میں نے کام بھی بہت کیا ہے۔ اردو میں غالباً سب سے زیادہ کام میں نے کیا ہے۔ آپ میری کتاب ''جنوب مغربی ایشیا میں ہمارا تہذیبی ورثہ'' دیکھیے؟ بارہ مولہ کی فلاسفی، اس کے تہذیبی رجحانات، اس کے علاقائی Development پر جو کام میں نے کیا ہے وہ مزید آگے بڑھانے کا کام ہے اور مجھے اس سے دلچسپی ہے۔

سوال: آج جبکہ قدریں مٹتی جارہی ہیں ایسے میں اردو تہذیب کہاں تک زندہ رہ پائے گی؟

جواب: میں کہہ نہیں سکتا ایسا بھی ہوتا ہے کہ؎ پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے
یہ بھی ہوسکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو والے اپنے فرائض انجام نہیں دے رہے ہیں۔ یہ افسوسناک بات ہے کہ ہمارے اساتذۂ اردو، اسکولوں کی سطح پر، کالجوں کی سطح پر، یونیورسٹیوں کی سطح پر، اپنی ذمے داریوں کو پورا نہیں کررہے ہیں۔ اردو کی بقا کی جدوجہد، تعلیم وتدریس کی صورت میں کرنا ضروری ہے۔ اس کی طرف ہمارے قدم بہت سستی سے اٹھ رہے ہیں بلکہ کہیں کہیں تو بالکل جمود کا عالم ہے۔

سوال: ان دنوں ایسے شاعروں اور ادیبوں پر تحقیق کی جارہی ہے جو ابھی زندہ ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب: یہ بہت بنیادی اور اہم سوال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ہر افسانہ نگار، ہر شاعر پر تحقیق کے نام سے کوئی کام نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ہم اشخاص پر کام کرتے ہیں تو بہتر یہ ہے کہ ہم ایک سے زیادہ افراد کو لیں اور ان کا تنقیدی، تجزیاتی، نفسیاتی مطالعہ کریں۔ میں نے بعض طالب علموں سے بات کی تو انھوں نے کسی کا نام لے کر کہا کہ ہم فلاں کی غزل گوئی پر تحقیق کر رہے ہیں۔ میں اس طرح کی تحقیق سے متفق نہیں ہوں۔ It is not research at all, And it should not be regarded as a research.

سوال: رشید حسن خاں کے تحقیقی طریقۂ کار کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: رشید حسن خاں تحقیق کے ان لوگوں میں سے ہیں جن کو Pure Researcher کہا جاسکتا ہے۔ پھر انھوں نے زبان کے بنیادی مسائل پر بات کی ہے۔ انھوں نے جو کچھ کام کیا ہے وہ ٹھوس کام کیا ہے۔ اس لحاظ سے وہ ممتاز محقق ہیں۔

سوال: ماہنامہ ''اردو دنیا'' کے قارئین کے نام آپ کا کیا پیغام ہے؟

جواب: آپ اردو کی طرف متوجہ ہوئیے۔ اپنے بچوں کو اردو پڑھائیے، اردو اخباروں اور کتابوں کے مطالعے کی عادت ڈالیے۔ ایسی ادبی تقریبات کا اہتمام کیجیے جن میں شریک ہوکر اردو نہ جاننے والوں کو اردو سیکھنے کی ترغیب ملے۔

●●●

سنجے گوڈبولے سے گفتگو

سنجے گوڈبولے کی پیدائش 19 مئی 1964 کو پونے میں ہوئی۔ان کی مادری زبان مراٹھی ہے لیکن وہ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔ سنجے گوڈبولے کو ادب وثقافت کے علاوہ نوادرات ومخطوطات سے اپنے زمانہ طالب علمی ہی سے دلچسپی رہی ہے۔ان کی عمر صرف تیرہ سال کی تھی تو انھیں ایک پرانے سامان کی دکان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا کیشر سرٹیفکٹ دستیاب ہوا جو انھوں نے پونے یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر پوتے دار تک پہنچایا۔اس واقعے سے وائس چانسلر بہت متاثر ہوئے اور یہ پیشین گوئی کی کہ مستقبل میں یہ لڑکا بڑا محقق بنے گا۔ یہ پیشین گوئی بالکل سچ ثابت ہوئی۔ سنجے قدیم ترین سکوں، مہروں، گھریلو اشیا اور اس طرح کی دوسری چیزوں کی فراہمی کے لیے بھاری سے بھاری قیمت ادا کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتے۔

گوڈبولے صاحب نے تین مضامین میں ایم۔اے کی سند حاصل کی ہے۔علم آثار قدیمہ میں پونے یونیورسٹی سے تواریخ اور ہندوستانیات (Indology) میں تلک یونیورسٹی سے ایم۔اے کی سند حاصل کی ہے۔انھوں نے پونے یونیورسٹی سے بی۔کام اور ایل۔ایل۔بی۔کی اسناد بھی حاصل کی ہیں۔ علاوہ ازیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن اور رائل نیوسمٹک

سوسائٹی لندن سے انھیں فیلوشپ بھی تفویض کی جا چکی ہے۔ فی الوقت بھارت اتہاس سنشوشن منڈل، پونے، Indian History Congress دہلی، Epigraphical Society of India میسور، Oriental Numismatie Society لندن، Numismatie Society of India وارانسی، Patron of International Collectors Society of rare items مہاراشٹر کے ممبر ہیں اور Numismatic Society of Maharashtra جو پونے میں ہے اس کے بانی کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔

نجے گوڑبولے کے اب تک 500 مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ وہ اردو کے ایک اچھے غزل گو بھی ہیں۔ مختلف زبانوں میں ان کی اب تک نو(9) کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انگریزی زبان میں "Cains Collection for Beginners" مراٹھی میں ''دیوان میر دوم''، ''کالی داس گپتا: فن اور شخصیت''، ''حیدر قریشی: فن اور شخصیت'' ''جانشین داغ بھائی جان عاشق'' اور ''غالبیات پر تین یادگار تقریریں'' قابل ذکر ہیں۔

سوال: آپ کی مادری زبان مراٹھی ہے، اردو سے دلچسپی کیسے پیدا ہوئی؟

جواب: مجھے بچپن ہی سے آثار قدیمہ میں دلچسپی ہے۔ میں نے آرکیولوجی میں ایم۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ مغلیہ عہد کی جتنی بھی چیزیں ہیں، وہ فارسی میں ہیں، اس لیے مجھے پہلے فارسی سے دلچسپی پیدا ہوئی، اس کے بعد اردو کا شوق پیدا ہوا اور میں نے باقاعدہ اردو پڑھنا اور لکھنا سیکھا۔

سوال: اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں کچھ بتائیے؟

جواب: میرا تعلق کوکن کے چتپاون برہمن گھرانے سے ہے۔ مہاراشٹر کے حکمراں پیشوا بھی چتپاون برہمن تھے۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں ہماری قوم نے مہاراشٹر کی تاریخ میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ میرا تعلق کوکن کے ایک گاؤں پاوس ضلع رتنا گیری سے ہے۔ ہمارے خاندان کا کاروبار پہلے ساہوکاری تھا۔ 1810 میں میرا اجداد کوکن سے پونہ منتقل ہو گئے۔ یہاں آنے کے بعد انھوں نے کتابوں کی اشاعت اور فروخت کا پیشہ

اختیار کر لیا تھا۔ 1850 کے آس پاس کچھ عرصے کے لیے مراٹھی میں ایک اخبار بھی جاری کیا تھا۔ اس کا نام ''ویرت موڈ'' تھا۔ ساتھ ہی میرے دادا کے دادا نے بہار دانش عنوان سے ایک کتاب شائع کی تھی جو فارسی حکایتوں کا مراٹھی ترجمہ تھا۔ مراٹھا راج کی سرکاری زبان مراٹھی کے ساتھ فارسی بھی تھی اس لیے اس وقت اکثر خاندان کے لوگ فارسی جانتے تھے۔

میرے پردادا مہاراشٹر کے بڑے کتب فروش تھے۔ میرے دادا پہلی عالمی جنگ میں ترکستان میں تھے۔ وہ اچھی اردو جانتے تھے۔ اسی دوران انھوں نے انگریزوں کو رضاکارانہ طور اردو سکھائی تھی۔ کتب فروشی ان کا پیشہ تھا۔ میرے والد گیا نیشور سیتا رام گوڈبولے مہاراشٹر اسکول ٹیکسٹ بک بیورو کے تقسیم کار اور مراٹھی کتابوں کے بڑے ناشر تھے۔ ساتھ ہی ساتھ حکمت اور علم نجوم میں بھی انھیں کمال حاصل تھا۔ کتب فروشی ہمارا خاندانی پیشہ ہے جس کو 194 سال پورے ہو رہے ہیں۔ میں بھی اسی پیشے سے منسلک ہوں۔

سوال: آپ نے تاریخ اور آثارِ قدیمہ کے علاوہ Indology میں بھی ایم۔اے کیا ہے۔ یہ نسبتاً غیر معروف مضمون ہے۔ کیا آپ اس پر کچھ روشنی ڈالنا پسند کریں گے؟

جواب: یہ موضوع ''بیسویں صدی'' میں جرمن اور انگریز دانشوروں اور محققین نے پیش کیا۔ آسان زبان میں اس لفظ کا ترجمہ کیا جائے تو ''بھارتیہ ودّیا'' ہوتا ہے۔ اس میں قدیم بھارت کی تاریخ، پرانے سکے، قدیم عمارتیں، پرانی تہذیب و تمدن، ادب، قدیم ہندوستانی لپیاں اور پرانی گپھائیں اور شلا لیکھ شامل ہیں۔ یہ بہت دلچسپ موضوع ہے۔ یورپ میں قدیم ہندوستان کی تحقیق کے لیے انڈولوجی انسٹی ٹیوٹ قائم کیے گئے ہیں۔

سوال: آپ کے ذاتی کتب خانے میں صدیوں پرانے مخطوطات، مہریں اور دیگر نایاب اشیا موجود ہیں۔ یہ چیزیں آپ نے کس طرح حاصل کیں؟

جواب: پرانی کتابیں، مخطوطے اور مغلیہ عہد کے نوادرات جمع کرنے کا شوق مجھے کالج کے زمانے سے

رہا ہے۔ میں پرانے خاندانوں کو تلاش کر کے ان سے رابطہ قائم کرتا تھا۔ ان کے پاس ایسے ذخیرے مل جایا کرتے تھے یا پرانی کتابوں کے تاجروں سے رابطہ رکھتا تھا۔ ان سے کام کی تمام چیزیں حاصل ہو جاتی تھیں۔ دھیرے دھیرے لوگوں کو میرے شوق کا علم ہوا تو بعض لوگ میرے گھر آکر مجھے مطلوبہ اشیا دینے لگے۔

سوال: آپ نے پونے میں اورینٹل ریسرچ فاؤنڈیشن قائم کیا ہے۔ اس کے قیام کے خاص مقاصد کیا ہیں اور ان میں کس حد تک کامیابی مل رہی ہے؟

جواب: میرا مقصد یہ تھا کہ پرانے مخطوطات جن کا تحقیق سے تعلق ہو، محفوظ ہو جائیں۔ ان اشیا پر میرے مسلسل مضامین مراٹھی اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ کچھ مخطوطے مرتب کر کے میں نے شائع کیے ہیں۔ 2000 میں میں نے ایک جرمن تھیسس شائع کیا جو ایک آسٹرین خاتون نے لکھا تھا جس کا موضوع 'مہورت' تھا۔ اس موضوع سے متعلق پرانی کتب کے حوالے میرے کتب خانے سے دیے گئے تھے۔ کتاب عالمی پیانے پر مقبول ہوئی ہے۔

سوال: آپ کو تحقیق سے دلچسپی ہے۔ اردو تحقیق کی موجودہ سمت و رفتار پر کچھ روشنی ڈالیے۔

جواب: ہمارے یہاں تحقیق کے میدان میں کافی کام ہوا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔ کدم راؤ پدم راؤ جیسا مخطوطہ شائع ہو چکا ہے۔ قدیم دکنی اور قدیم اردو لغت پر بھی کام ہو رہا ہے۔ مختلف صوبوں کی اردو ادب کی تاریخ مرتب کی جا رہی ہے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔

سوال: آپ کی کتاب ''جانشینِ داغ بھائی جان عاشق'' کے بارے میں محققین کا خیال ہے کہ اس کے سرورق پر دی گئی تصویر کسی اور کی ہے اور پورا کلام بھی بھائی جان عاشق کا نہیں ہے۔ اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

جواب: اس سلسلے میں عرض ہے کہ جو تصویر میں نے شائع کی ہے وہ محض آرائش کے لیے تھی۔ بھائی جان عاشق سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ جہاں تک کلام کا تعلق ہے مجھے جو دستیاب ہوا وہ میں نے شائع کیا۔ مجھے بھائی جان عاشق کے کلام کا چھوٹا سا حصہ ملا تھا جسے میں نے کالی داس گپتا رضا صاحب سے دکھایا تھا۔ ان کی تصدیق کے بعد ہی میں نے اسے شائع کیا تھا۔

سوال: پونے کا علمی وادبی ماحول کیسا ہے؟

جواب: پونہ کو عروسِ دکن کہا جاتا ہے۔ مراٹھی کے نامور ادیب، شاعر اور محقق یہاں پیدا ہوئے۔ شیواجی کے زمانے سے یہاں فارسی زبان رائج تھی، اس لیے پچھلی صدی کی تمام تحریریں فارسی زبان میں ملتی ہیں۔ یہاں اردو کی نشرواشاعت کا سلسلہ بھی زمانہ قدیم سے جاری ہے۔ یہاں سے اردو کا رسالہ 'اسباق' شائع ہوتا ہے۔ اردو ادب پر کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ شعری مجموعے شائع ہوتے ہیں۔ ادبی نشستیں ہوتی ہیں۔ آل انڈیا مشاعرے ہوتے ہیں۔ یہاں آزادی سے پہلے اردو کے بڑے ادیب وشعرا آکر رہے اور اپنی خدمات پیش کیں۔

سوال: اردو کے فروغ کے لیے آپ کے ذہن میں کیا تجاویز ہیں؟

جواب: اردو کے فروغ کا سب سے موثر ذریعہ تو اردو ذریعۂ تعلیم ہی ہے۔ اردو اگر اسکولوں میں پڑھائی جائے گی تو اس کی سماجی حیثیت مستحکم ہوگی اور ایک بات بتادوں کہ مہاراشٹر میں اردو کے سب سے زیادہ اسکول ہیں جو اردو والوں کے لیے باعث فخر ہے۔

سوال: آپ نے تاریخ، آثار قدیمہ، ادب اور تہذیب وتمدن جیسے مختلف میدانوں میں اپنی صلاحیت کے جوہر دکھائے ہیں۔ آپ بیک وقت ان تمام موضوعات پر کیسے کام کر لیتے ہیں؟

جواب: یہ مالک کی مہربانی ہے جو مجھے اتنے سارے کام کرنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ انڈولوجی ایسا موضوع ہے جس کی کئی شاخیں ہیں۔ اس میدان میں اترنے کے بعد الگ الگ کاموں اور موضوعات سے آشنائی ہوتی چلی جاتی ہے اور تلاش وجستجو کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا جاتا ہے۔ آخر میں آدمی اس کام کے تئیں وقف ہوجاتا ہے۔

سوال: اردو زبان وادب اور تعلیم کے فروغ کے ضمن میں قومی اردو کونسل کی خدمات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: قومی اردو کونسل نے اس سلسلے میں اہم کام کیے ہیں جس سے پوری ''اردو دنیا'' میں ان کتابوں کے حوالے دیے جاتے ہیں۔ تحقیق اور تنقید کے موضوعات پر قومی اردو کونسل کی کتابیں نہ صرف قابل مطالعہ ہیں بلکہ قابل حوالہ بھی ہیں۔

سوال: ''اردو دنیا'' کے قارئین کے نام آپ کیا پیغام دیں گے؟

جواب: میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔

•••

ترجمہ

ساجدہ زیدی سے گفتگو

ساجدہ زیدی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تعلیمات سے بحیثیت صدر شعبہ سبک دوش ہوئیں۔ پروفیسر ساجدہ زیدی ایک معروف ومنفرد شاعر، ڈراما نگار، ناول نگار، تنقید نگار اور مترجم ہیں۔ ان کے چار شعری مجموعے ''جوئے نغمہ، آتش سیال، سیل وجود اور آتش زیر پا''۔ ''دو ناول'' موج ہوا پیچاں اور مٹی کے حرم'' منظر عام پر آ کر شہرت ومقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ دو تنقیدی کتابیں، تلاش بصیرت اور گزرگاہ خیال کے علاوہ منظوم، ڈراما، سرحد کوئی نہیں اور، ڈراموں پر مبنی کتاب چاروں موسم، نے بھی قارئین کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ پانچواں شعری مجموعہ۔۔ ''پردہ ہے ساز کا'' عنقریب منظر عام پر آ رہا ہے۔ نفسیات وتعلیمات پر بھی ان کی چار عالمانہ کتابیں۔ شخصیت کے نظریات، انسانی شخصیت کے اسرار ورموز، Key Isues in Education اور Changing Perspectives on Creativity بے حد مقبول ہو چکی ہیں۔ نفسیات، تخلیق کی نفسیات، تعلیمات اور وجودی فلسفے میں ان کی خدمات کو ملک اور بیرون ملک شہرت ووقار اور مقبولیت حاصل ہوئی۔

ساجدہ زیدی 1927 میں میرٹھ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد سید محمد مستحسن زیدی (بارایٹ لا) تھے اور والدہ مختار فاطمہ زیدی تھیں۔ ساجدہ زیدی کی شاعری کا ترجمہ

انگریزی، روسی، مراٹھی، اڑیا اور ہندی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ انھوں نے انگریزی، جرمن، فرانسیسی اور اسپینی ڈراموں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، اور ان کے تعارفی نوٹ تحریر کیے ہیں۔ اب تک درجنوں بیرونی ممالک کا دورہ کر چکی ہیں۔ علاوہ ازیں ملک کے مختلف علمی و ادبی اور تعلیمی اداروں یو۔جی۔سی اور این۔سی۔آر۔ٹی۔ سے وابستہ رہی ہیں اور عمر کے آخری پڑاؤ پر بھی بڑے انہماک سے اردو زبان و ادب کی خدمت کی ہیں۔

سوال: جب آپ کوئی چیز تخلیق کرتی ہیں تو اس وقت کیا کیفیت ہوتی ہے؟ یا پھر کسی دباؤ میں لکھتی ہیں؟

جواب: محویت، انہماک، خود کو بھول جانے یا کھو دینے کی کیفیت، میرا رشتہ براہِ راست اپنے آپ سے ہوتا ہے۔ دباؤ میں تو نہیں لیکن فرمائش پر بھی کوئی چیز لکھتی ہوں (مثلاً کوئی مقالہ) تو نفسِ مضمون کو اپنا بنا کر، اس میں وقتِ تحریر محو ہو جانا ناگزیر ہوتا ہے۔ تخلیقی عمل دراصل ذات کے عمیق گوشوں تک رسائی سے عبارت ہے۔ میرا ذہن درحال تخلیق اسی کیفیت وجود میں گردش کرتا ہے۔ ہم ذات ہی کے شعور سے سماج اور کائنات تک پہنچ سکتے ہیں۔

سوال: آپ شاعری کی جانب کیسے راغب ہوئیں؟

جواب: ورثہ، ماحول، ذاتی تجربوں کی آنچ اور شاعری سے میرا وہ ذاتی رشتہ جو قضا و قدر نے مجھے بخشا تھا۔

سوال: کیا فنکار کی اہمیت کسی نظریے سے وابستگی کے سبب ممکن ہے؟

جواب: میرے خیال میں تو نہیں۔ لیکن ہمارے یہاں اردو میں تو یہی طریقہ رائج ہو گیا ہے کہ فنکاروں کو نظریوں کی نسبت سے پہچانا اور پہچوایا جاتا ہے۔ اردو میں اہمیت کا معاملہ فنکار کی تخلیقی سطح کے مقابلے میں، دیگر غیر ادبی خصوصیات کی نسبت سے طے کرنا فی زمانہ عام بات ہو گئی ہے۔

سوال: آپ کس ادبی فلسفے سے متاثر رہی ہیں۔

جواب: جہاں تک فلسفے کا تعلق ہے مجھے مارکسزم اور وجودیت دونوں سے بے حد دلچسپی رہی۔ مختصراً وجودیت فرد کی ذات کا فلسفہ ہے اور مارکسزم سماج میں فرد کے مقام کا۔ کوئی شاعر یا ادیب جو اپنی ذات سے منسلک ہے اپنے سماج اور کائنات سے بے تعلق کس طرح رہ سکتا ہے۔

میرے خیال میں فلسفے اور ادب کا ان سے سروکار ایک دوسرے کی ضد نہیں۔ جیسا کہ اکثر ترقی پسند اور جدیدیت پرست نقاضوں نے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ یہ دونوں فلسفے اصلاً Complimentrary ہیں۔ میری شاعری اور فکشن میں آپ دونوں ہی کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ باہم دیگر منسلک بھی اور خود آشکار بھی۔ لیکن اردو تنقید میں ان دونوں نظریات کو عموماً متضاد پیش کیا گیا، اس سے میں متفق نہیں ہوں۔ دراصل تخلیق فلسفہ نہیں ہوتی۔ اولاً تخلیق ہوتی ہے۔ تخلیق کے کیف وکم تخیل اور عرفان کے دائرے میں ہوتے ہیں ہاں فلسفیانہ شعور اس میں گہرائی پیدا کرسکتا ہے۔

سوال: آپ کا نظریہ فن کیا ہے؟

جواب: فن اور شاعری انسان کی ذات کی گہرائی کا اظہار ہے ذات کی پہنچ کا اظہار ہے۔ وجود وخیال کے وہ منطقے جہاں تک ہم عام زندگی کے کاروبار میں نہیں پہنچ سکتے۔ شاعری انسانی ذات اور کائنات کے رشتے کا اظہار ہے۔ انسانی نشاط والم کی یکجائی کا اظہار ہے۔ یعنی شاعری انسانی روح کے کرب کا اظہار ہے۔

سوال: نئی شاعری کس حد تک آپ کو متاثر کرتی ہے؟

جواب: اس وقت ہندوستان اور پاکستان میں بھی ایسا ماحول تخلیق کیا گیا ہے، جس میں شاعر پوری طرح کھل کر سامنے نہیں آسکتا۔ اول تو نقاد تخلیق کا پیش رو بننے کا منصب اختیار کر گیا ہے۔ دوسرے آج کل نقادوں وغیرہ کا تمام تر زور غزل پر ہے۔ شاعری کا طرۂ امتیاز غزل ہی کو سمجھ لیا گیا ہے دراں حالیکہ تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے کا تقاضا ہے کہ شعری اظہار کے نئے اور وسیع تر امکانات۔ مثلاً نظم آزاد اور نظم معرا کی کھل کر پذیرائی کی جائے کہ آج کے دور کی پیچیدگی اور تنوع کی ترجمانی ممکن ہو سکے۔ اور اس کے تسلسل میں نامانوس کیفیات و تجربات، نیز باریک تر رموزِ فن کی عقدہ کشائی ہو سکے۔ دوسری بات یہ کہ تنقید کو تخلیق کے پیچھے چلنا چاہیے۔ اور ہم عصر تنقید کی طرف سیاست اور مفادات سے بالاتر ہو کر رجوع کرنا چاہیے۔ بعض تنقیدی رویوں سے ادب کا بہت نقصان ہوا ہے مثلاً گروہ بندی اور ادبی سیاست اور سازشی ماحول وغیرہ۔

سوال: آپ کا تعلق کس شعبۂ نفسیات سے رہا ہے اور کیوں؟

جواب: نفسیات کے بھی بہت سے دبستان ہیں، علمی اعتبار سے تو ان میں سے اکثر کا مطالعہ بھی رہا اور تدریس بھی کی مثلاً۔ فرائڈ کا تجزیہ لاشعور اور ینگ کا تصور اجتماعی لاشعور اور "پرسونا اور شیڈو" (Persona and Shadow) وغیرہ کا تجزیہ۔ یہ سب "نفسیات عمق" (Depth Psychology) کے دائرے میں آتے ہیں۔ نیو فرائڈ نیز (New Freudians) مثلاً ایرک فروم، کیرن ہورنی، ایڈلر رولو مے وغیرہ نے نفسیات عمق کو سماجی نفسیات سے جوڑنے کی کامیاب کوششیں کیں۔ جس سے مثلاً ایرک فروم اور رولو مے تصورات میں انسانیتی نفسیات Humanistic Psychology کا عکس بھی شامل ہو گیا۔ بہر حال یہ سوال تو بہت بڑا ہے۔ میرے خیال میں انسانی زندگی کی بنیاد اور مختلف مراحل کو سمجھنے کے لیے نفسیات عمق، نیو فرائڈ نیز اور انسانیتی نفسیات کا رول تجربی نفسیات یعنی Experimental Psychology سے زیادہ اہم اور معنی خیز ہے۔ ادب میں بھی نفسیات کے ان ہی اسکولوں کا اثر عام ہے۔ نفسیات سے لگاؤ کی جگہ مختصراً انسان سے لگاؤ، انسان کی فطرت، اس کی تقدیر اور اس کے نشاط والم سے لگاؤ سمجھیے۔

سوال: نفسیات سے لگاؤ کی کوئی خاص وجہ؟

جواب: نفسیات سے لگاؤ کی وجہ یہی سمجھیے کہ مجھے انسان کی ذات، اس کے تجربات، اس کے کیف وکم میں دلچسپی ہے۔ میں انسان کی شخصیت کے اسرار و رموز اور اس کی پیچیدگی نیز گہرائی کو سمجھنے کی جویا ہوں۔ اسی دلچسپی نے مجھ سے شخصیت کی نفسیات دو ضخیم کتابیں لکھوائیں جن کی تکمیل میں مجھے کم و بیش دس بارہ سال لگے ہوں گے۔ یہ کتابیں نہ محض تحقیق ہیں نہ تخیل بلکہ دونوں کا امتزاج ہیں۔

سوال: ہندوستان میں موجودہ شاعری کی صورت حال کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: شاعری ہند و پاک دونوں جگہ ہو رہی ہے۔ تعین قدر کرنا قبل از وقت ہے۔ اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔ میرے خیال میں معمولی سے لے کر بہت اچھی شاعری تک ہو رہی ہے لیکن اس کی پرکھ مناسب طرح نہیں ہوئی ہے۔

سوال: آپ اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے کن ادیبوں سے متاثر ہیں؟

جواب: بہت سے ادیب ہیں کس کس کا نام لوں۔ مختصراً عرض ہے۔ تالستائی، دستیووسکی، چیخف، شیکسپیئر، برنارڈ شا، ہارڈی، ڈکنس، روماں رولاں، گورکی، ابسن، پرانڈیلو، ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ، کیٹس، کافکا، کامیو، آلبی، پنٹر، سارتر غرض بہت سے روسی انگریزی فرانسیسی، ہسپانوی اطالوی ڈرامہ نگار اور ادیب ہیں۔ مجموعی طور پر مجھے مغربی ادب، مغربی مصوری و سنگتراشی بہت پسند ہے۔ فارسی ادب بالخصوص حافظ وسعدی ان فنکاروں کے علاوہ میرے ادبی محبوب ہیں۔ دیکھیے شعروادب اور فنون لطیفہ کی دنیا بہت وسیع ہے۔ اس بحرِ ذخار سے جو چند قطرے حاصل کیے ہیں سب ہی سرمایۂ ذہن ودل ہیں۔ اس مختصر گفتگو میں اس سوال کا کلی طور پر جواب دینا ممکن نہیں۔ میرے اگلے شعری مجموعے "پردہ ہے ساز کا" کے پیش لفظ میں کچھ معروضات شامل ہیں۔

سوال: آپ اردو کے کن شعرا سے متاثر ہیں؟

جواب: متاثر تو میں اپنے کئی کلاسیکی شعرا سے ہوں۔ غالب میرے گرو ہیں۔ اقبال میرے ذہنی ہم سفر ہیں۔ میر بعض مقامات پر تارِ رگِ جاں کو چھیڑتے ہیں۔ انیس زبان کے استاد ہیں اور روحانی واخلاقی نظام اقدار کا منبع ہیں۔ حالی میرے جدامجد ہی نہیں بلکہ بعض انسانی اوصاف کا سرچشمہ بھی ہیں۔ ان کی کسر نفسی اور Modesty تخلیق کاروں میں عنقا ہے اور ان کا Comittment بے مثال۔ ان کی شاعرانہ (خصوصاً غزلیہ شاعری کی) سادگی دل پذیر ہے۔ پھر ہمارے پیش رو ہیں۔ فیض، سردار جعفری۔ ن م راشد اور اختر الایمان ہیں۔ یہ سب مجھے پسند ہیں۔ متاثر سے، یہ مطلب نہ لیجیے گا کہ میں نے ان سب کا اثر تخلیق شعر میں قبول کیا ہے۔ میرا مطلب پسندیدگی اور محبت واحترام سے ہے۔ اثر تو انسانی ذہن پر اس کے گذشتہ شعروفن اور ثقافت کی تمامتر وراثت کا ہوتا ہے۔ مبہم، مسلسل اور ناقابل تجزیہ...... لیکن جہاں تک اپنی شاعری میں کسی سے اثر قبول کرنے کا سوال ہے۔ میں نے نہیں کیا۔ کم از کم شعوری طور پر۔ میری شاعری میرے اپنے ذہن ودل کی طلب اور روح کے کرب کا اظہار ہے یہ قضاوقدر کا وہ عطیہ ہے جسے سر جھکا کر قبول کرنے

کے علاوہ چارۂ کار نہیں تھا۔

سوال: آپ کی بہن زاہدہ زیدی بھی مقبول و معروف شاعرہ ہیں۔ان کا مقابلہ آپ سے کیا جائے تو کسے زیادہ بہتر کہنا مناسب ہوگا۔آپ خود بتائیے؟

جواب: ہم بہنوں کا آپس میں مقابلہ کرنے کا کوئی جواز مجھے نظر نہیں آتا۔ہم دونوں کا اگر مقابلہ ہے تو ہم عصر اور قریبی پیش رووں سے ہے۔لیکن تنقید و تفہیم شعر میں مقابلے سے زیادہ اہم، ہر شاعر کو اس کے مخصوص محاورے اور سروکار سے پہچاننے اور سمجھنے کی کوشش ہے۔

سوال: کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ خود کو اختر الایمان کی سطح کی شاعر سمجھتی ہیں؟

جواب: میں نے یہ کبھی نہیں کہا۔اشارۃً بھی نہیں۔میں اختر الایمان کو بحیثیت شاعر بہت پسند کرتی ہوں، ان کا احترام کرتی ہوں۔ان پر دو مقالات لکھ چکی ہوں۔(خود ان کی فرمائش پر لیکن افسوس کہ ان کی وفات کے بعد) اختر الایمان کی اور میری شاعری کا مخصوص محاورے اور اسلوب بالکل جداگانہ ہے۔بشرط فرصت و صحت بھی ہو ان کی شاعری پر اور بھی لکھوں گا......جن لوگوں کا یہ کہنا ہے۔یا اعتراض ہے (ہو سکتا ہے خود آپ کا ہی ہو) کہیں ان کے ذہن میں تو یہ خیال نہیں آیا؟ خودستائی نہیں کروں گی لیکن زمانہ بتائے گا کہ میری نصف سے زائد نظمیں'' اپنے دور کے'' بڑے سے بڑے شاعر سے ٹکر لے سکتی ہیں۔(اگر چہ میرا اسلوب ان سب سے جدا ہے) عظیم شاعر تو اقبال کے بعد کوئی پیدا نہیں ہوا۔ویسے شاعر کو اطمینان کبھی نصیب نہیں ہوتا۔میری پیاس ابھی باقی ہے۔

سوال: آپ اپنی پسندیدہ نظموں کے نام بتائیے؟

جواب: اس وقت یاد کرنا بہت مشکل ہے۔پھر بھی چند نام یاد آ رہے ہیں بتاتی ہوں۔اذان سحر، صبح صادق، ''متاع آرزو کھو کر ملا کیا'' پل صراط تمنا، حکم سفر دیا تھا۔جستجو ذات کی، یوم الحساب، شب چراغ زندگی تو سوالوں کی زنجیر ہے۔یہ دنیائے وحدت، ہماری روح کا نغمہ کیا ہے، کب سے محو سفر ہو، کیا لکھوں کیا نہ لکھوں، آتش سیال، سیل وجود......اس وقت اتنے ہی نام ذہن میں آرہے ہیں۔بہت سی نظموں پر تو میں عنوان ہی نہیں دیتی۔خصوصاً پہلے دو مجموعوں کی۔بس ایک نظم لکھ دیتی ہوں مدعا یہ کہ بنیادی خیال تک قاری خود پہنچنے کی کوشش کرے تو بہتر ہے۔

سوال: آج کل نثری نظموں کا چلن عام ہوگیا ہے۔کیا آپ اسے شاعری مانتی ہیں؟

جواب: نثری نظم شاعری نہیں ہوسکتی۔ ہرفن کے کچھ اصول کچھ لوازمات ہوتے ہیں جو ناگزیر ہیں مثلاً اردو شاعری میں فکروتخیل، احساس وخیال کے علاوہ (جو ہر فن میں ہوتے ہیں) وزن، بحر، نغمگی، آہنگ، روانی وغیرہ ناگزیر ہیں۔علامت، استعارہ، رمز وکنایہ وغیرہ بھی شاعری کے وہ اجزا ہیں جو نظم کی طرح نثر میں جلوہ گر نہیں ہو سکتے......شاعری اپیل کرتی ہے، مسحور کرتی ہے، اب تک میری نظر سے کوئی ایسی ''نثری نظم'' نہیں گزری جس نے بے ساختہ اپیل کیا ہو۔ مسحور کرنا تو بڑی بات ہے۔

سوال: کیا وجہ ہے کہ ہمارے عہد میں میر وغالب، اقبال، انیس کے مرتبے کا کوئی بڑا شاعر نہیں ہے جب کہ نثر میں قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین جیسے بڑے ادیب موجود ہیں۔

جواب: دیکھیے میر وغالب اقبال وانیس جیسے عظیم شاعر صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور اپنے عہد کا کرب، اپنے زمانے کا اضطراب اور تاریخی شعور انھیں پیدا کرتا ہے مغلیہ عہد کے زوال کی عبرت خیز داستان اور اس کے روحانی کرب نے غالب جیسے نابغۂ روزگار کو پیدا کیا۔اور امت مسلمہ کے زوال اور انتشار اور ان کے پراگندگی، فکروخیال کے غم اور روحانی کرب نے اقبال کو اقبال بنایا آج کے مسائل پیچیدہ اور عالمگیر ہیں۔ہم بے حس مادیت، صارفیت اشتہاروں امریکہ جیسی دہشت گرد قوت کی جارحیت، انسانی اقدار کی بانگِ دہل تردید، خون ناحق، عراق اور افغانستان کی ہولناک تباہی کے عہد میں ہم نیپام بم، کے عہد میں جی رہے ہیں۔ہم انسان (فرد واحد) کی اور قوموں کی بے چارگی، محکومی اور کم مائیگی کے عہد میں، اور مٹھی بھر انسانیت کے دشمنوں کی سفاک ایٹمی سازشوں کے عہد میں جی رہے ہیں۔ ہمارے عہد کا کرب اتنا پیچیدہ ہے کہ اس میں شاعرانہ عظمت کا امکان بھی دیوانے کا خواب معلوم ہوتا ہے۔ہمارے عہد کا اضطراب اور ہے، ہمارا درد شعر کا سانچہ توڑ دیتا ہے۔رہا قرۃ العین حیدر اور عبداللہ حسین جیسے بڑے نثر نگاروں کا سوال، تو ان کے لیول کے شاعر تو آئے ہیں اور آ رہے ہیں وقت بتادے گا۔

سوال: کیا وجہ ہے کہ یہ دور شاعری کا نہیں بلکہ نثر کا ہے؟

جواب: اس سوال کا جواب بھی اس سے پہلے والے جواب میں مضمر ہے۔ اس میں اپنے ملک میں بڑھتی ہوئی ناانصافیوں خصوصاً فرقہ وارانہ عصبیت اور اردو زبان کے خلاف جارحیت کو اور شامل کر لیجیے۔ اس منظر نامے کو ظاہر ہے نثر میں سمیٹنا ممکن ہے، نظم (شاعری) ایک روحانی عہد نامہ ہے، اس میں اتنی Sordid حالات کیسے سما سکتے ہیں۔ نظم کے اوزان علامت، استعارہ، کنایہ تخیل اور روحانی کیف وکم ہیں۔ اس کا رشتہ عرفان ووجدان سے ہے چنانچہ ساری دنیا ہی میں یہ دور نثر کا ہے...... اس پر بھی اگر ہم جیسے کچھ دیوانے شاعری سے رشتہ برقرار رکھے ہوئے ہیں، تو ان کے حوصلے کو سمجھیے ان کے درد کو سمجھیے۔ غالب کا ایک شعر یاد آ رہا ہے شاعری میں میرا معاملہ تو بس یہی ہے:

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیوں کر ہو

•••

بیدار بخت سے گفتگو

جناب بیدار بخت کا شمار عصر حاضر کے اہم مترجمین میں ہوتا ہے۔ آپ نے اردو اور فارسی کے علاوہ سنسکرت ادب کا ترجمہ بھی انگریزی میں کیا ہے۔ آپ 1940 میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ 1947 میں والدین پاکستان چلے گئے۔ لیکن آپ کسی وجہ سے اپنے دادا اور چچا کے ساتھ دلّی رہ گئے۔ چچا سکندر بخت قومی رہنما ہیں۔ 1956 میں تعلیم کے لیے علی گڑھ گئے۔ 1962 میں سول انجینئرنگ کی ڈگری لی۔ 1966 میں انگلستان پہنچے، وہاں سے انجینئرنگ میں پوسٹ گریجویشن کیا۔ بعد میں لندن یونیورسٹی سے ڈی۔ ایس۔ سی۔ کی ڈگری لی۔ 1974 میں ٹورنٹو چلے گئے، اور اب وہیں اپنی بنگالی بیوی انیتا کے ساتھ مقیم ہیں۔ لڑکی آٹوا یونیورسٹی میں قانون کی پروفیسر ہے، اور لڑکا آسٹریلیا میں مینجمنٹ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔

جناب بیدار بخت کی اختر الایمان، مجروح سلطان پوری، علی سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، جمیل الدین عالی، امجد اسلام امجد، گوپال متل، پروین کوثل کی منتخب نظموں کے انگریزی تراجم پر مبنی 16 کتابیں ہندوپاک کے مختلف اشاعتی اداروں سے شائع ہوچکی ہیں۔ ان کے علاوہ آپ نے ''کلیات اختر الایمان'' اور اختر الایمان کی موت کے بعد شائع ہونے والے مجموعۂ کلام '' زمستاں سرد مہری کا'' کی ترتیب و تدوین محترمہ سلطانہ ایمان کے ساتھ کی اور اختر الایمان کی

منتخب نظموں پر مبنی مجموعہ ''درد کی حد سے پرے'' مرتب کیا۔ ان کے علاوہ منیر نیازی، حیدر قریشی، عزیز قیسی، منیب الرحمٰن، ندا فاضلی وغیرہ کی نظموں کے انگریزی ترجمہ 12 مختلف کتابوں میں شامل ہیں۔ مختلف رسائل و جرائد میں بھی آپ کے ترجمہ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آپ نے فارسی اور سنسکرت سے بھی اردو میں کچھ نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔

سوال: آپ ترجمے کی جانب کیسے مائل ہوئے؟

جواب: ایک بار ٹورنٹو میں سردار جعفری میرے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اپنی فرانسیسی پڑوسن کو یہ بتانے کے لیے کہ وہ اردو کے بڑے شاعر ہیں، میں نے ان کی دو ایک نظموں کے انگریزی ترجمے فی البدیہہ کیے تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہی میرے پہلے ترجمے تھے، مگر میرے دوست شاہین، جو کینیڈا کے شہر آٹوا میں رہتے ہیں اور اردو کے اچھے اور مشہور شاعر ہیں (پہلے شاہین غازی پوری کے نام سے لکھتے تھے)، انھوں نے یاد دلایا کہ میرے پہلے ترجمے ان کی نظموں کے تھے۔ خیر پہلے ترجمے جو بھی ہوں ترجموں کا محرک یہ خیال تھا کہ اپنی مادری زبان کی اچھی شاعری کو اوروں سے بھی متعارف کرایا جائے کہ ہمارا قد بھی کچھ اونچا نظر آئے۔ اب سے کوئی بیس پچیس سال پہلے، جب میں نے یہ کام شروع کیا تو جدید اردو شاعری کے انگریزی ترجمے بہت عام نہ تھے۔ بس فیض کے کچھ ترجمے ہوئے تھے اور کچھ انگریزی ترجمے ن۔م۔ راشد کی نظموں کے ہمارے مرحوم دوست حفظ الکبیر قریشی نے کیے تھے۔

سوال: ترجمے کے دوران کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

جواب: آپ نے ایسا سوال کیا ہے، جس پر ایک پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ بہت سی دشواریاں ہیں۔ سب سے بڑی دشواری تو یہ ہے کہ اچھے شعر میں معنی کی کئی تہیں ہوتی ہیں، جن کو ترجمے میں بحال رکھنا اگر ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے۔ اور پھر محاورات اور تلمیحات کو کسی اور زبان میں اس طرح منتقل کرنا کہ ترجمہ دوسری زبان میں غیر شعری نہ ہو بہت مشکل کام ہے۔ یہ سب کہہ کر میں یہ تاثر نہیں دینا چاہتا کہ میں نے ان دشواریوں پر قابو پا لیا ہے۔ کاش ایسا ہوتا۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ ایک مترجم کو، جس زبان میں ترجمہ کر رہا ہے اور جس زبان سے ترجمہ کر رہا ہے دونوں کی لفظیات کے ساتھ ساتھ تہذیب وثقافت سے بھی آگہی ضروری ہے۔ آپ کو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر عبور ہے لیکن کیا آپ کو کلچر سے جڑی چیزوں کا ترجمہ کرتے وقت دقت نہیں ہوتی ہے؟ مثلاً میر کے اس شعر کا ترجمہ آپ کیسے کریں گے؟

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انھی کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

جواب: سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ میں میر کے اس شعر کا ترجمہ اگر کروں گا بھی تو بہت مطالعے کے بعد، بہت سی لغتیں دیکھنے کے بعد۔ میرا حافظہ مشکوک ہے مگر یاد پڑتا ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے اس شعر کے بارے میں کچھ لکھا تھا، پہلے تو اسے پڑھوں گا۔ پھر اس شعر کے ترجمے کی جرأت کروں گا۔ وہ جو بات کہی آپ نے کہ مجھے اردو اور انگریزی زبانوں پر عبور ہے، تو عبور تو خیر بڑا لفظ ہے، ان دونوں زبانوں کی مجھے شدبد ضرور ہے۔ اردو میری مادری زبان ہے۔ بچپن میں دلی میں یہ زبان کانوں میں پڑی، پھر علی گڑھ میں تعلیم کے دوران اردو ادب سے شغف بڑھا۔ رہی انگریزی تو فیروز عالم صاحب، میں چالیس سال سے مغرب میں رہ رہا ہوں، تھوڑی بہت تو انگریزی آنا لازمی ہے۔ ویسے یہ عرض کردوں کہ اپنے انگریزی ترجمے شائع کرنے سے پہلے کسی اہل زبان عالم کو ضرور دکھا لیتا ہوں۔

سوال: آپ نے کن کن شاعروں کے کلام کو اردو کا قالب عطا کیا ہے؟

جواب: میں نے صرف جدید اردو شاعری کا ترجمہ کیا ہے۔ فہرست تو خاصی طویل ہے، فیض، میراجی کی کھیپ کے شاعروں میں ان دونوں کے علاوہ اختر الایمان، سردار جعفری، مخدوم محی الدین، احمد ندیم قاسمی، منیب الرحمٰن اور گوپال متل کے کلام کا ترجمہ کیا ہے۔ ان کے بعد کے شاعروں میں بلراج کومل، شہریار، کشور ناہید، پروین شاکر، امجد اسلام امجد، زبیر رضوی، ندا فاضلی، مظہر امام کی نظموں کے ترجمے کیے ہیں۔ کینیڈا اور امریکہ میں مقیم جن اردو شعرا کے ترجمے کیے ہیں وہ ہیں شاہین، اشفاق حسین، خالد سہیل اور پروین شیر اور بھی

کئی شاعروں کے کلام کو خراب کیا ہے، نام یاد نہیں آ رہے ہیں۔

سوال: آپ نے شاعری کے تراجم کی طرف زیادہ توجہ دی ہے اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب: میں نے نثر کے بھی ترجمے کیے ہیں لیکن زیادہ نہیں، اب سے کچھ مہینے پہلے تک میں نے صرف شاعری کا ترجمہ کیا تھا۔ اردو ادب میں شاعری اور شاعری کی تنقید بہت پڑھتا ہوں۔ افسانے ناول صرف چند ادیبوں کے پڑھتا ہوں، جن سے مجھے خاص شغف ہے۔ کچھ افسانوں کے ترجمے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی رخشندہ جلیل کی فرمائش پر ابھی حال ہی میں کیے ہیں۔

سوال: آپ اپنے تراجم سے کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: مجھے اس مغربی ادیب کا نام یاد نہیں آ رہا جس نے لکھا تھا کہ میں اپنے ترجمے ختم نہیں کرتا، ان سے دستبردار ہو جاتا ہوں۔ میرا حال بھی اسی ادیب کی طرح ہے۔ اگر میں اپنے ترجمے کو دس بار پڑھوں گا تو دس بار اس میں ترمیم کروں گا۔ اپنے ترجموں سے مطمئن شاذ و نادر ہی ہوتا ہوں۔

سوال: ہر مترجم کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ آپ کا مقصد کیا ہے؟

جواب: بنیادی مقصد تو میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ غیر اردو دانوں کو یہ بتا سکوں کہ ہماری زبان کی شاعری بھی قابل اعتنا ہے۔ اکثر ترجمے اسی بنیادی مقصد کے تحت کرتا ہوں، مگر کبھی کبھی دوستوں کی فرمائش پر بھی ترجمے سرزد ہو جاتے ہیں۔

سوال: اس کے علاوہ اور کیا مصروفیات ہیں؟

جواب: بھائی میں روزی روٹی تو پلوں کی انجینئرنگ سے کماتا ہوں، وہی میرا کل وقتی کام ہے۔ انجینئرنگ سے جو وقت بچتا ہے اس میں سے زیادہ حصہ اردو اور کچھ انگریزی ادب پڑھنے میں صرف ہوتا ہے۔ پھر جو وقت بچتا ہے وہ ترجموں وغیرہ میں لگ جاتا ہے۔

سوال: آپ نے دوسرے لوگوں سے بھی مدد لی ہے۔ دو لوگ مل کر کام کرتے ہیں تو لائحہ عمل کیا ہوتا ہے؟

جواب: غالباً آپ کا اشارہ میرے ترجموں کی طرف ہے، جس میں میرے معاون ہمیشہ انگریزی کے ایسے اہل زبان رہے ہیں جنھیں اردو بالکل نہیں آتی۔ ان لوگوں کے ذمے پہلا کام تو یہ

ہوتا ہے کہ مجھے یہ ہے یا نہیں۔ اگر وہ کہتے ہیں کہ بات نہیں بنی تو میں ان ترجموں کو رد کر دیتا ہوں۔ دو شاعر ایسے ہیں جو خود بہت اچھی انگریزی جانتے ہیں: منیب الرحمٰن اور شمس الرحمٰن فاروقی۔ ان کے کلام کا ترجمہ خود ان کے تعاون سے ہوا، اور ان ترجموں میں بہت وقت لگا اس لیے کہ شاعر انگریزی میں من وعن وہی کہنا یا کہلوانا چاہتا تھا جو اس نے اردو میں کہا۔

سوال: آپ نے انجینئرنگ کی ڈگری لی، ادب کی طرف کیسے مائل ہوئے؟

جواب: ارے بھائی ادب تو زندگی کی ضرورت ہے، جیسے کھانا پینا۔ یہ ضروری تو نہیں ہے کہ ادب میں صرف وہ شخص ہی دلچسپی لے جس نے ادب میں ڈگریاں لی ہوں۔

سوال: شاعری میں آپ کی پسند تو آپ کے ترجموں سے ظاہر ہے۔ تنقید میں آپ کس سے متاثر ہیں؟

جواب: متاثر تو بہت سے نقادوں سے ہوں، مگر ایسے نقاد جن کی تحریروں سے میں نے براہ راست بہت کچھ سیکھا ہے چند ہی ہیں: خلیل الرحمٰن اعظمی، شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، وارث علوی اور شمیم حنفی۔ رشید حسن خاں کا نام نقادوں میں نہیں لیا جاتا، مگر زبان اور بیان کے بارے میں ان کی تحریروں سے میں نے جو کچھ سیکھا ہے اسے بیان ہی نہیں کر سکتا۔ ان کی مرتب کردہ کئی کتابیں ایسی ہیں جن کو صرف حواشی کے لیے پڑھتا ہوں۔

سوال: آپ ہندوستان کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں؟

جواب: جامعہ ملیہ اسلامیہ نے مجھے ایک مہینے کے لیے اردو اور انجینئرنگ میں وزٹنگ پروفیسر کے طور پر مدعو کیا۔ انجینئرنگ میں تو میں دو کنیڈین یونیورسٹیوں میں adjunct professor ہوں، مگر اردو کی جز وقتی پروفیسری کی دعوت کو میری انا رد نہ کر سکی کہ میں تو اردو میں میٹرک فیل بھی نہیں ہوں۔

سوال: آپ کی تازہ کتاب کون سی ہے؟

جواب: ایک کتاب تو اختر الایمان کی نظموں کا انتخاب ہے جو 'درد کی حد سے پرے' کے عنوان سے ساہتیہ اکادمی نے 2002 میں شائع کیا تھا، اور دوسری اسی سال شمس الرحمٰن فاروقی کے کلام کے انتخاب اور اس کے انگریزی ترجموں کے ساتھ سٹی پریس کراچی نے شائع کی

ہے The colour of black flowers کے نام سے۔ اس میں غزلوں کے منتخب شعر بھی ہیں، رباعیاں بھی اور نظمیں بھی۔ ایک غزل کے دو شعر پیش ہیں۔

شجر تناور اوپر سے
اندر اندر گھنتا ہوں
دل کے کنوئیں میں گرتے ہیں
سات سمندر سنتا ہوں

ان شعروں کا ترجمہ یوں کیا ہے:

On the outside
a tall, proud tree
On the inside,
termite food.

The seven seas
empty themselves
in the well
Of my heart
or so I hear

•••

طنز و مزاح

مجتبیٰ حسین سے گفتگو

جناب مجتبیٰ حسین کا شمار عصر حاضر کے صف اول کے طنز و مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ آپ 15 جولائی 1936 کو ضلع گلبرگہ (کرناٹک) میں پیدا ہوئے۔ 1956 میں عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد سے بی۔اے کیا۔ پھر روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد دکن سے وابستہ ہوئے۔ 1962 میں اسی اخبار میں مزاحیہ کالم نگاری شروع کی۔ 1972 میں حیدرآباد سے دہلی منتقل ہوئے اور نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ سے وابستہ ہوئے جہاں سے 1991 میں بحیثیت ایڈیٹر وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ آپ جاپان، برطانیہ، فرانس، امریکہ، کینیڈا، روس، ازبکستان، پاکستان، سعودی عرب، سلطنت عمان اور متحدہ عرب امارات کی سیاحت کر چکے ہیں۔ تکلف برطرف (1968)، قطع کلام (1969) قصہ مختصر (1972)، بہرحال (1974)، آدمی نامہ (1981) بالآخر (1982)، جاپان چلو جاپان چلو (1983)، الغرض (1987)، سو ہے وہ بھی آدمی (1987)، چہرہ در چہرہ (1993) سفر لخت لخت (1995)، آخر کار (1997)، ہوئے ہم دوست جس کے (1999)، میرا کالم (1999)۔ مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں (دو جلدوں میں، (2002) مجتبیٰ حسین کے سفرنامے، مرتبہ: حسن چشتی (2003) مجتبیٰ حسین کے منتخب

کالم، مرتبہ: حسن چشتی (2004) آپ کی تعریف مرتبہ: سید امتیاز الدین (2005) آپ کی کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ آپ نے ''ضبط شدہ نظمیں'' اور ماہنامہ ''آج کل'' کا ''اردو طنز و مزاح نمبر'' بھی مرتب کیا۔ ہندی میں بھی آپ کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور ہندوستان کی کئی علاقائی زبانوں میں آپ کی تحریروں کے تراجم ہوئے ہیں۔ آپ کا سفرنامہ جاپان چلو، جاپانی زبان میں بھی شائع ہوا۔ آپ کو اڑیا ادیبوں کی تنظیم سرس ساہتیہ سمیتی، کٹک کی، جانب سے ''ہاسیہ رتن'' کا خطاب۔ (1980)، کل ہند مخدوم محی الدین ادبی ایوارڈ، آندھرا پردیش اردو اکادمی، (1993)، کل ہند کنور مہندر سنگھ بیدی ایوارڈ برائے، اردو طنز و مزاح ہریانہ اردو اکادمی۔ (1999) کل ہند ایوارڈ برائے مجموعی خدمات، کرناٹک اردو اکیڈمی (2002)، کل ہند جوہر قریشی ایوارڈ برائے طنز و مزاح، مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی (2002) مل چکا ہے۔ علاوہ ازیں تمام تصانیف پر ملک کی مختلف اکادمیوں کے انعامات مل چکے ہیں۔

سوال: آپ اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتایئے۔ آپ کے گھر کا ماحول کیسا تھا، آپ کے بچپن کے دن کیسے گزرے؟

جواب: میں ریاست حیدرآباد کے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوا۔ والد تحصیل دار تھے۔ میرے دادا نے غربت کی زندگی گزاری۔ والد محمد احمد حسین اور تایا محمد اسحٰق بچپن میں ہی حیدرآباد چلے گئے۔ تایا وکیل بن گئے۔ میرا آبائی وطن عثمان آباد ہے جو اب مہاراشٹر میں ہے۔ والد گلبرگہ میں تحصیل دار تھے۔ چنچولی (ننھیال) میں 15 جولائی 1936 کو میری پیدائش ہوئی۔ سرٹیفکیٹ میں میری عمر 3 سال بڑھا کر لکھی گئی کیوں کہ اس زمانے میں 16 سال سے کم عمر میں میٹرک کے امتحان میں شامل ہونے پر پابندی تھی۔ میں نے گلبرگہ میں تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصہ عثمان آباد میں، جہاں والد واپس آ گئے تھے، گزارا۔ چھٹیوں میں ارلا اور راجوری چلا جاتا تھا۔ پولیس ایکشن تک میرا خاندان خوشحال تھا۔ گلبرگہ، اورنگ آباد اور ورنگل تین صوبے داریاں تھیں۔ یہ تین لسانی علاقوں کے حساب

سے تھیں۔ گلبرگہ کے صوبے دار امیر علی خاں نہایت ادب دوست تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ گلبرگہ میں سیشن جج تھے۔ ان کے رشتے کے بھائی حسین احمد بیگ محکمۂ مال میں تھے۔ ان کی وجہ سے وہاں 1925 اور 1930 کے بعد ادب کا ماحول بنا۔ ہمارے بڑے بھائی محبوب حسین جگر کی ہمت افزائی مرزا فرحت اللہ بیگ نے کی۔ وہاں میرے بھائی نے پہلی ادبی انجمن بنائی۔ بعد میں ابراہیم جلیس بھی اس ماحول سے متاثر ہوئے۔ ہمارے گھر میں ادب کا ماحول شروع سے رہا۔ بڑے بھائی گریجویشن کر چکے تھے۔ میں ساتویں آٹھویں درجے میں تھا جب پولیس ایکشن ہوا اور سب سے زیادہ تباہی عثمان آباد میں ہوئی یہاں تک کہ پنچولی میں میرے ماموں کا قتل میری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ میں نے زندگی کے تضادات اور نشیب و فراز کو بڑی کم عمری میں دیکھا میں اس زمانے میں گھنٹوں اکیلا ہو جاتا تھا اور قبرستانوں میں جا کر بیٹھنے کی عادت ہو گئی تھی۔ میں رنجیدہ بہت رہتا تھا۔ اس افراتفری کے ماحول میں تعلیم ہو رہی تھی۔ اسی صورت حال میں میں نے میٹرک کا امتحان دیا۔ اس کے بعد میں نے زندگی کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ خوف سے نکلنے کے لیے میں سماجی کاموں اور ثقافتی پروگراموں میں بہت حصہ لیتا تھا۔ ڈراموں میں اچھی اداکاری پر مجھے انعامات بھی ملے۔ میں گلوکار بھی تھا۔

سوال: ادب کی طرف کیسے راغب ہوئے؟

جواب: بھائیوں کی وجہ سے بچپن سے ہی مطالعے کی عادت ہو گئی۔ خصوصاً روسی ادب ترجمے کے حوالے سے کم عمری میں ہی پڑھا۔ تنہائی میں ادب ہی میرا ساتھی تھا۔ تانڈور ہائی اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد میں نے گلبرگہ کے انٹر میڈیٹ کالج سے انٹر کیا۔ یہاں تک آتے آتے خوف اور دہشت سے نکل آیا تھا۔ گلبرگہ میں طلبہ یونین کی بزم اردو کا جنرل سکریٹری بنا۔ میں نے اس زمانے میں وہاں کی تاریخ کا سب سے بڑا کل ہند مشاعرہ کرایا تھا جس میں ساحر لدھیانوی اور کیفی اعظمی بھی آئے تھے۔ جگن ناتھ آزاد نے اس کی صدارت کی تھی۔ اسی زمانے میں لکھنے کا شوق میرے استاد مولوی عبدالمنان کی وجہ سے ہوا۔ اقبال کے مصرعے:

''اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے''

پر ان کے کہنے پر ایک انشائیہ لکھا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور حوصلہ افزائی کی۔

1953 میں عثمانیہ یونیورسٹی آ گیا۔ وہ حیدرآبادی تہذیب کے ساتھ ساتھ اردو تہذیب کے بھی عروج کا عہد تھا۔ مخدوم محی الدین، سکندر علی وجد، بدر شکیب، میر حسن وغیرہ اہم ادبی شخصیات کے علاوہ میرے بھائی محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس بھی ادبی افق پر چھائے ہوئے تھے۔

1952 کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو میڈیم ختم کر دیا گیا۔ میں نے اردو ایک مضمون کے طور پر پڑھی۔ سیاسیات Main مضمون تھا۔ میں وہاں بھی بزم اردو کا جنرل سکریٹری بنا۔

سوال: روزنامہ ''سیاست'' سے کیسے وابستگی ہوئی؟

جواب: 1949 میں محبوب حسین جگر صاحب اور عابد علی خاں صاحب نے مل کر ''سیاست'' نکالا۔ 1997 میں جگر صاحب کا انتقال ہوا۔ میں کالج کے زمانے سے ہی اخبار میں کچھ نہ کچھ کام کر دیتا تھا۔ تبصرہ وغیرہ لکھ دیتا۔ بی۔ اے۔ کرنے کے بعد باقاعدہ ''سیاست'' جوائن کیا۔ میرے ساتھوں میں وحید اختر اور اساتذہ میں علی محمد خسرو، عبدالقادر سروری، حمید الدین شاہد، حفیظ قتیل تھے۔ بھائیوں کے ساتھ میں بھی ترقی پسند تحریک سے قریب تھا۔ ایک عرصے تک صحافی کی حیثیت سے کام کیا۔ ''سیاست'' کا ایک طنزیہ کالم ''شیشہ و تیشہ'' شاہد صدیقی (شاعر اور نثر نگار) لکھا کرتے تھے۔ 31 جولائی 1962 کو ان کا انتقال ہو گیا۔ کئی لوگوں سے یہ کالم لکھوایا گیا لیکن بات نہیں بن پائی۔ جگر صاحب نے اچانک مجھ سے کہا کہ تم لکھو، میں نے بادل ناخواستہ وہ کالم لکھا۔ اس طرح 12 اگست 1962 کو صبح دس بجے میں نے کالم نگاری شروع کی۔

سوال: آپ کے ابتدائی کالموں پر قارئین کا ردعمل کیسا رہا؟

جواب: ابتدا میں کوہ پیما کے فرضی نام سے کالم لکھے۔ شاہد صاحب کوہ کن کے نام سے لکھتے تھے۔ پانچ چھ دن کے بعد لوگ پوچھنے لگے کہ کون یہ کالم روزانہ لکھتا ہے۔ چھ مہینے بھی نہیں ہوئے

تھے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے ''صدق جدید'' میں حیدرآباد کی صحافت کا ذکر کیا تو لکھا کہ حیدرآباد میں ''سیاست'' کا اچھا پہلو اس کا مزاحیہ کالم ہے۔ انھوں نے بڑی تعریف کی تھی۔ اس کے بعد میں نے پھر طنز و مزاح کو اپنا لیا اور آج یہی میری شناخت ہے۔ اس میدان میں آنے کے بعد میں نے بہت لوگوں کو پڑھا۔ یوسفی کی ''چراغ تلے'' پطرس اور رشید احمد صدیقی، ابن انشا، شفیق الرحمٰن وغیرہ کو دوبارہ خوب پڑھا۔ مغربی مزاح نگاری کا بھی خوب مطالعہ کیا۔

سوال: آپ نے اپنے اصلی نام سے کب لکھنا شروع کیا؟

جواب: پہلی بار اپنے اصلی نام سے ایک مضمون یوم غالب پر 1964 میں ''ہم طرفدار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں'' کے عنوان سے لکھا۔ یہ جلسہ اردو مجلد حیدرآباد کے زیر اہتمام ہوا تھا، جس کے سکریٹری منظور احمد صاحب کے اصرار پر یہ پڑھا تھا۔ اس میں تمام بڑے لوگ موجود تھے۔ مخدوم محی الدین، حبیب الرحمٰن، ہارون خاں شیروانی وغیرہ۔

سوال: ہندوستان میں طنز و مزاح کو مقبولیت عطا کرنے میں آپ کی کوششوں کا بھی بڑا دخل رہا ہے۔ ان پر مختصر روشنی ڈالیے؟

جواب: 1966 میں زندہ دلان حیدرآباد کے بینر تلے میں نے ہندوستان کے مزاح نگاروں کی پہلی کانفرنس منعقد کی جس کی صدارت کرشن چندر نے کی اور مخدوم محی الدین نے افتتاح کیا۔

1985 میں طنز و مزاح پر بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں 12 ممالک سے لوگ آئے تھے۔ اس میں علاقائی زبانوں کے بھی اجلاس ہوئے۔ بلرام جا کھڑ (اسپیکر) نے اس کی صدارت کی تھی۔ زندہ دلان حیدرآباد کی جانب سے 38 سال سے ''شگوفہ'' نکل رہا ہے۔ طنز و مزاح کے فروغ میں اس رسالے اور اس کے مدیر کا بڑا رول رہا ہے۔ ہم نے جب یہ انجمن شروع کی تو بھارت چند کھنہ، رشید قریشی، سلیمان خطیب، حمایت اللہ، نریندر لوتھر نے طنز و مزاح کی طرف خصوصی توجہ کی۔ اس کے بعد پٹنہ، بھوپال اور ممبئی میں طنز و مزاح کو اسٹیج پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ 1968 میں ممبئی گیا جہاں ''سر سنگا سنسد'' نے قہقہے کے عنوان سے پروگرام رکھا تھا۔ وہاں جب میں نے

''علامہ نارسا کی وفات میسرت آیات پر'' سنایا تو اسے بہت پسند کیا گیا۔ اس جلسے میں کنہیا لال نند اور کئی بڑے ادیب وشاعر موجود تھے۔ دھرم ویر بھارتی (مدیر ''دھرم یگ'') نے ''بیٹھے ٹھالے'' کے عنوان سے کالم لکھنے کی پیشکش کی۔ پھر انھوں نے بڑی محبت سے میری تحریریں شائع کیں۔

سوال: آپ دہلی کب آئے؟

جواب: 1962 میں سرکاری ملازمت ملنے کے بعد حیدر آباد کے محکمۂ اطلاعات میں اردو اخبارات کی نگرانی سے متعلق کام انجام دیتا رہا۔ 1972 میں کمیٹی فار پروموشن آف اردو نے کام شروع کیا تو مجھے دہلی بلایا گیا۔ 1962 سے 1972 تک بحیثیت مزاح نگار میری کافی شہرت ہو چکی تھی۔ یہاں مجھے بے حد وسیع کینوس ملا۔ لوگ دہلی کو ظالم شہر کہتے ہیں لیکن مجھے یہاں جو پیار ملا اس کا جواب نہیں ہے۔ یہاں بھی میں نے شروع میں تکلیف اٹھائی۔ این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی میں ایڈیٹر بننے کے بعد وہاں میں نے سنجیدگی سے اردو کا کام شروع کرایا۔ میں نے جنتا پارٹی کے زمانے میں تین مہینے میں تین درسی کتابیں تیار کرائیں۔ اس عہد میں مجھے پوری سہولیات بھی دی گئیں۔

سوال: دہلی میں آپ کی دیگر مصروفیات کیا رہیں؟

جواب: دہلی میں رہ کر میں صرف پڑھنے لکھنے تک محدود رہا۔ میرے سوشل ہونے کی وجہ سے ہر محفل میں میرا انتظار رہتا تھا۔ لیکن میں نے اس کا غلط فائدہ کبھی نہیں اٹھایا۔ یہاں سے میں امریکہ، سوویت یونین، خلیجی ممالک، یورپ، جاپان وغیرہ گیا۔ سرکاری سفر صرف ایک جاپان کا تھا۔ بقیہ جگہوں پر مجھے بطور ادیب بلایا گیا۔

سوال: آپ کو اردو کے علاوہ دیگر زبانوں کے ایوارڈ بھی ملے۔ ان کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

جواب: ایک عجیب بات یہ ہے کہ مجھے سب سے پہلا ایوارڈ اڑیا انجمن سرس ساہتیہ سمیتی نے دیا۔ ''دھرم یگ'' سے اڑیسہ کے فتورانند نے اڑیا میں میرے تراجم کیے تھے جو بہت پسند کیے گئے۔ وہاں مجھے ''ہاسیہ رتن'' کا خطاب دیا گیا۔ میرے مضامین پر ڈرامے لکھے گئے۔

جسٹس رنگ ناتھ مشرا کا بھی اس انجمن سے تعلق تھا۔ وہاں مجھے بڑی عزت ملی۔ بقیہ اعزازات تو مجھے بعد میں ملے۔

سوال: آپ کی ادبی زندگی پر آپ کے بھائیوں کا کتنا اثر رہا ہے؟

جواب: میری تربیت میں محبوب حسین جگر صاحب کا بڑا اثر تھا۔ ''غنچہ''، ''پھول''، ''تارے'' وغیرہ رسائل انھوں نے میرے نام جاری کرا رکھے تھے۔ ان کے علاوہ مجھے پڑھنے کے لیے کتابیں دیتے تھے۔ ان سے مجھے بڑا ڈر لگتا تھا۔ ان کی تربیت کا ہی نتیجہ تھا کہ دلآزاری کی چیزیں میرے مزاج میں نہیں آئیں۔ ابراہیم جلیس سے طنز و مزاح کے سلسلے میں متاثر ہوا۔

سوال: بچپن میں مستقبل کے لیے کوئی منصوبہ بندی؟

جواب: آزادی کے بعد ایسا بکھراؤ آیا کہ ہمارا گھر برباد ہو گیا اور کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وقت اور حالات جیسے رہے، اس حساب سے چلتا رہا۔ پیسہ جمع کرنے پر کبھی خاندان نے زور نہیں دیا۔ دوسروں کی مدد میں کبھی کمی نہ کی۔

سوال: بچپن کی شرارتیں؟

جواب: ایسے کئی واقعات ہیں جن میں سے دو کا ذکر کر رہا ہوں۔ چچا زاد بہن سے کم عمری (1956) میں میری شادی ہوئی۔ شادی اچانک طے ہوئی۔ عبدالقادر سروری صاحب کو دعوت نامہ دینے گیا تو بڑی شرم آئی، ہچکچاہٹ بھی تھی۔ انھوں نے پوچھا ''کس کی شادی ہے؟'' میں نے کہا ''چچازاد بہن کی شادی ہے۔'' انھوں نے پوچھا ''کس سے ہو رہی ہے؟'' میں نے کہا ''مجھ سے ہو رہی ہے۔'' وہ بہت ناراض ہوئے، یہ سوچ کر کے کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ہم لوگوں نے کچھ ایسے شاعر اور افسانہ نگار ڈھونڈ لیے تھے جو چائے اور کھانے پر کلام یا افسانہ سناتے تھے۔ ان سے صفحے کے حساب سے ہم لوگ پیسہ خرچ کراتے تھے لیکن جگر مرادآبادی نے ہمیں ایسا سبق سکھایا کہ زندگی بھر یاد رہے۔ 1955 میں جب وہ بزم اردو کی دعوت پر حیدرآباد آئے تو شہرت کی بلندیوں پر تھے۔ علامہ حیرت بدایونی کے بیٹے افضل محمد (جو بعد میں وائس چانسلر ہوئے) میرے دوست تھے۔ حیرت صاحب اور جگر صاحب کے دوستانہ مراسم

تھے۔ افضل محمد نے وعدہ کیا کہ وہ انھیں کالج میں بلوا لیں گے۔ ہم نے اعلان کرا دیا کہ مشاعرے میں جگر صاحب بھی شرکت کر رہے ہیں۔ ہم لوگ وقت معینہ پر ٹیکسی لے کر انھیں لینے پہنچ گیے۔ وہ شاہد صدیقی کے ساتھ تاش کھیل رہے تھے۔ ہم نے کہا تو بولے" آپ نے مجھے مشاعرے میں بلایا نہیں۔ میں کیوں آؤں۔" ہم لوگوں نے بڑی منت سماجت کی لیکن وہ رضامند نہیں ہوئے۔ ہم لوگ مایوس ہو کر واپس آ گئے۔ خوف اور شرم کے مارے مشاعرہ گاہ واپس آنے میں قدم ڈگمارہے تھے۔ ابھی ہم لوگ وہاں پہنچے ہی تھے کہ جگر صاحب بھی وہاں پہنچ گیے۔ انھوں نے نہ کرایا لیا اور نہ نذرانہ اور کسی سے اس واقعے کا ذکر بھی نہیں کیا۔ بڑی دیر تک سناتے رہے اور لوگ ڈوب کر سنتے رہے۔ اب کہاں وہ لوگ اور ایسی محفلیں!

سوال: آپ اپنے کالموں کے موضوعات کہاں سے اخذ کرتے ہیں؟

جواب: سیاسی بے اعتدالی، پانی یا بجلی کا مسئلہ، کوئی اور مسئلہ، سیاسی واقعات وغیرہ مختلف چیزوں سے موضوعات لیتا ہوں۔ میری کوشش رہی ہے کہ خود کو دہراؤں نہیں۔ کالم نگاری کی وجہ سے احمد ندیم قاسمی، شوکت تھانوی، مشفق خواجہ، ابراہیم جلیس اور نصر اللہ خاں کی تحریریں خاص طور سے ذوق و شوق سے پڑھیں اور بہت کچھ سیکھا۔

سوال: آپ کس مزاح نگار سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے؟

جواب: مجھے مشتاق احمد یوسفی سب سے زیادہ پسند ہیں اور میں اردو کا سب سے پہلا اور بڑا اہم مزاح نگار غالب کو مانتا ہوں۔ اس میں اپنے آپ کا مذاق اڑانے کا جو حوصلہ ہے، کسی اور میں نہیں۔ ہاں یوسفی میں ہے۔ ابن انشا، مشفق خواجہ، یوسف ناظم، فکر تونسوی، وجاہت علی سندیلوی مجھے پسند ہیں۔ رضا نقوی واہی نے شاعروں میں اکبر الہ آبادی کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ہماری کانفرنس کے بعد طنز و مزاح کی مجلسوں کی روایت پھیلی ہے۔ پاکستان میں ضمیر جعفری، مجید لاہوری، دلاور فگار اور ہندوستان میں فرقت کاکوری، احمد جمال پاشا، شفیق الرحمٰن وغیرہ نے اچھی پیروڈی لکھی ہے۔ انور مسعود، انعام الحق جاوید اچھے شاعر ہیں۔ عطاالله قاسمی، امجد اسلام امجد نے بھی اچھا طنز و مزاح لکھا ہے۔

سوال: طنز و مزاح اور انشائیہ میں کیا فرق ہے؟

جواب: Essay کی بنیاد پر یہ بحث چھڑی۔ سید محمد حسنین نے اس سلسلے میں بڑا کام کیا۔ دراصل دونوں ایک ہی چیزیں ہیں۔ وزیر آغا کی تعریف میری سمجھ میں تو نہیں آئی۔

سوال: ایک اچھے طنز و مزاح میں نگار میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں؟

جواب: ہلکے پھلکے انداز میں لکھنا اور بلیغ نکتے پیدا کرنا طنز و مزاح نگار کا کام ہے۔ زبان پر قدرت ہو، الفاظ سے غیر ضروری کھلواڑ نہ کیا جائے۔ باریک بینی، صورت حال کا کامیاب تجزیہ، انسان کی بوالعجبیوں کا مشاہدہ اور ان کو چابک دستی سے بیان کرنا ضروری ہے۔

سوال: ایک زمانہ تھا کہ برصغیر میں رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، فرقت کاکوری، شوکت تھانوی، کنہیالال کپور، احمد جمال پاشا، عظیم بیگ چغتائی اور رضا نقوی واہی جیسے اعلیٰ پائے کے طنز و مزاح نگار موجود تھے۔ آج ہندوستان میں آپ کے علاوہ یوسف ناظم ہیں۔ اور پاکستان میں مشتاق احمد یوسفی کے علاوہ کوئی بڑا مزاح نگار نظر نہیں آتا۔ آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہے۔ کیا آج کا معاشرہ طنز و مزاح کے لیے سازگار نہیں ہے؟

جواب: اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے کلاسیکی ادب سے دور ہو رہے ہیں، خصوصاً نئی نسل۔ بہت کم لوگوں نے ''آب حیات'' یا داستانیں پڑھی ہیں۔ نئی نسل میں وہ مزاح ختم ہو رہا ہے۔ دوسرے آج کی زندگی کے تقاضے بھی ایسے ہو گئے ہیں کہ مصروفیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اردو میں بڑی حد تک مجلسی مزاح رہا ہے۔ جملے بازی، پھبتی کسنا، درباروں کے ساتھ ختم ہو گیا۔ مشینی زندگی ہو گئی۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آدمی اپنے سروکار سے مخلص رہے۔ موسیقی والے ریاض کرتے ہیں۔ لیکن لکھنے کے لیے جس قدر مشق کی ضرورت ہے وہ نئی نسل نہیں کر رہی ہے۔

سوال: مشتاق احمد یوسفی کی خاص بات جو آپ کو پسند ہو؟

جواب: یوسفی دنیا کی کسی بھی زبان کے طنز و مزاح نگاروں سے بہت آگے ہیں۔ ان کی سوچ بھی بہت منفرد ہے۔ وہ لفظ تو چھوڑیے، کافی سوچ سمجھ کے استعمال کرتے ہیں۔ وہ ایسا لفظ استعمال کرتے ہیں کہ اس کے نئے معنی روشن ہو جاتے ہیں۔ وہ بڑے کرافٹ مین ہیں۔ وہ

جب تک مطمئن نہیں ہو جاتے، کوئی تحریر چھپنے کے لیے نہیں بھیجتے۔ وہ Perfectionist ہیں۔ انھوں نے چار کتابیں لکھی ہیں لیکن وہ حرف آخر ہیں۔ غالب نے ڈیڑھ سو سال پہلے طنز و مزاح کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا تھا، اس کا نقطۂ عروج مشتاق احمد یوسفی ہیں۔ میں ابن انشا کو بھی بڑا مزاح نگار مانتا ہوں۔ وہ ہمیشہ بے ساختہ لکھتے تھے۔ انھوں نے بے ساختگی میں جو برجستگی پیدا کی اور جذبے کی نزاکتوں کو جس طرح پیش کیا، انسان کی اوبڑ کھابڑ زندگی کو جس طرح نمایاں کیا، وہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ دنیا کی کسی زبان میں شاید ہی ایسا بے ساختہ لکھنے والا ملے۔ زبان کا ہر پہلو (Shade) ان کے سامنے تھا۔ ہر طبقے کے لوگوں کی زبان اور نفسیات پر ان کو قدرت حاصل تھی۔

سوال: اصلاح معاشرہ میں طنز و مزاح نگار کا کیا رول ہے؟

جواب: جب مزاح نگار کسی کا مذاق اڑاتا ہے تو بہت سی کام کی باتیں ہو جاتی ہیں۔ لیکن اسے اصلاح معاشرہ تک محدود کرنا غلط ہے۔ دوسروں میں خوشیاں بانٹنا خود نیک کام ہے۔ یہ کام مزاح نگار کرتا ہے۔ یوسفی کا کہنا ہے کہ طنز و مزاح سے اگر قوموں کی اصلاح ہوتی تو عربوں کو بارود ایجاد کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

سوال: آپ نے دہلی میں ایک طویل مدت تک قیام کرنے کے بعد حیدر آباد میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: دہلی کا مجھ پر گہرا اثر رہا ہے۔ یہ شہر مجھ پر بڑا مہربان رہا ہے۔ مجھے یہاں ہر طبقے میں محبت ملی، جو شاید ہی کسی کو ملے۔ مجھے اپنے بچوں کے سعودی عرب چلے جانے کی وجہ سے حیدر آباد آنا پڑا۔ بیٹی دہلی میں رہتی ہے۔ سنہ 2000 میں گھٹنے کی سرجری کرائی جو ناکام ہوگئی۔ اکتوبر 2000 سے میرے مسائل شروع ہوئے۔ چلنے پھرنے سے معذور ہونے لگا۔ کئی مہینے اسپتال میں رہا۔ دہلی کی سرگرمیوں میں شرکت، آنا جانا، زندگی سے جڑے رہنا ضروری ہے۔ میرے بڑے بیٹے کے بچے بڑے ہو گئے۔ ان کی تعلیم اور نگہداشت کے لیے مجھے حیدر آباد آنا پڑا۔ لیکن مہینہ ڈیڑھ مہینہ میں دہلی ضرور پہنچتا ہوں۔ یہاں رہ کر بھی میرے پاس حیدر آباد سے زیادہ دہلی سے فون آتے ہیں۔ حیدر آباد میرا محبوب شہر ہے۔

لیکن وہاں میرے پرانے ساتھی اب بہت کم رہ گئے ہیں۔ پورا حیدر آباد مجھے چاہتا ہے لیکن دوستوں کی کمی کھلتی ہے۔ مجھے بڑی تنہائی محسوس ہوتی ہے۔

سوال: آپ کو اپنی کون سی تخلیق سب سے زیادہ پسند ہے؟

جواب: مجھے لکھ دینے کے بعد کوئی مضمون پسند نہیں آتا۔ محفلوں میں پڑھنے کے بعد داد ملنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اچھے ہیں۔ میں قلم برداشتہ لکھتا ہوں۔ اس کی تعریف مشتاق احمد یوسفی نے بھی کی۔ یہ ان کی عظمت تھی کہ دبئی میں نثری مزاح کا جشن منایا جانے لگا تو یوسفی نے میرے لیے کہا کہ آپ میری بجائے مجتبیٰ حسین کا جشن منایئے جو مسلسل لکھ رہے ہیں۔ ان لوگوں نے جو سوئیر نکالا وہ میرے حوالے سے یادگار ہے۔

سوال: قومی اردو کونسل نے اردو زبان و تعلیم کے فروغ کے لیے جو کوششیں کی ہیں، ان کے بارے میں آپ کی رائے ہے؟

جواب: قومی اردو کونسل کے اغراض و مقاصد بہت نیک ہیں اور کام بھی مسلسل ہو رہا ہے۔ یہاں سے اچھی کتابیں شائع ہوئی ہیں لیکن اگر کونسل اردو زبان کو نصاب میں شامل کرانے کے لیے کوئی عملی قدم حکومت ہند کے دوسرے اداروں کے مشورے کے ساتھ اٹھائے تو یہ ایک عظیم خدمت ہوگی کیونکہ نصاب میں شمولیت کے بغیر زبان کا فروغ ممکن نہیں ہے۔ کونسل کے دائرۂ کار کو وسیع کرنے کے سلسلے میں جو عملی دشواریاں ہیں ان کی طرف حکومت کے سربر آوردہ اصحاب کو توجہ دلانا چاہیے۔

سوال: ''اردو دنیا'' کے قارئین کے نام آپ کا پیغام؟

جواب: ''اردو دنیا'' ایک اہم اور موثر رسالہ ہے جس کے ذریعے صحیح معنوں میں نہ صرف اردو کی حالت بلکہ اردو کے ادیبوں کے حالات کا بھی علم ہوتا رہتا ہے۔ یہ ایک مکمل اور بھرپور رسالہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ نئی نسل میں اس کی پذیرائی ہوگی۔ میری نیک تمنائیں ''اردو دنیا'' کے ساتھ ہیں۔

•••

سید مصطفیٰ کمال سے گفتگو

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کا نام ادبی حلقوں کے لیے جانا پہچانا ہے۔آپ کی شخصیت کے کئی رخ ہیں۔اردو تحریک سے کوئی 50 برس سے وابستہ ہیں، اردو صحافت سے بھی آپ کا تعلق خاصا پرانا ہے اور درس و تدریس سے بھی طویل عرصے تک منسلک رہے ہیں۔آپ گذشتہ 40 برس سے اردو کا ایک ایسا رسالہ شائع کر رہے ہیں جو صرف طنز و مزاح کے لیے مخصوص ہے۔ ماہنامہ ''شگوفہ'' نے طنز و مزاح کے حوالے سے جو کام کیا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کا تعلق حیدرآباد سے ہے۔آپ کی ولادت 12 جولائی 1939 کو حیدرآباد میں ہوئی البتہ اسکول سرٹیفکیٹ میں آپ کی تاریخ پیدائش 26 فروری 1939 درج ہے۔غالباً میٹرک کے امتحان کے لیے درکار عمر کم ہونے کی وجہ سے ساڑھے چار ماہ بڑھا کر عمر لکھوائی گئی۔آپ کے والد کا نام سید احمد علی اور والدہ کا نام خیر النسا بیگم تھا۔والد چونکہ محکمۂ جنگلات میں ملازم تھے اور ان کا اکثر تبادلہ ہوتا رہتا تھا اس لیے بار بار اسکول تبدیل کرنے کی وجہ سے مصطفیٰ کمال صاحب کی ابتدائی تعلیم متاثر ہوئی۔1955 میں آپ نے چادر گھاٹ ہائی اسکول، حیدرآباد سے اردو میڈیم میں میٹرک کیا۔1958 میں سٹی کالج، حیدرآباد سے انٹرمیڈیٹ اور 1961 میں سائنس کالج، عثمانیہ یونیورسٹی سے بی.ایس.سی کی ڈگری حاصل

کی۔اس کے بعد ایک سال سے زائد عرصے تک شعبۂ جنگلات، عادل آباد میں ملازمت کی لیکن یہ ملازمت انھیں پسند نہیں آئی اور واپس حیدر آباد آ گئے۔

ڈاکٹر سید مصطفٰے کمال نے 1965 میں جامعہ عثمانیہ سے اردو میں ایم اے کیا اور یونیورسٹی میں اول آئے۔ 1964 میں آپ کی ادارت میں مجلۂ عثمانیہ کا دکنی ادب نمبر شائع ہوا۔اس خصوصی اشاعت کو دکنیات کے موضوع پر آج بھی حوالے کی حیثیت حاصل ہے۔ایم اے کرنے کے بعد پروفیسر مسعود حسین خاں کی نگرانی میں ''حیدر آباد میں اردو کی ترقی —— تعلیمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے'' کے زیرِ عنوان پی ایچ ڈی میں جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا۔اس مقالے کے لیے آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز کے کاغذات کی کوئی ڈیڑھ سال تک چھان بین کرتے رہے۔ کافی مواد بھی اکٹھا کر لیا۔ اسی دوران 1965 میں کالج آف لینگویجز کے قیام میں بنیادی کردار ادا کیا اور دسمبر 1969 تک اس ایوننگ کالج میں رضا کارانہ تدریسی خدمات انجام دیں۔ 1965 سے 1976 تک روزنامہ ''رہنمائے دکن'' کے صفحۂ شعر وادب کی ادارت کا کام انجام دیا۔ اسی زمانے میں 1966 سے 1969 کے اختتام تک ممتاز کالج میں پارٹ ٹائم لکچرر رہے۔انجمن تحفظ اردو کے ترجمان ماہنامہ ''قومی زبان'' کی مجلس ادارت کے بھی رکن تھے۔یہ مصروفیات پی ایچ ڈی کے مقالے کی تکمیل میں مانع رہیں۔لیکن یو جی سی کی ایک اسکیم کے تحت انھوں نے یہ مقالہ 1984 میں مکمل کیا اور 1990 میں یہ کتابی شکل میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر سید مصطفٰے کمال نے طالب علمی کے زمانے سے ہی اردو تحریک میں سرگرم حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔انجمن تحفظ اردو کے بینر تلے آپ آندھرا پردیش میں اردو کو اس کا جائز مقام دلوانے کی کوششوں میں مصروف رہے۔انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی مجلس عمل کے بھی وہ رکن تھے۔نومبر 1968 میں رسالہ ''شگوفہ'' جاری کیا جو تا حال پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ جنوری 1970 میں انوار العلوم ایوننگ کالج میں آپ کا تقرر بحیثیت لکچرر ہوا۔ 1976 میں انوار العلوم ڈے کالج میں منتقل ہو گئے۔ 1984 میں ریڈر اور صدر شعبہ مقرر ہوئے اور 1997 میں وظیفہ حسنِ خدمت پر سبک دوش ہوئے۔جب 1998 میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

کا قیام عمل میں آیا اور فاصلاتی طرزِ تعلیم کے تحت بی اے کے آغاز کا فیصلہ ہوا تو درسی مواد کی تیاری و اشاعت کے لیے آپ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ یونیورسٹی میں ٹرانسلیشن ڈویژن قائم کیا گیا اور ڈاکٹر مصطفےٰ کمال کو کوآرڈینیٹر اور انچارج مقرر کیا گیا۔ وہاں انھوں نے قریب آٹھ سال خدمات انجام دیں اور اپنی نگرانی میں 198 کتابیں شائع کرائیں جن میں اردو میں پہلی بار ترجمہ کی گئی بی کام کی 54 کتابیں شامل ہیں۔ آپ نے آندھرا پردیش کے مدراس کی نصابی کتابوں کے اشاعتی پروجیکٹس میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔

سوال: ''شگوفہ'' کی اشاعت کا خیال کیسے آیا؟

جواب: 1965 میں برصغیر کے ممتاز طنز و مزاح نگار اور میرے دوست مجتبیٰ حسین نے طنز و مزاح نگاروں کی ایک قومی کانفرنس کے انعقاد کا ارادہ کیا۔ طے ہوا کہ حلقۂ اربابِ ذوق اور فائن آرٹس اکادمی کے ادبی شعبے زندہ دلانِ حیدرآباد کے اشتراک سے یہ کانفرنس منعقد کی جائے۔ اس کے لیے ایک مجلس استقبالیہ تشکیل دی گئی جس کے صدر بھارت چند کھنہ، نائب صدور میر عابد علی خاں، بُدھ ویر، اور منظور حسن، معتمد عمومی مجتبیٰ حسین، نائب معتمدین حمایت اللہ اور حفیظ قیصر منتخب ہوئے۔ مجھے آفس سکریٹری چنا گیا۔ مئی 1966 میں کانفرنس ہوئی جس کی صدارت کرشن چندر نے کی۔ ملک کے تمام اہم طنز و مزاح نگار پہلی بار ایک اسٹیج پر جمع ہوئے۔ یہ کانفرنس بے حد کامیاب رہی۔ کانفرنس کے موقعے پر اس کا سووینئر شائع ہوا جس کے مرتبین میں میں بھی شامل تھا۔ اس سووینئر کو توقع سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ 1967 میں دوسرے کل ہند مزاحیہ مشاعرے اور 1968 میں تیسرے سالانہ اجتماع پر سووینئر شائع ہوئے اور ان کی کاپیاں ہاتھوں ہاتھ بک گئیں۔ اس سے مجھے تحریک ملی اور میں نے خالص طنز و مزاح کا رسالہ شائع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ سووینئر کی مقبولیت اس بات کی شہادت تھی کہ قارئین طنزیہ و مزاحیہ تحریریں پڑھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ 1968 میں پرچہ نکالنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ میں نے مجتبیٰ حسین سے مشورہ کیا تو انھیں بھی یہ خیال پسند آیا۔ پرچے کا نام ''خنداں'' سوچا گیا تھا، دوسری ترجیح ''شگوفہ'' تھی۔ رجسٹرار نیوز پیپر آف انڈیا سے ''شگوفہ'' کی منظوری ملی۔

زندہ دلان حیدرآباد سے معاہدہ ہوا کہ یہ پرچہ اس کا ترجمان ہوگا تاہم اس کے مالکانہ حقوق میرے نام ہوں گے۔

یکم نومبر 1968 کو ''شگوفہ'' کا پہلا شمارہ شائع ہوا جس کی مجلس مشاورت میں کرشن چندر، بھارت چند کھنہ اور زینت ساجدہ تھے اور مجلس ادارت میں احسن علی مرزا، مجتبیٰ حسین اور حمایت اللہ۔ جون 1973 تک یہ رسالہ ڈیڑھ ماہی تھا اس کے بعد ماہنامہ ہوگیا۔ اس کی ابتدائی ساڑھے چار سالہ سفر میں کل 36 شمارے نکلے اور کبھی وقفہ نہیں آیا البتہ بعد کے دور میں چند سالنامے مشترکہ شمارے کی صورت میں شائع ہوئے۔

سوال: زندہ دلان حیدرآباد کا ابھی آپ نے ذکر کیا۔ یہ کس قسم کی تنظیم ہے؟

جواب: جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا زندہ دلان حیدرآباد، فائن آرٹس اکادمی حیدرآباد کا ادبی شعبہ تھا۔ 1950 میں فائن آرٹس اکادمی کا قیام عمل میں آیا اور کسی نام کے بغیر اس کا ادبی شعبہ بھی قائم ہوگیا۔ 1961 میں زندہ دلان حیدرآباد کے عنوان سے آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے ایک مزاحیہ مشاعرہ نشر ہوا جس کے بعد عزیز قیسی کی صدارت میں منعقدہ فائن آرٹس اکادمی کی ایک میٹنگ میں اس ادبی شعبے کا نام زندہ دلان حیدرآباد رکھا گیا۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کی جانب سے فائن آرٹس اکادمی حیدرآباد کے بینر تلے 1962 سے ہر سال ریاستی سطح پر مشاعرہ منعقد ہوتا تھا۔ 1966 کی کل ہند کانفرنس کے بعد زندہ دلان حیدرآباد کو ملک گیر شہرت حاصل ہوئی۔ میری تجویز پر اس تنظیم کا باقاعدہ دستور بنایا گیا اور 1968 میں اسے خودمختار حیثیت حاصل ہوگئی۔ بھارت چند کھنہ کو صدر اور مجتبیٰ حسین کو معتمد عمومی بنایا گیا۔ تب سے اب تک یہ تنظیم ملک میں طنز و مزاح کے فروغ کے لیے سنجیدگی سے عمل پیرا ہے۔ 1972 میں مجتبیٰ حسین کی دہلی میں منتقلی کے بعد حمایت اللہ، مصطفیٰ علی بیگ اور پھر طالب خوندمیری اس کے معتمد عمومی منتخب ہوئے۔ بھارت چند کھنہ کے بعد نریندر لوتھر اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صدارت پر فائز ہوئے۔ نریندر لوتھر کی تحریک پر ان کی صدارت میں عالمی طنز و مزاح کانفرنس

1984 میں منعقد ہوئی جس میں مختلف ممالک کے وفود نے حصہ لیا اور ہندوستان کی مسلمہ زبانوں کے متوازی اجلاس بھی منعقد ہوئے۔

سوال: کیا آپ کو شروع میں یہ امید تھی کہ اس قدر طویل عرصے تک اتنی پابندی سے ''شگوفہ'' شائع کر سکیں گے؟

جواب: ابتدا میں مجھے امید نہیں تھی کہ یہ رسالہ اتنے طویل عرصے تک جاری رہ پائے گا لیکن قارئین کی حوصلہ افزائی اور میرے مزاج کی ثابت قدمی اور احباب کے خلوص کی وجہ سے یہ پرچہ اس سال نومبر میں 40 برس پورے کرنے میں کامیاب ہوگا۔ ابتدائی دنوں میں میرے ذہن میں رسالے کا کوئی بہت واضح خاکہ نہیں تھا لیکن آہستہ آہستہ طنز و مزاح کا ایک خاص مزاج اس نے اپنایا جس میں ابتذال، تمسخر اور بھونڈا پن کی گنجائش نہیں تھی۔ گروہ بند ادبی رقابتوں اور شخصی حملوں سے ہمیشہ احتراز کیا گیا۔ اس رسالے نے طنز و مزاح کا ایک اعلیٰ معیار قائم کرنے کی کوشش کی اور ملک اور بیرون ملک میں اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ خلیجی ممالک خصوصاً سعودی عرب کے اردو قارئین نے رسالے کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ ہماری اوورسیز کمیٹی اور اس کے کنویز عابد معز نے اردو دنیا میں ''شگوفہ'' کو متعارف کرانے میں اہم رول ادا کیا۔

سوال: ''شگوفہ'' میں تنقیدی مضامین کیوں شائع نہیں کیے جاتے جب کہ کسی بھی صنف کی سمت و رفتار کا پتہ لگانے کے لیے یہ اہم ذریعہ ہیں؟

جواب: یہ صحیح ہے کہ ''شگوفہ'' کے عام شماروں میں ہم تنقیدی مضامین کم شائع کرتے ہیں لیکن خاص شماروں میں موضوع کی مناسبت سے مختلف پہلوؤں پر تنقیدی تحریریں شامل اشاعت رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہندوستانی مزاح نمبر (نثر) میں 14 اہم ہندوستانی زبانوں کے مزاح کے نمونوں کے ساتھ ہر زبان میں طنز و مزاح کی روایت پر ایک مختصر مضمون شائع کیا گیا تھا۔ ''پیروڈی نمبر'' میں پیروڈی کے فن پر اردو میں پہلی بار کافی مواد یکجا کیا گیا۔ 37 سالہ نمبر میں مزاحیہ رسالوں کا جائزہ لیا گیا اور خاص طور سے ''اودھ پنچ'' پر سیر حاصل مواد مہیا کیا گیا۔ مختلف اہم طنز و مزاح نگاروں پر شائع

کیے گئے خصوصی نمبروں میں ان شخصیتوں کے فن پر لازمی طور سے تنقیدی مضامین شامل رہتے ہیں۔ ''شگوفہ'' میں اکثر طنز و مزاح نگاروں کے گوشے بھی شائع ہوتے رہتے ہیں جس میں ایک تنقیدی مضمون شریک رہتا ہے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آج ادبی رسالوں کے قاری زیادہ تر ادیب و شاعر ہی ہیں جو صرف اپنی دلچسپی کے خاص موضوعات پر تنقیدی مضمون پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف ''شگوفہ'' کے 95 فیصد قاری ''خالص قاری'' ہیں جو چاہتے ہیں کہ طنزیہ و مزاحیہ تخلیقات سے لطف اندوز ہوں۔ انھیں طنز و مزاح کی سمت و رفتار کا خوب اندازہ ہے۔ ہمارے اکثر نقادوں کا حال یہ ہے کہ انھیں نہ تو عصری طنز و مزاح نگاروں کے فن اور ان کے رجحانات کا اندازہ ہے اور نہ موضوعات کا۔ جس مزاحیہ کتاب کا مقدمہ لکھیں گے اس کے مصنف کی مدح سرائی میں غلو سے کام لیں گے اور دیگر تمام مزاح نگاروں کو دوسرے اور تیسرے درجے کے ادیب و شاعر قرار دیتے ہوئے انھیں ادب کے دائرے سے ہی خارج کرنے کا فتویٰ جاری فرما دیتے ہیں!

سوال: ''شگوفہ'' کے اب تک کون کون سے خاص نمبر شائع ہوئے ہیں؟

جواب: ہندوستانی مزاح نمبر، پیروڈی نمبر، ڈراما نمبر، خلیج نمبر، رشید احمد صدیقی نمبر، کنھیا لال کپور نمبر، مجتبیٰ حسین نمبر، مشتاق احمد یوسفی نمبر، تخلص بھوپالی نمبر، بھارت چند کھنہ نمبر، نریندر لوتھر نمبر، یوسف ناظم نمبر، سلیمان خطیب نمبر، خواجہ عبدالغفور نمبر، ابراہیم جلیس نمبر۔ ان کے علاوہ سالنامے اور راجندر سنگھ بیدی، شوکت تھانوی، دلیپ سنگھ اور کرنل محمد خاں پر گوشے شائع ہوئے۔

سوال: ''شگوفہ'' کے لیے طنزیہ و مزاحیہ تحریریں، خاص طور سے تازہ تخلیقات حاصل کرنے میں آپ کو کبھی کوئی مشکل پیش آئی؟

جواب: ''شگوفہ'' کی اشاعت کے بعد کچھ ایسا ماحول بنا کہ جو لوگ پہلے سے طنز و مزاح لکھ رہے تھے، ان کی تخلیقی رفتار میں کافی تیزی آئی۔ ہماری کوشش تھی کہ نامور ادیبوں اور شاعروں خصوصاً فکشن نگاروں سے طنزیہ و مزاحیہ چیزیں لکھوائیں۔ اس میں ہمیں کامیابی بھی ملی۔

کرشن چندر نے ہماری بڑی حوصلہ افزائی کی۔ انھوں نے زندہ دلانِ حیدرآباد کو اپنا ڈراما ''دروازے کھول دو'' اسٹیج کرنے کے لیے تحریری طور پر اجازت دی۔ ان کی تحریریں ''شگوفہ'' میں چھپتی رہیں۔ ''حجام کی واپسی'' قسط وار شائع ہوا۔ جیلانی بانو، نعیم زبیری، عوض سعید، رفیعہ منظور الامین کے علاوہ اساتذۂ کرام گیان چند جین، ڈاکٹر حبیب ضیا اور ڈاکٹر لئیق صلاح وغیرہ نے کم کم ہی سہی اپنے رشحاتِ قلم سے ''شگوفہ'' کے مشمولات کو وقیع تر بنانے میں اہم حصہ لیا۔ ان کہنہ مشق تخلیق کاروں کے علاوہ بے شمار نئے لکھنے والوں نے مستقل مزاجی اور استقلال کے ساتھ عصری تقاضوں کی تکمیل کرتے ہوئے ''شگوفہ'' کے ادبی سرمائے میں باوقار اضافہ کیا۔

سوال: ''شگوفہ'' کو کن بڑے طنز و مزاح نگاروں کی سرپرستی حاصل رہی؟

جواب: یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ابتدا سے ہی تمام عصری طنز و مزاح نگاروں نے ہماری حوصلہ افزائی کی۔ کرشن چندر تو روزِ اول سے مجلسِ مشاورت میں شامل تھے۔ ان کا قلمی اور عملی تعاون ''شگوفہ'' کو حاصل تھا۔ ان کے علاوہ کنھیا لال کپور، فکر تونسوی، بھارت چند کھنہ، خواجہ عبدالغفور، نریندر لوتھر، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا، رضا نقوی واہی، دلاور فگار، مجتبیٰ حسین اور کنور مہندر سنگھ بیدی کا قلمی تعاون رسالے کو ہمیشہ حاصل رہا۔

سوال: ''شگوفہ'' کی اشاعت کا آغاز ایک ایسے دور میں ہوا جب ترقی پسندی اور جدیدیت کی کش مکش ابھی جاری تھی۔ آپ نے پرچے کو ان دونوں کے اثر سے کس طرح دور رکھا۔

جواب: طنز و مزاح کا سماج سے رشتہ بہت گہرا ہے۔ سماجی شعور کے بغیر طنز و مزاح نگار کا قلم اپنے جوہر نہیں دکھا سکتا۔ طنز و مزاح کو اصلاحی مقاصد کے لیے ایک حربے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے، اس وجہ سے ترقی پسند تحریک اور طنز و مزاح نگار میں قربت تو پیدا ہو سکتی ہے لیکن طنز و مزاح نگار کو نظریاتی طور پر کسی ایجنڈے کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ دوسری طرف جدیدیت ادب میں مقصدیت کی قائل نہیں تھی تاہم جدیدیت پسند نقادوں نے طنز و مزاح کے فنکارانہ اظہار کو ہمیشہ تحسین کی نگاہ سے دیکھا یہ اور بات ہے کہ جدیدیت پسندوں نے اب کلاسیکیت کے ساتھ سماج سے بھی رشتہ قائم کرلیا ہے۔

طنز و مزاح کے تمام موضوعات چونکہ سماجی اور معاشرتی موضوعات ہیں اس لیے اس پیرایۂ اظہار کو ان لوگوں نے اپنایا جو برائیوں پر نگاہ رکھتے تھے اور ناہمواریوں پر چوٹ کرنا چاہتے تھے۔ چوٹ یا طنز نظریاتی ادبی اختلافات سے ماورا ایک اعلیٰ ادبی قدر اور آفاقی طرزِ اظہار ہے۔ چنانچہ طنز و مزاح کا کام حق بات کو عوام تک پہنچانا ہے۔ ''شگوفہ'' نے یہ کام بخوبی انجام دیا۔ آج جب کہ ادبی تحریکیں کمزور پڑ گئی ہیں، گروہ بندانہ رقابت کا بیج بویا جا رہا ہے، ''شگوفہ'' طنز و مزاح کے فروغ کا کام جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس پر کسی تحریک کے عروج و زوال کا کوئی اثر نہیں ہے۔ یوں بھی ایسا کون ہے جو ہنستے ہنساتے اپنا کام کرنے کا قائل نہ ہو؟

سوال: ایک زمانے تک طنز و مزاح کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی اس کی کیا وجوہات تھیں؟

جواب: اس کے ذمے دار کچھ حد تک طنز و مزاح نگار بھی تھے۔ ماضی میں احساسِ برتری، تمسخر اور دوسروں پر ہنسنے کا رجحان غالب تھا۔ ماضی میں مزاح نگار درباروں سے منسلک تھے۔ لطائف کے ذریعے مخالفین پر حملے کیے جاتے تھے، دوسروں کی تذلیل و توہین کی جاتی تھی۔ شعرا کے ادبی معرکوں کی بھی یہی سطح تھی۔ غالب پہلا شاعر ہے جو اپنا مذاق اڑانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ غالب کے بعد صحت مند فضابنی اور طنز و مزاح کے اعلیٰ معیار کا تعین ہوا۔ 1985 میں ''شگوفہ'' کے ہندوستانی مزاح نمبر کے لیے نقادوں سے پوچھا گیا تھا کہ وہ طنز و مزاح کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ اکثر نقادوں نے اسے دوسرے درجے کا ادب قرار دیا تھا لیکن آج کا نقاد یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ کسی صنف کا کوئی درجہ نہیں ہوتا، تخلیق اور تخلیق کار کے درجے کا تعین ہوسکتا ہے۔ اس لحاظ سے آپ مشتاق احمد یوسفی، یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کو ادب کے کس درجے میں رکھیں گے؟

سوال: اردو میں طنز و مزاح کی موجودہ صورت حال کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: ہندوپاک میں گذشتہ تیس چالیس سال سے جو طنز و مزاح لکھا جا رہا ہے وہ موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے، زبان کی چاشنی، اسلوب کی تازگی اور عصری آگہی اور سماجی شعور کے اعتبار سے یقیناً اس لائق ہے کہ آپ اسے ادب کا قابل قدر حصہ سمجھیں۔ یہ بات مانی جاتی

ہے کہ اردو میں طنز و مزاح کا جو سرمایہ ہے، ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ معتبر اور باوقار ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے درجۂ اوّل کے جو طنز و مزاح نگار تھے، جنھوں نے طنز و مزاح کا معیار بلند کیا، وہ اب ہمارے درمیان نہیں ہیں جیسے شفیق الرحمٰن، ابن انشا، رشید احمد صدیقی، کرنل محمد خاں، ضمیر جعفری، کنھیا لال کپور، فکر تونسوی، رضا نقوی واہی، دلاور فگار اور احمد جمال پاشا وغیرہ۔ لیکن نئی نسل میں کئی نام نمایاں ہوئے ہیں۔ نثر اور نظم کی تقریباً تمام اصناف میں طنز و مزاح کے بہترین نمونے سامنے آرہے ہیں۔ بعض اوقات مکمل طور پر اور کبھی جزوی طور پر طنز و مزاح کا اسلوب مختلف النوع تحریروں پر حاوی نظر آتا ہے، خاص طور سے نثر میں۔ مزاحیہ ناول اور افسانے گو کہ کم لکھے جارہے ہیں لیکن سفرنامے، رپورتاژ، انشائیے، تقریظ، تاثراتی مضامین، سوانح اور خود نوشت سوانح وغیرہ طنزیہ و مزاحیہ پیرائے میں مسلسل لکھے جارہے ہیں۔

سوال: اردو تحریک میں آپ طالب علمی کے زمانے سے سرگرم ہیں۔ آندھرا پردیش میں اردو کو اس کے جائز حقوق دلوانے کی سمت میں کی گئی کوششوں کے بارے میں کچھ بتایئے۔

جواب: آزادی کے بعد 1948 میں حیدرآباد میں پولیس ایکشن ہوا۔ اردو ریاست حیدرآباد کی سرکاری زبان تھی۔ یکلخت تمام دفاتر اور مدارس سے اردو ہٹا دی گئی۔ اس بدلے ہوئے خوف اور جبر کے ماحول میں اردو تعلیم کا سلسلہ قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش اور خاص طور پر اس کے معتمد مولوی حبیب الرحمٰن نے اردو کو اس کا کھویا ہوا مقام دلوانے کی کوشش شروع کی۔ 1956 میں لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تشکیل نو ہوئی اور وسیع تر ریاست آندھرا پردیش کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بعد مخالف اردو لہر میں کمی آئی۔ آندھرا کے سیاسی قائدین نے اردو کے تئیں فراخ دلانہ رویہ اختیار کیا۔ وزیر اعلیٰ نیلم سنجیوا ریڈی نے جامعہ عثمانیہ کے بین کلیاتی اردو فیسٹول میں (جو پروفیسر عبدالقادر سروری کی سرپرستی میں ہر سال منعقد ہوتا تھا) اعلان کیا کہ ماضی میں اردو کا جو خصوصی موقف رہا ہے اس کے پیش نظر اسے ریاست آندھرا پردیش میں دوسری سرکاری زبان کا مقام حاصل

رہے گا۔ اس اعلان سے اردو والوں میں پھیلی ہوئی مایوسی دور ہوئی اور انجمن ترقی اردو کو پرامن ماحول میں کام کرنے کا موقع ملا۔

اسی زمانے میں میرے دوست چندر سریواستو نے انجمن تحفظ اردو کی ضلع میدک میں بنیاد ڈالی۔ بعد میں وہ حیدرآباد منتقل ہو گئے۔ میں بھی نائب معتمد کی حیثیت سے انجمن تحفظ اردو آندھرا پردیش کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگا۔ ساری ریاست میں اس انجمن کی شاخیں قائم کی گئیں۔ باگا ریڈی (سابق وزیر آندھرا پردیش) عرصۂ دراز تک اس انجمن کے صدر رہے۔ انجمن نے ایک ماہنامہ بھی شائع کرنا شروع کیا جس کا نام ''قومی زبان'' تھا۔ اس کے مدیر چندر سریواستو تھے۔ یہ رسالہ اس زمانے میں اردو تحریک کی اہم آواز سمجھا جاتا تھا۔ بعد میں اس رسالے کے حقوق اردو اکادمی آندھرا پردیش کے نام منتقل کر دیے گئے۔

انجمن تحفظ اردو آندھرا پردیش نے ریاست کے مدارس میں اردو تعلیم کی صورت حال کو بہتر بنانے کے سلسلے میں بعض بنیادی کام کیے۔ ریاستی اسمبلی کے منظورشدہ لسانی بل 1965 میں اردو کی شمولیت کے لیے وسیع پیمانے پر مہم چلائی گئی لیکن اس وقت کے وزیر تعلیم نرسمہاراؤ کے معاندانہ رویے کے نتیجے میں آندھرا پردیش میں اردو دوسری سرکاری زبان نہیں بن سکی۔ البتہ بل کی دفعہ 7 (سات) کے تحت اردو کے لیے چند سہولتیں مہیا کی گئیں۔ بل کی منظوری کے بعد مسلسل جدوجہد کے طفیل جو سرکاری حکم نامے جاری ہوئے ان سے انتظامیہ اور تعلیم کی سطح پر اردو کے استعمال کی صورتحال کسی قدر بہتر ہوئی۔ حالیہ عرصے میں آندھرا پردیش کے کئی اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا موقف دیا گیا لیکن ان احکامات پر عمل آوری کی سطح پر اردو والوں کو کسی طرح کا تعاون حاصل نہیں ہے۔ افسوس یہ ہے کہ خود اردو والے بھی آج اردو تحریک سے ماضی کی طرح خلوص اور جذبے کے ساتھ وابستہ نہیں ہیں۔

سوال: ادب میں طنز و مزاح کی کیا اہمیت ہے؟ اس کا آغاز آپ کب سے مانتے ہیں؟

جواب: طنز و مزاح انسانی اظہار کا سب سے دلکش اور موثر اسلوب ہے۔ ادیب و شاعر اپنے شگفتہ طرز اظہار سے قاری کے لیے نشاط اور انبساط کی ایک خاص فضا تعمیر کرتے ہیں۔ غیر

متناسب، بے جوڑ، مضحک مظاہر کی ظریفانہ تصویر کشی سے مزاح پیدا ہوتا ہے اور کبھی فرد یا سماج کی کمزوریوں کو اصلاح کی خاطر نشانہ بنایا جاتا ہے۔اس طنز میں نشتریت اور چبھن ہوتی ہے۔قاری طنز ومزاح کی دونوں کیفیتوں میں زندگی کی بوالعجبیاں دیکھتا ہے۔

خالص طنز ومزاح کے دبستان کا آغاز دلی اور لکھنؤ کے خوش فکر وخوش نوا تخلیق کاروں کی تحریروں سے ہوا۔لندن کے ''پنچ'' اخبار کے اتباع میں شائع ہونے والا ''اودھ پنچ'' اخبار طنز ومزاح کی اولین تحریک بن گیا۔اس اخبار سے وابستہ طنز ومزاح نگاروں نے سیاسی اور سماجی مسائل کے ذریعے عوام سے اپنا رشتہ قائم کیا۔انیسویں صدی کی اس روایت کو بیسویں صدی کے تخلیق کاروں نے تازہ موضوعات اور نئے اسالیب کے ساتھ نئی ہیئتوں میں پیش کرنے کا کامیاب تجربہ کیا۔اب وہ ہر بات، بلالحاظ نثر ونظم مزاح کے اسلوب میں کہنے پر قادر ہوئے۔

سوال: کیا وجہ ہے کہ نثر میں اچھے طنز ومزاح نگاروں کی ایک بڑی فہرست نظر آتی ہے لیکن شاعری کے میدان میں اکبر الہٰ آبادی کے بعد کوئی بڑا نام ابھر کر سامنے نہ آسکا؟

جواب: مجھے اس بات سے اتفاق ہے کہ طنز ومزاح میں نثر کا معیار نظم کے مقابلے میں نہایت بلند ہے۔نثر لکھنے والے طنز ومزاح نگاروں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے نہ صرف شخصی طور پر ادب میں اونچا مقام حاصل کیا بلکہ ان کی تحریروں سے اردو ادب کے وقار اور اس کے ادبی سرمایے میں بھی اضافہ ہوا۔مشتاق احمد یوسفی آج اردو نثر کی آبرو ہیں۔(سچ کہا گیا کہ یہ ''دورِ یوسفی'' ہے)۔اکبرالہٰ آبادی کے بعد مزاحیہ شاعری کے میدان میں صرف رضا نقوی واہی اور دلاور فگار نے تخلیقی سطح پر خود کو منوایا۔لیکن اکبر کی سی فنکارانہ چابک دستی کسی مزاحیہ شاعر کو نصیب نہ ہوسکی۔شاعر یوں بھی عام طور پر سامع کی پسند کا تابع ہوتا ہے۔ایک تو ذہین شعرا مزاح کی طرف کم مائل ہوئے اور جو مائل ہوئے تو ان کے وژن اور اظہار کی سطح میں کبھی تال میل نہ ہوسکا۔اس طرح مزاح میں اکبرالہٰ آبادی کا ثانی پیدا نہ ہوسکا۔

•••

صحافت

سنتوش بھاٹیہ سے ملاقات

سوال: 'چوتھی دنیا' کا ایک اور ایڈیشن نکالنے کے لئے آپ نے اردو کو ہی کیوں چنا؟

جواب: یہ 'چوتھی دنیا' کا ایڈیشن نہیں ہے، یہ اردو کا آزادانہ اخبار ہے۔ ہم نے اردو کو اس لئے چنا کیونکہ اردو ہندوستان کی دوسری سب سے طاقتور زبان ہے۔ ہندوستان میں 20 کروڑ لوگ اردو بولتے اور سمجھتے ہیں اور پاکستان، بنگلہ دیش نیز خلیج کو ملا کر 50 کروڑ لوگ بولتے اور سمجھتے ہیں۔ اسی لئے ہم نے اردو میں نکالنے کا فیصلہ کیا تا کہ ان 50 کروڑ لوگوں کے ساتھ ہندوستان اور دنیا کے بنیادی مسائل پر کھل کر صاف صاف بات کی جا سکے۔

سوال: چوتھی دنیا کے لئے آپ نے براڈ شیٹ کا سائز کیوں چنا؟ اردو میں اس بڑے سائز کے ہفت روزہ یا پندرہ روزہ جرائد کا رواج نہیں ہے۔

جواب: جب آپ کہتے ہیں کہ اردو میں اس کا رواج نہیں ہے تو کچھ ہو نہیں سکتا اور کسی بھی چیز پر چاہے وہ سائز ہو چاہے وہ زبان ہو اس کے اوپر کسی کا کاپی رائٹ نہیں ہے۔ ہم ہر وہ چیز کرنا چاہتے ہیں جو چیز نئی ہو لوگوں کی نظر میں آئے اور لوگوں کو اپنے ساتھ جوڑے۔ میری دانست میں اردو میں آج تک ایسا براڈ شیٹ ہفت روزہ نہیں نکلا جیسا ہم نے نکالا ہے اور ہمارا ماننا ہے کہ اردو کے لوگوں کو بھی بہتر چیز دیکھنے اور بہتر چیز پڑھنے کا حق ہے۔

سوال: شروعات میں کیسی فیڈ بیک مل رہی ہے؟

جواب: اردو 'چوتھی دنیا' کا اردو بولنے والوں نے زبردست خیر مقدم کیا ہے، جس سے ہمارا حوصلہ بڑھا ہے اور 30 روز کے اندر ہی 'چوتھی دنیا' اردو نے پورے ملک میں اپنی موجودگی درج کرادی ہے، جس کا ثبوت ہندوستان بھر سے موصول ہونے والے خطوط اور ای میل ہیں۔ جو لوگ ہمارا اخبار پڑھ رہے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اس میں شائع تمام مضامین نہ صرف بے حد معیاری ہیں بلکہ تمام آرٹیکل بے حد اہم موضوعات پر ہیں۔ کئی لوگوں کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ ہم اردو میں پہلی بار اس طرح کی بولڈ اسٹوری دیکھ رہے ہیں۔ یہ ہمارا نہیں 'چوتھی دنیا' کے قارئین کا کہنا ہے کہ اب تک ان مضامین پر انگریزی یا ہندی اخبارات کی ہی اجارہ داری تھی۔ اردو اخبارات میں اس طرح کے موضوعات نہیں لیے جاتے تھے۔ لیکن اب لگ رہا ہے کہ اردو جرنلزم میں بھی تبدیلی آئے گی اور بنیادی زندگی سے جڑے ہوئے ملک کو تبدیل کرنے والے اور دماغ کو غذا فراہم کرنے والے مضامین دیگر اخباروں بھی شائع ہونگے۔

سوال: کیا سب کچھ آپ کی توقعات کے مطابق ہو رہا ہے یا کہیں کچھ کمی محسوس ہو رہی ہے؟

جواب: بالکل! سب کچھ ہماری توقعات کے مطابق ہو رہا ہے۔ ہم نے اردو اخبار یہ سوچ کر نہیں نکالا تھا کہ ہم کو اس سے پیسہ کمانا ہے، کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ اردو میں اشتہارات نہیں ہوتے۔ ایک نفسیاتی Tabo ہے اور جو لوگ بازار کنٹرول کرتے ہیں انہیں لگتا ہے کہ اردو بولنے والوں کی قوت خرید کمزور ہے۔ اس لئے اردو میں اشتہارات کم ہوتے ہیں، لیکن ہمارا نظریہ دوسرا ہے۔ ہمارا ماننا ہے کہ جو لوگ سامان خرید سکتے ہیں ان کے لئے اخبار نہیں نکالنا ہے، بلکہ اخبار ان کے لئے نکالنا ہے جو ملک کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں اور یہ سب عام لوگ ہیں اور فیصلہ کرنے میں ان کا اہم رول ہے اور اسی لئے ہم ان کے لئے اخبار نکال رہے ہیں، جن کا فیصلہ لینے میں اہم رول ہے۔

سوال: اردو صحافت کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں اور آج کل کے اردو اخبارات کے بارے میں آپ کا کیا تاثر ہے؟

جواب: مجھے اردو صحافت کے بارے میں بہت زیادہ معلومات نہیں ہیں، اس لئے اردو صحافت کے حوالے سے میرا کوئی خاص نظریہ بھی نہیں ہے۔ جتنا دوستوں سے سنتا ہوں اس پہ لگتا ہے کہ اردو میں جتنا کام ہونا چاہئے اتنا ہو نہیں رہا ہے۔ اردو کو ملک میں جو رول ادا کرنا چاہئے وہ نہیں کر رہی ہے۔ اس کی وجوہات کو تو وہ لوگ جانیں جو اردو صحافت میں ہیں اور میں ان پر کوئی کمنٹ نہیں کرنا چاہتا اور نہ ہی اس لائق ہوں کہ ان پر تنقید کروں۔ میں تو اردو میں وہ کرنا چاہتا ہوں جو میں نے ہندی اور انگریزی میں کیا ہے۔ چھپی ہوئی سچائی، دبے ہوئے راز، بھوک، درد اور موت سے جڑے ہوئے سوال اور عام آدمی کا بجھا ہوا خواب، انہیں سامنے آنا چاہئے۔ چاہے وہ انگریزی زبان ہو، ہندی زبان ہو یا پھر اردو ہو۔ میری کوشش رہے گی اردو قارئین کو بھی وہ چیزیں دی جائیں جو ابھی تک انہیں نہیں ملی ہیں۔ یعنی انہیں ایسی صحافت سے روشناس کرایا جائے، جو انتہائی بے باک اور حقیقت پرمبنی ہو۔

سوال: اردو صحافت میں آپ کو کن باتوں کی کمی دکھائی دیتی ہے جسے آپ 'چوتھی دنیا' کے ذریعے دور کرنا چاہیں گے۔

جواب: اردو صحافت میں کیا کمی ہے وہ تو اردو والے بتا سکتے ہیں۔ میں تو مثبت بات کہہ سکتا ہوں، 'چوتھی دنیا' میں ہم یہی مثبت چیز کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہاں ہم پھر ان لوگوں کی بات کرنا چاہتے ہیں جنھوں نے اردو 'چوتھی دنیا' کو پڑھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جن موضوعات کا احاطہ 'چوتھی دنیا' کر رہا ہے اور جو انکشاف 'چوتھی دنیا' کرتا ہے اور جس طرح کا تجزیہ ہم پیش کرتے ہیں وہ براہ راست لوگوں کے دلوں کو چھو جاتا ہے اور اردو اخبار پڑھنے والوں کا یہ کہنا ہے کہ جو موضوعات ہمیں اردو 'چوتھی دنیا' میں پڑھنے کو مل رہے ہیں وہ ہمیں کہیں نہیں ملتے۔

سوال: شمالی ہندوستان میں خاص طور سے یوپی میں اردو آزادی کے بعد بری طرح پچھڑ گئی ہے آپ کے خیال میں اس کے کیا اسباب ہیں؟

جواب: میرا ماننا ہے کہ اردو ہو یا ہندی زبان کو تھوڑا آسان ہونا چاہئے۔ جہاں پر سخت ہندی بولی جاتی ہے وہاں پر ہندی بیک فٹ پر چلی جاتی ہے اور جہاں سخت کلاسیکل اردو بولی جاتی ہے

وہاں اردو بیک فٹ پر چلی جاتی ہے۔ زبان کو رابطہ کی زبان ہونا چاہئے تا کہ عام لوگ اس کو سمجھ سکیں۔ زبان کو کبھی بھی اپنا علم یا supremacy دکھانے کا ذریعہ نہیں بننا چاہئے۔ جب ایسی کوشش ہوتی ہے (جو کہ ماضی میں ہوئی ہے) تو زبان دم توڑنے لگتی ہے۔ اس کی وجہ سے اردو ہی نہیں ہندی بھی پچھڑ گئی ہے۔ دوسری سب سے بڑی پچھڑنے کی وجہ یہ ہے کہ اردو روزی روٹی کی زبان نہیں رہی یہ صرف ادب کی زبان بن کر رہ گئی ہے۔ اس میں ہر ایک کا رول رہا۔ سیاستدانوں کا، اردو جاننے والوں کا، بازار کا۔ نتیجہ کے طور پر اردو پچھڑتی چلی گئی۔ اردو بولنے والوں کو اگر یہ بھروسہ ہے کہ اردو بولنے والے سرکار بنا سکتے ہیں یا کسی کو جتا یا ہرا سکتے ہیں تو وہ اس بات کے لیے دباؤ کیوں نہیں بنا سکتے کہ اردو پھر سے روزی روٹی کی زبان میں تبدیل ہو۔

سوال: اردو زبان کے بارے میں جو نا امیدی کی باتیں اکثر کہی جاتی ہیں ان سے آپ کہاں تک متفق ہیں اور آپ کو اردو کا مستقبل کیسا دکھائی دیتا ہے۔

جواب: ناامید لوگ ناامیدی کی باتیں کرتے ہیں، میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا، بلکہ میرا تو یہ ماننا ہے کہ شمالی ہندوستان میں آسان اردو ہی بولی جاتی ہے، عام بول چال کی زبان دراصل اردو کی Popular شکل ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو اپنی طاقت پہچانے، خود کو ان موضوعات سے جوڑے جن موضوعات کو آج کی دنیا میں لوگوں کو جاننا ضروری ہے۔ اردو نے ماضی میں بہت بڑے بڑے کام کیے ہیں۔ اردو نے آزادی کی لڑائی میں اہم رول ادا کیا۔ انقلابیوں کی زبان اردو رہی ہے، ملک کا سب سے مشہور نعرہ انقلاب زندہ باد، اردو نے دیا ہے، آج بھی 'سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے' لوگ شان اور فخر سے گاتے ہیں، اتنا ہی نہیں جتنی بڑی پریم کہانیاں محبت کی پیار کی جو چاشنی اردو میں نظر آتی ہے، وہ بے مثال ہے۔ اردو تہذیب و تمدن اور پیار محبت کی زبان ہے۔ اخوت، محبت، بھائی چارہ، جذباتی ہم آہنگی یہ سب ہمیں اردو میں نظر آتا ہے۔

سوال: روزنامہ راشٹریہ سہارا کے بڑھتے ہوئے اڈیشنوں، ای ٹی وی اردو چینل کی بڑھتی ہوئی مقبولیت، ایک ہندی اخبار گروپ کی طرف سے اردو کا ایک مشہور روزنامہ درجن بھر شہروں

سے جاری کرنے کے مبینہ منصوبوں اوراب 'چوتھی دنیا' کی اشاعت کے بعد کیا ہم یہ سمجھیں کہ کارپوریٹ سیکٹراب اردو میں تجارتی امکانات تلاش کر رہا ہے، یا پھراردو واقعی میڈیا کے لئے ایک منافع بخش زبان بن گئی ہے۔

جواب: کس کی مقبولیت بڑھ رہی ہے، کون کس مقام پر ہے مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ اس کا فیصلہ وہ لوگ کریں جنہیں یہ گمان ہے کہ وہ یہ فیصلہ کر سکتے ہیں۔ ہم نے ایک صحیح اور سچے ارادے سے اخبار نکالا ہے بس! اس سے زیادہ میں کیا کہوں۔

سوال: قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں سے آپ کس حد تک واقف ہیں اور ان میں مزید کس طرح کا سدھار آپ دیکھنا چاہیں گے۔

جواب: قومی اردو کونسل جیسا کہ نام سے ظاہر ہے حکومت کا ادارہ ہے اور اس ادارے کا کام اردو زبان وادب کو فروغ دینا ہے اور جیسا کہ میں نے اپنی اردو ایڈیٹر محترمہ وسیم راشد سے اس کے نام اور کام کے بارے میں جانا ہے، اس سے یہی معلوم ہوا کہ کونسل اردو کے فروغ کے لیے بے تحاشہ کام کر رہی ہے۔ جس میں اردو کمپیوٹر کورس، صحافت کورس (جو شاید اب شروع ہو رہا ہے) اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً اردو اکابرین کو مدعو کر کے اردو کی صورت حال پر بحث ومباحثہ کرنا یہ سب بہترین کام ہیں اور ویسے بھی کونسل کی خوش قسمتی ہے کہ اس کے پاس حمید اللہ بھٹ صاحب جیسے ڈائریکٹر ہیں، جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے، مگر ان کی پدرانہ شفقت سے کسی کو انکار نہیں۔ بھٹ صاحب کی محنت، لگن اور ان کی کاوشوں کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے اور خود ہمارے اردو دنیا کے دوست بھی ان کی کوششوں کو سراہتے ہیں۔ تو میرے خیال میں جو کام کونسل میں ہو رہا ہے وہ قابل داد ہے۔ یہاں ایک بات مجھے ضرور عرض کرنی ہے کہ اردو صحافت پر باقاعدہ سمپوزیم، سمینار اور کانفرنس ہونی چاہئیں تاکہ سبھی اردو صحافی ایک دوسرے سے مل سکیں اور سبھی کے اندر ایک دوسرے کے اخبار کے لیے نیک خواہشات اور نیک جذبہ پیدا ہو اور یہ احساس ہو جائے کہ ہم سبھی اردو زبان کے سپاہی ہیں اور سبھی کو اس کی بقا کی لڑائی لڑنی ہے۔

سوال: آپ بنیادی طور پر ہندی کے صحافی ہیں اور اردو سے ناواقف! پھر بھی آپ کا کالم اردو اخبارات میں شائع ہوتا ہے اور پسند بھی کیا جاتا ہے؟ اس کالم کے بارے میں کچھ بتایئے۔

جواب: میری ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ جس چیز کو میں جیسا دیکھوں ویسا ہی اس کو بیان کروں۔ میرے لکھنے کی کسوٹی یہ ہوتی ہے کہ جو سب سے کمزور آدمی یا کمزور طبقہ ہے، اس کو میرے لکھنے سے کچھ فائدہ ہو رہا ہے یا نہیں۔ میں نے اپنے لکھنے پر کبھی بھی کسی مذہب کسی فرقہ کسی طبقہ، کسی بھی ذات کسی بھی خیال کو اور سب سے بڑھ کر پیسے کا اثر ابھی تک نہیں ہونے دیا ہے۔ یہ میں نے کوئی انوکھا کام نہیں کیا ہے، چونکہ یہ صحیح کام ہے، اس لیے میں نے اس کو کیا ہے اور میرا ماننا ہے کہ سبھی کو کرنا چاہیے۔ شاید اسی لیے میرے مضامین اردو پڑھنے والوں کو پسند آتے ہیں۔

•••

جان میکنسن سے گفتگو

51 سالہ جان میکنسن (John Makinson) دنیا کے بڑے اشاعتی اداروں میں سے ایک پین گوئن گروپ (Penguin Group) کے چیئرمین اور چیف ایگزیکیٹو ہیں۔ وہ بین الاقوامی میڈیا کمپنی پرسن کے بورڈ آف ڈائرکٹرس میں بھی شامل ہیں جس کی شاخیں پینگوئن، فنانشیل ٹائمس گروپ اور پرسن ایجوکیشن ہیں۔

جناب میکنسن کی پیشہ ورانہ زندگی میں صحافت اور سرمایہ کاری کا باہم امتزاج نظر آتا ہے۔ کیمبرج میں تاریخ اور انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز رائٹرس (Reuters) میں ملازمت سے کیا۔ پھر 1979 میں فنانشیل ٹائمس سے وابستہ ہوئے اور 1994 سے 1996 کے درمیان اس کے مینیجنگ ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ مالیات کے شعبے میں ان کے کیریئر ریکارڈ کو دیکھیں تو انھوں نے 'ساچی اینڈ ساچی' (Saatchi & Saatchi) کی امریکی ہولڈنگ کمپنی میں وائس چیرمین کی حیثیت سے کام کیا۔ 1996 سے 2002 کے دوران وہ پرسن گروپ کے مالیاتی ڈائرکٹر رہے۔ وہ 2000 سے پینگوئن گروپ کے چیئرمین اور 2002 سے اس کے چیئرمین کے ساتھ ساتھ چیف ایگزیکیٹو بھی ہیں۔

جناب میکنسن، جو حال ہی میں چنئی میں تھے، ان سے کی گئی گفتگو کے اہم اقتباسات روزنامہ ''دی ہندو'' کے شکریے کے ساتھ پیش خدمت ہے۔

سوال: گزشتہ چند دہائیوں میں بڑے اشاعتی اداروں، مثلاً پینگوئن، حصول کاری کے عمل کی وجہ سے پہلے سے بھی زیادہ بڑے ہو گئے ہیں۔ اس صورت حال میں چھوٹے ناشروں کا مستقبل کیا ہے؟

جواب: میرے خیال میں چھوٹے ناشروں کے لیے بھی گنجائش ہے۔ اس وقت برطانیہ میں چند ایک چھوٹے ناشر ہیں، جو بہت ہی کامیاب ہیں۔ پروفائل بکس (Profile Books)، حالانکہ ایک چھوٹا اشاعتی ادارہ ہے، لیکن اس نے برطانیہ میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں (Best Selling Titles) میں سے تین کتابیں شائع کی تھیں۔ اس کے علاوہ کینن گیٹ (Cannon Gate) اشاعتی کمپنی بھی بہت کامیاب رہی ہے لیکن یہ ایک بہت ہی جوکھم بھرا کاروبار ہے اور اس میں کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ مقبول عام ہونے والی کتابیں شائع کی جائیں۔ 'کینن گیٹ'' نے 'لائف آف پائی' (Life of Pi) اور 'پروفائل' نے 'Eats, Shoots and Leaves" جیسی کتابیں شائع کیں۔ یہ دونوں کتابیں بین الاقوامی سطح پر سب سے زیادہ فروخت ہوئیں۔ اس طرح کی کتابوں کی اشاعت میں کامیابی کے باوجود مسئلہ یہ ہے کہ چھوٹے ناشروں کے لیے ایسی کتاب خریدنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ وہ پیشگی کی رقومات میں ہو رہے اضافے کو برداشت نہیں کر پاتے ہیں لہٰذا ایک چھوٹے ناشر کو اپنا وجود قائم رکھنا بہت مشکل ہے۔

سوال: لیکن کیا وہ اپنا وجود قائم رکھ پائیں گے؟

جواب: میں پراُمید ہوں۔ حقیقت میں ہمیں ان کی ضرورت ہے۔ اشاعتی شعبے کو خطرہ اشاعتی کمپنیوں کے ایک دوسرے میں ضم ہونے سے نہیں ہے کیونکہ اس میں انضمام اور علاحدگی لازم وملزوم ہیں۔ خطرہ دراصل کتابوں کی تقسیم، خصوصاً ہائی اسٹریٹ خوردہ فروشی کے نظام میں کسی خاص ادارے یا کمپنی کے تسلط سے ہے۔ برطانیہ کی دو سب سے بڑی کتب فروش کمپنیوں واٹر اسٹونس (Water Stones) اور اٹا کرس

(Otta Kars) کے درمیان انضمام کی تجویز زیر غور ہے۔ اگر یہ دونوں کتب فروش نیٹ ورک آپس میں مل گئے تو نئے اور ابھرتے ہوئے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنے والے چھوٹے ناشروں کی مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا کیونکہ اگر آپ اس مشترک کمپنی یا نیٹ ورک سے وابستہ خریدار کو اپنی کتاب کو فروغ دینے کے لیے آمادہ نہیں کر پاتے ہیں تو آپ خسارے میں رہیں گے۔ لہٰذا یہ رجحان ادبی اشاعت کے لیے عام طور پر اور چھوٹے ناشروں کے لیے خاص طور پر ایک بڑا خطرہ ثابت ہو رہا ہے۔

سوال: گزشتہ سال پینگوئن نے 70 سال مکمل کر لیے اور آپ نے اس موقع پر بطور یادگار 70 مختصر کتابیں ایک سیریز کے تحت شائع کیں۔ کیا ان کتابوں نے اچھا کاروبار کیا یا ان کتابوں کو اس لیے شائع کیا گیا تھا کہ پینگوئن اور پیپر بیک کے بارے میں ایک بہتر تاثر قائم کیا جا سکے۔

جواب: دیکھیے، ان کتابوں کی بیس لاکھ سے زیادہ کاپیاں فروخت ہوئیں، اس لحاظ سے تو یہ بہت کامیاب رہیں لیکن ان کتابوں کی اصل قدر و قیمت ہمارے لیے یہ ہے کہ یہ پینگوئن اور پیپر بیک کے تجارتی مارکہ کی اہمیت کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ ''ہم پینگوئن ہیں اور ہم ایک اختراع پسند ناشر ہیں'' بلکہ ہر ایک کو پینگوئن اور پیپر بیک کی میراث کی یاددہانی مقصود تھی۔ پچھلے سال جو ہم نے کیا وہ بھی پینگوئن کتابوں کے ڈیزائن کے ورثے کی جانب ہر کسی کی توجہ مبذول کرانے کے مقصد سے تھا۔ وہ سبھی خوبصورت ڈیزائن والی کتابیں تھیں۔ ہم 70 ڈیزائنروں کے پاس گئے اور انھیں 70 دن کا وقت اور 70 پاؤنڈ دیا۔ حالانکہ ان کتابوں کے ڈیزائن کے لیے یہ کوئی بڑی رقم نہیں تھی۔ لیکن ہمیں کئی خوبصورت ڈیزائن حاصل ہو گئے۔ یہ سیریز مصنفین سے ہمارے تعلقات کے حق میں بھی نیک ثابت ہوئی۔ مجھ سے نہ جانے کتنے مصنفین آ کر ملے، جن کی کتابیں، اس سیریز میں شائع ہوئی تھیں اور انھوں نے مجھ سے کہا کہ ''یہ ایک عظیم کارنامہ تھا اور ہم نے اسے کافی پسند کیا۔''

سوال: اس وقت پینگوئن کن اہم شعبوں میں سرگرم ہے؟

جواب: اس وقت جو ایک اہم معاملہ ہے، جو کہ ایک چیلنج بھی ہے، وہ یہ کہ ڈیجیٹل ٹکنالوجی کس طرح کتابوں کی تجارت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ کیا کتاب کو الیکٹرانک کتاب (e-book) کی شکل میں پسند کیا جائے گا؟ کیا ہمیں کتابوں کو فروخت کرنے کے ساتھ ساتھ کرائے پر بھی دستیاب کرانا چاہیے، کیا ہمیں خریداروں کو انٹرنیٹ پر کتابیں فراہم کرنا چاہیے۔ یہ سب کلیدی سوالات ہیں، جن سے ہم نبرد آزما ہورہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں خطرے کا بھی امکان ہے لیکن اس کے ساتھ یہ ایک بہت بڑا موقع بھی ہے۔

کتابوں کی اشاعت اور تجارت میں اضافے کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ کتابی صنعت میں ترقی ہوئی ہے لہٰذا اگر آپ کتابوں کی نکاسی کے لیے نئے مواقع پیدا کرتے ہیں، خواہ یہ ایک سوپر مارکیٹ میں ہو یا انٹرنیٹ پر ہو۔ تو اس سے مانگ میں اضافہ یقیناً ہوگا۔

ڈیجیٹل دنیا یقیناً اس اضافی فراہمی کے مواقع پیدا کرنے جارہی ہے۔ ہمیں کاپی رائٹ کی حفاظت اور کاپی رائٹ کے علاقائی معاملات پر بہت باخبر رہنے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی اگر ڈیجیٹل دنیا کاپی رائٹ کے معاملے سے استفادہ کرتی ہے تو بدلے میں مصنفین کو بھی واجب معاوضہ ملنا ضروری ہے۔

سوال: کیا واقعی الیکٹرانک کتابیں مقبول ہوتی ہیں؟ اکا دکا مصنفین مثلاً اسٹیفن کنگ، کی کامیابی کے بارے میں سننے کو ملتا ہے لیکن بیشتر کے بارے میں ایسا نہیں ہے؟

جواب: میں یہاں پر میلکم گلیڈ ویل کے اس قول کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا کہ ہر نئی چیز ایک Tipping Point پر پہنچتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان میں سے بیشتر کی ہیئت اور ساخت بھی Tipping Point تک جا پہنچے گی۔

سونی کی الیکٹرانک کتاب یا پڑھنے کی مشین (Sonye-book reader) جس کا اجرا حال ہی میں ہوا ہے، وہ دیگر الیکٹرانک کتابی آلات سے، جنھیں میں نے دس سال پہلے دیکھا تھا، مختلف ہے۔ ہاں میں یہ مانتا ہوں کہ ہم میں سے کوئی بھی ''جنگ اور امن'' (War and Peace) کو الیکٹرانک آلے کے ذریعہ نہیں حاصل کریں گے؟

میرے خیال میں، ہم لوگ ایسا کریں گے ہم شاید ایک ایسا موقع چاہیں گے جس میں کتاب کو خریدنے کے ساتھ کرائے پر بھی حاصل کرنے کی سہولت ہو۔

سوال: کیا ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں کتابیں شائع کرنے کی پین گوئن کی پیش رفت اسی ملک تک محدود رہے گی یا یہ ایک بڑے تجربے یا حکمت عملی کا حصہ ہے؟

جواب: ایک طرح سے دیکھا جائے تو یہ حکمت عملی کے خلاف ہے۔ ہم ابتدا سے ہی انگریزی زبان کے ناشر رہے ہیں۔ میرا یہ نظریہ ہے کہ غیر ملکی زبانوں کے اشاعتی بازار انگریزی زبان کے بازار سے مختلف ہیں اور مجموعی طور پر یہ بہت منفعت بخش بھی نہیں ہیں۔ لہٰذا ہم کبھی اتنا پراعتماد نہیں ہو سکے۔ نہ ہی تجارت کی اقتصادیات کے تئیں اور نہ ہی اس بازار سے اپنی واقفیت کی بنا پر۔ تاکہ دوسری زبانوں مثلاً فرانسیسی، اسپینی یا اطالوی زبان میں اشاعت کتب کا سلسلہ اور کاروبار شروع کر سکیں۔

ہندوستان کی انفرادیت یہ ہے کہ یہاں بازار سے متعلق جانکاری کے تئیں ہم پراعتماد ہیں۔ ہم یہاں بیس برسوں سے ہیں حالانکہ ملیالم اور ہندی کتابوں کی تقسیم کا کاروبار انگریزی سے قدرے مختلف ہے، لیکن یہ ایک دم مختلف بھی نہیں ہے۔ پینگوئن کا برانڈ یہاں بہت مشہور ہے اور ہندوستانی زبان بولنے والوں میں بھی یہ برانڈ متعارف ہے۔ کسی کتاب پر چڑیا (پینگوئن) کی تصویر کی خاص اہمیت ہے۔ دوسری بات جو میں شدت سے محسوس کرتا ہوں کہ ہم صرف انگریزی میں ہی کتاب شائع کر کے ہندوستان کے ساتھ انصاف نہیں کر رہے ہیں......اور اگر ہم ہندوستان جیسے کثیر ثقافتی ملک، میں کتاب شائع کریں۔ تیسری بات جو صرف ہم لوگ اہم بازار کے طور پر دیکھ رہے ہیں یہ ہماری کوتاہ بینی ہوگی اگر ہم خود کو انگریزی زبان تک محدود رکھیں۔ ہم اپنے پروگرام (علاقائی زبانوں میں اشاعت) میں تیزی سے اضافہ کر رہے ہیں اور اس سال ہم انگریزی کے 180 ٹائیٹل کے مقابلے میں ہندوستان زبانوں میں 70 کے قریب کتابیں شائع کرنے جا رہے ہیں۔

سوال: گذشتہ چند برسوں میں پینگوئن انڈیا کے کاروبار میں ہنگامی طور پر اضافہ ہوا ہے لیکن آپ اس کے معیار کو لے کر کتنے مطمئن ہیں؟ آپ نے فکشن کی بعض ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو بہت کم اپیل کرتی ہیں؟

جواب: ٹھیک ہے۔ اگر آپ ہر سال دو سو کتابیں شائع کرتے ہیں تو ہر کتاب تجارتی اعتبار سے کامیاب نہیں ہوگی اور آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے ہیں کہ ہر کتاب عمدہ تھی۔ لیکن اگر آپ مجموعی طور پر ہماری کتابوں کو دیکھیں اور ان کا موازنہ اس ملک کے دوسرے ناشروں سے کریں تو میں یہ کہوں گا کہ طباعتی اور تحریری معیار کے اعتبار سے ہم بہتر ہیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ یہ محض ایک تاریخی اتفاق ہے کہ ہندوستانی فکشن کا ایک عظیم عہد تھا، جس میں ارون دھتی رائے اور وکرم سیٹھ جیسے تخلیق کار پیدا ہوئے اور مجھے نہیں لگتا ہے کہ حالیہ چند برسوں میں نئی صلاحیتوں کو اس طرح فروغ نہیں دیا گیا ہے کہ ان کا مقابلہ ان کے پیش روؤں سے کیا جا سکے میرا خیال ہے کہ اس میں غلطی ناشروں کی نہیں ہے۔ اگر نئے ٹیلنٹ دستیاب ہوتے تو ہم ان پر ضرور توجہ دیتے اور انھیں فروغ بھی دیتے۔

•••

تعلیم

محمد علی اشرف فاطمی سے گفتگو

متحدہ ترقی پسند محاذ حکومت نے اپنے قیام کے فوراً بعد سے ہی اقلیتوں اور دیگر پسماندہ طبقات کی ہمہ جہت ترقی بالخصوص تعلیمی پسماندگی دور کرنے کی سنجیدہ کوششیں شروع کی ہیں، ساتھ ہی ساتھ اردو زبان کی ترویج و ترقی پر بھی خاطر خواہ توجہ دی ہے۔ ان تمام امور پر جناب محمد علی اشرف فاطمی، مرکزی وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل سے ایم۔ این۔ شاہنواز کی گفتگو قارئین کی نذر ہے۔

سوال: اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے عملی سطح پر آپ کی وزارت کیا کر رہی ہے؟

جواب: ہندوستان میں دو طبقوں کے لوگ سب سے زیادہ پسماندہ ہیں۔ ایک درج فہرست ذاتیں اور درج فہرست قبائل اور دوسرے مسلمان۔ دونوں طبقوں کے لیے حکومت نہ صرف سنجیدہ ہے بلکہ عملی سطح پر ان کی فلاح و بہبود کے لیے کئی منصوبے زیر غور ہیں۔ عام طور پر اسکولوں میں بچوں کا داخلہ ہی بہت کم ہوتا ہے بالخصوص مسلم بچوں کا تو داخلہ اور بھی کم ہوتا ہے اور ہاں داخلے کے بعد درمیان میں ہی ترک تعلیم کی شکایت عام ہے، لڑکیوں میں تو یہ بہت زیادہ ہے۔ ایسے میں حکومت کو بدنام کرنا مناسب نہیں ہوگا کیونکہ ہندوستان کا کوئی ایسا دیہی حلقہ نہیں ہے جہاں ابتدائی اور ثانوی سطح کی تعلیم کے لیے اسکول نہ ہو۔

سوال: سروشکشا ابھیان (سب کے لیے تعلیم کی مہم) اپنے مقاصد کے حصول میں کہاں تک کامیاب ثابت ہو رہا ہے؟

جواب: سروشکشا ابھیان کے نتائج بہت اچھے ہیں۔ دوسرے پی جی ایس سینٹر کے اشتراک سے جتنے مدارس اور مکاتب ہیں، انھیں ہم لیے رہے ہیں تاکہ کہیں سے یہ شکایت نہ ملے کہ ہمارے درمیان اسکول نہیں ہے۔ مثلاً مدھیہ پردیش میں 300 مدارس اور بہار 400 مدارس کو سروشکشا ابھیان سے جوڑا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جہاں جہاں سے درخواستیں موصول ہو رہی ہیں، ہم سروشکشا ابھیان سے جوڑ رہے ہیں۔

سوال: ان دنوں بہار میں شکشا متر کی تقرری کا سلسلہ جاری ہے۔ حکومت کی جانب سے ان شکشا متروں کو کیا کیا سہولتیں فراہم ہیں؟

جواب: اس سلسلے میں جو سب سے اہم بات ہے وہ یہ کہ ای جی سینٹر کے اشتراک سے جتنے بھی اسکول چل رہے ہیں، ان سبھی اسکولوں میں بچوں کو دن کا کھانا اور کتابیں مفت فراہم کی جا رہی ہیں۔ دوسرے ہر 40 طالب علموں پر ایک استاد کی تقرری کی جا رہی ہے جسے ہم شکشا متر کے طور پر تنخواہ بھی دے رہے ہیں اور دیگر سہولتیں بھی۔ سردست ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے بچوں اور بچیوں کو پابندی سے اسکول بھیجیں اور درمیان میں تعلیمی سلسلے کو منقطع نہ ہونے دیں۔

سوال: بہار میں طالبات کے لیے خاص طور سے ثانوی تعلیم کا فقدان ہے۔ حکومت سے بارہا شکایت کے باوجود کوئی خاطر خواہ نتیجہ ابھی تک برآمد نہیں ہو سکا ہے۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہنا چاہیں گے؟

جواب: جہاں تک بہار میں ثانوی تعلیم کا تعلق ہے، حکومت اس مسئلے پر بہت سنجیدہ ہے اور ابھی حال ہی میں ہم نے کئی اہم فیصلے لیے ہیں جن کے نتائج بہت جلد سامنے آنے شروع ہو جائیں گے۔ دوسرے ابھی ہم نے پورے ہندوستان میں 750 کستوربا گاندھی آواسیہ ودیالیہ قائم کرائے ہیں۔ دس فی صد ایسے تعلیمی ادارے ان علاقوں میں قائم کیے گئے ہیں

جہاں اقلیتی طبقے کی آبادی زیادہ ہے۔ ہندوستان میں پہلی مرتبہ اس حکومت نے فیصلہ کیا کہ کستوربا گاندھی آواسیہ ودیالیہ میں صرف لڑکیاں زیر تعلیم ہوں گی اور کم از کم 75 فی صد سیٹیں درج فہرست ذاتوں، درج فہرست قبائل، پسماندہ طبقے اور مسلم لڑکیوں کے لیے مخصوص ہوں گی۔

سوال: کسی بھی کیندریہ ودیالیہ میں اردو تعلیم کا نظم نہیں ہے، نو ودے ودیالیہ کا بھی یہی حال ہے۔ اس سلسلے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

جواب: میں ایسا نہیں مانتا کہ کسی بھی اسکول میں اردو تعلیم کا نظم نہیں ہے مثلاً نو ودے ودیالیہ کے مقابلہ جاتی امتحان میں اردو داں بچے بیٹھتے ہی نہیں تو ان کا داخلہ کیسے ہوگا اور جب متعلقہ مضامین کے بچے مذکورہ اسکول میں زیر تعلیم نہیں ہوں گے تو اردو تعلیم کا انتظام کس کے لیے کیا جائے گا۔ بہرحال میں اس سلسلے میں ایک میٹنگ جلد ہی بلا رہا ہوں تاکہ مزید معلومات حاصل کرسکوں کہ نو ودے ودیالیہ میں مسلم بچوں کے نہ آنے کی کیا وجہ ہے؟ جہاں تک کیندریہ ودیالیہ کا سوال ہے تو اس میں تو بیشتر سرکاری ملازمین کے بچے ہوتے ہیں اور سرکاری ملازمت میں مسلمانوں کا تناسب بہت کم ہے۔ نتیجے کے طور پر اردو پڑھنے والے طلبہ کیندریہ ودیالیہ میں خال خال ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ دوسرے آج کل کے بچے اردو پڑھنا نہیں چاہتے۔ وہ انگریزی اور دیگر مضامین پڑھنا چاہتے ہیں۔ لیکن انھیں اردو بھی پڑھنی چاہیے اور اس کی سہولیات مہیا کرانے کے لیے حکومت سے مطالبہ بھی کرنا چاہیے۔

سوال: آپ نے بہار کے تمام اضلاع میں کیندریہ ودیالیہ کھولنے کا اعلان کیا ہے، جہاں اردو ایک مضمون کے طور پر پڑھی جاسکے گی لیکن متعلقہ محکمے سے اسے منظوری نہیں مل سکی ہے، ایسے میں کیا بچوں کا مستقبل متاثر نہیں ہوگا؟

جواب: اردو تعلیم کی نفاذ کے تعلق سے کارروائی جاری ہے لہٰذا اردو پڑھنے والے طلبہ کو فکرمند ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے بلکہ انھیں چاہیے کہ اپنی تعلیم کی طرف متوجہ ہوں اور بہتر سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کریں کیونکہ تعلیم ہی ساری کامیابی کی کنجی ہے۔ ہماری پہلی کوشش یہی ہے کہ بہار کے تمام اضلاع میں ایک کیندریہ ودیالیہ اور ایک نو ودے ودیالیہ کی سہولت ہو

اور مجھے پوری امید ہے کہ 06-2005 تک ہم اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوں گے۔

سوال: ابھی حال ہی میں بہار کے سی۔ بی۔ ایس۔ سی سے دسویں جماعت پاس کئی طلبہ کو دہلی کے مختلف کیندریہ ودیالیوں نے داخلہ دینے سے اس لیے انکار کر دیا کہ ان بچوں نے اردو بحیثیت ایک مضمون لے رکھی تھی، کیندریہ ودیالیہ کی اردو مخالف پالیسی میں تبدیلی کے لیے آپ کی وزارت کوئی کارگر اقدام کرے گی؟

جواب: مجھے اس سلسلے میں کوئی اطلاع نہیں ہے لیکن ایسا واقعہ اگر پیش آیا ہے تو وہ بچے مجھ سے ملیں۔ میں دیکھوں گا کہ ان کا داخلہ کیوں نہیں ہوا اور اس سلسلے میں جو بھی رکاوٹ ہوگی، میں اسے دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔

سوال: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے متعلق آپ کی وزارت نے کئی اہم فیصلے کیے ہیں مثلاً ہندوستان کے متعدد شہروں میں نئے مراکز مطالعہ (اسٹڈی سینٹر) اور علاقائی مراکز (ریجنل سینٹر) قائم کرائے ہیں لیکن اتنی بڑی آبادی کے پیش نظر یہ کیا یہ مراکز، ناکافی نہیں ہیں؟ اردو کے فروغ کے تعلق سے اس یونیورسٹی کی کارکردگی کس حد تک اطمینان بخش ہے؟

جواب: سر دست ہماری وزارت نے پانچ نئے علاقائی مراکز کو منظوری دی ہے، سری نگر، بھوپال، دربھنگہ، ممبئی اور کولکاتا۔ ان کے علاوہ جیسے جیسے ضرورت محسوس ہوگی، نئے علاقائی مراکز قائم کیے جائیں گے اور مراکز مطالعہ بھی ضرورت کے مطابق کھولے جائیں گے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اردو کے فروغ کے لیے، بہت بہتر کام کر رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ وائس چانسلر پروفیسر اے ایم پٹھان کی سرپرستی میں یہ یونیورسٹی ہمارے دیرینہ خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں اہم کردار ادا کرے گی۔

سوال: اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی میں تقریباً تمام مضامین کے ساتھ ساتھ پروفیشنل کورس کی تعلیم کا بھی انتظام ہے مگر اردو سے متعلق ایک بھی کورس نہیں ہے۔ کیا آپ کی وزارت اس سلسلے میں کچھ کر رہی ہے؟

جواب: اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی میں اردو تعلیم کا کوئی کورس نہیں ہے۔ واقعی یہ بات افسوس ناک ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے اگنو میں اردو سے متعلق کورسوں کی

شروعات ہوتا کہ اردو والے بھی اس سے مستفیض ہوسکیں۔

سوال: بہار میں تمام اردو ادارے وسائل کی کمی کے سبب دم توڑ رہے ہیں، اس کے لیے کون ذمے دار ہے؟

جواب: میں ایسا نہیں مانتا کہ بہار میں اردو ادارے دم توڑ رہے ہیں۔ تمام اسکولوں اور مدارس میں اردو تعلیم کا انتظام ہے۔ دوسرے میں آپ کو یہ بتادوں کہ پہلے 1200 مدارس منظور تھے اور ابھی ہم نے 2700 نئے مدارس کو منظوری دی ہے لہٰذا یہ کہنا مناسب نہیں ہوگا کہ بہار میں اردو کی صورت حال ابتر ہے۔

سوال: حال ہی میں بی جے پی نے قدیم ہندوستان کی تاریخ کے حوالے سے نویں جماعت میں شامل مواد پر سخت اعتراض کیا ہے، اس سلسلے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

جواب: کسی پارٹی کے اعتراض کرنے یا سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کتابیں لکھتے وقت ذات پات اور مذہب کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ غیر جانبدار ہو کر صحیح تاریخ لکھی جاتی ہے۔ کسی خاص مقصد کے پیش نظر کوئی چیز نہیں لکھی جاتی۔

سوال: قومی اردو کونسل ایک بڑا ادارہ ہے۔ اس کی کارکردگی سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: قومی اردو کونسل اردو کے فروغ کے حوالے سے قابل قدر خدمات انجام دے رہی ہے۔ قومی اردو کونسل اپنے محدود وسائل کے ساتھ جس وسیع پیمانے پر مختلف شعبوں میں اپنی خدمات انجام دے رہی ہے، وہ لائق تحسین ہے۔ ان کاموں کو مزید فروغ دینے کی ضرورت ہے۔

•••

پروفیسر بصیر احمد خاں سے گفتگو

پروفیسر بصیر احمد خاں اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی میں آجکل بحیثیت پرو وائس چانسلر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس سے پہلے موصوف ہمدرد یونیورسٹی میں تقریباً 16 برسوں تک درس و تدریس کے علاوہ مختلف انتظامی عہدوں پر رہے مثلاً ڈین آف ویلفیر اسٹوڈنٹ اور پروکٹر۔ آپ کا تعلق ہمیشہ لکھنے پڑھنے سے رہا، آپ کی کئی تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ پچھلے دنوں جناب محمد نثار نے ان سے ایک خصوصی ملاقات میں ''اگنو اور اردو کا مستقبل'' کے حوالے سے گفتگو کی، جو پیش خدمت ہے۔

سوال۔ آج اگنو (اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی) فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت بین الاقوامی شہرت کی حامل یونیورسٹی ہے۔ اس کی چند اہم خصوصیات پر روشنی ڈالنے کی زحمت کریں۔

جواب: جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان ایک ترقی پذیر ملک ہونے کے ساتھ ساتھ آبادی کے لحاظ سے دنیا کا دوسرا سب سے بڑا ملک ہے اور یہاں آج بھی خط افلاس سے نیچے زندگی گزارنے والوں کا تناسب تقریباً 23 فیصد ہے جو زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم

ہیں حکومت کی مختلف تعلیمی اسکیموں کے ذریعے تمام ممکنہ کوششوں کے باوجود شرح خواندگی میں کوئی قابل قدر اضافہ نہیں ہوا ہے اور آج بھی شہروں اور دیہی علاقوں میں لوگوں کی بڑی تعداد تعلیم سے محروم ہے۔ تعلیم یافتہ خواتین کا تناسب مردوں کے مقابلے میں افسوسناک حد تک کم ہے۔ ظاہر ہے اتنی بڑی آبادی کو رسمی نظام تعلیم کے ذریعے زیور تعلیم سے آراستہ کرنا ناممکن نہ سہی مشکل ضرور ہے کیونکہ اس کے لیے جس بڑے پیانے پر انفرااسٹرکچر اور دیگر لوازمات کی ضرورت ہے حکومت دستیاب کرانے سے قاصر ہے۔
مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی جانب سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو تعلیم سے بہرہ ور کرانے کے سلسلے میں جو متعدد اسکیمیں چلائی جارہی ہیں اور جن کے مثبت نتائج بھی سامنے آرہے ہیں، ان میں فاصلاتی نظام تعلیم کا بہت نمایاں رول ہے اور آج اس نظام تعلیم کے ذریعے نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک تک لوگ کثرت سے مختلف شعبہ ہائے تعلیم میں ڈگریاں حاصل کر کے کامیاب ہورہے ہیں۔ جہاں تک اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کا تعلق ہے تو میں آپ کو بتادوں کہ آج یہ دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی اور فاصلاتی نظام تعلیم کا بین الاقوامی شہرت یافتہ ادارہ ہے۔ سردست یہاں 17 لاکھ طلبہ رجسٹرڈ ہیں اور تقریباً 125 سے زیادہ کورسیز میں تعلیمی سہولتیں دستیاب ہیں۔ اگنو کے امتحانات کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی) حکومت ہند اور پوری دنیا کی یونیورسٹیوں اور حکومتی اداروں کی منظوری حاصل ہے۔ اگنو کے دو ہزار سے زیادہ اسٹڈی سینٹر ہیں اور تقریباً چالیس بیرونی ممالک میں اس کی شاخیں قائم ہیں۔ یہاں سے پورے ملک میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے۔ پورے ملک میں 48 ریجنل سینٹر ہیں۔
آج اگنو کی کامیابی سے متاثر ہوکر متعدد ریاستی یونیورسٹیاں فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت قائم ہورہی ہیں۔ فاصلاتی نظام تعلیم میں یونیورسٹی کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے اگنو کو ''کامن ویلتھ آف لرننگ ایوارڈ'' سے سرفراز کیا گیا ہے۔

سوال: یونیورسٹی میں زیر تعلیم طلبہ کسی طرح کی کمی محسوس نہ کریں۔ اس کے لیے یونیورسٹی نے کیا کیا طریقہ کار اپنا رکھا ہے، خاص طور سے درس و تدریس کے حوالے سے۔

جواب: موجودہ دور انفارمیشن ٹیکنالوجی کا دور ہے اور اس ٹیکنالوجی نے انسانی زندگی میں حیرت انگیز تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ پوری دنیا آج سمٹ سمٹا کر ایک گاؤں میں تبدیل ہو چکی ہے اور برسوں کی مسافت کو ہم منٹوں اور سکنڈوں میں طے کرنے لگے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کے کسی بھی خطے میں رہ کر ہر وہ کام انجام دیا جا سکتا ہے جو کل تک محض ایک خواب و خیال تھا۔ جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے تو یونیورسٹی نے زیر تعلیم طلبہ و طالبات کے لیے وسیع پیمانے پر سہولتیں فراہم کی ہیں۔ تاکہ وہ کسی بھی مرحلے پر کسی طرح کی دشواری محسوس نہ کریں۔ ہم اپنے ریڈیو اور ٹی وی چینل کے ذریعے تعلیمی پروگرام چلاتے ہیں اس کے علاوہ سی.ڈی.، وی.سی.آر.، ٹیپ ریکارڈر، کیسٹ اور اسٹڈی میٹریل وغیرہ متعلقہ طلبہ کو فراہم کراتے ہیں، ٹیلی کانفرنسنگ کے ذریعے بھی تعلیم کی سہولت ہے ساتھ ہی ہر اسٹڈی سینٹر پر باضابطہ درس و تدریس کا نظم ہے جہاں طلبہ متعلقہ استاد سے رابطہ قائم کر کے استفادہ کرتے ہیں۔ کچھ ایسے مضامین (Subjects) جن میں کلاس کرنا لازمی ہے ان کے لیے بھی باضابطہ نظم ہے۔ آپ کو میں یہ بھی بتا دوں کہ طلبہ کو جو اسٹڈی میٹریل یونیورسٹی بھیجتی ہے اس کے لیے یونیورسٹی ہر سال 12 کروڑ روپے کا کاغذ خریدتی ہے۔

سوال: یونیورسٹی میں داخلے سے متعلق کیا کیا شرائط ہیں؟

جواب: یونیورسٹی میں داخلہ لینا کسی کے لیے بھی بہت سہل ہے کیونکہ یونیورسٹی میں داخلے سے متعلق شرائط و ضوابط کو بہت ہی اوپن رکھا گیا ہے تاکہ کوئی بھی شخص جو حصول تعلیم کا خواہشمند ہے محض سخت ضوابط کے سبب حصول علم سے محروم نہ رہ جائے۔ دوسرے وہ سبھی طلبہ و طالبات جنھیں کسی کالج یا یونیورسٹی میں داخلہ نہیں مل سکا ہے، یا وہ لوگ جو کسی وجہ سے اپنی تعلیم مکمل نہیں کر سکے اور ایک مرتبہ پھر حصول تعلیم کے خواہشمند ہیں، انکو میں داخلہ لے کر اپنا تعلیمی سفر جاری رکھ سکتے ہیں کیونکہ یونیورسٹی کے اولین مقاصد میں یہ بھی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ یونیورسٹی سطح کی تعلیم سے فیضیاب ہوں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ یونیورسٹی میں داخلہ لینا یقیناً بہت سہل ہے

لیکن پاس ہونا اتنا سہل نہیں وہ اس لیے کہ یونیورسٹی کا اپنا ایک خاص معیار ہے اور یونیورسٹی اس معیار کو ہر حال میں قائم رکھنا چاہتی ہے۔ لہٰذا یونیورسٹی میں زیر تعلیم طلبہ طالبات سخت محنت کر کے ہی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں بصورت دیگر انھیں اپنے نتائج سے مایوسی ہوگی۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یونیورسٹی کے ذریعے تیار کردہ اسٹڈی میٹریل پوری دنیا میں قابل ستائش سمجھا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مختلف مقابلہ جاتی امتحانات میں شریک ہونے والے امیدوار دو کروڑ روپیے کا ہر سال اسٹڈی میٹریل خریدتے ہیں۔ اس سے بھی یونیورسٹی کے معیار کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

سوال: اگنو میں مختلف علوم و فنون اور مختلف زبانوں میں اعلیٰ سطحی تعلیم کا نظم ہے لیکن اردو تعلیم کا کوئی باضابطہ نظم نہیں ہے، کیا مستقبل قریب میں اردو کے تعلق سے کچھ بہتری کے امکانات ہیں؟

جواب: یونیورسٹی کے قیام کے کچھ ہی دنوں بعد سے اردو بحیثیت اختیاری مضمون کے داخل نصاب ہے لیکن باضابطہ طور پر اردو میں اعلیٰ سطحی تعلیم کا اب تک کوئی نظم نہیں تھا آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ یہاں عنقریب باضابطہ طور پر اردو اور عربی کے کورس شروع کیے جانے والے ہیں اور اس سلسلے میں کاروائی تیز رفتاری سے جاری ہے۔ امید ہے کہ بہت جلد اس کے نتائج آپ کے سامنے ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ ان کورسیز کے شروع ہونے کی صورت میں سب سے زیادہ فائدہ عربی مدارس کے طلبہ کو ہوگا اور وہ مین اسٹریم میں شامل ہو سکیں گے۔

سوال: سچر کمیٹی رپورٹ کے تعلق سے آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

جواب: دیکھیے، سچر کمیٹی رپورٹ کے حوالے سے حکومت بہت سنجیدہ ہے اور مجھے پوری امید ہے کہ اس کے بہتر نتائج سامنے آئیں گے۔ سردست میں آپ کو بتا دوں کہ وزارت تعلیم نے سچر کمیٹی رپورٹ کے تحت اگنو کو یہ ذمے داری سونپی ہے کہ تعلیمی اعتبار سے پسماندہ علاقوں میں اسپیشل اسٹڈی سینٹر کا قیام جلد از جلد عمل میں لایا جائے تاکہ ان علاقوں کا معیار تعلیم بلند ہو سکے۔ اس ضمن میں عربی مدارس میں بھی اگنو کے اسٹڈی سینٹر قائم کیے جا رہے ہیں۔ کسی مدرسے کا کوئی سرپرست اساتذہ، صدر مدرس یا کوئی بھی ذمے دار شخص اپنے تعلیمی ادارے میں اگنو کا اسٹڈی سینٹر قائم کرنا چاہیے تو وہ حسب ذیل پتے یا ٹیلی فون نمبر پر

رجوع کرسکتا ہے:

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، میدان گڑھی، نئی دہلی10068
فون:91-11-29534215+(o) فیکس91-11-29534186-
ای میل:bakhan@ignou.ac.in

سوال: کیا یہ نظام تعلیم طلبہ کو اساتذہ سے مکمل طور پر بے نیاز نہیں کردے گا؟

جواب: بالکل نہیں، وہ اس لیے کہ اتنی بڑی آبادی کو روایتی طرز تعلیم کے ذریعے تعلیم فراہم نہیں کرائی جاسکتی کیونکہ ہمارے پاس وسائل کا فقدان ہے۔ دوسرے گزشتہ چند برسوں میں جس سرعت کے ساتھ گرانی بڑھی ہے اور تعلیمی اخراجات میں مختلف سطحوں پر اضافہ ہوا ہے خاص طور سے پیشہ ورانہ تعلیم وغیرہ میں وہ عام شہریوں کی دسترس سے باہر ہے۔ انھیں اسباب کے پیش نظر اس نظام تعلیم سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جوڑنے کی کوشش کی جاری ہے کیونکہ اس نظام تعلیم کے تحت ہر خاص و عام، عورت و مرد، امیر غریب خواہ اس کا تعلق شہر سے ہو یا دیہی علاقوں سے گھر بیٹھے بیٹھے بہت کم خرچ میں اپنا تعلیمی سفر بہتر ڈھنگ ڈھنگ سے جاری رکھ سکتا ہے۔ عمر کی بھی قید نہیں ہے۔ جہاں تک طلبہ کو اساتذہ سے بے نیاز کرنے کی بات ہے ایسا کچھ بھی نہیں ہے بلکہ ہمارے اس نظام کے تحت طلبہ اساتذہ سے بالمشافہ ہوتے ہیں اور اپنے مسائل کا حل دریافت کرتے ہیں لہٰذا یہ کہنا کہ اس نظام کا مقصد طلبہ کو اساتذہ سے بے نیاز کرنا ہے، قطعی درست نہیں ہے۔

•••

سید حامد سے گفتگو

سید حامد کا شمار ان عبقری شخصیات میں ہوتا ہے جو کسی بھی قوم میں بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔ انھوں نے 1939 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔اے۔کی ڈگری حاصل کی اور وہیں سے 1941 میں انگریزی ادب میں ایم۔اے کیا۔دوران ملازمت انھوں نے 1947 میں فارسی زبان وادب میں بھی ایم۔اے مکمل کیا۔ہائی اسکول سے لے کر ایم۔اے تک انھوں نے تمام امتحانات میں اول مقام حاصل کیا۔

سید حامد نے اپنی ملازمت کی شروعات (1943) یوپی سول سروس سے کی اس کے بعد انھوں نے 1951 میں انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروس کو جوائن کیا۔1980-85 کے درمیان وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے پر فائز رہے۔اس عہدے پر فائز رہتے ہوئے انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تعلیمی وتہذیبی فضا کو بہتر بنایا۔ ماہنامہ ''تہذیب الاخلاق'' کواز سرنو جاری کیا۔پورے ملک میں انھوں نے ''تعلیمی کارواں'' نکالے جس سے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔

سید حامد 1985 سے ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کے سکریٹری ہیں۔اس سوسائٹی کی نگرانی میں اسکول اور فلاحی اداروں سے 1992 کے علاوہ سول سروس کی تیاری کے لیے

ایک ادارہ ہمدرد اسٹڈی سرکل چلایا جاتا ہے۔ سید حامد 1987 تک انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر رہے۔ ان دنوں وہ جامعہ ہمدرد کے چانسلر ہیں۔ انھوں نے جہاں سماجی وفلاحی کارنامے انجام دیے ہیں وہیں تخلیقی وتنقیدی کام بھی کیے۔ ان کی کتابوں میں ''نگار خانۂ رقصاں''، ''مہر و ماہ'' (ترجمہ)، ''کرب آگہی''، "Problems of Indian Muslims"، ''آزمائش کی گھڑی''، ''غالب کی فارسی''، ''مضامین سید حامد''، اور ''قلم اور قدم'' وغیرہ شامل ہیں۔

سوال: کسی بھی قوم کی ترقی کے بنیادی عناصر کیا ہیں؟

جواب: عام طور پر جب قوموں کی ترقی کا ذکر آتا ہے تو لوگ تعلیم کو بے حد اہم قرار دیتے ہیں اور بغیر تعلیم کے ظاہر ہے کسی بھی قوم کی ترقی ناممکن ہے۔ تعلیم کے علاوہ اتحاد نہایت ضروری ہے۔ اس لیے کہ جو قومیں نفاق اور تفرقے کا شکار ہیں ان کی جملہ توانائیاں آپس میں جھگڑنے میں صرف ہو جاتی ہیں، ایسے میں وہ آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ یہ تقریباً ایسا ہی ہے کہ ایک ٹرین ہے اور اس کے دونوں سروں پر دو برابر طاقت کے انجن لگے ہوئے ہیں اور دونوں مختلف سمتوں میں جانے کی کوشش کر رہے ہیں، تو پھر فاصلہ طے نہیں ہو پائے گا۔ اس کے بعد تنظیم بہت ضروری ہے۔ تنظیم کے بعد ولولہ یعنی زندگی کا ولولہ، جوش، لوگوں پر سبقت لے جانے کی خواہش۔ ان کے علاوہ بلکہ بہت پہلے آجانا چاہیے تھا خدا کا خوف اور انسانیت کا دور۔ یہ بہ ظاہر تو ترقی کے لیے ضروری نہیں لگتا لیکن یہ بہت ضروری ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ نہ معلوم کتنی قومیں ان دو باتوں کے نہ ہونے سے تباہ ہو گئیں۔

سوال: عہد حاضر میں مسلمانوں کے حالات کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: یہ بات تو عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ ہندوستانی مسلمان دو علاقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک جنوبی ہندوستان اور ایک حد تک مغربی ہندوستان اور دوسرا شمال و شمال مشرق۔ اول الذکر نے خدا کے فضل سے ترقی کی ہے اور وہاں آگے بڑھنے کی ایک سنجیدہ کوشش ہو رہی ہے۔

شمال اور شمال مشرق میں بڑی پسماندگی ہے اور اسی اثنا میں وہاں بیداری کی لہر بھی کبھی آئی ہے لیکن وہ ہمہ گیر نہیں رہی۔ کچھ لوگوں نے شہروں میں کوشش کر لی، اس کے کچھ

نتائج برآمد ہوئے لیکن جو ہمارے بڑے بڑے مسائل ہیں وہ حل کے قریب نہیں ہیں۔ یہ کہتے ہوئے بڑی تکلیف بھی ہوتی ہے کہ شمالی ہندوستان میں بڑا جمود ہے، بڑی بے حسی ہے اور بڑی خودغرضی ہے۔ وہ یہ سمجھتے نہیں کہ دو چار آدمی اگر آگے بڑھ گئے تو اس سے قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ جب تک کہ ان کے دل میں، جو صاحب حیثیت یا صاحب شعور، صاحب علم یا صاحب اقتدار ہیں، قوم کا واقعی درد پیدا نہیں ہوتا تب تک بہت زیادہ ترقی کی امید نہیں کی جاسکتی۔

لیکن انوکھی بات یہ ہے کہ شمال کے اس علاقے میں لوگ بستے ہیں جسے Cowbelt کہتے ہیں۔ وہ لوگ اجتماعی احساس اس قدر نہیں رکھتے جس قدر دوسرے علاقوں میں لوگ رکھتے ہیں۔

مسلمانوں کی عام حالت اطمینان بخش کی نہیں ہے۔ بڑی دشواری ہر اس شخص کے لیے ہے جو خواہاں ہو کچھ کرنے کا۔ عام طور پر شمال کے مسلمانوں پر قول وفعل میں بڑا تضاد ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی نیت کیا ہے؟ وہ کس حد تک کسی تحریک کے ساتھ ہیں اور کس حد تک اپنے مفادات کا حساب لگا رہے ہیں۔

ایک بڑے مفکر کا مقولہ ہے کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ میں نے یہ کہنے کی جسارت کی کہ ہر بچہ مقروض پیدا ہوتا ہے اور اس کو اپنی زندگی اس قرضے کو ادا کرنے میں صرف کرنی چاہیے۔ جوان لوگوں کا ہم پر ہے، پوری نسل انسانی پر، جنھوں نے کسی نہ کسی عنوان سے انسانیت کو ترقی دی ہے چاہے روحانی طور پر یا مادی طور پر۔ اس طرح کے قرضے کو چکانے کا احساس بھی یہاں پیدا نہیں ہوا ہے جبکہ یہ پیدا ہونا چاہیے۔ ہمارے مسائل بہت سنگین ہوتے جارہے ہیں۔

سوال: اترپردیش کی گھریلو صنعتوں اور ان میں کام کرنے والوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: ہمارا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ ہم ہاتھ سے کام کرتے ہیں، اپنے سر کو اونچا رکھتے ہیں۔ اور چھوٹی صنعت وحرفت میں ید طولیٰ بھی رکھتے ہیں۔ لیکن اب یہ بات بھی انڈسٹریڈریشن کی وجہ سے

شاید ان کے خلاف جائے۔ اس لیے کہ اس کے بعد ان کے لیے بہت کم گنجائش رہ جائے گی۔ ایک سیلاب سا آرہا ہے مگر ہم لوگ سنجیدہ نہیں ہیں۔ ہمیں یہ احساس ہی نہیں ہے کہ طوفان آرہا ہے تو مقابلے کی کسی قسم کی تیاری بھی نہیں کر رہے ہیں۔

میرٹھ، مرادآباد سے لے کر مرزاپور تک گھریلو صنعتیں ہیں۔ ان میں کام کرنے والوں کی صحت اور تعلیم کا کسی کو خیال ہی نہیں۔ صحتیں برباد ہو گئی ہیں۔ تپ دق اگر ایک گھر میں پہنچتی ہے تو اس گھر کے سب افراد کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ یہ بڑا مسئلہ ہے جو ہمارے سامنے پچاس سال سے ہے۔ لیکن اس کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ کسی کو الزام تو نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس حمام میں ہم سب ننگے ہیں۔ ہم چین کی نیند سوتے ہیں اور وہ بے چارے ایسے حالات میں روزی کماتے ہیں۔

ہم نے کبھی یہ کوشش نہیں کہ حکومت کے جو پروگرام اور منصوبے ہیں، ان سے ہم باخبر رہیں اور ان سے ہم حصہ رسدی وصول کریں۔ اگر ہم نے اکادکا کوششیں کیں تو اس کا کیا اثر ہوگا۔ اول تو ہم بے خبر ہیں، ہم اپنا حصہ مانگتے نہیں اور دوسرے یہ کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں یہ انتظام ہے، حکومت کے پروگراموں کا، ان کے گوشۂ خاطر بھی ہماری طرف زیادہ نہیں ہیں۔

سوال: اس بدلتے تناظر میں مسلم قیادت کے تعلق سے آپ کیا امکانات محسوس کرتے ہیں؟

جواب: میں یہ سوچتا ہوں کہ ہمارے لیے اب ملک گیر قیادت کا امکان بہت کم ہے۔ اب وہ قیادت ہونی چاہیے جو شہر شہر اور گاؤں گاؤں ابھرے۔ یہ کام بڑے پیمانے پر ہونا چاہیے۔ اس کا جو اجتماعی اثر ہوگا وہ غیر معمولی طور پر حیرت انگیز ہوگا۔ مگر دشواری یہ ہے کہ ہم لوگ گداگری اور دست نگری کے عادی ہو گئے ہیں اور یہ بھی سوچنے لگے ہیں کہ حکومت کرے۔ یہ ذمے داری تو خود ہماری ہے اگر حکومت کسی خاص طبقے پر خاص توجہ زیادہ دنوں کے لیے کرے گی تو وہ طبقہ اور اپاہج ہو جائے گا۔ کمر کسنے کا جو تصور ہے اس سے ہم ابھی تک محروم رہے ہیں۔

سوال: کوئی ایسا ایک کام بتائیں جو مسلم نوجوانوں کو روزگار کے مواقع سے باخبر رکھے؟

جواب: میں اکثر کہتا رہتا ہوں کہ ہر شہر میں کم سے کم ایک چھوٹا سا مرکز بنالیں۔ کسی بھی صاحب ثروت، صاحب خیر سے کہیں کہ اپنے مکان کا صرف ایک کمرہ دے دیں جو گلی پہ کھلتا ہو۔ اس میں ملکی اور علاقائی اخبارات آجائیں۔ ان اخباروں میں جو خبریں روزگار اور تعلیم سے تعلق رکھتی ہوں، ان خبروں کو ہم تختۂ سیاہ پر لکھ دیا کریں۔ آنے جانے والے لوگ یہ دیکھ لیں کہ تعلیم اور روزگار کے لیے کیا گنجائش ہیں۔

سوال: مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: 1951 سے مردم شماری والوں نے مذہب وار اعداد وشمار چھاپنا بند کر دیا ہے۔ یہ ہمارے ساتھ ایک طرح سے ناانصافی ہے۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کتنے زوال پذیر ہیں تو ممکن ہے کچھ لوگوں کی آنکھیں کھلتے ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ کوشش کرنا شروع کرتے۔ ہمارے یہاں ایسے بہت لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہمارے محلے سے بہت کم بچے اسکول جایا کرتے تھے اب تو ایک اژدہام ہے۔ لہٰذا تعلیمی اعتبار سے مسلمان بہت ترقی کر رہے ہیں۔ یہ سب ظاہری باتیں ہیں، جو ٹھوس اعداد وشمار ہیں وہ کچھ اور کہتے ہیں۔ اعداد وشمار کے لحاظ سے تو شمال میں مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال اطمینان بخش نہیں ہے اور یہاں لڑکیوں کی طرف سے غفلت بھی برتی جارہی ہے۔ لڑکیوں کے لیے مختص اسکول، کالج ہونے چاہیے تھے۔ اس کے لیے ہم نے نہ ہی حکومت سے مطالبہ کیا اور نہ ہی حکومت نے کچھ اس طرح کا قدم اٹھایا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ ہم میں آج بھی ہیکڑی ہے، اکڑ ہے۔ اس ہیکڑی اور اکڑ سے کام نہیں چلتا۔ بہت سے مسائل پر ہم نے بڑا غلط رخ اختیار کیا۔ اس سے ملک کی اکثریت ہم سے اور بدگمان ہوگئی ہے۔ یہ بات ہمیں ذہن نشیں رکھنا چاہیے کہ کوئی حکومت ہماری مدد نہیں کرسکتی خواہ وہ کتنی ہی خواہاں ہو جب تک کہ ملک کی اکثریت ہمارے لیے ایک نرم گوشہ اپنے دل میں پیدا نہیں کرتی۔

سوال: 1995 میں آپ نے جو تعلیمی کارواں نکالا تھا، اس کی بنیاد کن باتوں پر تھی اور اس کے نتائج کیا رہے؟

جواب: ہم نے جو کارواں نکالا تھا اس میں تعلیم کو اولیت دی گئی تھی لیکن اس میں تین چیزیں، صحت، حفظانِ صحت اور اصلاح معاشرہ کو بھی شامل کرلیا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ ہمارے یہاں بہت فضول خرچی ہے۔ وہ روپیہ جو تعمیری کام میں صرف ہونا چاہیے وہ نمود ونمائش، شادی بیاہ اور ہنگاموں میں صرف ہوتا ہے۔ چوتھی بات جسے ہم نے بعد میں اولیت دی وہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ کہ ہمارا دین ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہم انسانیت کے لیے رحمت ثابت ہوں اور دوسرے یہ کہ ہمارے مسائل اس کا تقاضا کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر فرقہ وارانہ ہم آہنگی نہیں رہی اور اکثریت ہم سے بدظن رہی تو ہمارے راستے میں بڑی رکاوٹیں آئیں گی۔

تعلیمی کارواں کے نتائج کو دو طرح سے آنکا جاسکتا ہے۔ ایک تو ایسے نتیجے جو آنکھوں کے سامنے فوراً آجائیں۔ اس میں یہ ہوا کہ کئی جگہ اسکول کھلے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کا جو سب سے اہم نتیجہ تھا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں میں تعلیم کے متعلق ایک لہر پیدا ہوئی۔

سوال: آج مسلمانوں کو کس طرح کی تعلیم حاصل کرنی چاہیے؟

جواب: اول تو وہی تعلیم جیسے انگریزی مین اسٹریم ایجوکیشن کہتے ہیں۔ اس کے بغیر تو ہم ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ یہ بےحد ضروری ہے۔ دوم یہ کہ ہم لوگ اہل حرفہ ہیں۔ ہم لوگ جن گھریلو صنعتوں میں لگے ہوئے ہیں ان میں ہمارے طریقے بہت فرسودہ ہو چکے ہیں۔ ان کو بہتر بنانا چاہیے۔

ہم نے عام تعلیم میں فاصلاتی تعلیم سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ہماری لڑکیاں جو باہر نہیں جاسکتیں، ہمارے بچے جنھوں نے بیچ میں تعلیم چھوڑ دی، ان کے لیے یہ ایک راہ نجات ہے۔ ہمیں فاصلاتی تعلیم سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

سوال: مسلم تعلیمی اداروں کے معیار کو کس طرح بہتر بنایا جاسکتا ہے؟

جواب: مسلم تعلیمی اداروں کے معیار کو اونچا کرنے کے لیے Remedial کلاسیز لازمی ہیں۔ اختلافات کو ختم کرنے کا ایک زریں اصول یہ ہے کہ ہم یہ طے کرلیں کہ ادارہ مقدم ہے اور افراد کی حیثیت بالکل ثانوی ہے۔ کسی بزرگ نے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب نازل

کرنا چاہتا ہے تو اس سے ادارہ بنانے اور اسے چلانے کی صلاحیت سلب کر لیتا ہے۔

مسلمانوں کی تعلیم کے حوالے سے حکومت ہند نے مختلف کمیٹیاں بنا رکھی ہیں۔ ایک تو وزیر اعظم نے اعلیٰ سطح کمیٹی بنائی ہے، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو مسلمانوں کی تعلیم سے دلچسپی ہے۔ وہ کمیٹی جون 2006 تک اپنی سفارشات پیش کر دے گی۔ اس طرح کی کمیٹیوں سے مسلم تعلیمی اداروں کو باخبر رہنا چاہیے۔

سوال: آج کے دور میں اردو میڈیم اسکول کس حد تک کامیاب ہیں؟ ہمیں اس سلسلے میں کیا قدم اٹھانا چاہئیں؟

جواب: اردو میڈیم اسکولوں کے متعلق اگر ہم دلی کے اردو میڈیم اسکولوں کو دیکھ کر رائے قائم کریں تو حوصلہ فرسا معاملہ ہے۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہم کو اپنی زبان سے دست بردار نہیں ہونا چاہیے۔ اردو میڈیم اسکول اس لحاظ سے اردو زبان کی ترویج کے ترجمان ہیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ اردو میڈیم اسکولوں میں Sandwich Summer کورسیز چلائے جائے۔

سوال: ہمارے ملک میں تقریباً تمام اقلیتوں کے اپنے اپنے ٹیلی ویژن چینل ہیں کیا مسلمانوں کا بھی اپنا ایک چینل ہونا چاہیے؟

جواب: میرے ذہن میں کوئی ویژن تو نہیں ہے مگر مسلمانوں کے ذہن میں ایک بات ہے کہ دوسری اقلیتوں کی طرف مسلمانوں کا بھی اپنا ایک ٹیلی ویژن چینل ہونا چاہیے اور یہ بدیہی بات ہے کہ مسلمانوں کا اپنا ایک چینل ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ لوگ اخبار بھی کم پڑھتے ہیں، کتابیں بھی کم پڑھتے ہیں۔ لوگ ٹی وی چینل سے کان لگائے رہتے ہیں تو وہ قوم بہت بدنصیب اور محروم ہوگی جس کا اپنا کوئی چینل نہ ہو۔

سوال: مسلمانوں میں فلاحی تنظیم (چیریٹیبل ٹرسٹ) کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا ہے۔ ایسا کیوں؟

جواب: اس سلسلے میں یہ کہا جائے کہ جو تصور تھا وہ معدوم ہو گیا ہے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ ہمارے پاس چیریٹیبل ٹرسٹ اور سوسائٹیاں بہت کم ہیں جس کی وجہ سے ہم بہت نقصان اٹھا رہے ہیں اور جو اربوں روپیہ اصلاحی، فلاحی اور تعمیری کاموں کے لیے حکومت دیتی ہے اس سے

بڑی حد تک ہم محروم ہیں۔ یہ ساری باتیں تبھی ہوں گی جب ہم اپنی شخصیت میں گم ہونے کے بجائے انسانیت کی فکر کرنے لگیں، ملت کی فکر کرنے لگیں۔

سوال: آپ کے بارے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ آپ کا قلم اور قدم بیک وقت چلتے ہیں، ایسے میں آپ ادب کے لیے موقع کیسے نکالتے ہیں؟

جواب: پہلے کچھ پڑھ لکھ لیا کرتا تھا مگر اب کچھ نہیں کر پاتا۔ بہت پہلے میں قافیہ پیمائی کرتا رہا پھر اس کے بعد فلاحی و اصلاحی مضامین لکھتا رہا پھر تیسری منزل جو قدم والی آپ نے بتائی یعنی ملک میں گھومنے کا کام کیا۔

کوئی نہ کوئی قیمت تو آپ کو دینی پڑتی ہے۔ لکھنے پر اگر آپ توجہ کریں تو اچھا لکھ پائیں اور عملی کام اگر کریں تو اس میں کوئی کارنامہ کر جائیں۔ میرے کام کرنے کی رفتار بہت تیز نہیں ہے۔ میں باقاعدگی کے ساتھ مطالعے اور تحریر کے لیے وقت نہیں نکال پاتا۔ میری زندگی کبھی اس طرح منضبط نہیں رہی۔

سوال: ''مہر و ماہ'' کا ترجمہ کرنے کے دوران آپ نے لکھا تھا کہ اب نثر ساتھ نہیں دے پا رہی ہے اور اس کا ترجمہ آپ نے اشعار میں کیا۔ کیا ان دنوں بھی آپ ایسا کوئی ترجمہ کر رہے ہیں؟

جواب: نہیں۔ ان دنوں ایسا کوئی ترجمہ نہیں کر رہا ہوں۔ کبھی کوئی چیز محرک ہو جاتی ہے۔ ایک زمانے میں امریکہ سے رسالہ ''مصور'' نکلا کرتا تھا۔ اس میں ایک دفعہ انگریز شاعر رابرٹ براوننگ اور شاعرہ الزبتھ بیرتھ کی خط و کتابت کے ساتھ ان کی داستان تصویروں کے ساتھ شائع ہوئی۔ مجھے یہ دلچسپ لگا، میں نے سوچا کہ ان خطوط کا ترجمہ کیا جائے اور میں نے ترجمہ کیا۔ مگر جب سے میں فلاحی کاموں میں مصروف ہوا تو ایسے کام کرنے کی فرصت نہیں مل پاتی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ قومی آواز (دہلی) آزاد ہند (کولکاتہ)، انقلاب (ممبئی)، سیاست (حیدرآباد) اور سالار (بنگلور) جیسے اخباروں میں فلاحی مضامین لکھتا رہتا ہوں۔ کبھی کبھی تہذیب الاخلاق (علی گڑھ) میں کوئی مضمون بھیج دیتا ہوں۔

سوال: آپ کی ساری صفات اور خوبیوں کا علم عوام کو ہے مگر آپ کے اندر کا جو شاعر ہے وہ عوام تک نہیں پہنچا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: وہ شاعر اس لائق نہیں تھا کہ عوام تک پہنچے۔ ایک زمانہ تھا کہ کبھی کبھی کسی مشاعرے یا ادبی نشست میں چلا جاتا تھا۔ اب فرصت نہیں ملتی۔

سوال: آپ کی ایسی کوئی خواہش جو پوری نہیں ہوئی اور اس کا آپ کو بے حد افسوس ہو؟

جواب: میرے ذہن میں ہمیشہ رہا کہ کچھ کتابیں لکھوں گا۔ کسی ایک موضوع پر کوئی ایک مبسوط کتاب لکھنے کی خواہش رہی مگر یہ کام میں نہیں کر پایا۔ اس کی حسرت لے کر ہی جاؤں گا۔

سوال: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی اردو خدمات سے آپ کس حد تک اتفاق کرتے ہیں؟ کونسل کے لیے آپ کا کوئی مشورہ؟

جواب: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی اردو خدمات کا جائزہ میں نے تفصیل سے نہیں لیا ہے لیکن یہ بات تو عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ پر آشوب دور میں بھی اس ادارے نے اردو کا پرچم بلند رکھا اور اس میں جدید ٹیکنالوجی کو داخل کیا، یہ ایک مثبت قدم ہے۔ اس کے نتائج برآمد ہوتے رہیں گے۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ یہ ادارہ کا گلی محلے تک پھیلاؤ کر سکتا ہے کہ نہیں لیکن اس کی اہم ضرورت ہے۔

سوال: ''اردو دنیا'' آپ کی نظر میں کیسا رسالہ ہے؟

جواب: یہ ایک معیاری رسالہ ہے۔ میرے خیال میں اگر علوم کے متعلق مضامین اس رسالے میں شائع کیے جاتے تو اردو قارئین عالمی پیش رفت سے باخبر رہتے۔ ہمارے یہاں سنجیدہ رسالوں کی کمی ہے۔ یہ رسالہ اس کمی کو پورا کر رہا ہے۔ اس رسالے میں ان عالمی اور ملکی کتابوں کی تلخیص دی جائے جو ایک عرصے تک چرچے میں رہتی ہیں تو کیا ہی اچھا ہو۔

•••

مشیر الحسن سے گفتگو

پروفیسر مشیر الحسن نے جون 2004 کے آغاز میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے چارج سنبھالا۔ اس سے قبل وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اکادمی آف تھرڈ ورلڈ اسٹڈیز میں جدید تاریخ ہند کے پروفیسر اور ڈائرکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔ پروفیسر حسن نے ہندستان میں اسلامیات، تقسیم ہند اور فرقہ وارانہ مسائل کے موضوع پر کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ''ٹائمس آف انڈیا'' نئی دہلی 24 جون 2004 کے شکریے کے ساتھ انٹرویو کے اقتباسات پیش خدمت ہے

سوال: کیا آپ یہ مانتے ہیں کہ 1990 کے آغاز میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پرو وائس چانسلر کی حیثیت سے آپ نے اپنے عہد میں جس صاف گوئی اور بے باکی سے کام لیا، یہ اس کا بدلہ ہے؟ کیا یہ وائس چانسلر شپ کچھ تاخیر سے ملی ہے؟

جواب: وائس چانسلر ہونا کسی کا پیدائشی حق نہیں ہے۔ میں اپنی پی۔ ایچ۔ ڈی کے فوراً بعد 1978 میں جامعہ سے منسلک ہو گیا اور اسے چھوڑنے کا کبھی خیال بھی نہیں آیا۔ بیرون جامعہ کسی عہدے کے لیے میں نے کبھی کوشش نہیں کی اور میں نہیں سمجھتا کہ میں نے کوئی موقع گنوایا

ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ میں محض ایک استاذ نہیں بلکہ ایک محقق بھی ہوں۔ میں کتابیں لکھ کر پوری طرح مطمئن تھا۔ ابھی بھی میرا خیال ہے کہ میں کم عمر وائس چانسلروں میں سے ایک ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ ایک موقع آیا ہے اور اسے میں ایک چیلنج کے طور پر قبول کر رہا ہوں۔

سوال: آپ کے تقرر نے بیورو کریٹس کو وائس چانسلر کی حیثیت سے مقرر کرنے کے جدید رجحان کو پلٹ دیا ہے۔ کیا اکیڈمیشین حضرات کے لیے یونیورسٹیوں کی سربراہی بہتر ہے؟

جواب: نہ تو سارے اکیڈمیشین دور اندیش ہوتے ہیں اور نہ ہی سارے ایڈمنسٹریٹروں میں دور اندیشی کی کمی ہوتی ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر ایک بیوروکریٹ تھے، انھوں نے اس وژن کو فروغ دیا جو یونیورسٹی کے اعلا مفاد میں تھا۔ انھوں نے جو منصوبے بنائے اور ان پر عمل درآمد شروع کیا اس کا فائدہ ہم لوگوں کو ہوگا۔

سوال: جامعہ کی مضبوطی اور کمزوری کیا ہے؟

جواب: سیکولر، غیر متعصب اور روشن خیالی کی اقدار اس کی مضبوطی ہیں اور کمزوریاں ایسے مسائل ہوں گے جن کا تعلق شناخت اور تبدیلی کی مزاحمت سے ہے۔ شکر ہے کہ اس خاص ذہنیت میں تبدیلی آ رہی ہے۔

سوال: جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کی ایک مرکزی یونیورسٹی ہے۔ مگر یہ دہلی یونیورسٹی اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے مختلف کیوں ہے؟

جواب: اکتوبر 1920 میں اس کی تاسیس عمل میں آئی۔ اس وقت سے اس کی تاریخ پیچیدہ رہی ہے۔ بہت سارے اسباب کی بنا پر یہ آزادی کے بعد اپنی وہ پہچان نہیں بنا سکی جس کی حقدار تھی اور نہ ہی اپنے دائرہ علم کو وسعت دے سکی۔ میرا خیال ہے کہ اس کے لیے کسی کو موردِ الزام قرار دینے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ خود ہمارے اندر عدم موزونیت ہے۔ حالیہ چند برسوں میں اس ادارے کے سلسلے میں کچھ غلط تاثر دور کیے گئے ہیں۔ مگر اس سمت میں ہمیں مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ مزید برآں اکیڈمک پروفائل کو بھی بلند کرنا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر جامعہ کے Mass Communication Research

Centre کو خاصی شہرت ملی ہے کیوں کہ اس کی پرفارمنس بہت اچھی رہی ہے۔ ہمیں لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔

سوال: مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کی وجہ کیا ہے؟

جواب: سرکاری اسکولوں تک رسائی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بہت سارے مسلم خاندان اپنے بچوں خصوصاً اپنی لڑکیوں کو مدارس ومکاتب میں بھیجنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے درمیان تعلیمی فروغ میں ریاستوں کا رول انتہائی ناکافی رہا ہے۔ لیکن جہاں کہیں بھی صوبائی حکومت نے موثر انداز میں مداخلت کی ہے جیسے کیرالہ میں، کسی حد تک کرناٹک میں اور حال میں سابقہ حکومت کے ذریعے مدھیہ پردیش میں، یا ذاتی اقدامات کے ذریعے مواقع فراہم کیے گئے ہیں وہاں مثبت نتائج دیکھنے کو ملے ہیں۔ مسلمانوں کی جو شبیہ پیش کی جاتی ہے کہ وہ تعلیم کے مخالف ہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔

سوال: مین اسٹریم کا حصہ بننے کی مخالفت کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے، کیا یہ تصور بھی غلط فہمی پر مبنی ہے؟

جواب: پہلے ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ مین اسٹریم ہے کیا؟ یہ فرض کر لینا کہ مسلمان صرف اس وجہ سے مختلف ہیں کہ وہ ایک جداگانہ مذہب کی پیروی کرتے ہیں ان کے ساتھ ناانصافی ہے۔ وہ ٹھیک اسی طرح مین اسٹریم کا حصہ ہیں جیسا کہ دوسری قومیں۔ میرے خیال میں یہ ایک ایسا سوال ہے جس کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔

سوال: کیا حکومت کو نئے سرے سے تاریخ نویسی میں مداخلت کرنی چاہیے؟

جواب: یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر حکومت وقت اور ممتاز مورخین کو بحث کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر سابقہ حکومت کے ذریعے متعارف کرائی گئی کتابیں نظر ثانی کی متقاضی ہیں۔ NCERT کی کتابیں ہی نہیں بلکہ پورے ہندی خطے میں طلبہ کو پڑھائی جانے والی کتابیں بھی بدل دینی چاہئیں کیونکہ یہ تمام کی تمام زہر آلود ہیں۔ اس ہم آہنگی تک رسائی کے لیے درسی کتابیں ہمارے متنوع اقدار کا آئینہ ہوں ایک کل جماعت کانفرنس بلائی جا سکتی ہے۔

سوال: کیا درسی کتابیں لکھوانا حکومت کا کام ہے؟

جواب: اس پر بحث کی شدید ضرورت ہے۔ ایک موزوں مباحثے کے بغیر کوئی بھی فیصلہ قبل از وقت ہوگا۔

سوال: ایک رائے سامنے آئی ہے کہ گجرات کا قتل عام سیکولر تعلیم کی ناکامی کا بین ثبوت ہے؟

جواب: سیکولرزم لازمی طور پر ایک سیاسی تصور رہا ہے۔ اسے سماجی، ثقافتی اور عقلی اصطلاحوں میں منتقل نہیں کیا گیا ہے۔ بہت سے ایسے وسائل ہیں، صحافت، اسکول، کالج، سیاسی و سماجی تنظیمیں جن کے ذریعے آپ معاشرے کو سیکولر بنا سکتے ہیں۔ ہم نے ان وسائل کا استعمال نہیں کیا ہے۔ نہرو نے 1937 میں جو کچھ کیا تھا وہ ہمیں 2004 میں کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں عوامی رابطے کی ایک مہم چلانی ہے جسے معاشرے کے بڑے حلقے تک پہنچنا ہے اور مشترکہ تمدنی اقدار کی وضاحت کرنی ہے۔ کانگریس، کمیونسٹ اور دیگر مرکزی پارٹیوں جیسے سماج وادی اور بہوجن سماج پارٹی کو چاہیے کہ وہ اپنا کردار پہچانیں جو موجودہ صورت حال میں وہ ادا کر سکتی ہیں۔

سوال: کیا انتظامی ذمے داری آپ کی درسی مصروفیت میں مانع نہیں ہوگی؟

جواب: انیسویں صدی میں دہلی کے مسلم دانشوروں سے متعلق ایک کتاب پر کام کر رہا ہوں۔ میں یقیناً اسے مکمل کروں گا اور دیگر مسائل پر بھی اپنا ردعمل ظاہر کرتا رہوں گا۔

•••

کرشن کمار سے گفتگو

پروفیسر کرشن کمار ممتاز ماہر تعلیم اور این۔سی۔آر۔ٹی کے ڈائرکٹر ہیں۔ پروفیسر موصوف سے یہ انٹرویو 'ٹائمز آف انڈیا' نئی دہلی۔6 جون 2005 کے شکریے کے ساتھ پیش خدمت ہے۔

سوال: آپ نے جب سے این۔سی۔ای۔آر۔ٹی کے ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھالا ہے، اس وقت سے کونسل نصابی ڈھانچے پر نظر ثانی (Curriculum Review Framework) میں مصروف ہے۔ مستقبل کے لیے آپ کا کیا منصوبہ ہے؟

جواب: ہم اگست میں نظریہ سازی سے متعلق ایک کانفرنس کا انعقاد کر رہے ہیں اور پھر نومبر میں، ہم اس نظریے کا ایک تفصیلی خاکہ 'این۔سی۔ای۔آر۔ٹی۔۔۔اگلی دہائی میں' کے عنوان سے ایک کانفرنس میں پیش کریں گے۔

سوال: این۔سی۔ای۔آر۔ٹی کو فی الوقت کن مسائل کا سامنا ہے؟

جواب: آئینی ترمیم کے ذریعے تعلیم کو ابتدائی سطح پر لازمی قرار دیا گیا ہے اور اس مسئلے پر ہمیں فوری طور پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ اس آئینی ترمیم پر عمل درآمد کرنے کے لیے این۔سی۔ای۔آر۔ٹی کو اپنا نقطۂ نظر اسی کے مطابق بنانا ہوگا۔

سوال: گذشتہ چالیس برسوں میں آپ این۔سی۔ای۔آر۔ٹی کی خدمات کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب: گذشتہ چالیس برسوں میں این۔سی۔ای۔آر۔ٹی نے پالیسیوں کی رہنمائی اور نئے پروگراموں کی ترتیب و تنظیم میں اہم کردار ادا کیا ہے۔تاہم دوسرے اداروں کی طرح یہ بھی بہت حد تک شہروں تک محدود ہو گیا ہے اور دیہی بچوں خصوصاً محروم طبقے کے بچوں کی ضروریات کو پورا کرنے میں اس کی صلاحیت ناکافی ثابت ہوئی ہے۔چونکہ اسکول کی سطح تک تعلیم ریاستوں کی ذمے داری ہے لہٰذا عام طور پر این۔سی۔ای۔آر۔ٹی ریاستی حکومتوں کے توسط سے اس عمل میں شامل ہے۔حالانکہ کچھ ریاستیں اس سلسلے میں ہمارے ساتھ مل کر کام کرتی ہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ ہم انھیں اس عمل میں شامل ہونے کی ترغیب دیں اور خاص طور سے ان ریاستوں کو جہاں ہندی بولی جاتی ہے اور جہاں بنیادی سہولتوں سے محروم اور تارک مکتب (Dropouts) بچوں کے مسائل تشویش ناک ہیں۔

سوال: عالم کاری (Globalization) اور تحقیقی سرگرمیوں (Research Activities) کے تئیں این۔سی۔ای۔آر۔ٹی کا نقطۂ نظر کیا ہوگا؟

جواب: ہمیں عالم کاری اور تحقیق کے تمام پہلوؤں پر وسیع پیمانے پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔عالم کاری کی وجہ سے سامنے آنے والے مبارزات کا مقابلہ علم، ٹیکنالوجی اور صلاحیت کی تعمیر کے حوالے سے کس طرح کرنا چاہیے، ہمارے مختلف پروگراموں میں اس کی ترجمانی ہونی چاہیے۔این۔سی۔ای۔آر۔ٹی بنیادی طور پر ایک تحقیقی ادارہ ہے لہٰذا تحقیق کو ہمارے مستقبل کے لائحۂ عمل کا ایک حصہ ہونا چاہیے تاکہ ہندوستان معاشی عالم کاری کے عمل سے پیدا ہونے والے مبارزات کا مقابلہ کر سکے۔مزید یہ کہ تعلیمی اصلاحات میں سرگرم کردار ادا کرنا ایک جوکھم بھرا کام ہے۔فی الحال قومی نصاب برائے تعلیم کے ڈھانچے کی نظر ثانی (نیشنل کریکولم فریم ورک ریویو) پر پروفیسر یشپال کی قیادت میں کام ہو رہا ہے اور اس کے متعلق مرکزی مشاورتی بورڈ برائے تعلیم (سینٹرل اڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن) میں گفتگو کی جا رہی ہے۔اس پر بحث و مباحثے کے بعد ہماری یہ ذمے داری ہوگی کہ ہم اس کی سفارشات پر عمل درآمد کریں۔

سوال: کیا آپ ہمیں ان مسائل کے بارے میں مختصراً بتائیں گے جن پر گفتگو ہوئی ہے؟

جواب: اس عمل کے دوران ابھی تک جو مسائل ابھر کر سامنے آئے ہیں وہ چنوتی دینے والے ہیں۔ مثال کے طور پر امتحان سے متعلق اصلاح۔ مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ نے حال ہی میں ایک میٹنگ کی تھی جس میں اس طرح کے سوالات اٹھائے گئے کہ امتحان کا عمل کیوں اتنا زیادہ محنت طلب، سخت اور غیر اصلاح شدہ ہے۔ سی۔ بی۔ ایس۔ ای اور دیگر بورڈوں کے بشمول این۔سی۔ای۔آر۔ٹی کا اہم کام امتحان کے عمل کو بچوں کے لیے آسان، موزوں اور پسندیدہ بنانا ہے۔

ہمیں ابتدائی درجے سے بارھویں تک ایسی نصابی کتابیں تیار کرنی ہیں جو بچوں کی فطرت اور ذہنی صلاحیت کے عین مطابق ہوں اور ان پر اپنا اثر مرتب کر سکیں۔ لہٰذا این۔سی۔ای۔آر۔ٹی میں بنیادی سوال نصابی سرگرمیوں کے دائرۂ عمل کی توسیع ہے۔ فی الحال ہمارے پاس ایسا کوئی پروگرام نہیں ہے جو ڈراما، موسیقی، مصوری یا رقص کے شعبے سے تعلق رکھتا ہو۔

سوال: کیا تعلیمی نظام میں اصلاحات کے لیے بھی کچھ اہم سفارشات پیش کی گئی ہیں؟

جواب: شانتا سنہا کی قیادت میں نیشنل فوکس گروپ (NFG) نے ریاستوں میں پنچایتی راج کی سطح سے لے کر اعلیٰ سطح تک تعلیمی ڈھانچے میں اصلاحات کے لیے چند اہم سفارشات پیش کی ہیں۔ این۔سی۔ای۔آر۔ٹی تمام ریاستوں کو اس بات پر آمادہ کر رہی ہے کہ وہ ان سفارشات پر عمل کریں تاکہ تعلیمی نظام کو زیادہ موثر بنایا جا سکے، خاص طور سے سماج کے ان طبقوں کے درمیان جن کی تعلیمی حالت بہتر نہیں ہے۔ اس میں دلت، قبائلی لڑکیاں اور معذور بچے شامل ہیں۔

سوال: قومی نصاب برائے تعلیم کے ڈھانچے پر نظر ثانی (NCIR) کا کام کب تک مکمل ہو جائے گا؟

جواب: مئی میں مکمل پیکیج قومی مشاورتی بورڈ برائے تعلیم کی میٹنگ میں پیش کر دیا گیا ہے اور جیسے ہی اسے مجلس منتظمہ (Executive Committee) اور مجلس عامہ (General Committee) کی منظوری ملے گی، ہم درجہ اول، سوم، چہارم، نہم، یازدہم (گیارھویں) کے لیے نیا نصاب جاری کر کے اس پر عمل درآمد کریں گے۔

سوال: گریڈنگ سسٹم کے متعلق این۔سی۔ای۔آر۔ٹی کا کیا نظریہ ہے؟

جواب: سی۔بی۔ایس۔ای پہلے ہی سے ہمارے ساتھ کام کر رہی ہے اور ہم سوالات کے انداز کو بہتر بنانے، اندرونی جانچ پر عمل درآمد کرنے اور مارکنگ سسٹم کے ساتھ گریڈنگ سسٹم کو متعارف کرنے کے لیے آپس میں تعاون کر سکتے ہیں۔ تعلیمی اصلاحات کی شروعات پہلے عملی نکات کی تشخیص سے ہونی چاہیے اور پھر دھیرے دھیرے عملی نکات کے دائرۂ عمل کی توسیع کی جانی چاہیے۔

سوال: کیا اس عمل میں لڑکیوں کے مسائل اور نسوانی اقتدار بخشی (Empowerment) کو بھی شامل کیا جائے گا۔

جواب: چھوٹے بچوں کی تعلیم سے متعلق ایک نیشنل فوکس گروپ (NFG) ہے جس کی صدر ینا سوامی ناتھن ہیں۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ بیشتر لڑکیاں اپنی ابتدائی تعلیم کے دوران پڑھائی پر توجہ مرکوز نہیں کر پاتیں کیونکہ انھیں اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کی دیکھ بھال بھی کرنی ہوتی ہے۔ اگر ہمارے پاس چھوٹے بچوں کی تعلیم کے حوالے سے ایک معتبر نظام ہو جہاں ایسے بچوں کی دیکھ بھال کی جا سکے جو ابھی اسکول جانے کے قابل نہیں ہیں تب اس طرح لڑکیوں کے سر سے ایسے بچوں کی دیکھ بھال کرنے کی ذمے داری کو کم کیا جا سکتا ہے۔ ہم لوگ صنفیاتی حساسیت (Gender Sensitivity) کو فروغ دے کر سماج کے ایک بڑے طبقے کو گھٹتے ہوئے جنسی تناسب کے خطرے سے بھی آگاہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

سوال: عام طور پر نصابی کتب کسی مضمون میں دسترس حاصل کرنے کا موقع فراہم کرتی ہیں اور پھر اس کے بعد حل طلب مسائل کی طرف توجہ مبذول کراتی ہیں۔ کیا این۔سی۔ای۔آر۔ٹی کی کتابیں یہ موقع فراہم کرتی ہیں؟

جواب: اعلیٰ معیار کی کتابوں کی کبھی بھی قلت نہیں رہی ہے۔ مسئلہ ہمارے کسی مضمون تک رسائی حاصل کرنے کے طریقۂ کار کا ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ نصابی کتب کو جامع ہونا چاہیے اور ان سے بچوں کی ذہنیت کی ترجمانی ہونی چاہیے۔ لیکن بدقسمتی سے نصابی کتابیں ایسا تاثر قائم

کرتی ہیں جیسے کہ وہ انسائیکلوپیڈیا ہوں۔ یشپال کمیٹی (1993) نے کہا تھا کہ ''ہمارے نظام میں بچوں کو بہت کچھ پڑھایا جاتا ہے لیکن اس سے سیکھنے کا موقع بہت کم ملتا ہے۔''

مزید یہ کہ اسکول اور کالج کی تعلیم میں کئی چیزیں مشترک ہیں۔ جب ایک استاد بی ایس سی سال اول کے طلبہ کو کچھ پڑھاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اسے پہلے ہی اسکول میں پڑھ چکے ہیں۔ ان کے کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ان اصطلاحات سے واقف ہیں لیکن وہ شاید ہی ان تصورات کو سمجھتے ہوں۔ اس طرح کی سطحی واقفیت آموزشی عمل کے لیے نقصان دہ ہے۔ نصابی کتابوں میں نئی اطلاعاتی ٹیکنالوجی کو بھی شامل کرنے کی ضرورت ہے۔

سوال: کیا وجہ ہے کہ سائنس اور ریاضی سے طلبہ کی دلچسپی دھیرے دھیرے کم ہو رہی ہے؟

جواب: دلچسپی کو ہونے کا سوال سن کر مجھے یقیناً افسوس ہوتا ہے کیونکہ ہندوستان ایک ایسا ملک رہا ہے جہاں نوجوان طبقہ سائنس اور ریاضی میں نئی چیزوں کو تلاش کرنے میں کافی دلچسپی رکھتا تھا۔ ہمارا تعلیمی نظام ایسا ہے جہاں ہم دلچسپی کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ہم سائنس اور ریاضی کو انسائیکلوپیڈیا کا تاثر دینے والی نصابی کتابوں اور ایسے تعلیمی نظام سے جہاں کوچنگ کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے، باہر نکالنے میں کامیاب ہوں گے۔

یہ ایک ایسا کام ہے، جس کے لیے سماج کے مختلف طبقوں کو ایک ساتھ آگے آنا چاہیے اور این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی کو بھی اس سلسلے میں غور و فکر کرنا چاہیے۔ تعلیم کا اہم مقصد تخلیقی صلاحیت کو پروان چڑھانا ہے اور ہمارے صدر جمہوریہ کے بقول ''تخلیقی صلاحیت میں ہی ترقی کا راز مضمر ہے۔''

سوال: این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی کے گذشتہ پانچ برسوں کو آپ کس طرح دیکھتے ہیں اور تاریخ کی کتاب کا جو مسئلہ ہے اسے آپ کس طرح حل کرنا چاہتے ہیں؟

جواب: میں چیزوں کو ان کی خصوصیات کے حوالے سے دیکھتا ہوں۔ نصاب ایسا ہونا چاہیے جو جواز پر مبنی ہو اور جو ایک معقول ضابطے کے تحت کام کرے۔ اس میں کسی نظام فکر کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ تعلیم بحث و مباحثے، غور و فکر، باہمی ربط اور معقول بنیاد پر فیصلہ کرنے کا ایک عمل ہے۔

نصاب کا مقصد محض دستاویز تیار کرنا نہیں ہے بلکہ صحیح پالیسی کو پیش کرنا ہے۔ دستاویزات

تیار کرنے میں کافی آگے ہیں لیکن جب اس پر عمل درآمد کا وقت آتا ہے تو ہمارا جوش وخروش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور یہیں ہمارے لیے مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ تعلیمی نظام کو آسان اور زیادہ لچک دار بنانے کے لیے عملی اقدام کی ضرورت ہے تاکہ بقول پروفیسر یشپال ''اسکول میں بچے کی زندگی کو مزید دلچسپ بنایا جائے۔'' اگر مقصد یہ ہے تو پھر مجھے نظریاتی ٹکراؤ کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

●●●

یشپال سے گفتگو

ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر یش پال این سی ای آر ٹی کی نیشنل اسٹیرنگ کمیٹی کے چیئر پرسن ہیں۔ موصوف سے یہ انٹرویو 'ٹائمز آف انڈیا' نئی دہلی، 2 جون 2005 کے شکریے کے ساتھ پیش خدمت ہے۔

سوال: آپ کا تعلق نیشنل چلڈرنس سائنس کانگریس سے رہا ہے۔ بچے آپ سے کس طرح کے سوالات کرتے ہیں؟

جواب: بچوں کے مشاہدے پر مبنی سوالات، نہایت دلچسپ ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک تجسس اور مزید جاننے کی خواہش ہوتی ہے۔ ایک بہترین عمل وہ ہے جب بچے سوچنا شروع کرتے ہیں اور گفتگو کرتے ہیں، یہی وہ طریقہ ہے جس سے علمی ماحول وجود میں آتا ہے۔

سوال: کیا وجہ ہے کہ ہندوستان میں سائنس تحریک آگے نہیں بڑھ رہی ہے؟

جواب: این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی کے نصاب پر نظر ثانی کی گفتگو کے دوران بہت سے ماہرین نے کہا کہ تعلیمی نظام کے ایک حصے کے طور پر ہمارے پاس نیشنل چلڈرنس سائنس کانگریس کی

طرح کا ہی ایک نظام ہونا چاہیے تا کہ بچے ماحول اور اپنے گردو پیش کے متعلق معلومات فراہم کریں۔ وہ واقفیت سے بھر پور اور کار آمد اعداد و شمار جمع کر سکتے ہیں جسے دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں اسے تعلیم کا ایک حصہ سمجھنا چاہیے جہاں زمینی سطح سے وابستہ افراد مسائل سے قریب اور ہم آہنگ ہوتے ہیں، مسائل سے موافقت پیدا کرتے ہیں اور تب ہم اس کے متعلق کچھ کر سکتے ہیں۔

سوال: آپ تدریسی و آموزشی عمل سے 1960 کی دہائی میں وابستہ ہوئے۔ کیا آپ ان تجربات و مشاہدات پر روشنی ڈالیں گے جو اس طویل مدت میں آپ کو حاصل ہوئے؟

جواب: میرا تجربہ یہ ہے کہ محض سرکاری احکامات کی وجہ سے چیزیں وجود میں نہیں آتیں۔ مثال کے طور پر ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈ امینٹل ریسرچ (TIFR) کے انیل سد گوپال 1965-66 میں مدھیہ پردیش کے ایک گاؤں میں گئے اور وہاں پر دیہی بچوں کے لیے ایک اسکول شروع کیا۔ آموزشی عمل جسے انیل نے متعارف کرایا وہ روایتی تعلیم سے مختلف اور نہایت دلچسپ تھا۔ ٹی۔ آئی۔ ایف۔ آر میں سے بہت سارے لوگ انیل کے خیالات سے مسرور تھے۔

میں نے ایک پبلک اسکول کے ساتھ کام کرنا شروع کیا اور پھر ممبئی میونسپل اسکولوں میں کام کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہر جگہ ہمیں نصاب میں تھوڑی بہت تبدیلی کرنی ہوگی۔ انیل نے بہت سارے دوسرے کام کیے اور یہ اکلویہ (Ekalavya) کی شکل میں سامنے آیا جو کہ ایک اہم تحریک ہے جس کے تحت ہزاروں اسکول آموزش کے نئے طریقوں پر کام کر رہے ہیں۔ لیکن مسئلہ اس وقت کھڑا ہوتا ہے جب آپ ان کے آموزشی طریقے کا موازنہ امتحان کے طور طریقے سے کرنے لگتے ہیں۔

سوال: تعلیم کو مصنوعی سیارچے کے ذریعے متعارف کرانے میں آپ کا کلیدی کردار ہے جو کہ بہت زیادہ کامیاب نہیں رہا۔ آپ کا کیا ردعمل ہے؟

جواب: میں نے یہ تجربہ کیا تا کہ کوشش کروں اور یہ دیکھوں کہ کیا لوگوں کو سیارچے کے ذریعے تعلیم یافتہ بنایا جا سکتا ہے۔ میں نے سیکھا کہ اس کام کے لیے یگانگت اور عالم گیریت دونوں کو

اکٹھا کرنا ضروری ہے، اس لیے ہم نے اس کے لیے ایک ماڈل تیار کیا جس میں لگانگت اور عالم گیریت کے نقطۂ اتصال کے لیے چھوٹے ٹرانسمٹر سیارچے سے وابستہ تھے۔ اس طرح کی کوششوں کو سماج میں زندہ رکھنا نہایت ضروری ہے۔

سوال: عصر حاضر میں ریاضی اور تعلیمی بوجھ کو کم کرنے کے لیے جو بحث چل رہی ہے۔ اس کے لیے کیا اقدامات کیے جارہے ہیں؟

جواب: ہم لوگ اس بات پر غور وفکر کررہے ہیں کہ کس طرح ریاضی پڑھائی جائے کہ بچے اس میں دلچسپی لے سکیں۔ مزید ہم سی۔بی۔ایس۔سی اور دوسرے اداروں کے ساتھ مشورہ کررہے ہیں کہ کس طرح تعلیمی بوجھ کے مسئلے کو حل کیا جائے۔ جلد بازی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جب آئی آئی ٹی کا ایک پروفیسر تین گھنٹے میں ایک پرچہ حل نہیں کرسکتا تو پھر ایک بچے سے یہ توقع کیوں کی جائے کہ وہ اسے تین گھنٹے میں حل کرے۔

سوال: جو نصاب تیار ہو رہا ہے آپ اسے کس طرح دیکھتے ہیں؟

جواب: مجھے امید ہے کہ یہ فرسودہ بیانات کا مجموعہ نہیں ہوگا اور نہ اس میں پچھلی باتیں دہرائی جائیں گی۔ تعلیم ایسی ہونی چاہیے کہ بہت ساری چیزیں نئی سمت میں گامزن ہوسکیں۔

سوال: بچے یشپال سے اتنی محبت کیوں کرتے ہیں؟

جواب: بچے مجھ میں اپنے کو دیکھتے ہیں اور میں ان میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں۔ علاوہ ازیں میری جملہ عملی کوششیں سب کو ساتھ ساتھ لے کر چلتی رہتی ہیں اور محض لفظی بازی گری تک محدود نہیں رہی ہیں۔

•••

شاعری

شہریار سے گفتگو(۱)

پروفیسر شہریار نے گیان پیٹھ ایوارڈ 2008 کے لیے اپنے نام کے اعلان کے بعد جو پہلا انٹرویو کسی اردو جریدے کو دیا وہ یہاں پیشِ خدمت ہے۔ یہ انٹرویو سعودی عرب میں دورانِ سفر مختلف نشستوں میں کیا گیا۔

سوال: محترم شہریار صاحب! پہلے تو اس بے حد گراں مایہ اور مؤقر ادبی ایوارڈ گیان پیٹھ کے لیے دلی مبارک باد اور تحسین وتوقیر قبول فرمائیے۔ یہ ہماری ادبی برادری کے لیے باعثِ صد افتخار ومسرت ہے۔ یہ ہمارے لیے سوا خوش نصیبی کا محل ہے کہ گیان پیٹھ ایوارڈ کی تفویض کی اطلاع عین اس وقت ملی ہے جب آپ بہ نفسِ نفیس ہمارے ساتھ جدہ اور ریاض (سعودی عرب) میں ہندوستانی سفارت خانے کے زیرِ اہتمام منعقدہ آل انڈیا مشاعروں میں شرکت کے لیے تشریف لائے ہوئے ہیں۔ اس طرح ہم اس دل افزا و ذہن پرور خبر کے پہلے چشم دید سامع ہیں، تو آیئے اس انٹرویو کا آغاز اسی سوال سے کرتے ہیں کہ اس اعلیٰ پائے کے ادبی ایوارڈ کو حاصل کرتے ہوئے آپ دلی طور پر کیسا محسوس کر رہے ہیں۔

جواب: ظاہر ہے مجھے بہت خوشی ہوئی، سطحی اور ظاہری خوشی نہیں، ایک قلبی و ذہنی طمانیت کا احساس! اس سے پہلے بھی مجھے کئی ایوارڈز مل چکے ہیں۔ وہ بھی میرے لیے خوشی کا باعث تھے۔ اس لیے بھی کہ میں نے کسی بھی ایوارڈ کے لیے کوئی شعوری یا عملی تگ و دو نہیں کی، نہ ان میں کسی رسوخ ورسائی کو دخل رہا۔ میں اپنی تخلیقی ریاضت میں منہمک رہا اور مجھے مختلف مراحل پر ان کا ثمر ملتا رہا۔ ہاں اپنے تخلیقی مدارج میں میں نے ان لوگوں کو ضرور ملحوظ رکھا جو میری شاعری کو پسند کرتے تھے جو مجھ سے توقع رکھتے تھے اور مجھے بے لاگ تحسین وتنقید سے نوازتے تھے۔

سوال: اپنے آغاز سخن کے بارے میں کچھ بتائیں۔

جواب: اس کا کوئی معینہ اندازہ نہیں تھا۔ ذاتی حالات کی بنا پر گھر سے الگ رہنا پڑا۔ زیادہ تر عرصہ خلیل الرحمٰن اعظمی کے ساتھ گزرا۔ اسی عرصے میں ادبی رجحان پیدا ہوا۔ 1958 میں شاعری شروع کی۔ قارئین اور اہلِ ادب کی توجہ مجھے شروع ہی سے ملنے لگی۔ ہندو پاک کے رسائل میں کلام کی اشاعت ہونے لگی۔ 1965 میں پہلا مجموعہ ''اسمِ اعظم'' شائع ہوا۔ اوزان وبحور میں نے باقاعدہ نہیں سیکھے۔ لیکن بعض شاعروں کی طرح عروض نہ جاننے پر میں کوئی فخر بھی نہیں کرتا، بلکہ سیکھنا چاہتا تھا۔ ایم اے کے امتحان میں ایک پرچہ جس میں بطور مضمون صوتیات یا شعریات کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا، میں نے شعریات اختیار کیا تھا۔

سوال: آپ نے غزلیں اور نظمیں تقریباً یکساں تعداد میں کہی ہیں پابند، آزاد اور نثری نظمیں بھی، تو آپ نثری نظم سے کس حد تک متفق ہیں؟

جواب: نثری نظم کہنے کا حق اسے ہے، جو پابند یا آزاد نظم کہنے پر قدرت رکھتا ہو، یہ ہیئت محض سہل نگاری کا پروانہ نہیں ہے۔ بغیر کسی بحر کی موجودگی کے ایک نیم مترنم داخلی آہنگ وترتیب کو قائم رکھنا یوں کہ وہ کاملاً نظم معلوم ہو، نثر پارہ نہ معلوم ہو، اس فارم کا چیلنج ہے اور یہی اس کا تخلیقی جواز بھی ہے، میں نے نثری نظمیں کم کم کہی ہیں۔ 'ساتواں در' میں کچھ نثری نظمیں ہیں، ادھر گزشتہ چند برسوں میں بھی نثری نظمیں ہوئی ہیں، ہاں البتہ آزاد غزل سے میں متفق نہیں ہوں، خود مظہر امام نے جو اس صنف کے بانی کہلاتے ہیں، اسے آگے نہیں بڑھایا، بعض دیگر شعرا نے بھی اس باب میں کوئی زیادہ پیش رفت نہیں کی، یہ صنف پسندیدہ نہ ہو سکی۔

سوال: ڈاکٹر محمد حسن نے لکھا ہے کہ شہریار غزل کے آرٹ سے ہٹ کر نظم کہتے ہیں اور ڈاکٹر عتیق اللہ کا خیال ہے کہ شہریار کی غزل کی تربیت نظم نے کی ہے، آپ اس تعلق سے کچھ وضاحت کرنا چاہیں گے۔

جواب: ساز صاحب! غزل کا پیرایہ اور طریقۂ اظہار نظم سے مختلف ہے، ڈکشن کی کسی حد تک مماثلت ہوسکتی ہے، لیکن ان فریب ناک پہلوؤں کے مغالطے میں نہ پڑنا چاہیے، میں جب تخلیقی ساعتوں میں ہوتا ہوں تو یہ کوئی طے شدہ منصوبہ نہیں ہوتا کہ میں غزل کہوں گا یا نظم۔ خیال، احساس اور موضوع اپنا قالب خود اختیار کر لیتے ہیں اور میں اس قالب کی مناسبت سے پیراہن تراشتا ہوں۔ غزل میں موسیقیت از خود ہی ہوتی ہے۔ میں نظم میں بھی غنائیت کا خیال رکھتا ہوں۔ غیر غنائی شعری اظہار مجھے نہیں پسند آتا۔ اگر نظم صوتی و معنوی طور پر Compact نہ ہو تو اطمینان نہیں ہوتا۔ اسی طرح وہ شاعری جو بہ آسانی نثر بن سکے، میری نظر میں کمزور شاعری ہے، جو ترسیل کی سکت تو رکھتی ہے، اظہار کی وقعت نہیں رکھتی، خالص بیانیہ شاعری بھی مجھے زیادہ پسند نہیں آتی ہے۔

سوال: آپ اپنے معاصر شعرا میں کن کو پسند کرتے ہیں؟ موجودہ اردو شاعری کے اجتماعی کردار کے بارے میں آپ کا کیا تاثر ہے؟

جواب: اپنے ہم عصروں کو میں نے غور سے پڑھا ہے۔ ہم لوگوں میں زیادہ اختلاف نہیں تھا، میری کسی کے ساتھ کوئی چشمک بھی نہیں رہی۔ اپنے ہم عصروں میں احمد مشتاق مجھے زیادہ اچھے لگتے ہیں، مجھے وہ ہم عصر زیادہ پسند ہیں جو مجھ سے مختلف ہیں، محمد علوی، ندا فاضلی، منیر نیازی، احمد مشتاق، اور بھی کچھ اہم نام ہیں، جہاں تک اجتماعی عصری شعری کردار کا معاملہ ہے، اچھے ادب اور کم اچھے ادب کو عملی طور پر منقسم نہیں کیا جانا چاہیے، جو کوئی لکھ رہا ہے اسے پیدا ہونے کا حق ہے، جو اہم ہے وہ باقی رہ جائے گا، بقیہ اپنے آپ ہی منسوخ ہو جائے گا، آپ اپنی پسند یا ناپسند کی تعمیم نہ کیجیے، اسے جنرلائز نہ کیجیے، بعض غیر اہم فنکار ادبی پروسس کی اجتماعی افزائش میں کھاد یا خام مواد کا کام کرتے ہیں۔

اس ضمن میں ایک اہم بات میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ جس فن کار کے ہاں صلاحیت اور امکانات قوی ہوتے ہیں، اس کا فن پارہ ایک طرح آزاد بھی ہوتا ہے، یعنی اس فن پارے کے ساتھ اس فن کار کی معروضی شناخت ضروری نہیں ہوتی۔ اہم شاعری اپنے عہد کے حصاروں میں قید ہو کر نہیں رہ جاتی بلکہ آئندہ زمانوں کی کھلی فضاؤں میں بھی پرواز کرتی ہے۔ کئی پرانے فن پارے آج بھی Relevant ہیں، کئی نئی تحریریں عہد حاضر کے اندر بھی دم توڑ چکی ہیں۔

سوال: اسی سے متصل ایک سوال یہ ہے کہ آپ کے بعد کی پیڑھی سے آپ کی کیا توقعات ہیں؟

جواب: مجھے اپنے بعد کی پیڑھی سے توقع ہے، میں پرامید ہوں۔ لیکن مجھے بارہا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نئی نسل خود اپنے بارے میں سنجیدہ نہیں ہے، ان میں ارتکاز نہیں ہے، اب شاعری مجموعی طور پر اتنی اچھی تو ہو ہی چکی ہے کہ بڑے شعر کہنا مشکل ہے۔ ایسے میں اچھے شعر کہنا تو اور بھی زیادہ مشکل ہے، آج کا منظر نامہ زیادہ پیچیدہ ہے۔ نئی نسل کو اس اعتبار سے مختلف ہونا چاہیے، اگر نئے لوگ وہی کہہ رہے ہیں جو ہم لوگ کہہ چکے ہیں تو کیا بات ہوئی؟ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ نئے لوگ ہم سے بہتر شعر کہہ رہے ہیں یا نہیں۔ مگر اس تسلسل میں ان کا مختلف ہونا ضروری ہے۔

سوال: آپ کی پیش رو یعنی ترقی پسند شاعری کے بارے میں آپ کی رائے؟

جواب: میں نے ترقی پسندانہ شاعری نہیں کی، مگر میں ترقی پسندی کے خلاف بھی نہیں رہا۔ پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن (PWA) کا ممبر بھی رہا، جس طرح میں جدید شاعروں اختر الایمان، میراجی، ن م راشد، منیر نیازی، عزیز حامد مدنی وغیرہ کو پسند کرتا ہوں، اسی شدت سے ترقی پسند شاعر فیض، مخدوم، مجروح بھی مجھے محبوب ہیں۔ جوش و فراق بھی بہت پسندیدہ ہیں۔ کسی بھی دور کا نمائندہ ادب زندہ رہتا ہے، اس دور کی تنقید آگے چل کر رد ہو سکتی ہے۔ ادب رد نہیں ہوتا۔

سوال: یہ جو کہا جاتا ہے کہ ترقی پسندوں کے یہاں زندگی کے اقدار واضح طور پر سیاہ و سفید کے تضاد میں منقسم تھے، ان کے یہاں سرمئی (Grey) شیڈس نہیں تھے۔

جواب: یہ واضح خانہ بندی دراصل ترقی پسند تنقید ہی کی سہولت تھی ورنہ ترقی پسند ادب میں ایک حد تک سفید و سیاہ کی وضاحت کے علاوہ کئی جگہ سرمئی اور مخلوط رنگ بہ آسانی دکھائی دیتے ہیں۔ فیض و جذبی ہی کے یہاں نہیں بلکہ خود سردار جعفری تک کے یہاں۔

سوال: ترقی پسندانہ آب و رنگ کا نہ سہی، مگر آپ کے یہاں زندگی کے تئیں ایک مثبت و رجائی رویہ ہی ہے۔ یعنی جدید صنعتی شہروں کی تنہائی، بے سمتی، یاسیت، اجنبیت جیسے علائق کے باوجود ایک رجائی میلان جیسے نظم 'زیست کا حاصل' یا 'وہ کون تھا' یا کئی اور نظموں کی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

جواب:... زندگی یقیناً بے معنی نہیں ہے، زندگی کی صالح اقدار کی شکست و ریخت جو ہمیں معاشرے میں نظر آتی ہے، جس سے تنہائی، بے چہرگی، یاس اور لایعنیت کا استفہامیہ پیدا ہوتا ہے وہ سب ایک کرب کا احساس ہے۔ میری شاعری میں اس صورت حال کا اظہار محض اعتراف شکست یا اس سے کسی قسم کی ذہنی لذت کوشی ہرگز نہیں ہے۔ اس کرب کے اظہار میں ایک باطنی احتجاج اور نا قبولیت کا عنصر ہے۔ یہ احتجاج ترقی پسندوں کا سا بلند آہنگ نہ سہی، Out ward نہ سہی، مگر یہ ایک حساس اور باشعور فرد کے شدید دکھی ہونے کا بیان ہے۔ یہ احتجاج میں دکھ نہیں بلکہ دکھ میں احتجاج ہے۔

سوال: آپ کی شاعری میں جذبے اور احساس کی شدت، اظہار میں ایک اعتدال، ٹھہراؤ اور Moderation کے ساتھ ڈھلتی ہے، یہ سوال شاید کچھ غیر مرتکز معلوم ہوتے ہیں، مگر آپ اس نکتے کی وضاحت ضرور کر سکتے تھے۔

جواب: میرے یہاں اکثر ذات کو غیر ذات Personal کو Impersonal سے مربوط کرنے کا عمل ہے، اس لیے آپ کو میری شاعری میں خود ترحمی یا سطحی جذباتیت نہیں ملے گی۔

سوال: قطع کلام کے لیے معذرت خواہ ہوں، مگر جیسے فیض کا شعر ہے:

اگر شرر ہے تو بھڑکے، جو پھول ہے تو کھلے
طرح طرح کی طلب تیرے رنگِ لب سے ہے

یہ خیال آپ کے یہاں یوں متوازن ہوتا ہے:

دل ہے تو دھڑکنے کا بہانہ کوئی ڈھونڈے
پتھر کی طرح بے حس و بے جان سا کیوں ہے

یا فیض ہی کے اس شعر:

اک فرصتِ گناہ ملی، وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

کے موازنے میں آپ کا یہ اعتدال آمیز شعر:

گھر کی تعمیر تصور ہی میں ہو سکتی ہے
اپنے نقشے کے مطابق یہ زمیں کچھ کم ہے

جواب: یہ عمل دراصل میرے یہاں فرد اور سماج کے مابین شخصی ترحم کو لاشخصی حقائق کے ادراک کے ساتھ متوازن کرنے سے عبارت ہے۔ ہر شخصی سانحہ ایک غیر شخصی تجربہ بھی ہوتا ہے اور بسا اوقات خود ایک معروضی حقیقت شخصی واردات بھی بن جاتی ہے۔ مثلاً:

تنہائی کی یہ کون سی منزل ہے رفیقو
تا حد نظر ایک بیابان سا کیوں ہے

یا یہ شعر:

مگر اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے
خلا میں اک نیا چہرہ ابھاریں

جو تنہائی کو شکل دینے کا ایک تخلیقی مطالبہ ہے۔

سوال: اگر میں صحیح تفہیم کر سکا ہوں تو اس کی مثال آپ کی نظم 'لازوال سکوت' سے بھی دی جا سکتی ہے، جس میں زندگی کے بہت سارے جاری عوامل کو نیچر کی حرکات و سکنات کے علامتی پیرائے میں بیان کیا گیا ہے اور پھر یہ نظم اپنے کلائمکس میں ایک موڑ اختیار کرتی ہوئی وہاں پہنچتی ہے، جہاں شاعر کی آنکھ کھل جاتی ہے اور اس کی نظر سرہانے رکھے ہوئے روزنامے کی سرخی پر پڑتی ہے، گویا نظم Abstract سے Concrete کی طرف سفر کر جاتی ہے۔ میں نے اس نظم کا حوالہ یوں بھی دیا کہ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ ابہام و رمزیت کو کس حد تک برتنا پسند کرتے ہیں؟

جواب: بیان اور اخفا Said اور Unsaid کے درمیان ہر فن کار کو ایک اپنا تخلیقی فیصلہ کرنا ہوتا ہے، وہ ابہام کو وہیں تک برتے، جہاں تک وہ تخلیقی سطح پر ابہام کو Afford کر سکے، ابہام یا

رمز کا حسن ایہام و اہمال کے پردوں میں گم نہ ہو جائے، ایک نمائندہ قاری فن پارے کی کلیدی معنویت یا اس کے اطراف کی معنوی جہات تک بخوبی پہنچ سکے، نظم کی اکائی بھی مجروح نہ ہو۔ میری ایک نظم میں پہاڑی مقام پر ہونے والی ایک چوٹی کی سیاسی کانفرنس کے ماجرے کو اشارتی و جمالیاتی طرز میں ابھارتے ہوئے کلائمکس میں اس کانفرنس کی گفتگو کی لاحاصلی اور اسے صیغۂ راز میں رکھے جانے کو یوں اخفائی وضاحت تک لا کر چھوڑا گیا ہے کہ:

صفر تلک درجۂ حرارت پہنچ چکا تھا

مزید تفصیل راز میں ہے یا یہ رمزیہ شعر ملاحظہ کیجیے جس میں ایک ابلاغ مضمر ہے، جو لوگوں کے بارے میں ہے، جو سیاسی ہیں یا مذہبی ہیں یا ادبی ہیں، یا زندگی کے کسی بھی شعبے میں کام کر رہے ہیں، جو دکھی ہیں مگر اپنے دکھ کو خبر نہیں بننے دیتے۔

رات اپنے پر نہ کھولے تو جھلس جائے زمیں   اس سے کیا مطلب ہے میرا یہ بیاں ہو گا نہیں

سوال: یعنی اگر موضوع کرخت و سنگلاخ بھی ہو تو آپ اس کی ترسیل جمالیاتی آب و رنگ ہی میں کرنا پسند کرتے ہیں؟

جواب: جمالیات تو فنونِ لطیفہ کی قدرِ اول ہے۔ تخلیقِ فن تخلیقِ حسن ہی ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ جمالیات کے پیمانے عہد بہ عہد بدلتے ہیں کھردرے پن کی بھی اپنی جمالیات ہوتی ہے۔ گلابی، نیلے سبز رنگوں ہی کا نہیں، بھورے، سرمئی اور مٹیلے رنگوں کا بھی اپنا جمال ہوتا ہے، مگر ایک جمالیاتی تناسب تو بہر حال ناگزیر ہے۔

یہاں اس سے پہلے والے سوال کے بارے میں جو آپ نے ابہام کے تعلق سے کہا تھا، مزید یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ابہام کو شاعر کا عجز نہیں بلکہ حسن ہونا چاہیے۔ اس طرح کہ تخلیق کار خود بھی ایک تحیر سے گزرے اور یہی تحیر قاری کو بھی ملے۔ یہ تحیر چاہے لفظ میں مضمر ہو چاہے، مصرعے میں، چاہے بین السطور میں ہو۔ مثلاً غالب کے یہ اشعار دیکھیے:

ابن مریم ہوا کرے کوئی   میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے   اب کسے رہنما کرے کوئی

یہاں یہ بھی برسبیل تذکرہ کہتا چلوں کہ غالب کی ساری شاعری شخصی طور پر خود مکتفی ہے، وہ زمانہ بھی کچھ اس طرز کی شاعری کا تھا۔ غالب اپنے خیال کی تعمیم نہیں کرتے۔ اسے جنرلائز generalise نہیں کرتے۔ اس کے برخلاف اقبال جو اتنے ہی بڑے فن کار ہیں اپنے افکار کو جنرلائز کرتے ہیں کہ ان کے دور میں شاعری کی سماجی و اخلاقی معنویت فائق ہو چکی تھی۔ ابلاغ و ترسیل کے خطوط بھی عہد بہ عہد بدلتے ہیں۔

سوال: کیا شاعری میں شاعر کے موقف حیات یا نظریے کے عمل دخل کے آپ قائل ہیں؟

جواب: ایک بات تو یہ کہ نظریہ شاعری کے اچھے یا برے ہونے کی کوئی کسوٹی نہیں ہے۔ ایقان کے تحت بھی اچھی بری شاعری کی مثالیں ہیں اور الحاد کے ضمن میں بھی، یہی بات دیگر نظریات کے معاملے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

فن کار کی زندگی اور اس کا فن دراصل دو متوازی خطوط ہوتے ہیں، ریل کی پٹریوں کی طرح دونوں کا متوازی طور پر ساتھ ساتھ چلنا اشد ضروری ہے۔ مگر ان کا آپس میں مل جانا بالکل غیر ضروری ہے بلکہ فن کے لیے تباہ کن بھی ہو سکتا ہے۔ دونوں پٹریوں کا مل جانا شکستگی کا ہی باعث ہوگا۔

سوال: آپ تنقید بھی لکھتے ہیں۔ ان دنوں تنقید کے جو خانے بن گئے ہیں۔ اطلاقی تنقید، اکتشافی تنقید، تاثراتی تنقید وغیرہ وغیرہ تو آپ ان سے کہاں تک اتفاق کرتے ہیں؟

جواب: میں بحیثیت لکچرار اور پروفیسر فکشن بھی پڑھاتا تھا اور تنقید بھی، ظاہر ہے پڑھانے کے لیے مسلسل ہوم ورک بھی کرنا پڑتا تھا۔ میرے تنقیدی مضامین میں محنت و ریاضت کا بڑا رول ہے۔ تنقید کی اہمیت یہ ہے کہ مختلف زمانوں میں ادب کے ابواب کھولنے کے لیے مختلف کنجیاں درکار ہوتی ہیں۔ پھر ایک ہی ادب پارے کو مختلف زاویوں سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ آپ یہ دیکھیے کہ جیسے جیسے انسان کے علم میں اضافہ ہوتا گیا، ویسے ویسے علوم کے شعبے اور خانے بھی بڑھتے گئے یہ تمیز و تقسیم علوم کی جزیاتی تفہیم کے لیے ناگزیر تھی۔ اسی طرح جب تنقید کے دائرے پھیلتے گئے اور اس کے شعبے وسیع ہوتے گئے تو تنقید کے مختلف زاویے اور ضابطے بھی مقرر کیے گئے اور ان کو اصطلاحی نام بھی دیے گئے۔ تنقید کے ضابطے بھی روز بہ

روز بدلتے رہتے ہیں۔ میں نے آگے بھی کہا ہے کہ ادب رد نہیں ہوتا۔ تنقید رد ہو سکتی ہے۔ ادب کے مطالعے کے اپروچ بھی البتہ عہد بہ عہد بدلتے ہیں۔ مطالعے کی تبدیلی اس بات کا ثبوت ہے کہ ادب تبدیل ہو رہا ہے۔ یعنی ادب پیدا ہو رہا ہے۔

سوال: آپ نے چند فلموں کے لیے بہت ہی خوبصورت گیت لکھے جو غزل کے فارم میں تھے اور جو بے حد مقبول بھی ہوئے۔ مثلاً فلم، امراؤ جان، گمن، انجمن وغیرہ کے گیت۔ مگر یہ سلسلہ صرف تین برس 1979 تا 1981 تک ہی جاری رہا۔ آپ نے اسے آگے کیوں نہیں بڑھایا۔

جواب: مظفر علی نے میرے کچھ شعر، عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو، سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے، وغیرہ سن رکھے تھے جو انھیں پسند بھی بہت آئے تھے، انھوں نے خود ہی مجھے اپنی فلم 'گمن' کے لیے نغمہ نگاری کی پیش کش کی تھی۔ امراؤ جان کے کردار کو فلمانے کا مشورہ ایک طرح سے میرا ہی تھا، جو مظفر علی صاحب نے بخوش قبول کر لیا۔ بڑی حد تک میری غزلوں ہی کی مناسبت سے امراؤ جان کا کردار تشکیل بھی کیا گیا تھا۔ کچھ شعر اور کچھ مصرعے میرے پہلے ہی سے کہے ہوئے تھے۔ پھر کچھ تبدیلیاں اور اضافے کیے۔

اس کے بعد فلم 'انجمن' ریلیز ہوئی جس کے لیے لیش چوپڑہ صاحب نے خود ہی مجھے آفر دیا تھا۔ میرے فلمی نغمے، غزلیں ہی ہیں۔ حالانکہ تجربے کے دوران مجھے محسوس ہوا کہ میں پہلے سے ترتیب دی ہوئی دھنوں پر بھی غزل کے فارم سے ہٹ کر گیت بخوبی لکھ سکتا ہوں۔ ہاں مگر فی البدیہہ کلام موزوں کر لینا یا تک بندی کر لینا نہ میرا ہنر ہے نہ میرا امزاج۔

بچپن میں میرے والد نے مجھ سے کہا تھا ''وہ کبھی نہ کرو، جو سمجھو کہ نہ کر سکو گے'' سو میں نے فلمی نغمہ نگاری سے کنارہ اختیار کر لیا۔

ملاقاتی: پروفیسر شہریار صاحب! اس خصوصی انٹرویو کے لیے جو برادرم نصرت ظہیر صاحب کے ایما پر لیا گیا اور جس کے لیے آپ نے مدینہ منورہ کی زیارت اور ریاض کے دو روزہ قیام کے دوران مختصر مہلتوں میں اپنا وقت اور توجہ عنایت کی آپ کا نہایت شکر گزار ہوں۔ میرے لیے یہ یادگار رہے گا کہ اپنے عہد کے ایک انتہائی اہم شاعر گیان سے پیٹھ ایوارڈ کی تفویض کے موقع پر پہلا انٹرویو لینے کی سعادت میرے حصے میں آئی۔۔۔ شکریہ!

●●●

شہریار سے بات چیت (II)

سوال: عام طور پر کوئی خوبصورت یا متاثر کن واقعہ یا حادثہ شاعری کا سبب بنتا ہے۔ کیا آپ کی زندگی میں بھی ایسا ہی کچھ ہوا جس نے شاعری کی طرف آپ کی رہنمائی کی؟

جواب: نہیں، مجھے کوئی ایسا واقعہ یا حادثہ یاد نہیں ہے۔ میں نے کئی بار اس پہلو پر بھی غور کیا ہے۔ خود مجھے بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ میں شاعری کر سکتا ہوں یا میں ایک دن شاعر بھی بن جاؤں گا۔ یہ سب محض اتفاق ہے۔

سوال: لیکن کہیں سے تو آپ کو شاعری کی تحریک ملی ہوگی؟

جواب: میرے خاندان میں دور دور تک کسی کا بھی شعر و ادب سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ زیادہ تر افراد جو پولیس محکمے میں ملازم تھے۔ میری پرسنلٹی کو دیکھتے ہوئے بھی یہ سوچتے تھے کہ یہ پولیس آفیسر بنے گا۔ میرے والد صاحب کی بھی یہی خواہش تھی لیکن مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں ہاکی کا کھلاڑی تھا اور اتھلیٹ بھی تھا۔ والدین نے اسی وجہ سے میری عمر بھی کچھ زیادہ لکھوائی تھی۔ میں نے گھر والوں کی خواہش سے بغاوت کر دی۔ فاصلے پیدا ہو گئے اور مجھے گھر چھوڑ کر الگ ہونا پڑا۔ 1955 میں میں خلیل الرحمٰن اعظمی کے ساتھ

رہنے لگا اور باقی زندگی میں انھوں نے میری دیکھ بھال کی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے شاعری کا شوق ہوا اور 1958 سے میں نے باقاعدہ شعر کہنا شروع کر دیا۔

سوال: آپ کو اپنا پہلا شعر یا پہلی غزل یاد ہے؟

جواب: کچھ بھی یاد نہیں ہے۔ دراصل میں نے کبھی کسی کام کے لیے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی۔ مجھے زندگی میں ہر چیز اچانک ہی ملی ہے۔

سوال: اردو شاعری کے تین ادوار/ترقی پسند، جدیدیت اور مابعد جدیدیت پر کچھ روشنی ڈالیں؟

جواب: میں ہر نئی سوچ اور نئی تحریک کی قدر کرتا ہوں اور قدر کرنی بھی چاہیے۔ کیونکہ ہر نئی سوچ کے کچھ اسباب بھی ہوتے ہیں۔ اسے دھیان میں رکھنا بھی ضروری ہے۔ ادب میں یہ تبدیلی تنقید کی سطح پر زیادہ ہوتی ہے۔ ترقی پسند شاعری، علامہ اقبال اور دوسرے شاعروں کی شاعری سے بہت زیادہ الگ بھی نہیں تھی۔ البتہ شاعری کو پرکھنے کے جو معیار تھے وہ تھوڑے مختلف تھے۔ ان معیاروں کی روشنی میں ادب لکھا گیا۔ اچھا ادب بھی لکھا گیا اور برا ادب بھی لکھا گیا۔ پھر تبدیلی کی ضرورت محسوس کی گئی تو جدید رجحان سامنے آیا۔ اس میں بھی تنقید کی سطح پر بہت زیادہ تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ اب مابعد جدیدیت میں تنقیدی اصولوں پر بہت زیادہ زور دیا جارہا ہے۔ یعنی تنقید بہت زیادہ اہم ہوگئی ہے اور تخلیق ابھی تلاش کی جارہی ہے۔ مابعد جدیدیت کے اصولوں اور معیاروں کا اطلاق کن تخلیقات پر کیا جائے، انھیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر سامنے لایا جارہا ہے۔ جس طرح 1936 کے بعد والی شاعری کو ترقی پسند اور 1960 کے بعد والی شاعری کو جدیدیت سے جوڑا گیا، بالکل اسی طرح یہاں بھی تلاش جاری ہے۔ میری شاعری میں ایک سوشل کمیٹمنٹ ہے اور شاید اسی سبب مجھے جدید شعرا کی فہرست میں شامل کیا گیا۔

سوال: ایک طبقے کا یہ بھی کہنا ہے کہ غزل کا روایتی آہنگ جدت پسندی کی نذر ہو گیا ہے۔ کیا آپ بھی ایسا سمجھتے ہیں؟

جواب: نہیں یہ بات غلط ہے۔ مشاعروں میں بھی جدید رنگ کی شاعری سنائی جاتی ہے۔ روایتی آہنگ تبدیل ہوتے روز وشب کے ساتھ بدلا ہے۔ الفاظ تبدیل ہوتے ہیں، احساس بدلتا ہے، جذبہ بھی بدلتا ہے، یہ فطری تقاضا بھی ہے۔

سوال: آپ نے نثری نظمیں بھی لکھی ہیں، آج اردو شاعری کا ایک بڑا حلقہ نثری نظموں کی مخالفت کر رہا ہے، نثری نظموں کے متعلق آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

جواب: میں ذاتی طور پر نثری نظموں کا اعتراف کرتا ہوں اور اسے بھی ایک صنف سخن تسلیم کرتا ہوں لیکن نثری نظمیں ان شاعروں کو لکھنی چاہیے جو پابند شاعری بھی کرتے ہیں۔ میں نثری نظمیں لکھنے کا حق انھیں دیتا ہوں۔ ظاہر ہے جو موزوں شاعری پر دسترس رکھتے ہیں وہ نثری نظمیں بھی ذمے داری کے ساتھ لکھیں گے۔ جو بات موزوں شاعری میں وہ نہیں پیش کر سکتے اسے وہ نثری نظموں میں پیش کریں گے لیکن جو شعرا ایک بھی شعر موزوں نہیں کہہ سکتے انھیں نثری نظمیں بھی نہیں لکھنی چاہیے۔ میں کسی بھی تجربہ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ میں نے بھی نثری نظمیں لکھی ہیں، لیکن بہت زیادہ نہیں۔ میرے شعری مجموعے ''ساتواں در'' میں نثری نظمیں بھی شامل ہیں لیکن مجھے نثری نظمیں کہہ کر وہ اطمینان حاصل نہیں ہوا جو موزوں نظمیں لکھ کر حاصل ہوتا ہے۔

سوال: آج کی اردو شاعری پر آپ کے تاثرات جاننا چاہوں گا؟

جواب: آج اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی شاعری کا حال ایک جیسا ہی ہے۔ دیکھیے دو طرح کی شاعری ہوتی ہے۔ ایک وہ شاعری جو خوبصورت ہوتی ہے اور دنیا، ملک، معاشرے اور زندگی کے مسائل کو پیش کرتی ہے اور دوسری شاعری صرف تفریح کے لیے کی جاتی ہے۔ ایک وہ شاعری جو چھپتی ہے، ایک وہ شاعری جو سنی جاتی ہے۔ یہ بہت ہی واضح فرق ہے۔ مشاعروں اور ادبی سمیلنوں سے اردو اور ہندی شاعری کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے یہاں اتنا فرق ہو گیا ہے جو ہونا نہیں چاہیے تھا۔ سنجیدہ شاعری اور پاپولر شاعری دو اسٹریم ہو گئے ہیں۔ مشاعروں میں زیادہ تر ایسی شاعری پیش کی جاتی ہے جو صفحۂ قرطاس پر نہیں آتی۔ مشاعروں کے شاعروں کا مقصد

بھی یہ نہیں ہے۔ انھیں صرف پاپولر ہونا ہے۔ تک بندی بھی عام ہوگئی ہے۔ اچھی شاعری تو خیر بہت بڑے پیمانے پر کبھی نہیں ہوئی۔ آج بھی نہیں ہو رہی ہے۔ چھوٹے پیمانے پر ہی سہی مگر ہو ضرور رہی ہے۔

سوال: اردو شاعری نے کبھی انقلابات برپا کیے تھے مگر آج صرف مشاعروں کی حد تک محدود ہوتی جا رہی ہے؟

جواب: آج دوسرے ذرائع بھی سامنے آگئے ہیں۔ اخبار بھی موجود ہے، ٹیلی ویژن بھی ہے، ریڈیو بھی ہے۔ اب تو انٹرنیٹ بھی آگیا ہے۔ لوگ باگ حالاتِ حاضرہ سے باخبر بھی ہیں۔ آپ شاعری کے ذریعے معاشرے پر طنز کریں یا نہ کریں، لوگوں کو ہر بات کی خبر ہے۔ ہر کوئی اپنی سہولت کے حساب سے زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ ایثار، قربانی اور خلوص کا دور ختم ہو چکا ہے۔ ہر آدمی کو دنیا کی آسائش درکار ہے۔ بچوں میں بھی وہ Value System نہیں رہا کہ وہ اچھی چیزوں کو اچھے ذرائع سے حاصل کریں۔ پوری دنیا میں خرابی آئی ہے۔ اچھے لوگ بھی موجود ہیں اور برے لوگ بھی موجود ہیں۔ ویسے بھی اب شاعری سے انقلاب برپا کرنا ناممکن ہے۔ اس کے لیے دیگر ذرائع ہیں۔

سوال: ہند و پاک میں جو شاعری ہو رہی ہے اس میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟ اور زیادہ بہتر شاعری کہاں ہو رہی ہے؟

جواب: ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک میں اچھی شاعری ہو رہی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہندوستان میں اچھی شاعری ہو رہی ہے اور پاکستان میں بری۔ یا پھر پاکستان میں اچھی شاعری ہو رہی ہے اور ہندوستان میں بری۔ دونوں ملکوں میں اچھی شاعری کی جا رہی ہے۔ دراصل پاکستان میں اب مشاعروں کا کوئی سسٹم نہیں رہا۔ وہاں ہندوستان کی طرح مشاعرے نہیں ہوتے۔ کچھ مشاعرے ہوتے تھے وہ بھی اب بند ہو چکے ہیں۔ سال میں ایک آدھ بار کوئی بڑا مشاعرہ مہاجروں کے ذریعے برپا کیا جاتا تھا، اب وہ بھی نہیں ہو رہا ہے۔ پوری دنیا میں جہاں بھی مشاعروں کا انعقاد عمل میں آتا ہے اس میں پاکستان کی نمائندگی وہی شعرا کرتے ہیں جو چھپتے ہیں۔ ان کی ادبی اہمیت بھی ہوتی ہے۔ اس کے

برعکس ہمارے یہاں کے زیادہ تر وہ شعرا حصہ لیتے ہیں جن کا ادب میں کوئی مقام نہیں ہوتا ہے۔ باہر کے ممالک میں اس کی وجہ سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان میں اچھی شاعری نہیں ہو رہی ہے یا پھر بہت کم ہو رہی ہے۔ ہندوستان میں جو مشاعرے منعقد ہوتے ہیں، ان میں ناظمِ مشاعرہ پر پہلے غور کیا جاتا ہے۔ نظامت کس کی رکھی جائے؟ کتنے مزاحیہ شاعروں کو رکھا جائے؟ ترنم میں پڑھنے والے شاعر کتنے ہوں گے؟ کتنی خواتین کو رکھا جائے؟ بعدازاں دو چار شاعروں کو رکھنے پر بھی غور کیا جاتا ہے۔ ادبی شاعروں پر توجہ نہیں دی جاتی۔

سوال: مشاعرہ تو آپ بھی پڑھتے ہیں۔ مشاعرے کے اسٹیج پر جاتے وقت آپ کے احساسات کیا ہوتے ہیں؟

جواب: شروع شروع میں تکلیف ہوتی تھی۔ سچائی تو یہ بھی ہے کہ میں اس طرح کے مشاعروں میں جا کر پچھتاتا بھی تھا۔ برا بھلا بھی کہتا تھا۔ اب عادت ہوگئی ہے۔ مشاعروں سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ آپ دنیا دیکھ لیتے ہیں۔ خود میں نے دنیا کے بیس بائیس ملکوں کا دورہ کیا ہے۔ امریکہ، فرانس، کینیڈا، اٹلی، دبئی، سعودی عرب، پاکستان، بلجیم، قطر، بحرین اور دیگر کئی ممالک میں میں مشاعرے پڑھ چکا ہوں۔ مشاعروں میں دنیا کے دیگر ممالک کے شاعروں سے ملاقات کا موقع بھی ملتا ہے۔ عوام میں اردو کی مقبولیت مشاعروں کی وجہ سے بھی ہوئی ہے یہ بھی ایک سچائی ہے۔

سوال: ہندوستان میں اردو کی جو مجموعی صورتِ حال ہے، کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

جواب: جی ہاں! ہندوستان میں اردو کی مجموعی صورت حال اچھی ہے۔ 1947 میں مجھے زیادہ ہوش نہیں تھا، پھر بھی کافی ہوش تھا۔ اس وقت جو حالات تھے اس سے خدشہ تھا کہ اردو اور مسلمان دونوں کا مستقبل تاریک ہوگا لیکن ایسا ہوا نہیں۔ میں نے وہ زمانہ دیکھا ہے۔ بوڑھے مسلمانوں کے لیے ٹرینوں میں الگ سے ڈبے مخصوص تھے اور وہ پولیس والوں کی نگرانی میں سفر کرتے تھے۔ علیگڑھ میں صرف ایک ہوٹل ایسا تھا جس میں کبھی کبھار مرغ کا گوشت مل جاتا تھا۔ آج ہر ہوٹل میں گوشت ملتا ہے۔ حالات بھی ویسے نہیں ہیں۔ کچھ

علاقے بٹوارے سے قبل بھی ایسے تھے جہاں اردو کی حالت دگر گوں تھی اور آج بھی ہے۔ آج اتر پردیش میں اردو دوسری سرکاری زبان ہے مگر عام لوگوں میں اردو کے تئیں زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ بہار اور مہاراشٹر میں اردو کی صورتِ حال اچھی ہے۔ اردو میڈیم کے اسکولوں کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ دوسری ریاستوں میں بہتر صورتِ حال ہے۔ آج اردو صرف اردو والوں کے سبب سے پیچھے ہے۔ اردو والوں کو جس طرح سے دلچسپی لینی چاہیے وہ اتنی دلچسپی نہیں لے رہے ہیں۔ ہندوستان میں سرکار اردو کے فروغ کے لیے جو رقم خرچ کررہی ہے، پاکستان میں بھی اتنا پیسہ خرچ نہیں کیا جاتا۔ ہندوستان میں ہر یونیورسٹی میں اردو ڈپارٹمنٹ قائم ہے۔ اسکول اور کالج ہیں۔ اردو اکادمیاں ہیں۔ ہم ان کا صحیح استعمال نہیں کر پارہے ہیں۔ یہ بالکل ایماندارانہ بات ہے، اردو کو اب کسی سے کوئی خطرہ نہیں ہے، سوائے اردو والوں کے۔ آندھرا پردیش میں بھی اردو ترقی کر رہی ہے۔ مجموعی طور پر ہندوستان میں اردو کی صورتِ حال بری نہیں ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا صورتِ حال اور بھی بہتر ہوتی جائے گی۔ خود ان لوگوں نے جنھوں نے اردو کے ساتھ تعصب برتا ہے، انھیں اب یہ احساس ہونے لگا ہے کہ اردو ہندوستانی زبان ہے اور اس کے ساتھ ناانصافی برتی گئی ہے۔

سوال: اردو رسم الخط میں تبدیلی کے لیے بھی آوازیں اٹھائی جاتی ہیں۔ کیا اردو کا رسم الخط تبدیل کیا جانا چاہیے؟

جواب: ایسی آوازوں پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھیے لباس ہی سے آدمی کی پہچان بنتی ہے۔ اردو کی پہچان بھی اس کے رسم الخط سے ہے۔ اردو کے تمام بڑے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات دیوناگری رسم الخط میں موجود ہیں۔ اگر آپ کو اردو سے محبت ہے تو پہلے اپنے نصاب میں اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو بھی شامل کیجیے۔ اردو ایک زندہ اور متحرک زبان ہے۔ میں اردو رسم الخط میں تبدیلی کے خلاف ہوں۔

سوال: آپ کی فلمی شاعری کے بارے میں بھی گفتگو ہونا ضروری ہے۔ کیا فلموں میں لکھنے کا موقع بھی محض اتفاق تھا یا پھر آپ نے باقاعدہ کوئی پلاننگ کی تھی؟

جواب: میری زندگی میں سب کچھ اچانک ہی ہوا ہے۔ میں نے کوئی بھی کام پلاننگ کے تحت نہیں کیا۔ مظفر علی سے میرے مراسم تھے۔ انھیں مصوری کا شوق تھا۔ انھوں نے جب فلم ''گمن'' کا منصوبہ تیار کیا اور مجھ سے اس میں گیت لکھنے کی فرمائش کی، میں راضی ہوگیا۔ ''گمن'' میں میری دو غزلیں شامل تھیں۔ ''سینے میں جلن، آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے'' اور ''عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو''۔

بعد از اں مظفر علی نے لکھنؤ کے ماحول پر فلم بنانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں چونکہ فکشن پڑھ رہا تھا اس لیے میں نے انھیں ''امراؤ جان ادا'' بنانے کا مشورہ دیا۔ ''امراؤ جان'' میں میرے پانچ گیت شامل تھے۔ اس فلم کے کئی مناظر میں میرے اشعار بھی موجود ہیں۔ یش چوپڑہ کی فلم ''فاصلے'' میں بھی میرے گیت شامل تھے۔ مظفر علی کی فلم ''انجمن'' کے لیے بھی میں نے گیت لکھے ہیں۔ ''دامن'' اور ''زونی'' نامی دو فلمیں تکمیل کے مرحلے تک نہیں پہنچ سکیں۔

•••

شہر یار سے گفتگو (III)

سوال: شہریار صاحب آپ نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ آپ خود کو دہراتے نہیں ہیں اور اپنے چاہنے والوں اور پڑھنے والوں کو مایوس کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اگر آپ کو کبھی ایسا محسوس ہو کہ آپ اپنے چاہنے والوں کی توقعات پوری کرنے کی کوشش میں خود اپنی توقعات پر پورے نہ اترے ہوں تو آپ کیا کریں گے؟ آپ اپنی پسند کو ترجیح دیں گے یا اپنے پڑھنے والوں کی؟

جواب: پہلے تو میں اپنی پسند ہی کو ترجیح دیتا ہوں۔ اپنی لکھی ہوئی تحریر کو غیر کی طرح پڑھتا ہوں جب تک میں یہ نہ جانوں کہ یہ کچھ نہ کچھ مختلف ہے، میں اسے قبول نہیں کرتا۔ اب اس عمل میں شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جو میرے قاری ہیں۔ میں ابلاغ کا قائل ہوں اور میں یہ نہیں کہتا کہ میں صرف اپنے لیے لکھتا ہوں۔

سوال: آپ نے پہلے کہا تھا کہ آپ شعوری طور پر کسی شاعر سے متاثر نہیں ہیں۔ اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟

جواب: غالب تو متاثر کرتے ہیں۔ دراصل غالب ہر شخص کو اس کی اپنی سطح پر متاثر کرتے ہیں۔ ن م راشد اور اختر الایمان میرے ماڈل رہے ہیں۔

سوال: آپ کے پسندیدہ شعرا، غالب، فراق، فیض، مجید امجد، مختار صدیقی، ن م راشد، میرا جی، اختر الایمان، منیر نیازی اور ناصر کاظمی رہے ہیں تو کیا ان کا پرتو آپ کی شاعری پر نہیں پڑا؟

جواب: اس میں اور بہت سے نام چھوٹ گئے ہیں۔ غضنفر نے مجھ پر ایک خاکہ لکھا تھا، میرے دوستوں میں انھوں نے کچھ نام چھوڑ دیے۔ اس پر بہت سے میرے دوست نالاں ہوئے۔ دراصل فہرست سازی کوئی ضروری نہیں ہے میں سب کو پڑھتا ہوں۔ تنقید بھی، افسانہ بھی اور شاعری بھی۔

سوال: آپ کی مختصر نظمیں بہت باا‌ثر ہوتی ہیں۔ مجھے منیر نیازی کی مختصر نظمیں بھی بہت پاور فل لگتی ہیں۔ کیا آپ ان کی مختصر نظمیں پسند کرتے ہیں؟

جواب: ان کی بھی اور اختر الایمان کی چھوٹی چھوٹی نظمیں مجھے پسند ہیں۔ منیر نیازی کی نظموں میں اختر الایمان کا سا ارتکاز نہیں ہوتا۔ مختصر نظموں میں جب تک شدت تاثر نہ ہو بات نہیں پیدا ہوتی۔

سوال: مابعد جدیدیت کی ادبی تھیوری تو یہ کہتی ہے کہ آپ کا اپنا کچھ نہیں ہوتا۔ کوئی نہ کوئی لفظ، نہ کوئی استعارہ، کوئی نہ کوئی ایکس پریشن آپ کہیں نہ کہیں سے اٹھا لیتے ہیں۔ اگر آپ کی نظموں اور غزلوں......ڈی کنسٹرکٹ (ردتشکیل) کیا جائے تو کیا ایسا ہی ہوگا؟

جواب: یہ میں نہیں بتا سکتا۔ جب تک میں ملازمت میں تھا تو......کتابیں پابندی سے پڑھتا تھا لیکن وظیفہ لینے کے بعد میں نے اپنے اوپر سے پابندی ہٹالی ہے۔ اب وہی پڑھتا ہوں جو مجھے اچھا لگتا ہے۔ تھیوری ہو باتیں جن میں مصنف یا شاعر کو بے دخل کر دیا گیا ہے میرے لیے ناقابل فہم ہیں۔...... چونکہ تھیوری میں مختلف سماجی علوم داخل ہیں تو تجزیہ کرنے والا جب تک کئی......مثلاً نفسیات، عمرانیات، فلسفہ اور تاریخ وغیرہ پر کامل دسترس نہ رکھتا ہو، کسی فن پارے کا تجزیہ ٹھیک طریقے سے نہیں کر سکتا۔

سوال: آپ نے اکثر کہا ہے کہ خلیل الرحمٰن اعظمی نے آپ کو بگاڑا بھی ہے اور بنایا بھی۔ کیا آپ ہمیں یہ بتا سکتے ہیں کہ انھوں نے آپ کو بگاڑا کس طرح اور بنایا کس طرح؟

جواب: دیکھیے۔ بگاڑنے والی بات تو میں نہیں جانتا۔ شاید یوں ہی کہا ہو لیکن جہاں تک بنانے کا

سوال ہے تو آج میں چھوٹا موٹا جو بھی شاعر ہوں۔اس میں ان کا بہت حصہ رہا ہے۔شاعری کی طرف میرا رجحان انھی کی صحبت کا اثر ہے۔عجیب بات یہ ہے کہ ہماری دوستی کی کوئی شعوری بنیاد نہیں تھی۔لیکن ہم میں قدر گہرے دوست تھے کہ ان کا شاعری سے گہرا تعلق میرے تخلیقی سر چشموں میں پہنچ گیا۔

سوال: آپ کے تین دوست ایسے ہیں جن کے لیے آپ اپنی جان بھی دے سکتے ہیں اور کسی کی جان بھی لے سکتے ہیں۔میری مراد مغنی تبسم، شمس الرحمن فاروقی اور گوپی چند نارنگ سے ہے۔کیا یہ محض ایک اتفاق...... یہ تینوں حضرات اردو ادب کے مانے ہوئے نقاد بھی ہیں ان کے علاوہ بھی کوئی اور دوست ہے جس کے لیے آپ ایسا بھی جذبہ رکھتے ہوں؟

جواب: دیکھیے گوپی چند نارنگ، شمس الرحمن فاروقی اور مغنی تبسم سے میری دوستی تیس چالیس سال پرانی ہے۔اس وقت یہ لوگ اتنے مشہور نہیں تھے اور......نقاد کے اسٹیبلش بھی نہیں تھے۔اسے اتفاق ہی کہہ سکتے ہیں۔۔جی ہاں ان کے علاوہ بھی میرے بہت اچھے اور چاہنے والے دوست ہیں۔مثلاً مجتبیٰ حسین ہی کو لے لیجیے۔مجتبیٰ حسین سے میری دوستی تیس سال پرانی ہے۔مجتبیٰ حسین کے علاوہ بھی اور بہت سے دوست ہیں۔جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ فہرست سازی سے مشکل یہ ہوتی ہے کہ اگر کسی دوست کا نام رہ گیا تو پھر غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔

سوال: شہر یار صاحب 1986 میں آپ کو آپ کے مجموعہ کلام ''خواب کا در بند ہے'' پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ایسا کیوں ہے کہ ادب کا ساہتیہ اکادمی ایواڈ جنوبی ہند کے لکھنے والوں تک نہیں پہنچتا؟

جواب: مجھے نہیں معلوم جنوب کہاں سے شروع ہوتا ہے۔شروع میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ادیب یا شاعر کی مجموعی خدمات پر ملتا تھا۔اس وقت صرف بہت ہی سینیر لکھنے والوں کو یہ ایوارڈ دیا جاتا تھا۔بعد میں یہ انعام کتابوں پر ملنے لگا۔میرا یہ خیال ہے کسی ایوارڈ کے ملنے یا نہ ملنے سے اچھے فن کار کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔اچھا لکھنے والا یا لکھنے والی اس سے بے نیاز ہوتا/ ہوتی ہے۔اب دیکھیے گذشتہ میں پریم چند، عصمت چغتائی، مخدوم، جذبی اور سردار جعفری کو یہ ایوارڈ نہیں ملا۔اس سے ان لکھنے والوں کی عظمت کم تو نہیں ہوتی۔

بعض اچھے لکھنے والوں جیسے قرۃ العین حیدر کو یہ ایوارڈ ملا۔ لیکن اس سے ان کی عظمت نہیں بڑھی وہ ہر حال میں اچھی ادیبہ کہلائیں گی اور پھر میرا خیال ہے کہ جہاں کہیں "ہیومن ایجنسی" ہوگی وہاں کچھ نہ کچھ اونچ نیچ تو ہوگی ہی۔

سوال: آپ نے حیدر آباد سے اپنے دیرینہ تعلق کا اکثر ذکر کیا ہے۔ آپ کے رسالے "شعر و حکمت" کی وجہ سے اس شہر سے آپ کا ادبی تعلق تو مسلسل ہے ہی۔ اپنے بزرگ دوستوں میں آپ مخدوم صاحب کا نام تو لیتے ہیں لیکن سلیمان ادیب کا تذکرہ نہیں کرتے۔ کیا آپ نے انھیں بھلا دیا ہے؟

جواب: بحیثیت شاعر، سلیمان ادیب مجھے بہت پسند کرتے تھے۔ "صبا" میں انھوں نے میرا ایک گوشہ بھی شائع کیا تھا۔ علی گڑھ جب بھی آتے تو مجھے بلاتے تھے۔ لیکن ان سے کبھی میرا پرسنل تعلق نہیں رکھا۔ 1968 سے میں حیدر آباد مسلسل آ تا رہا ہوں، وہ بہت ہی خوش گوار اور کبھی نہ بھولنے والے دن ہیں۔ عوض سعید، شاذ تمکنت، مغنی تو جب بھی تھے اور اب بھی ہیں۔ اب تو میں انھی کے لیے آتا ہوں۔

سوال: کیا آپ ہندستان اور پاکستان کے موجودہ لکھنے والوں میں کوئی مماثلت پاتے ہیں۔ میرا مطلب ہے۔ فارم ٹریٹ منٹ، ڈکشن وغیرہ میں۔ کیا دونوں جانب ایک جیسا ہی ادب تخلیق ہو رہا ہے؟

جواب: ملک کی تقسیم ہی غیر فطری رہی۔ ادب کی تقسیم بھی غیر فطری ہوگی۔ البتہ مختلف زمانوں میں مختلف علاقوں کا ادب میں رول رہا ہے۔ موجودہ زمانے میں پنجاب کا رول ہے۔ اسے ہم ہندستانی یا پاکستانی نہیں کہہ سکتے۔

سوال: شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے آپ کے بارے میں کہا ہے کہ آپ ہمارے سب سے زیادہ داخل ہیں اور سب سے زیادہ دور کوش شاعر ہیں۔ یہ داخل بینی وغیرہ تو کشف و کرامات سے تعلق رکھتے ہے۔ کیا آپ اس میں یقین رکھتے ہیں؟ میرا مطلب ہے ایسا روحانی تجربہ جہاں آدمی وہ دیکھ اور دکھا سکے جو عام آدمی نہیں کر سکتا۔ کیا آپ کا ایسا کوئی روحانی تجربہ رہا ہے؟

جواب: ان کی اس سے کیا مراد ہے۔ یہ تو میں نہیں جانتا۔ ہوسکتا ہے وہ اپنے اندرون میں جو بھی ہوتا ہے۔ اتھل پتھل، اسے بیان کر رہے ہوں۔ میرے خیال میں داخلیت اور خارجیت کے درمیان میں کوئی چیز ہے جیسے سفیدی اور سیاہی کے درمیان کئی رنگ آتے ہیں۔ میں تو اس درمیانی کیفیت کا قائل ہوں اور شاید میری شاعری میں بھی ایسا ہی کچھ ہے۔ جی نہیں۔ اس طرح کے کشف وکرامات سے میں بالکل کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

سوال: آپ کو نظم اور غزل میں، ہم آہنگی کا راستہ اختیار کرنے والوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کیا سابق میں فیض نے بھی یہی نہیں کیا تھا؟

جواب: فیض کے یہاں، ان کی غزلوں میں خاصا روایتی انداز رہا ہے۔ انھوں نے اردو کی کلاسیکل شاعری کی اصطلاحات وہی رکھی ہیں جیسے، ساقی، محتسب، زنداں، قفس، صیاد وغیرہ اور انھوں نے غزل اور نظم دونوں میں استعمال کیا ہے۔ اسی لیے ان کی نظم میں غزل والی بات نظر آتی ہے۔ ویسے غزل کے ڈکشن میں جو تازگی ہے وہ مخدوم، مجروح اور فیض میں تقریباً یکساں ہے۔

سوال: سیاسی حالات کا اثر انسان کے ہر شعبۂ حیات پر پڑتا ہے۔ فنونِ لطیفہ بھی اس سے الگ نہیں۔ موجودہ عالمی سیاسی صورتِ حال اور ہمارے سارک ممالک کی نئی کاوشیں جن میں کشمیر کے مسائل بھی کچھ حل ہوتے ہوئے نظر آرہے ہیں، آپ کی نظر میں کیا اہمیت رکھتے ہیں۔ کیا کہیں کوئی امید نظر آتی ہے؟

جواب: میں تو اصل میں شروع ہی سے اوپٹمسٹ (Optimist) رہا ہوں۔ مثلاً 1947 کے بعد تقسیم کے وقت جو صورت حال تھی، وہ بہت مختلف تھی۔ اس وقت ایسا لگتا تھا کہ معلوم نہیں اس ملک میں مسلمان رہ بھی پائیں گے یا نہیں۔ آج بحیثیت ایک اقلیت کے ہندوستان میں مسلمان موجود ہیں اور اپنی اپنی زندگیوں کے دائرے میں خاصی ترقی بھی کر رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک میں طاقت کا غلط استعمال ہوا ہے۔ یہ ہر جگہ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ دہشت گردی اختیار کی جائے۔ یہ رجحان کوئی منزل نہیں رکھتا۔ نفرت خوف کی پیداوار ہے۔ جس معاشرے میں خوف ہوگا وہاں نفرت ہوگی۔ میری نظر میں دہشت گردی واقعی بری چیز ہے۔ چاہے کسی کی طرف سے ہو۔ ''بنیاد پرست'' کی اصطلاح

اور ''دہشت گرد'' کی اصطلاح عام طور سے صرف مسلمانوں کے لیے مختص کردی گئی ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے یہ اور بات ہے کہ بعض مسلمان خود پر لگائے ہوئے الزامات صحیح ثابت بھی کرنا چاہتے ہیں۔ اب یہی دیکھیے اردو جو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ دہشت گردوں کی زبان کہی جارہی ہے۔ بہرحال میں اس بات کا قائل ہوں کہ اگر ملک میں ترقی ہوگی تو مسلمانوں میں بھی ترقی ہوگی۔

●●●

احمد فراز سے گفتگو (۱)

احمد فراز کی شاعری رومان و تخیل، احتجاج و حسیت اور حریت و تفکر کے ایک حسین امتزاج سے عبارت ہے۔ ان کی شاعری کے متعلق فیض احمد فیض نے کہا تھا کہ ''وہ ظلم، ناانصافی کے خلاف اتنی ہی شدت سے احتجاج کرتے ہیں جتنی شدت سے محبت کا اعتراف کرتے ہیں۔ وہ ایک Living Legend بن چکے ہیں اور بعض معنوں میں پاکستان کی اولین مقبول ترین شخصیت ہیں۔ ان کی شہرت پاکستان کی حدود کو عبور کر چکی ہے۔ ان کی غزلیں ہندستان میں بھی کافی مقبول و مشہور ہیں اور غلام علی، مہدی حسن، رونا لیلیٰ، جگجیت سنگھ وغیرہ نے اپنی آواز دے کر ان میں مزید چار چاند لگا دے ہیں۔ معاصر غزل گویوں نے ان کی کافی تعریف کی ہے۔ 74 سالہ احمد فراز کا قلم آج بھی اسی رفتار سے چل رہا ہے۔ گذشتہ دنوں وہ دہلی میں منعقد مشاعرہ جشنِ بہار میں شرکت کے لیے دہلی آئے تو رخشندہ جلیل نے ان سے شاعری، سیاست اور عوام سے متعلق گفتگو کی، جو حاضر خدمت ہے۔

مرا قلم تو امانت ہے میرے لوگوں کی
مرا قلم تو عدالت مرے ضمیر کی ہے

اسی لیے تو جو لکھا تپاکِ جاں سے لکھا
جبھی تو لوچ کماں کا، زبان تیر کی ہے

احمد فراز

سوال: تقسیم کے سانحے، اور مارشل لا کے صدمے برداشت کرتے ہوئے پاکستان میں اردو شاعری زندہ رہی ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ شاعری کی آواز کو دبانے کی ہر ممکن کوشش کے باوجود یہ پروان چڑھی۔ کیا آپ کو لگتا ہے کہ شاعری کو اپنے اظہار کے لیے عدم استحکام اور ظلم وستم جیسے عناصر کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیا یہ ان کے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہے؟

جواب: پاکستانی شاعری کو مؤثر بنانے میں ان تمام عناصر کا اہم رول رہا ہے۔ ابتدا سے ہی ہمارے سیاست داں یا تو اپنا اعتماد کھو چکے ہیں یا پھر ذاتی مفاد کے لیے ان کا سودا کیا ہے۔ محض چند ہی قلم کار جو یا تو جیل میں تھے یا جن کو ریڈیو اور ٹی۔ وی۔ پر جانے کی ممانعت تھی یا جن پر کچھ بھروسہ کر کے ایک ریاست سے دوسری ریاست میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ ملک میں لگنے والے تمام مارشل لا شعرا کے لیے سخت تھے لیکن ان میں کچھ مارشل لا زیادہ ہی سخت تھے۔ جنرل ضیاءالحق کا مارشل لا بدترین تھا۔ اس کے ذریعے وہ ایک طرف تو بنیاد پرستوں کو بڑھاوا دے رہے تھے اور دوسری طرف ترقی پسند مفکرین کو سزا دے رہے تھے۔ یہ دور ہمارے ملک کے قلم کاروں کے لیے بڑا ہی نازک تھا۔ اس چیز نے شعرا کی فکر کو تقویت فراہم کی اور احتجاجی شاعری کو پاکستان میں مقبولِ عام کیا۔

سوال: آپ کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''تنہا تنہا'' 1950 میں شائع ہوا، اس وقت آپ انڈر گریجویٹ طالبِ علم تھے۔ اس زمانے میں کن شعرا سے آپ متاثر ہوئے؟

جواب: اس زمانے کے شعرا میں کچھ نام مثلاً فیض، غالب، حفیظ، ن۔م۔ راشد، ساحر لدھیانوی وغیرہ کافی مشہور اور مرکزِ توجہ تھے۔ ترقی پسند تحریک اس وقت اپنے شباب پر تھی۔ میری طرح سبھی نوجوان قلم کار اس سے متاثر تھے۔ ہم سارے لوگوں کے حالات یکساں تھے اس لیے فطری طور پر ہمارے محسوسات بھی ایک جیسے تھے۔ اگر ماحول میں غبار ہے تو تمام لوگ اسی غبار آلود فضا میں سانس لیں گے۔ فرق صرف سانس چھوڑنے کے عمل میں ہوگا۔ میں فیض سے بے حد متاثر تھا، بالکل اسی طرح جیسے میرے دیگر معاصر شعرا سردار و مجروح سے

متاثر تھے۔ دراصل فیض ہی تنہا ایسے شاعر تھے جنھوں نے پوری نسل کو متاثر کیا۔ رومانی، غنائی اور احتجاجی عناصر جن سے ان کی شاعری کا خمیر تیار ہوا، وہ ہم سبھی میں کم وبیش موجود ہیں۔

سوال: یہ کہا جاتا ہے کہ آپ کی شاعری کو فیض کا لباس پہنا دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: ابتدائی زمانے میں مجھ پر فیض کا بڑا اثر تھا لیکن ان کے علاوہ دوسرے لوگ بھی جن میں بالخصوص فارسی شاعر نظیری بھی شامل ہیں، کا بھی اثر رہا ہے۔ فیض نے شاعری کے روایتی محاوروں کو آسان لفظوں اور پیکروں میں ڈھال کر نئے معنی سے آراستہ کیا۔

سوال: آپ کی شاعری میں حسین سادگی بڑی ادبیت کے ساتھ راہ پا گئی ہے اور ہندی کے صاف و شفاف الفاظ بھی جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ مثلاً آپ کی غزل ''کٹھن رہ گزر کی'' اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: جی ہاں۔ میرا خیال ہے کہ اگر اردو کو ایک ادبی زبان کی صورت میں زندہ رہنا ہے تو اسے اپنی لفظیات کو وسعت دینا ہوگی ورنہ اس کی جڑیں خشک ہو جائیں گی۔ اسے ہندی، فارسی اور تمام دیگر زبانوں سے زیادہ سے زیادہ الفاظ مستعار لینے ہوں گے۔ میری نسل کے اردو شعرا کے لیے فارسی زبان نے روایتی علامت ''شمع اور پروانہ'' کے علاوہ اور بھی بہت کچھ دیا ہے۔ تقسیم کے بعد ان لوگوں نے اردو سے عربی اور فارسی کے الفاظ نکال دیے اور یہاں ان لوگوں نے ہندی کے نرم وشیریں الفاظ کو ہٹا دیا اس طرح سرحد کے دونوں جانب اردو زبان سیاست کا شکار ہوگئی۔ اردو شعرا بے دست و پا ہو گئے۔ فارسی اپنی وسیع لفظیات کے ساتھ ایک شیریں زبان ہے۔ اس کے محاورے بڑے ہی موزوں اور زبان بڑی ہی نرم اور دلنشیں ہے۔ اردو زبان اور شاعری پر اس کا کافی اثر رہا۔ ہندی میں بھی اسی طرح نرم وشیریں الفاظ تھے جو کہ نئی سنسکرت زدہ ہندی میں متروک قرار پائے۔ فیض نے اسی گنگا جمنی زبان کو اثر انگیز طریقے سے برتا ہے۔ بعض اوقات اردو کی تہی دامنی اور اس کی محدودیت کا احساس ہوتا ہے۔ روایتی امیج اور تشبیہات باعث تکدر ہوتے ہیں۔ اردو زبان اور اردو شاعروں کو چاہیے کہ وہ ان دائروں سے اوپر اٹھیں۔

سوال: آپ کو عوامی شاعر کہا جاتا ہے ۔ آپ اپنی آئندہ نسل بالخصوص جوانوں تک اسے کیسے پہنچائیں ۔گے؟

جواب: انھی نوجوانوں کو تو اس مشعل کو لے کر آگے بڑھنا ہے کیونکہ یہ اس کمی کو پورا کرنے والے ہیں۔

سوال: ایک جملے میں آپ خود کو کیا کہیں گے، ایک غنائی شاعر، ایک رومانی انسان یا ایک مجاہد؟

جواب: میں محض ایک شاعر ہوں ۔ یہ تمام صفات لایعنی ہیں ۔ آپ شاعر کو مختلف خانوں میں نہیں بانٹ سکتے ۔ آپ خواہ رومانی یا احتجاجی شاعری کر رہے ہوں، شاعری کو غالب ہونا چاہیے جس میں زبان کی لطیف غنائیت ، جذباتیت اور تفکر کے امتزاج سے ایک سنگیت پیدا ہونا چاہیے جس میں زبان کی لطیف غنائیت ہو، جسے اردو میں جذب اعظم کہا جاتا ہے۔ میرا ماننا ہے کہ شاعری کو بعید از فہم نہیں ہونا چاہیے اور اس سے لطافت، حلاوت اور کوملتا کا اخراج نہیں کرنا چاہیے ۔ صرف نظریہ شاعری نہیں بن سکتا۔ الفاظ کے زیر و بم سے اسے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ لفظوں کا انتخاب بہت ضروری ہے اور اسی کے ساتھ بحر اور وزن بھی۔ جنگ کے ترانے کے زیر و بم اور لے کسی رومانی نظم سے بالکل علاحدہ ہوں گے، لیکن اسے اَن میوزیکل نہیں ہونا چاہیے۔

سوال: آپ اپنے کیریر کے بارے میں مختصراً بتایئے؟

جواب: میں نے اپنے کیریر کی شروعات ریڈیو اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے کی۔ اس کے بعد میں نے اردو تدریس کا کام شروع کیا۔ پھر نیشنل سینٹر (جس کا مقصد بنیادی طور پر مشرقی اور مغربی پاکستان کی تہذیبی زمین کو ہموار کرنا تھا) کا ڈائرکٹر بنا۔ اس کے بعد میں اکیڈمی آف لیٹرس سے منسلک ہو گیا اور اس کے پہلے پروجیکٹ ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے بعد نظر بند کر دیا گیا۔ مجھے ایک انجان جگہ پر رکھا گیا۔ عدالت نے مجھے رہا کیا لیکن میں نے برسوں تک افریقہ، یورپ اور دیگر کئی جگہوں پر جلاوطنی کی زندگی گزاری۔ ملک واپس آنے کے بعد کچھ عرصے ''لوک ورثہ'' کی سرپرستی کی۔ ان دنوں میں نیشنل بک فاؤنڈیشن جو کہ پاکستان کا سب سے اعلا اشاعتی ادارہ ہے اور جس کا کام ملک بھر میں کتب کی فراہمی اور اشاعت کتب

کی ترقی اور فروغ ہے کا میں منیجنگ ڈائرکٹر ہوں۔ یہ ادارہ کتاب میلوں کا انعقاد کرتا ہے اور حکومت کے لیے نیشنل بک پالیسی بھی تیار کرتا ہے۔

سوال: آپ ہندستان ایک مدت سے آتے جاتے رہے ہیں؟ کیا اس بار ہندستان میں آپ کی خصوصی آمد پر کوئی ایسی چیز ہے جو آپ کو کسی تبدیلی کا احساس دلاتی ہے؟

جواب: میرے لحاظ سے یہاں کوئی بھی تبدیلی نہیں ہے۔ میں جن لوگوں سے ملتا ہوں وہ ہمیشہ سے ویسے ہی ہیں اور ان کے لیے میں بھی ویسا ہی رہا ہوں۔

سوال: کیا پاکستان میں بھی ان دنوں دونوں ملکوں کے رویوں میں موجودہ بدلاؤ سے ایسا ہی محسوس کیا جارہا ہے؟

جواب: جی ہاں۔ ہندستان کے بارے میں ان کے خیالات میں تبدیلی آئی ہے۔ تعلیم یافتہ لوگ امن اور آشتی چاہتے ہیں اور دوسرے معاملات میں بہتری کے خواہاں ہیں۔ لہجے کی کرختگی ختم ہونے لگی ہے اور روشن خیالی بھی آئی ہے کیونکہ لوگوں کو اپنی حکومت پر اعتماد نہیں ہے، حکومت کے ذریعے کسی بھی اقدام پر بھروسہ نہیں ہے۔ اخیر میں میرا کہنا یہی ہے کہ دونوں طرف کے عوام کو ایک دوسرے سے روابط بڑھانے سے ہی زیادہ بدلاؤ آئے گا۔

سوال: کیا آپ کو لگتا ہے کہ گرم جوشی دکھانے، امن کی بات کرنے اور دوستی کے قیام کے لیے لوگوں کو ہدایت دی گئی ہے؟

جواب: ہدایتیں وہاں ہوتی ہیں جہاں ہاتھ اٹھانے اور گرانے کا حکم دیا جاتا ہے۔

سوال: دونوں ملکوں کے عوام کو آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

جواب: ہندستان اور پاکستان دونوں ممالک کے عوام کو اس بات پر زور دینا چاہیے کہ وہ اپنے ارادوں کو سیاست دانوں سے قبول کروائیں۔ دونوں ممالک کے عام لوگوں کے درمیان بہتر سے بہتر روابط پیدا ہوں۔ عوام کو چاہیے کہ وہ سیاست دانوں کو بتائیں کہ وہ دونوں ملکوں کے عوام کے درمیان روابط بڑھانے اور دل جیتنے کے بجائے اسلحوں، بم اور فوج پر کیوں پیسے برباد کرتے ہیں۔

•••

احمد فراز سے بات چیت (II)

مشاعرے ہماری تاریخی اور تہذیبی روایت کا بیش قیمت حصہ ہیں جنھیں برقرار رکھنا چاہیے۔ ان کی وجہ سے نئی نسل میں اردو کے تئیں دلچسپی پیدا ہوئی ہے اور مشاعروں نے اردو زبان کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار برصغیر کے معروف شاعر احمد فراز نے ایک خصوصی بات چیت کے دوران کیا۔

حال ہی میں مشاعرہ جشن بہار میں شرکت کے لیے دہلی آئے احمد فراز نے ہندوستان اور پاکستان میں اردو زبان کے مستقبل سے متعلق سوال کے جواب میں کہا کہ زبانیں کبھی مرتی نہیں ہیں البتہ ان پر دوسری زبانیں اثر انداز ہو جاتی ہیں۔ اس وقت دنیا بھر میں انگریزی کا چلن بڑھا ہے لیکن یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی زبان سے رشتہ نہ توڑیں۔ انھوں نے اس بات کو غلط بتایا کہ پاکستان میں قومی زبان ہونے کے باوجود اردو پر علاقائی زبانیں حاوی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو پاکستان کی قومی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ بلوچستان، صوبہ سرحد، پنجاب اور سندھ کی سرکاری زبان ہے۔ یہ بات دیگر ہے کہ لوگ اپنی اپنی علاقائی زبانیں بھی بولتے ہیں۔ جہاں تک بات اردو کے مستقبل کی ہے تو ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی جگہ خطرہ ہے، کیونکہ اردو زبان سے یہ بھی ایک

طرح کی دشمنی ہے کہ ہندوستان میں عربی اور فارسی کے الفاظ سے اردو کو دور کیا جارہا ہے تو پاکستان میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ سے۔ ایسا کر کے اردو کے دامن کو تنگ کیا جارہا ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کی موجودہ شاعری سے متعلق سوال پر انھوں نے قدرے محتاط انداز اختیار کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت دونوں ہی ملکوں میں اچھا ادب پیدا نہیں ہو رہا حالانکہ دونوں جگہ حالات سازگار ہیں۔ اس سوال پر کہ آپ کی نظر میں اس دور کا بڑا شاعر کون ہے؟ احمد فراز نے کہا کہ شاعر چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا اور اچھے ادیب اور شاعر ہر دور میں پیدا ہوتے ہیں۔ پاکستان میں احتجاجی شاعری کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ یہ بات درست ہے کہ پاکستان میں احتجاجی شاعری ہو رہی ہے کیونکہ پوری قوم شاعروں سے توقع رکھتی ہے کہ وہ ان کے مسائل اور ان کی بات کو اٹھائیں۔ احمد فراز نے کہا کہ حال ہی میں انھوں نے حکومت کو اپنے ایوارڈ بھی واپس کر دیے ہیں۔

موجودہ دور میں شاعری کے مزاج میں آئی تبدیلی کے بارے میں انھوں نے کہا کہ ہر دور میں ادب میں تبدیلی آتی ہے۔ ہر دور کی شاعری کا مزاج الگ ہوتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہر دور میں شیکسپیئر اور کیٹس پیدا نہیں ہوتے، یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ نئی نسل کی شاعری کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ نئی نسل بھی اچھی شاعری کر رہی ہے لیکن انھوں نے کسی کا نام لینے سے گریز کیا۔ موجودہ دور کی شاعری میں خواتین کے رول کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ خواتین میں اس دور میں کئی بولڈ رائٹر اور شاعرات سامنے آئی ہیں جن کا ادب میں اپنا ایک منفرد مقام ہے۔ انھوں نے مثال کے طور پر پروین شاکر، ادا جعفری اور فہمیدہ ریاض کے نام بھی لیے۔ اس سوال پر کہ لوگوں کو آپ سے شکایت ہے کہ آپ بہت سال سے اپنا پرانا کلام ہی سنا رہے ہیں، انھوں نے کہا کہ مشاعروں میں نیا کلام کون سناتا ہے؟ میں تو پھر بھی کافی نیا سناتا ہوں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ آپ یا تو اچھی شاعری کی توقع رکھیں یا بہت سی شاعری کی۔ شاعری بہت زیادہ ہوگی تو اچھی نہیں ہوگی۔

پاکستان میں ''تنقید'' بے حد کمزور کیوں ہے؟ اس سوال پر انھوں نے کہا کہ ہر جگہ ہر چیز اچھی نہیں ہوتی۔ آپ کے یہاں تنقید بہت اچھی ہے تو ہمارے یہاں شاعری اور افسانے بہت اچھے لکھے جارہے ہیں لیکن نقاد اچھے نہیں ہیں۔ اسی طرح آپ کے یہاں فلمیں بہت اچھی ہیں ہمارے یہاں ڈرامے بہت اچھے بنتے ہیں۔ اردو زبان و ادب کے فروغ میں مشاعروں کی اہمیت سے

متعلق سوال پر احمد فراز نے کہا کہ مشاعرے ہماری تاریخی اور تہذیبی روایت کا بیش قیمت حصہ ہیں۔ ان کی وجہ سے نئی نسل میں اردو کے تئیں دلچسپی پیدا ہوئی ہے اور مشاعروں نے اردو زبان کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پہلے مشاعروں میں سیکڑوں سامعین آتے تھے، اب ہزاروں میں آتے ہیں۔ مشاعروں کے روزافزوں گرتے معیار کے لیے انھوں نے شعرا کو ذمے دار قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ اچھی شاعری کو داد مانگنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہندوستان میں بعض شاعر کہہ کر داد مانگتے ہیں یہ سب پاکستان میں نہیں ہے۔

پاکستان میں فوجی حکومت کے بارے میں وہاں کے ادیبوں کا کیا رویہ ہے؟ اس سوال پر احمد فراز نے کہا کہ تاناشاہ سے کون خوش ہوسکتا ہے۔ انھوں نے کسی کا نام لیے بغیر کہا کہ جب فوجی جنرل رٹائر ہونے والے ہوتے ہیں تو فوج کی طاقت سے اقتدار پر قابض ہو جاتے ہیں لیکن اس بار اس فوجی حکومت کا ایسا حشر ہوگا کہ آئندہ کوئی فوجی جنرل ایسا نہیں کرے گا۔ حال ہی میں اسلام آباد میں پیش آئے لال مسجد سانحے کے بارے میں انھوں نے کہا کہ میں ایک شاعر ہوں۔ اس معاملے کو سیاسی نظر سے دیکھنے کے بجائے اس نظر سے دیکھتا ہوں کہ اس میں کتنے انسان مارے گئے۔ ہمارا کہنا ہے کہ اگر کوئی مجرم ہے تو اس کا جرم پہلے عدالت میں ثابت کرو پھر سزا دو نہ یہ کہ کسی کو گولیوں سے بھون ڈالو۔ لال مسجد کا سانحہ مشرف حکومت کی نااہلی کے سبب ہوا۔ انھوں نے کہا کہ میں تو خود مشرف سرکار کے خلاف تحریک میں شامل رہا ہوں۔ فوجی حکومت سے کوئی ادیب اور حساس شخص کیسے مطمئن ہوسکتا ہے۔ اس سوال پر کہ آج دنیا بھر میں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف ایک مہم جاری ہے۔ انھیں دہشت گرد بتایا جا رہا ہے، احمد فراز نے کہا کہ جہاں تک بات دہشت گردی کی ہے تو طالبان امریکہ نے پیدا کیے اور پاکستان میں تاناشاہ بھی امریکہ کی ہی پیداوار ہیں۔ اس کے باوجود آج دنیا بھر میں جو صورت حال ہے اس میں مسلمانوں کو اپنے آپ کو تھوڑا سا بدلنا ہوگا اور اپنا محاسبہ کرنا ہوگا۔ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کے بارے میں انھوں نے کہا کہ دونوں ملکوں کے تعلقات پہلے کے مقابلے میں کافی اچھے ہوئے ہیں، ان میں بہتری آئی ہے لیکن ابھی کافی گنجائش باقی ہے۔ دونوں ملکوں کے عوام میں محبت ہے بھلے ہی حکومتوں میں نہ ہو۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان ترقی کر رہا ہے یہ ہمارے لیے خوشی کی بات ہے۔ پرتبھا پاٹل کے صدر منتخب ہونے کے بارے میں انھوں نے کہا کہ یہ ایک اچھا اور

مثبت قدم ہے۔ کشمیر کے تعلق سے پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ کشمیر کا ایشو دبا نہیں فی الحال صرف منظر سے ہٹا ہے۔ دونوں کے درمیان مذاکرات جاری ہیں۔ اللہ کرے کوئی مثبت نتیجہ نکل آئے۔ کچھ سیاستدانوں کی اس تجویز پر کہ دونوں ملکوں کو حقیقی کنٹرول لائن کو ہی بین الاقوامی سرحد تسلیم کر لینا چاہیے، احمد فراز نے کہا کہ اگر یہی کرنا تھا تو 60 سال تک ٹکراؤ اور کشیدگی کا ماحول کیوں بنائے رکھا گیا۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ یہ سب سیاستدانوں کا کام ہے ہمارا کام تو محبتیں بانٹنا ہے اور ہم اپنا کام کر رہے ہیں۔

•••

مغنی تبسم سے بات چیت

حیدرآباد کا ایک مشہور اور مصروف تجارتی و رہائشی مگر تہذیبی علاقہ چکڑ پلی۔ علمی وادبی سرگرمیوں کا مرکز ادارہ ادبیات اُردو کی قدیم اور تاریخی عمارت۔ اس سے بالکل قریب کپاڈیہ لین۔ ذرا اندر جاتے ہی دائیں طرف عابد ولا۔ احاطے کی دائیں جانب پروفیسر مغنی تبسم کی رہائش گاہ۔ عمر کے 81 برس مکمل کر چکے مغنی تبسم صاحب رُک رُک کر ہلکے ہلکے، مدھم مدھم باتیں کرتے ہیں۔ اُن کا لب ولہجہ یوں بھی بڑا پُرسکون رہتا ہے۔ عمر کی اس منزل پر مزید ٹھہراؤ آ گیا۔ جیسے عمل اور زندگی سے معمور دریائے رواں ذرا سانس لینے کے لیے ٹھہر گیا ہو۔ گفتگو سے اندازہ ہوا کہ مغنی صاحب جسمانی طور پر خواہ نقاہت کے شکار ہو گئے ہیں لیکن ذہنی طور پر آج بھی چاق و چوبند ہیں۔ یادداشت بہت ہی اچھی ہے۔ جملے مرتب استعمال کرتے ہیں۔ معنی و مفاہیم واضح ہوتے ہیں اور زندگی اور ادب، دونوں ہی کے تعلق سے اپنی ایک رائے رکھتے ہیں۔ البتہ اُنھوں نے بتایا کہ کمزوری بہت ہے۔ ''تنفس کی شدید شکایت ہے۔ دن میں دو بار آکسیجن لیتا ہوں۔ چار مرتبہ نیبولائزر۔ ایک نرس مستقل ڈیوٹی پر رہتی ہے۔ وہی یہ سارے کام کرتی ہے۔'' یہ گفتگو ان دنوں کی یاد ہے جب مغنی تبسم بقیدِ حیات تھے۔

سوال: آپ نقاد بھی ہیں اور شاعر بھی۔ دوسری طرف آپ کی ادارت میں 'سب رس' اور 'شعر و حکمت' جیسے موقر ادبی جرائد نے ایک طویل سفر طے کیا۔ آپ ہمیں بتائیے کہ آخر وہ کون سا پس منظر ہے جس سے آپ کی شخصیت متنوع ادبی صلاحیتوں سے روشن ہوگئی؟

جواب: میرے والد عبدالغنی اور تایا محمد صدیق دونوں ہی شاعر تھے۔ ان کے اثرات کے تحت میں بھی شاعری کی طرف مائل ہوا۔ ایک زمانہ تھا کہ میرے والد جج تھے اور ملازمت کے سلسلے میں حیدرآباد سے باہر رہتے تھے لیکن ہر ہفتے حیدرآباد آتے تھے۔ اُن کے آنے پر ہمارے گھر میں ایک فی البدیہہ مشاعرہ منعقد ہوتا تھا۔ میرے والد اور تایا کسی دی ہوئی طرح پر اشعار لکھتے تھے۔ تیاری کے لیے ایک گھنٹے کا وقت دیا جاتا تھا۔ میرے پھوپھی زاد بھائی عبدالقادر جن کا لحن بہت اچھا تھا، ہماری غزلوں کو ترنم سے پیش کرتے تھے۔ اس طرح بچپن سے ہی ہماری حوصلہ افزائی ہوئی۔ چارکمان (چارمینار کے قریب) میں تایا صاحب کی میوے کی دُکان تھی جسے شاہی سرپرستی حاصل تھی۔ اُس دُکان پر بہت سے شاعر اکٹھا ہوتے تھے جن سے تایا صاحب کی دوستی تھی۔ میں وہاں بھی آتا جاتا تھا اور میرے تایا اکثر مشاعروں میں مجھے اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ اس طرح مجھ میں شاعری کا شوق بھی پیدا ہوا اور اُنھیں کی صحبت میں میری شاعری پروان چڑھی۔ جہاں تک ادبی صحافت کا تعلق ہے تو مجھے ابتدا ہی سے اس سے شغف رہا ہے۔ ایک دلچسپ یاد میں آپ کو شریک کرنا چاہوں گا کہ جب میں مڈل اسکول میں زیر تعلیم تھا تو ہمارے اسکول کے امتحانی پرچے کھریا کے پریس (لیتھو سے مختلف قدیم طریقہ طباعت) میں چھپتے تھے۔ میں نے بھی اس سے نقل کرتے ہوئے کھریا کا ایک پریس بنالیا اور اپنی پسند کی شعری تخلیقات جمع کر کے اسے چھاپ لیا اور اسے میگزین کی شکل دے دی۔ بعد ازاں جب میں ہائی اسکول میں تھا تو میرے ساتھی ادیب و شاعر لڑکوں نے ایک ادبی انجمن قائم کی۔ ہم اُس انجمن کی جانب سے 'شبستانِ ادب' نام سے ایک رسالہ شائع کرتے تھے۔ میں جب انٹرمیڈیٹ میں پڑھ رہا تھا اُنھی دنوں میرا پہلا مجموعہ کلام 'نوائے تلخ' شائع ہوا۔ اسی طرح جب میں جامعہ عثمانیہ پہنچا تو 'مجلہ عثمانیہ' سے میری وابستگی رہی۔ غرضیکہ شاعری اور ادبی صحافت میرے بچپن کے ساتھی ہیں۔ گزرتے ہوئے دنوں میں بعض نشیب و فراز کے ساتھ ان سے میرا رشتہ مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔

سوال: عام طور پر کہا جا رہا ہے کہ ہمارا ادب انحطاط کا شکار ہے۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: آج دُنیا میں جو حالات ہیں، اُس میں صارفیت کا غلبہ ہے اور ہر چیز بکاؤ ہے۔ اس سے ادب بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ آئے دن نئی تحریکیں اُبھر رہی ہیں اور ادیب سے یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ وہ ان تحریکوں کا ساتھ دے۔ مثلاً جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات، پس ساختیات وغیرہ۔ وہ جو عام 'میڈیوکر' mediocre ادیب و شاعر ہیں وہ کوشش کرتے ہیں کہ خود کو اس میں ڈھال لیں۔ اس طرح اُن پر ایک نفسیاتی دباؤ بنا رہتا ہے اور اُنھیں وہ تخلیقی آزادی حاصل نہیں ہوتی جو قدما کو تھی۔ ان کا تخلیقی عمل آزادانہ اور بے لوث نہیں رہ پاتا۔ وہ اعزازات و انعامات کے خواہشمند اور طلب گار ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ آج کل ذرائع ابلاغ خاص طور پر ریڈیو، ٹی وی اور انٹرنیٹ وغیرہ عام انسانی زندگی میں اتنے دخیل ہو گئے ہیں کہ لوگوں کو کتاب پڑھنے کی مہلت نہیں دیتے۔ یہی سبب ہے کہ ہمارا ادب انحطاط کا شکار ہے اور خاص طور پر تحریری ادب کو وقعت حاصل نہیں ہو رہی ہے۔

سوال: کیا آپ ادبی تحریکات کو ادب کے لیے مفید نہیں مانتے ہیں؟

جواب: نہیں ایسا نہیں ہے۔ دراصل آج کل ہماری تنقید میں ساختیات، پس ساختیات، جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسی اصطلاحوں کا بہت چرچا ہے۔ بہت سے تخلیق کار شاید ان اصطلاحات سے ناواقف ہوتے ہیں۔ لیکن نقاد حضرات ان پر کوئی نہ کوئی ٹھپہ لگا دیتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ادیب اور شاعر اس بات پر خوش ہوتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر ان تحریکوں سے ہر دور میں متاثر رہا ہوں۔ بلکہ ان رجحانات و تحریکات کو فروغ دینے میں بحیثیت نقاد اور مدیر میرا حصہ رہا ہے۔ 1960 اور 70 کے درمیان میری شاعری میں جدیدیت کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد میں نے شاعری کی طرف کم توجہ کی لیکن میں اپنے مضامین، تقاریر اور اداریوں کے ذریعے بھی تحریکات کی حوصلہ افزائی کرتا رہا اس لیے کہ میں تخلیقی ادب پر عالمی تحریک و رجحان کے اثرات کو مفید متصور کرتا ہوں۔

سوال: 70-60 کے درمیان بلاشبہ آپ کی شاعری میں جدیدیت کے اثرات نمایاں ہیں لیکن آپ ایک زمانے تک ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے؟

جواب: ہاں ہاں۔اس سے کب انکار ہے۔ میں تو اپنی نوجوانی کے دور میں ہی ترقی پسند تحریک کا رُکن بن گیا تھا۔اُن دنوں روزنامہ 'پیام' کے مدیر اختر حسن صاحب انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری تھے۔ دراصل وہ ایسا دور تھا جب حیدرآباد کے بیشتر ادیب اس تحریک سے وابستہ تھے اور اس کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔لیکن آزادی کے بعد حیدرآباد کا نقشہ ہی بدل گیا۔حکومت ہند دیسی ریاستوں کو ہندستان میں ضم کردینے کے حق میں تھی۔حیدرآباد دیسی ہی ایک دیسی اور خودمختار ریاست کا درجہ رکھتا تھا۔سیاسی لوگوں کی طرح ادیبوں میں بھی الحاق کی تائید اور مخالفت میں دو گروہ بن گئے۔حد تو یہ ہے کہ ترقی پسند ادیبوں کے اندر بھی تقسیم ہوگئی۔ایک ہندستان میں ضم ہوکر جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ چاہتا تھا۔دوسرا گروپ بھی جاگیردارانہ نظام کو ناپسند کرتا تھا لیکن وہ آزاد ریاست رہتے ہوئے اندرونِ ریاست اپنی جدوجہد جاری رکھنا چاہتا تھا۔اسی درمیان گرفتاریوں کا سلسلہ چل پڑا۔بہت سے ادیب مثلاً اختر حسن، عالم خوندمیری، سلیمان اریب گرفتار کرلیے گئے۔میں اُن ادیبوں میں شامل تھا جو گرفتاری سے بچ گئے تھے۔ہم لوگوں نے مصلحتاً انجمن کا نام بدل کر محفل علم وادب رکھ دیا۔ بعد میں جب کمیونسٹ پارٹی پر سے پابندی ہٹ گئی تو انجمن عوامی مصنفین قائم کی گئی جس سے بیشتر حیدرآبادی ادیب نئے جوش وخروش کے ساتھ جڑ گئے۔مگر آزادی کے دو برسوں بعد رفتہ رفتہ ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیوں میں ایک ٹھہراؤ آگیا اور ترقی پسندی کی جگہ بتدریج جدیدیت اپنی جگہ بناتی چلی گئی۔1960 تک پہنچتے پہنچتے یہ نظریہ عام ہونے لگا اور ادبا وشعرا اُس کی جانب مائل ہونے لگے۔

سوال: ہماری ادبی دُنیا میں شاعری اور خاص طور پر غزلوں کا جو سیلاب آرہا ہے اُس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ آج نثری اور دیگر شعری اصناف پر کم توجہ دی جا رہی ہے؟

جواب: آپ نے صحیح فرمایا۔آج شاعری کا رجحان بہت ہی زیادہ ہے۔اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ شاعری کا کوئی معیار باقی نہیں رہ گیا ہے۔اچھی بری ہر طرح کی شاعری رسالوں میں شائع ہوتی ہے۔ادبی جرائد کو نثری تخلیقات وتصنیفات اشاعت کے لیے کم موصول ہوتی

ہیں لہٰذا وہ سستی شاعری بالخصوص غزلوں سے اپنے جرائد کا پیٹ بھرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ شاعری اب پڑھنے کے ساتھ سننے کی چیز بھی ہوگئی ہے۔ شاعری اور ادب کے قارئین اس لیے بھی کم ہو گئے ہیں کہ بہت سے لوگ جنھیں شاعری سے دلچسپی تو ہے مگر وہ اپنی زبان سے آگاہ نہیں ہیں۔ مشاعروں کے سامعین بھی اکثر زبان سے ناواقف ہونے کے باوجود شاعری میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اُنھیں معیار کا اندازہ نہیں ہوتا لیکن وقتی طور پر ترنم، گرما گرم معاصر موضوعات، ردیف و قوانی کے صوتی آہنگ کی وجہ سے لوگ حظ اُٹھاتے ہیں۔ واہ واہ کرتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر شاعر پھر وہی شاعری کرتا ہے۔ البتہ یہ وضاحت بھی کرتا چلوں کہ ایسا نہیں ہے کہ شاعری کا چمن بالکل ہی سوکھا پڑا ہے۔ آج اچھی شاعری بھی ہو رہی ہے لیکن اس کا تناسب بہت کم ہے۔

سوال: آپ نے شعری، نثری اور ادبی صحافت کے میدان میں کافی کام کیے ہیں۔ کیا ایسا بھی کوئی پروجیکٹ ہے جو نامکمل رہ گیا ہو۔ جس کی آپ کو تشنگی ہو؟

جواب: اُردو میں اسلوبیاتی اور خاص طور پر ادب کے صوتیاتی مطالعے میں میرا نمایاں حصہ رہا ہے۔ عام طور پر صوتیاتی تنقید میں میری کارکردگی کو سراہا گیا ہے۔ اس میں میں نے بعض بنیادی کام بھی کیے ہیں۔ جیسے قدیم اُردو میں خرابی یہ رہی ہے کہ علم عروض میں بحور، اوزان، قوانی کی بنیاد مصمتوں پر رکھی گئی ہے جبکہ ہمارا عروضی ڈھانچہ مصوتوں پر استوار ہے۔ میں نے اُردو عروض کا مطالعہ صوتیاتی نقطۂ نظر سے کیا ہے اور قدیم علم عروض کی کوتاہیوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس سلسلے میں میرے مضامین شائع ہو چکے ہیں اور میں اس مطالعے کو مزید وسعت دینا چاہتا ہوں۔ آج کل اسی مطالعے میں مشغول ہوں۔ آپ اسے میرا پروجیکٹ کہہ سکتے ہیں۔ میں اسے مکمل کرنا چاہتا ہوں۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! آج جو اُردو ادارے ہیں مثلاً اُردو اکادمیاں، اُردو یونیورسٹی، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان۔ اُن کی کارکردگی سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: قومی کونسل کو حکومت کی بڑی سرپرستی حاصل ہے اور مختلف شہروں میں جو اُردو کے ادارے کام کر رہے ہیں اُنھیں نیشنل کونسل سے مدد ملتی ہے۔ کونسل کی کارکردگی بہت ہی اطمینان بخش

ہے۔ اُس کے ڈائرکٹر نے ماہنامہ اُردو دُنیا کو ایسا رسالہ بنا دیا ہے جس سے تخلیقی ادب کے علاوہ مختلف علمی شعبوں میں بھی اسے مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اُس میں مضامین کا تنوع اور ایک معیار ہوتا ہے۔ مختلف ریاستوں میں اُردو کے جو کام ہو رہے ہیں، اُردو دُنیا کے ذریعے ہمیں وہ معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔ اس رسالے کا نیا انداز بھی بہت خوب ہے۔ البتہ ہم ادیب لوگ کسی رسالے کی شکل وصورت سے زیادہ مواد کو اہمیت دیتے ہیں۔ قومی کونسل کے علاوہ جو دیگر ادارے ہیں اُن میں مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی بھی بہت نمایاں طور پر ترقی کر رہی ہے۔ اُردو اکادمیوں میں بعض مثلاً مہاراشٹر، بہار، دہلی وغیرہ اچھا کام کر رہی ہیں لیکن بیشتر اکادمیاں ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں کی اشاعت پر کم اور اُنھیں انعامات و اعزازات دینے پر زیادہ رقم صرف کرتی ہیں۔

سوال: ہم اپنی بات چیت یہیں ختم کرتے ہیں۔ البتہ میں چاہوں گا کہ آپ اپنی پسند کے کچھ اشعار قارئین کو سنا دیجیے۔

جواب: ضرور!

کل میرے لفظوں میں میری جان رہے گی
دُنیا جب دیکھے گی تو حیران رہے گی

بس اتنی ہے اپنی کہانی
آگ، ہوا، مٹی اور پانی

ایک اک پیڑ اُکھڑتا دیکھا
زور جنگل میں ہوا کا دیکھا
پاس آتے ہوئے صحرا میں کبھی
دور جاتا ہوا دریا دیکھا

•••

کلیم عاجز سے گفتگو

کلیم عاجز دورِ حاضر کے اہم شاعروں میں سے ایک ہیں۔ان کی پیدائش 11 اکتوبر 1924 کو پٹنہ میں ہوئی اور شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی سے بحیثیت پروفیسر سبک دوش ہوئے۔کلیم عاجز کے تین شعری مجموعے ''وہ جو شاعری کا سبب ہوا''، ''جب فصل بہاراں آئی تھی'' اور ''کوچۂ جاناں'' کے علاوہ ''جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی''، ''ابھی سن لو مجھ سے'' (سوانح عمریاں) ''اِک دیس اک پردیسی'' ''یہاں سے کعبہ کعبے سے مدینہ'' (سفر نامہ) ''دوانے دو''، ''پہلو نہ دکھے گا'' (مجموعۂ مکاتیب) ''مجلس ادب'' (رپورتاژ) اور ''دفتر گم گشتہ'' (تنقید) وغیرہ نثری کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

سوال: اپنے شعری سفر کے آغاز اور اس کے ابتدائی مراحل کے بارے میں کچھ بتایئے؟

جواب: شعر گوئی کا میلان دس بارہ سال کی عمر سے تھا جب میں کلکتے میں ایک اسکول میں پڑھتا تھا۔لیکن شاعری کا آغاز میں نے شعوری طور پر نہیں کیا۔بغیر کسی محنت و جستجو کے خود بخود شعر بے ساختہ ہو جاتے تھے۔1936 سے 1946 تک دس سال شعر سے بہت قربت رہی، طبیعت میں موزونیت اور بے ساختگی بے حد تھی مگر اسے مشغلے کے طور پر اختیار کرنے کا ارادہ

پھر بھی نہ ہو سکا۔ 1946 کے فساد میں میرے خاندان کے بائیس افراد شہید ہو گئے تو میں نے سب کچھ بھلا دیا، شعر کہنا چھوڑ دیا اور طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ 1949 یا 1950 میں ایک عزیز مجھے پٹنہ سیٹی کے ایک مشاعرے میں لے گئے۔ وہاں شاعری سن کر مجھے اپنی بھولی ہوئی چیزیں یاد آ گئیں جیسے اچانک کوئی پرانا رفیق یاد آ جائے۔ اس طرح میں نے پھر دوبارہ لکھنا شروع کر دیا مگر اب جو شاعری سامنے آئی وہ نوجوانی کی شاعری سے بالکل الگ تھی۔ اس میں بناوٹ اور رعنائی نہیں تھی۔ یہ دل کی آواز تھی جو اشعار کے روپ میں ڈھل کر سامنے آ رہی تھی۔ 1946 کے بعد جو کچھ میرے دل پر گزرا اس میں اسی کی ترجمانی ہوتی تھی۔ یہ شاعری گویا میری دوسری زندگی تھی جو آج تک میری ہم نشیں ہے۔

سوال: عمر کی اس منزل پر پہنچ کر اپنی شاعری سے متعلق آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟ تخلیقی سفر میں ایک طویل مدت گزارنے کے بعد کیا آپ اپنی شاعری سے مطمئن ہیں؟

جواب: جی ہاں! میں بالکل مطمئن ہوں۔ جس طرح کسی بچھڑے ہوئے ساتھی کے ملنے کے بعد پھر اسے چھوڑنے کو جی نہ چاہے اسی طرح شاعری نے مجھے اور میں نے شاعری کو اپنایا۔ دنیا سے جو بیزاری، حالات سے بے پروائی طبیعت میں پیدا ہو گئی تھی اب حالات سے اتنا ہی زیادہ تعلق پیدا ہو گیا اور دنیا نئی شکل میں سامنے آئی۔ شاعری شخصیت کا ایک جزو بن جائے ایسا اردو شاعری میں کم نظر آتا ہے بہ استثنا میر۔ ہاں میر نے شاعری کے لیے اپنے کو مٹا دیا اور شاعری کو بچانے کے لیے ساری خواہشات ترک کر دیں یہ میں نے نہیں کیا۔ شاعری کو ہمنوا بنایا۔ دنیا میں مذہب کے بعد مجھے سب سے عزیز اپنی شاعری ہے۔

سوال: آپ نے خود کو زیادہ تر غزل تک کیوں محدود رکھا؟ آپ نے نظم گوئی کی طرف توجہ کیوں نہیں کی؟

جواب: نظمیں بھی کہی ہیں، اس کا مجموعہ بھی چھپا ہے مگر سچائی یہ ہے کہ طبیعت کا میلان غزل کی طرف زیادہ رہا۔ کیونکہ غزل میں زندگی کی جو ترجمانی ہوتی ہے وہ کسی صنف میں نہیں۔ غزل Subjective ہے نظم Objective۔ غزل خواہش سے ہوئی اور نظم فرمائش یا مطالبے پر۔

سوال: آپ کی شاعری سے متعلق گفتگو ایک مخصوص دور یا زمانے کے حوالے سے ہوتی ہے۔ اس تناظر میں آپ کی شاعری کو عہد گذشتہ کی آواز سے تعبیر کیا جائے تو آپ کیسا محسوس کریں گے؟

جواب: ہاں یہ عہد گذشتہ کی آواز ہے لیکن اس میں عہد جدید کی سچائی بھی ہے۔ اس میں حال کی ترجمانی بھی ہے۔ میں نے تاثیر، انداز بیان اور انداز پیش کش کلاسیکی شاعری سے لیا ہے نئی نسل کے شعرا کا روایت سے رشتہ منقطع ہو گیا ہے اس لیے جدید شاعری میں وہ قوت و توانائی نہیں جو دل کو متحرک و مشتعل کر سکے۔ میں نے روایت کی پاسداری کی ہے اس لیے اسلوب و ادا تو روایتی محسوس ہو گی ہی مگر اس میں جو صداقت قوت اور تاثیر ہے وہ ہر زمانے کو متاثر کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔

سوال: آپ کے نزدیک شاعری کے لیے بنیادی شرائط کیا ہیں؟

جواب: سچائی۔ سادگی۔ خلوص۔ شاعری دل میں سچائی، سادگی اور خلوص سے اترتی ہے۔ اب شاعری میں سچائی تو ہے لیکن اخلاص اور سادگی نہیں ہے، بناوٹ اور صناعی ہے۔ ہمارے متوسط دور کی شاعری میں بھی صناعی تھی مگر وہ صرف الفاظ کی حد تک تھی اب شاعری میں خیال کی سطح پر بھی صناعی آ گئی ہے سچائی تو بالکل نہیں اور نہ خلوص ہے۔

سوال: غزل میں جدید و قدیم کی بحث سے آپ کہاں تک متفق ہیں؟ کیا غزل میں روایت کی پاسداری ضروری ہے؟

جواب: اس کے بغیر تو شاعری زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔ زندگی میں جو بات ایک ہزار سال پہلے تھی وہ اب بھی ہے۔ زندگی کا رنگ روپ بدلتا ہے اس کی روح نہیں بدلتی۔ جو بات انسان ہزار سال پہلے کہتا تھا وہ اب بھی کہتا ہے، انداز اور اسلوب بدل جاتا ہے۔ اس لیے روایت کی پاسداری اس معنی میں ضروری ہے کہ زبان و بیان میں حسن و دلکشی جو روایتی شاعری کی سب سے اہم خوب صورتی تھی وہ جدید غزل میں بھی پیدا ہو۔ روایت سے تعلق میں گہرائی پیدا کرنی ہوگی تا کہ ہماری شاعری میں بھی ویسی ہی سچائی اور تاثیر پیدا ہو سکے۔

سوال: تخلیقی عمل ایک لاشعوری عمل ہے۔ لیکن کیا آپ اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے کہ بہتر فن پارہ شعوری کوششوں کی بدولت وجود میں آتا ہے؟

جواب: بے شک۔ مجھے اس سے اتفاق ہے۔ دراصل تخلیقی عمل میں شعور ولاشعور دونوں کام کرتے ہیں۔ خیال لاشعور سے آتا ہے مگر اس کی پیش کش شعوری ہوتی ہے۔ تجربات لاشعور میں ہوتے ہیں مگر اچانک کوئی حادثہ واقعہ پیش آ جائے تو اسے شعوری طور پر شاعر اپنے انداز میں پیش کرتا ہے۔ مگر یہ پیش کش ایسی نہیں ہوتی ہے جیسے مولانا آزاد کی تحریریں۔ جو بار بار لکھتے تھے کاٹتے تھے، اس میں لاشعوری کم اور شعوری چیزیں زیادہ ہو جاتی تھیں۔ شعرا جو خیال پیش کرتے ہیں وہ اندر سے خود نکلتے ہیں مگر اسے وہ تراش خراش کر پیش کرتے ہیں۔ اس میں شعوری ولاشعوری دونوں عمل اہم ہوتے ہیں اور ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔

سوال: آپ کی شخصیت کی تعمیر میں عظیم آباد کے ادبی ماحول کا بھی خاص دخل رہا ہے؟ آپ نے زندگی کا بیشتر حصہ یہیں گزارا۔ یہاں کی ادبی فضا کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب: اب یہاں ادبی فضا ہے ہی نہیں۔ جس زمانے میں میں نے شاعری شروع کی تھی اس زمانے میں ہی وہ فضا دم توڑ رہی تھی مگر روح سلامت تھی۔ جو پیغام، گرمی اور چنگاری عظیم آباد کی شاعری کا خاصہ تھی، وہ کچھ کچھ موجود تھی۔ جو یادگار شعرا بچے کھچے تھے ان سے قوت و توانائی ملتی تھی، وہ مخلص تھے، ان میں ریاکاری نہیں تھی اس لیے ان کی صحبتیں میرے لیے باعث کشش تھیں۔ صرف شاعری کی ہی بات نہیں، عظیم آباد کا جو معاشرتی ماحول تھا، جو آداب واقدار تھے اور جو خلوص تھا اس میں میری پرورش ہوئی۔ اب وہ تمام آداب واقدار مفقود ہیں۔ پہلے لوگ شاعری کے ساتھ بازاری برتاؤ نہیں کرتے تھے۔ شاعری ان کی دوست، عزیز اور رشتے دار تھی اس لیے شاعری کے ساتھ ان کا کردار بھی ہمیں عزیز تھا۔ میری شخصیت اور شاعری کی نشوونما میں یہاں کے قدیم اساتذہ کا گہرا اثر رہا ہے۔

سوال: کیا زندگی کا کوئی ایسا واقعہ آپ کی ذہن میں ہے جو آپ کی کسی مشہور غزل یا تحریر کا محرک ہیں؟

جواب: بہت سارے واقعات ہیں، واقعات کی اتنی کثرت ہے کہ میری تمام شاعری کو آپ حالات وحادثات کا ردعمل کہہ سکتے ہیں۔ سینکڑوں غزلیں ایسی ہیں جو حالات کے ردعمل میں لکھی گئی ہیں۔ یہ سب حالات وحادثات اور تجربات کی ہی پیداوار ہیں۔

سوال: ایوارڈ یا اعزاز کو آپ کس نظریے سے دیکھتے ہیں؟

جواب: مجھے اعزاز وایوارڈ کی خواہش، تمنا کبھی نہیں تھی اور نہ ہے مگر بیرون ملک لوگوں نے انعامات سے نوازا تو انکار بھی نہیں کیا۔ جب بھارت سرکار کی طرف سے پدم شری ملا تو حیرت ہوئی کہ میں جس سرکار کے خلاف بولتا اور لکھتا ہوں وہ مجھے انعام دے رہی ہے۔ امریکہ میں مجھ سے ایک تقریب میں لوگوں نے کہا کہ میاں تم باہر کیسے ہو تمھیں تو اندر ہونا چاہیے تھا۔ پدم شری کا معاملہ یہ ہے کہ دلّی میں اچانک ایک صاحب ہمارے پاس آئے اور کہا کہ "میں ہوم منسٹری سے آیا ہوں اور یہ بتانے آیا ہوں کہ سرکار آپ کو کچھ پُرسکار دینا چاہتی ہے۔" مجھے حیرت ہوئی کہ میں نے کوئی ایسا کام تو نہیں کیا۔

سوال: نثری نظم یا آزاد غزل سے متعلق آپ کا خیال کیا ہے؟

جواب: میں اسے نہیں پڑھتا اور نہ اس سے کوئی دلچسپی ہے۔ ہمارے سامنے غزل کا جو قدیم چہرہ ہے اس کے سامنے کوئی چہرہ نہیں جچتا۔

سوال: آپ کی شاعری اور میر کی شاعری میں آہنگ واسلوب کی مماثلت کی بنا پر آپ کو "تابع میر" یا "میر ثانی" بھی کہا جاتا ہے۔ کیا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں؟

جواب: اس سے مجھے پوری طرح اختلاف ہے۔ اختلاف یہ ہے کہ لوگ مجھے "تابع میر" کہتے ہیں اور بغیر سوچے سمجھے اور پڑھے اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں نے بھی میری شاعری پر تقلید میر کا ٹھپہ لگا دیا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ شعوری کوشش نہیں ہے۔ اس میں تتبع، تقلید کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ان کی زندگی اور میری زندگی میں مماثلت ہے اسے تقلید کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ تقلید شعوری ہوتی ہے یعنی ایک خاص رنگ پیدا کرنے کی کوشش کرنا جب کہ میری شاعری میں میر سے مماثلت غیر شعوری ہے جو خود بخود پیدا ہوئی ہے۔

سوال: اردو شاعروں کی اتنی بڑی تعداد کے باوجود آج کوئی میر، غالب اور اقبال پیدا نہیں ہوتا۔ آپ اس کا سبب کیا سمجھتے ہیں؟

جواب: اردو شعرا کی کثرت پہلے بھی تھی۔ آبادی کے تناسب سے شعرا کی کثرت اس وقت بھی کم نہیں تھی۔ ایک ایک شاعر کے دو دو شاگرد تھے۔ لیکن اب میر، اقبال وغیرہ پیدا نہیں ہوتے کیونکہ آج کی شاعری انسانیت کے درد و سوز سے مبرا ہے۔ آج کے شعرا فنکاری اور الفاظ و

خیال کو جوڑنے کے مشغلے میں مصروف ہیں۔ زندگی کو چیلنج کرنا اور اس کی خراب شکل کو دور کرنے اور اس کو صحیح شکل دینے کی کوشش اور اس کوشش میں کسی طمع، لالچ، خواہش اور شہرت و ناموس کو حائل نہیں ہونے دینے کا جذبہ نہیں ہے۔ دردمندی، غم گساری، جو شاعری کی بنیاد ہے اس کی کمی ہے۔ جب تک شاعر کا خیال ہے، آرزو تمنا اور مقصد شاعر کے خون میں سرایت نہ کرے اس کی شاعری اصل شاعری نہیں ہو سکتی۔ دردمندی کے سوز میں انسان جتنا پگھلے گا اس کی شاعری میں اتنی ہی توانائی قوت اور کشش پیدا ہوگی اور اس کی شاعری کی عظمت میں اضافہ ہوگا۔ اب تو شاعری الفاظ و خیالات کے ساتھ کھیلنے کا ''فیشن'' ہے پھر اقبال، میر اور غالب کیسے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اقبال نے شعر میں......

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی
مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

اسی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ درد و سوز اور آرزو مندی ایسی بیش قیمت دولت ہے جس کے بدلے میں شان خداوندی بھی قبول نہیں۔ یہی چیز انسان کو میر، اقبال، غالب وغیرہ بناتی ہے۔ یہی نہیں تو شاعری میں عظمت، توانائی کیسے ہوگی؟

سوال: اردو زبان کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں آپ کیا مشورے دینا چاہیں گے؟

جواب: سب سے بڑا مشورہ یہ ہے کہ اردو سے محبت کیجیے۔ جس سے محبت ہوتی ہے اس کے لیے انسان قربانی دیتا ہے۔ جس طرح انسان بیوی بچے اور گھر سے محبت کرتا ہے اور ان کے لیے قربانی دیتا ہے اسی طرح اردو سے محبت کرنی ہوگی۔ اس کے بغیر اردو کی ترویج و اشاعت ممکن نہیں۔ صرف تقریر، تحریر، کتابوں کی اشاعت اور تنخواہوں سے اس کی ترویج و اشاعت نہیں ہو سکتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ صحیح اردو بولنا اور لکھنا سیکھیے، روایت کی پاسداری کیجیے، اس کو خوب پڑھیے اور لکھیے تب صحیح اردو آئے گی اور جب صحیح اردو آئے گی تو اس کا حسن ہمیں بھی اپنی طرف کھینچے گا۔ پھر لڑنے اور مطالبہ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی خود بخود سب اس کو اپنائیں گے۔ جب اردو میں یہ حسن تھا تو انگریز اور ہندو بھی اس میں شاعری کر رہے تھے۔ اب یہ حسن ختم ہو رہا ہے اس لیے لوگ اس سے دور ہو رہے ہیں۔

سوال: ''اردو دنیا'' کے قارئین کو آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

جواب: میرا پیغام یہی ہے کہ زندگی کو ٹھیک سے سمجھیے۔ زندگی میں سچائی اور عمل میں صداقت پیدا کیجیے۔ شاعری سچائی کی ترجمانی کرے اور قاری سچائی کو قبول کرنا سیکھے۔ قومی زندگی کو آج جو خود غرضی، جھوٹ اور ریاکاری کا زنگ لگ گیا ہے وہ نہ اچھا ادیب بنا سکتا ہے اور نہ اچھا قاری۔ ان سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا تب ہی اچھی زندگی، اچھا ادب اور اچھی شاعری کا لطف اٹھایا جاسکتا ہے۔

●●●

مظہر امام سے گفتگو

مظہر امام کا شمار موجودہ عہد کے ممتاز شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کی پیدائش 5 مارچ 1930 کو دربھنگہ میں ہوئی۔ گریجویشن تک تعلیم دربھنگہ میں ہی حاصل کی۔ اردو میں ایم۔اے علی گڈھ یونیورسٹی سے اور فارسی میں ایم۔اے، بہار یونیورسٹی سے کیا اور دونوں امتحانوں میں یونیورسٹی میں اول آئے۔ کلکتہ میں سی۔ایم۔او۔ہائی اسکول میں سات سال تک درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ رہے بعد ازاں آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام آفیسر کی حیثیت سے تقرری ہوئی۔ تیرہ سال دور درشن سے وابستہ رہے اور سری نگر دوردرشن سے بحیثیت ڈائرکٹر 1988 میں سبک دوش ہوئے۔

مظہر امام صاحب کے پانچ شعری مجموعے زخم تمنا (1962)، رشتہ گونگے سفر کا (1971)، پچھلے موسم کا پھول (1988) بند ہوتا ہوا بازار (1993)، پالکی کہکشاں کی (2000)۔ تنقیدی و تحقیقی مضامین کے چار مجموعے، آتی جاتی لہریں (1981)، ایک لہر آتی ہوئی (1997) تنقید نما (2004)، آزاد غزل کا منظر نامہ (1988) اور خاکوں کا مجموعہ "اکثر یاد آتے ہیں" (1993) شائع ہو چکے ہیں امریکن پروگرام انسٹی ٹیوٹ آف امریکہ نے مظہر امام کو ان مجموعی خدمات (لائف ٹائم اچیومینٹ) کے اعتراف میں 1998 میں "مین آف دی

ایز'' اعزاز دیا۔ اس کے علاوہ انھیں دلی اردو اکادمی ایوارڈ، بہار مظہر الحق ایوارڈ، غالب ایوارڈ، متھلا اکادمی ایوارڈ ساہتیہ اکادمی انعام مل چکا ہے۔

سوال: آپ کا رجحان شاعری کی طرف کیسے ہوا اور آپ نے شاعری کب شروع کی؟

جواب: میرے گھر میں شعر و ادب کا ماحول بالکل نہیں تھا۔ ہاں میرے ننیہال میں میرے ماموں منظور احمد نظر شاعری کا زبردست شوق رکھتے تھے۔ ان کی صحبت کا اثر کہیے یا پھر شوق۔ میرے بڑے بھائی افسانے بھی لکھنے لگے تھے اور شاعری بھی کرنے لگے تھے جبکہ مجھے شاعری سے بالکل دلچسپی نہیں تھی۔ میں اپنی ماں سے شکایت کیا کرتا تھا کہ بڑے بھائی کو پڑھائی کا کم اور شاعری کا زیادہ شوق ہے۔ لیکن انھی دنوں ایک مشاعرہ ہوا جس نے میری کایا پلٹ کر دی۔ مشاعرے سے واپسی کے بعد میں نے شاعری شروع کر دی۔ اس وقت میری عمر تیرہ (13) برس تھی اور میں میٹرک کا طالب علم تھا۔

سوال: آپ کے کیریئر میں بھی کافی تبدیلیاں آئیں۔ اگر میں غلط نہیں ہوں تو آپ کے کیریئر کا آغاز تدریس کے پیشے سے ہوا اور پھر سترہ برس ریڈیو اور اس کے بعد سری نگر دوردرشن میں ڈائرکٹر کے عہدے پر رہے اور وہیں سے سبک دوش ہوئے۔ یہ دونوں مختلف پیشے آپ کو کیسے لگے؟

جواب: جہاں تک دونوں پیشوں کے مختلف محسوس ہونے کا سوال ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ مجھ میں ہر طرح کے ماحول کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔ جب میں کالج میں پڑھتا تھا تو میں یونیورسٹی کا استاد بننا چاہتا تھا، میری یہ خواہش کسی حد تک پوری بھی ہوئی۔ گریجویشن کے بعد کلکتہ کے ایک روزنامہ اخبار ''کارواں'' سے بلاوا آیا اور میں اس میں کام کرنے لگا۔ لیکن 21 دن کے بعد وہ بند ہو گیا۔ دو مہینے میں نے فاقہ مستی میں گزارے اور اس کے بعد سات سال ایک اسکول میں پڑھایا، آل انڈیا ریڈیو میں 17 برس پروگرام ایگزیکٹیو اور دوردرشن میں تیرہ برس گزارے۔ جیسا کہ آپ جانتی ہیں کہ تدریس کے پیشے میں سنجیدگی تھی اور ریڈیو اور ٹی وی میں گلیمر تھا۔ لہٰذا ان کی طرف میلان ہونا ایک فطری چیز تھی۔ ریڈیو میں

آنے کے بعد میں نے کہا تھا کہ میں نے اپنی کشتیاں جلادی ہیں:

میں عکس عکس رنگ بہاراں میں کھو گیا
یہ حادثہ عجیب ہے ہونا تھا، ہو گیا

ٹی وی اور ریڈیو کا ماحول میرے مزاج کے مطابق تھا، یہاں میری شاعری کو بڑے بڑے رقیبوں کی صحبت سے تحریک ملی اور میں نے کشمیر کی غزلوں کے نام سے بہت سی غزلیں کہیں جو بہت مشہور ہوئیں۔ میری غزلوں کے مجموعے ''پچھلے موسم کے پھول'' پر ساہتیہ اکادمی کی طرف سے انعام بھی ملا۔

سوال: ''پچھلے موسم کا پھول'' جس پر آپ کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس کے کچھ پسندیدہ اشعار سنائے۔

جواب:

دل اکیلا ہے بہت لالۂ صحرا کی طرح
تم نے بھی چھوڑ دیا ہے مجھے دنیا کی طرح

مجھ سے یوں بچھڑو نہ تم عہد گذشتہ کی طرح
دل کے نزدیک رہو وعدۂ فردا کی طرح

تم ہوا ہو تو بکھیرو مجھے ساحل ساحل
موج ہے ہو تو بہا لو مجھے دریا کی طرح

سوال: آپ نے آزاد غزل کا نیا تجربہ کیا۔ اس ''صنفِ سخن'' میں جو آپ کی پہلی غزل تھی جسے آزاد غزل کی بنیاد کہنا بہتر ہوگا۔ اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: آزاد غزل کا تجربہ میں نے سترہ برس کی عمر میں کیا۔ اکثر غزل پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں غیر ضروری الفاظ لائے جاتے ہیں اور کبھی کبھی دو مصرعوں میں خیال پوری طرح ادا نہیں ہو پاتا ہے اور بہت سی باتیں مبہم رہ جاتی ہیں۔ اس زمانے میں، میں نے آزاد نظموں کا مطالعہ

کیا۔ میں نے دیکھا کہ مصرعے تو چھوٹے بڑے ضرور ہیں لیکن ہم قافیہ ہیں اور مجھے یک لخت لگا کہ ایسے تو آزاد غزل بھی کہی جا سکتی ہے یعنی شعر کے دونوں مصرعے چھوٹے بڑے ہوں لیکن قافیہ اور ردیف کی پابندی رہے جو غزل میں ہوتی ہے۔ پہلی بار 1962 میں میرے مجموعۂ کلام ''زخم تمنا'' میں یہ غزل شائع ہوئی۔ اس کے بعد میری دوسری آزاد غزل 1968 میں ''شب خون'' رسالے میں چھپی اور اس کا کافی چرچا ہوا۔ لاہور سے شائع ہونے والے رسالے ''فنون'' میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے مضمون میں اس کا بطور خاص حوالہ دیا اور وہاں کے مشہور شاعر ظفر اقبال نے بھی آزاد غزل کہی۔ اس طرح آزاد غزل کا سلسلہ چل نکلا۔ آج تک تین سو سے زیادہ شاعروں نے آزاد غزل کہی ہے جن میں قتیل شفائی، رفعت سروش، ساحر ہوشیار پوری، کرشن موہن وغیرہ شامل ہیں اور آج خوشونت سنگھ کے لفظوں میں:

"Waves of modernity swept over the traditional form of Ghazal in both the countries, India and Pakistan. So we have scores of poets in both the countries indulging in Azad (unfettered) Ghazal. Qateel Shifai is its best exponent from Pakistan.

Mazhar Imam who is the pioneer of this form of poetry is the best known modernist. A couplet from his Azad Ghazal."

یوں بھی جی لیتے ہیں جینے والے
کوئی تصویر سہی آپ کا پیکر نہ سہی

سوال: آپ تنقید کی طرف کیسے راغب ہوئے؟

جواب: میں بنیادی طور پر ادب کا قاری ہوں۔ میری دلچسپی ادب کی تخلیق سے زیادہ ادب کے مطالعے میں رہی ہے۔ میں نے اردو کے علاوہ انگریزی، فارسی اور انگریزی کے حوالے سے

دوسری زبانوں کے ادب کو پڑھنے کی کوشش کی۔ دورانِ مطالعہ جو خیالات ذہن میں آتے رہے ان کو نوٹ کرتا رہا۔ میں نے مخمور جالندھری کے مجموعے پر تبصرہ 1948 میں لکھا تھا۔ اس کے بعد کچھ مضامین میں نے ایسے لکھے جو رسمی تنقید سے ذرا ہٹ کر تھے اس لیے پسند بھی کیے گئے اور پھر بہت سے مضامین مذاکروں کے لیے لکھے۔ ''اکثر یاد آتے ہیں'' کے نام سے میں نے ادبی شخصیتوں کے خاکے شوقیہ طور پر لکھے جو کتابی صورت میں چھپے اور مقبول بھی ہوئے۔

سوال: ترقی پسند تحریک سے بھی آپ کا تعلق رہا ہے۔ آپ کن ترقی پسند شاعروں یا ادیبوں سے متاثر ہوئے؟

جواب: ترقی پسند ادبی تحریک سے میرا تعلق سولہ سترہ برس کی عمر سے ہی قائم ہو گیا تھا۔ اس وقت تک نئے ادب اور ترقی پسندی میں کوئی خاص فرق نہیں سمجھا جاتا تھا اس لیے ترقی پسند لکھنے والوں کے ساتھ محمد حسن عسکری، ن م راشد، میرا جی وغیرہ بھی میرے پسندیدہ لکھنے والے تھے۔ اس زمانے میں آسانی سے دستیاب ہو جاتے تھے۔ انگریزی کے شاعروں میں ایلیٹ، برنارڈ شاہ اور لوئی میکنیس سے میں خاصا متاثر رہا۔

سوال: آپ کی شاعری شیریں لب و لہجے، سادگی اور سنجیدگی سے عبارت ہے۔ یہ خصوصیات آپ کی شاعری میں کیسے آئیں؟

جواب: دراصل میرے مزاج میں بچپن سے ہی حسن پرستی اور نرمی کا دخل رہا ہے۔ میں ہر چیز میں حسن اور دلکشی تلاش کرتا ہوں۔ میں زندگی کے لیے نظم وضبط کو اہمیت دیتا ہوں اور یہی سلیقہ میری شاعری میں شروع سے ہی کارفرما رہا ہے۔ شاعری خیالات سے زیادہ الفاظ سے بنتی ہے اور میں نے الفاظ کے انتخاب میں حسن، دلکشی، نرمی اور شیرنی کا خاص خیال رکھا ہے۔ اصل میں شعر کہتے ہوئے یہ سب اپنے آپ آجاتا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگوں کو میری شاعری کا یہ پہلو بہت پسند آتا ہے۔

سوال: آپ کی شاعری کا ترجمہ کن زبانوں میں ہوا؟

جواب: میری شاعری کے ترجمے انگریزی، روسی، عربی، فارسی کے علاوہ ہندوستان کی تمام مشہور زبانوں یعنی بنگالی، مراٹھی، تمل، تیلگو، پنجابی میں ہوئے ہیں؟

سوال: شاعری اور عشق کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ کیا شاعری کے ساتھ آپ کی حقیقی زندگی میں بھی ایسا محسوس کیا جا سکتا ہے؟ جیسا کہ آپ نے لکھا ہے:

میں تیرا ہی ہو کے رہ گیا ہوں
ورنہ یہ جہاں بھی کیا برا ہے

دل اکیلا ہے بہت لالۂ صحرا کی طرح
تم نے بھی چھوڑ دیا ہے مجھے دنیا کی طرح

جواب: یہ رشتہ بڑا ہی فطری ہے۔ لیکن اس کا اثر حقیقی زندگی پر پڑنا ضروری نہیں۔ ہاں میری شاعری ایسی ضرور ہے جیسے کہ دل اکیلا ہے......وغیرہ۔ یہی احساس شاعر کو عام آدمی سے الگ کر دیتا ہے۔ عام آدمی ہزاروں مرتبہ یہ سب سوچتا ہے مگر کہہ نہیں پاتا۔ شاعر کہہ کر دل ہلکا کر لیتا ہے۔ اصل میں خوبصورت رشتوں کی اہمیت کا احساس اور لفظوں میں پرو کر انھیں دلکش بنانا ہی شاعری ہے۔

سوال: ادب اپنے زمانے کے تابع ہوتا ہے اور اس کے مطابق ادب میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ کیا آپ کی شاعری میں یہ تبدیلیاں واقع ہوئیں؟

جواب: میری شاعری ہمیشہ زمانے کے بدلتے ہوئے رجحانات کا ساتھ دیتی رہی ہے۔ میری شاعری کا ابتدائی دور کلاسیکیت سے متاثر رہا۔ اس کے بعد اس پر ترقی پسند تحریک کا اثر رہا۔ پھر جدیدیت کا رجحان ہوا اس کے بعد کھلے ذہن سے سوچنے کا رجحان بھی ہوا جو ان دونوں سے الگ ہے۔ میں نے خود بھی اسے پسند کیا اور میری شاعری پر اس کا اثر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

سوال: آپ کی شاعری پر عالمیت کا کتنا اثر ہے؟

جواب: میری شاعری پوری انسانیت سے وابستہ ہے۔ اپنی قوم اور اپنے وطن کی تمناؤں اور آرزوؤں کا اظہار جو میری شاعری میں ہوا ہے، وہ بھی کسی محدودیت کو ظاہر نہیں کرتا۔ پوری دنیا آج جن مسائل سے دوچار ہے، ان پر میری نظر ہے اور میں ان پر غور و خوض بھی کرتا

رہتا ہوں۔ میری نظم ہو یا غزل، وہ آج کے تقاضوں سے الگ نہیں ہے۔ بین الاقوامیت یا عالمیت کے مطالبات سے آج کا حساس شاعر آنکھیں نہیں چرا سکتا۔ دنیا سمٹ کر بہت چھوٹی ہوگئی ہے۔ میری شاعری عالمی نظریات سے ہم آہنگ ہے۔

سوال: موجودہ دور میں جب یہ کہا جانے لگا تھا کہ اردو کا دائرہ سمٹ رہا ہے ایسے میں قومی اردو کونسل نے ایک وسیع لائحۂ عمل کے ساتھ اس زبان کے تحفظ اور بقا کی کوششیں کی ہیں۔ ان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اسم با مسمیٰ ہے۔ اس نے اردو زبان وادب کے فروغ میں کئی اہم کام کیے ہیں۔ کمپیوٹر کے ذریعے اس نے اردو کو نئے زمانے کا ہم قدم بنایا ہے۔ جگہ جگہ اردو کتاب میلے کے ذریعے اس نے اردو کتابوں کو قارئین کے ایک وسیع حلقے تک پہنچایا ہے اور اردو جاننے والوں کو اپنی زبان کی کتابیں خرید کر پڑھنے کی طرف راغب کیا ہے۔ قومی کونسل نے اردو کتابوں کی اشاعت کا ایک اعلیٰ معیار بھی قائم کیا ہے۔ نہ صرف ادبی، بلکہ سائنسی، معاشی، سماجی اور دوسرے موضوعات پر بھی اس نے کارآمد کتابیں شائع کی ہیں۔ امید ہے قومی اردو کونسل اپنے دائرہ کار کو مزید بڑھائے گی، اور اردو والوں کی تمام توقعات کو پورا کرے گی:

یہ انتہا نہیں، آغاز کارِ مرداں ہے

سوال: ''اردو دنیا'' کے قارئین کے نام آپ کیا پیغام دیں گے؟

جواب: اردو زبان کے تحفظ اور بقا کی کوشش میں عملی تعاون دیجیے اور اپنے بچوں کو اردو ضرور پڑھائیے۔ اگر آپ کے بچے اردو سے ناآشنا رہ گئے تو وہ اپنی تہذیبی اور ثقافتی جڑوں سے کٹ جائیں گے۔

•••

رفعت سروش سے گفتگو

جناب رفعت سروش 2 جنوری 1926 کو نگینہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ اب تک ان کے 11 شعری مجموعے، 9 منظوم ڈرامے اور اوپیرا، 6 ناول، افسانے اور ڈرامے، 6 مجموعہ مضامین، تین حصوں میں خودنوشت، تین تراجم اور ہندی میں پانچ کتابیں چھپ چکی ہیں۔

جناب رفعت سروش کی قومی اقبال سمان، سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ، ہم سب غالب ایوارڈ، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، آغا حشر کاشمیری عالمی ایوارڈ کے علاوہ متعدد اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ موصوف 1945 سے 1984 تک آل انڈیا ریڈیو سے ایک ناٹک کار، نغمہ نگار، پروڈیوسر، ڈائرکٹر اور افسانہ نگار کے طور پر جڑے رہے اور ریڈیو میں اردو ادب کی آن بان اور شان کو محفوظ رکھا۔

سوال: آپ شاعری کی طرف کیسے راغب ہوئے؟

جواب: میں جس گھر میں پلا بڑھا، وہاں منشی اور منشی کامل کے طلبہ میرے بھائی مولانا ممتاز علی سے پڑھنے آتے تھے۔ وہ خود ایک اچھے شاعر تھے اور اپنے شاگردوں کو شاعری کے نکات سے

واقف کراتے رہتے تھے۔ چونکہ میرا بچپن موانہ ضلع میرٹھ میں ان کے ساتھ ہی گزرا اس لیے مجھے بھی شاعری سے دلچسپی ہو گئی۔ 1938 کی بات ہے جب میں قریب 10-12 سال کا ہی تھا، آپ یقین نہیں کریں گی ان دنوں میں نے ایک شعر کہا تھا

اگر گل دکھاتا ہے آثار نکہت
تو کرتا ہے گلچیں تشدد نمائی

مجھے اب احساس ہوتا ہے کہ اس وقت میں شاعری کی طرف کیسے راغب ہوا۔ ماحول کا اثر کتنا اہم ہوتا ہے۔ یہ شعر میرے مزاج اور میری زندگی کی تصویر کھینچتا ہے۔ میں ایک واقعہ بیان کرنا چاہوں گا۔ میں آٹھویں جماعت میں تھا اور ایک ڈپٹی کلکٹر اسکول کا معائنہ کرنے آئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہر بچے کو اپنی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور بنانا چاہیے۔ انھوں نے جب مجھ سے پوچھا تو میرا جواب تھا ''میں ایک شاعر بننا چاہتا ہوں۔'' سو کیتی جی میں نے 1941 تک نگینہ میں رہ کر شاعری کی۔

سوال: اس کے بعد؟

جواب: میرا جھکاؤ مصوری کی طرف بہت تھا۔ مصوری کا میری زندگی میں ایک بہت اہم کردار ہے۔ میں نے سب سے پہلے شاہ جہاں کی تصویر بنائی جس پر مجھے انعام بھی ملا، لیکن میرے بڑے بھائی نے کہا کہ مصوری ایک بہت بڑا گناہ ہے سو میں انسانوں کے بجائے پیڑ پودوں کی مصوری کرنے لگا، جس کا عکس میری شاعری میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ اس مصوری نے آڑے دنوں میں میرا کافی ساتھ دیا۔ اکثر چادروں، تکیوں، دوپٹوں اور ساڑیوں پر بیل بوٹے بنا کر میں نے پیسہ کمایا اور اپنی روزی روٹی چلائی۔ پھر 1942 میں میں نے جدید شاعری کی۔ اس کا محرک لاہور کا ''حلقۂ اربابِ ذوق'' تھا۔ انھی دنوں میری ملاقات اختر الایمان سے ہوئی اور میرا حوصلہ بڑھا۔ میرا کلام لاہور کے اہم رسالوں ''شاہکار''، ''ہمایوں'' اور ''ادبی دنیا'' میں چھپنے لگا اور یہاں سے میرا ادبی سفر شروع ہوا۔ میری پہلی نظم تھی ''گلاب کا پھول'' پھر ''اندھیری رات'' اور ''نجم سحر'' وغیرہ نظمیں کہیں پھر میرے اندر کا مصور جاگ اٹھا اور مجھے قدرتی شاعری کی طرف لے آیا۔

اس کے بعد میں 1943 میں دہلی آیا۔ اس دوران میری ملاقات مجاز سے ہوئی ان کی وجہ سے میرا رجحان ترقی پسند ادب کی طرف ہوا۔ اس نشیب و فراز اور جدو جہد کی دنیا میں شاعری اور مصوری کے خوابوں کے دور سے گزرتے ہوئے 1945 میں فلم نگری ممبئی میں اپنی قسمت آزمانے جا پہنچا۔

سوال: فلم نگری میں پہنچ کر تو ہر کوئی پروڈیوسر، ڈائرکٹر بننے کا خواب دیکھنے لگتا ہے، کیا آپ کے ساتھ ایسا کبھی ہوا؟

جواب: ممبئی میں میں ایک اہم قلم کار کی حیثیت سے جانا جانے لگا۔ ان دنوں ریڈیو ایک بڑا اہم میڈیا تھا جس میں بڑی نامی گرامی ہستیاں پروگرام کرنے آتی تھیں۔ جیسے سردار جعفری، کیفی اعظمی، سجاد ظہیر، کرشن چندر، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس اور دیگر عظیم ہستیاں، میں بھی اس گروپ کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ اس وقت ہندوستان کی ''ادبی دنیا'' کے جانے مانے شاعروں میں میرا نام بھی شمار ہونے لگا۔

اکتوبر 1945 میں حیدر آباد میں منعقد ہونے والی انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں میں نے حصہ لیا۔ وہاں فراق گورکھپوری، مخدوم محی الدین، ساحر لدھیانوی، قاضی عبدالستار وغیرہ ان تمام شخصیتوں نے مجھے بہت متاثر کیا اور میں اردو ادب کی وسیع دنیا سے روشناس ہوا۔

سوال: آپ کو شاعری کے ساتھ ساتھ اوپیرا (Opera) میں بھی مہارت حاصل ہے اور آپ نے بہت سارے اوپیرا لکھے ہیں۔ کیا اس کی تفصیل بتائیں گے؟

جواب: آپ نے Opera کے بارے میں بات کی لیکن اس سے پہلے میں ریڈیو کے لیے Verse Plays لکھے اور پروڈیوس کیے جو بہت مقبول ہوئے اور شائع بھی ہوئے۔ لیکن اوپیرا اس سے مختلف ہے۔ 65-1964 کی بات ہے جب میں دہلی ریڈیو اسٹیشن میں ایک رائٹر پروڈیوسر کی حیثیت سے تبادلے پر آچکا تھا، مجھے سحر اچھرت رام نے تاج محل پر بیلے (Ballade) لکھنے کی پیش کش کی جسے خاص طور سے غیر ملکی سیاحوں کے لیے تیار کرنا تھا۔ یہ میرا Stage کا پہلا Opera تھا جسے ''بھارتیہ کلا کیندر'' نے سرود نواز جناب امجد علی خاں کی موسیقی اور کرشن کمار کی کیروگرافی کے ساتھ تیار کیا اور اسے مسلسل 5 مہینے ہوٹل شیراز میں دکھایا گیا۔

1980 میں یہی اوپیرا ''شاہ جہاں کا خواب'' کے نام سے ''پھول والوں کی سیر'' کے جشن میں ''کتھک کیندر'' اور ''بھارتیہ کلا کیندر'' نے مل کر پیش کیا۔ 1970 میں ''جہاں آرا'' لکھا جس کی موسیقی ڈاکٹر وشنو کھرانا نے اپنے ذاتی ادارے گیتکا کے لیے تیار کی اور یہ اوپیرا ہاؤس دلی کے علاوہ چنڈی گڑھ، لکھنؤ اور حیدر آباد میں دکھایا گیا۔ بلراج ورما نے اس کے متعلق ایک بھرپور مضمون لکھا۔ اس کے علاوہ ''روشنی'' جو گاندھی جی کی وفات پر دکھایا گیا اور ''شیریں فرہاد'' جسے ریڈیو سیلون پر پیش کیا گیا۔

اس کے علاوہ دوسرے اوپیرا بھی ہیں جیسے ''شانِ مغل''، ''انارکلی''، ''حبہ خاتون''، ''تماشا میرے آگے''، ''مانو ادھیکار''، ''رنگ بسنتی''، ''ساون بھادوں''، ''ڈگر پنگھٹ''، ''قسمت کے پھول'' اور ''روشنی کا کارواں'' جو 1984 میں ایوانِ غالب میں اردو اکادمی کے تعاون سے پیش کیا گیا۔

ریڈیو کے لیے پروین رائے جو ایک رقاصہ تھی اس پر اوپیرا لکھا۔ ''رنگ بسنتی'' اور ''ساون بھادوں'' مشہور مغنیہ نینا دیوی نے ٹیلی ویژن پر خود پیش کیے۔ منظوم ریڈیائی ڈراموں میں نئی صبح World Peace پر ''پروازِ آدم''، ''زمین آدم'' اور ''وقت گیت گاتا ہے'' مجھے بہت اچھے لگے اور وہاں ہندستان کی آزادی پر میرا پہلا اوپیرا جو 15 اگست کے موقع پر دکھایا گیا ''ہندستان شادمانی کے دروازے پر''۔

سوال: آپ کے ہم عصر شاعروں جیسے کرشن موہن، بانی، راہی، کمار پاشی، مخمور سعیدی، مخمور جالندھری اور بلراج کومل سب چوٹی کے شاعر ہیں مگر شہرت اور انعامات سب سے زیادہ آپ نے ہی حاصل کیے، اس کا سہرا کس کے سر جاتا ہے؟

جواب: مکتی جی! بنیادی طور پر اس کی وجہ میری شاعری ہی ہے اور ان نقادوں کے سر بھی سہرا ہے جنھوں نے میری شاعری کو سمجھا، مانا، لیکن مجھے شکایت ہے کہ جو پہچان مجھے ملنی چاہیے وہ نہیں ملی اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے ہم عصر لوگوں کی کتابیں پہلے آگئیں اور میری بعد میں چھپیں کیوں کہ میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ کتابوں کے چھپنے کا بڑا اثر ہوتا ہے۔

سوال: ہم جس زندگی کی کشتی پر سوار ہیں، یہ کب ڈگمگا جائے کون سا جھٹکا کہاں لے جائے کچھ کہا نہیں جا سکتا، لیکن ان گردشوں سے گزر کر بھی آپ ایک بہادر سپہ سالار کی طرح ثابت قدم رہے، یہ کیسے ممکن ہوا؟

جواب: غالب نے فرمایا کہ:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

غالب کے اس شعر کی تشریح ہی میری زندگی کا نچوڑ ہے۔ آج تک میں نے ناامیدی کو پاس نہ آنے دیا اور بڑے صاف لہجے میں کہتا ہوں جیسا کہ میر نے کہا ہے:

بڑے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

میں ہر مشکل میں کھڑا رہا، مجھے احساس ہونے لگا کہ میرے ساتھی مجھے نظر انداز کر رہے ہیں لیکن میرے قلم نے لکھا:

کہاں کہاں بجھاؤ گے میری نوا کی مشعلیں
تمام زندگی کو نغمہ وار چھوڑ جاؤں گا
میں حرف حرف ہوں سرِدش اک یقینِ زندگی
میں لفظ لفظ اپنا اعتبار چھوڑ جاؤں گے

اور مسکراتے ہوئے کہا یہ میری قوت ہے کہ میں ناکامی سے نہیں ڈرتا، بیماری آئے گی چلی جائے گی، مجھے زندگی کا یقین ہے اور خدا کی ذات پر ایمان بھی۔

سوال: بیماریوں اور موت کے ساتھ میں رہ کر آپ نے زندگی کو جس خوبصورتی سے جیا ہے، یہ سب کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ ہمت و حوصلہ آپ میں کیسے آیا؟

جواب: جب آدمی زندگی گزار رہا ہوتا ہے تو ہمیشہ اسے اس سے بہتر بنانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ میں لا اُبالی شاعر بن کر نہیں جیا، میں نے اپنی شامیں بار میں نہیں گزاریں، گھر سے بے نیازی نہیں برتی۔ ان سب باتوں نے مجھے ایک خوبصورت زندگی دی۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

میں نے اپنے بچوں کی پرورش کے لیے کسی سے کوئی سہارا نہیں لیا۔ سماجی رہتے اور دوستوں کے تعلقات کا بھی لحاظ رکھا۔

سوال: ایک تخلیق کار کو اپنی تمام تخلیقات عزیز ہوتی ہیں، پھر بھی کوئی ایک نظم سنائے جو آپ کو سب سے زیادہ پسند ہو؟

جواب: نظم سنیے۔ عنوان ہے ''بچپن''۔

ایک چھپر کا گھر نیم کے سائے میں
اونگھتا ہے دھندلکے میں لپٹا ہوا
شام کا وقت ہے اور چولھا ہے سرد
صحن میں ایک بچہ برہنہ بدن
باسی روٹی کا ٹکڑا لیے ہاتھ میں
سر کھجاتا ہے جانے ہے کس سوچ میں
اور اُسارے میں آٹے کی چکی کے پاس
ایک عورت پریشان خاطر اداس
اپنے رخ پر لیے زندگی کی تھکن
سوچتی ہے کہ دن بھر کی محنت کے بعد
آج بھی روکھی روٹی ملے گی ہمیں
تم حقارت سے کیوں دیکھتے ہو اسے
دوست یہ میرے بچپن کی تصویر ہے

سوال: آپ کی شاعری گلوبلائزیشن سے کتنی جڑی ہے؟

جواب: آج نیا نعرہ لگا ہے گلوبلائزیشن کا۔ ہم ترقی پسند مصنفوں نے اپنے آپ کو کبھی بھی جغرافیائی حدوں میں محدود نہیں سمجھا بلکہ دنیا کو اپنا گھر تصور کیا۔ اقبال نے صحیح کہا تھا

نہ میں عجمی نہ ہندی نہ عراقی نہ حجازی
کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی

ترقی پسند تحریک نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ ادب کو وطنیت کی حدوں سے آگے بڑھ کر اسے آفاقیت دی اور دنیا میں جہاں جہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے سروکار رکھا۔ ہم لوگوں نے امنِ عالم کا نہ صرف خواب دیکھا بلکہ اس کے لیے جدوجہد بھی کی۔ انسانیت کے درد کو اپنا درد سمجھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ گلوبلائزیشن کا یہی مطلب ہے۔ ہمارے کسی شاعر نے کہا ہے

گو میرے دل کو زخم ذاتی ہیں
ان کی ٹیسیں تو کائناتی ہیں

سوال: عصر حاضر کی شاعری، قدیم شاعری اور مستقبل کی شاعری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: اچھی شاعری اپنے وقت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ہم جسے پرانی شاعری کہتے ہیں وہ پرانے وقت کی تھی۔ آج جو شاعری ہو رہی ہے وہ آج کے ماحول کی عکاسی کرتی ہے اور کل جو شاعری ہوگی اس میں کل کا ماحول ہوگا لیکن ایک بات بہت اہم ہے کہ سچا اور اچھا شاعر Basic Values کو لے کر چلتا ہے۔ اس لیے اگر آج ہم ان بنیادی اقدار کو اپنا موضوع بناتے ہیں تو کل بھی اس کا اثر باقی رہے گا۔

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اِک مصرعۂ تر کی صورت

سوال: پچھلی ایک صدی میں جس طرح تبدیلیاں رونما ہوئیں، ان کا کس حد تک اثر آپ کی شاعری پر پڑا؟

جواب: ابھی ایک نعرہ اٹھا تھا مابعد جدیدیت کا۔ مجھے لگا کہ یہ تصور ہر زمانے میں ہی میرے ساتھ رہا جب ترقی پسندی کا دور تھا میں نے ان سے ہٹ کر لکھا جب نراشا کی بات ہوئی تو میں نے آشا کی بات لکھی اور اب پچھلے برسوں سے مجھے بہت تکلیفیں جھیلنی پڑیں۔ نیچرل کلائمٹی نے میری شاعری پر بہت اثر کیا، میرے اپنے تاثرات بدلے کیونکہ میری زندگی میں بدلاؤ

آیا پھر بھی میں نے Negative رویے سے گریز کیا۔ آشا وادی رہا اور آج تک ویسا ہی لکھتا آ رہا ہوں۔

سوال: قومی اردو کونسل کی کوششیں اردو کے سلسلے میں کیسی لگیں؟

جواب: قومی اردو کونسل ایک ملٹی پرپز ادارہ ہے جس میں کتابیں چھاپنا، رائٹرز کو امداد دینا بہت دنوں سے چلا آ رہا ہے۔ لیکن پچھلے کچھ برسوں سے اس ادارے نے اپنے فعال سربراہ کی رہنمائی میں اردو تعلیم کے پھیلاؤ کے لیے جو نئے قدم اٹھائے ہیں وہ قابل تعریف ہیں۔ خاص طور پر کونسل ضرورت مند اداروں کو کمپیوٹر مہیا کراتی ہے اور اس وجہ سے کمپیوٹر اردو میں کام کرنے کی تعداد بڑھ رہی ہے اور روزگار کے مواقع میسر ہو رہے ہیں۔ انھوں نے کئی جگہ پر کتاب میلے بھی لگوائے جس کی وجہ سے لوگوں میں کتابیں پڑھنے کا شوق بھی بڑھا ہے۔ کونسل کی کتابوں کی قیمت بھی بہت کم رکھی جاتی ہے۔ یہاں سے بڑی بڑی تعداد میں علمی اور تحقیقی کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں۔ یہ ادارہ ایک اچھا کام انجام دے رہا ہے۔ ان کے دو اہم رسالے نکلتے ہیں ''فکر و تحقیق'' جس میں تنقیدی اور تحقیقی مضامین میں شامل ہوتے ہیں اور ''اردو دنیا'' جس میں معلوماتی مضامین کے علاوہ اردو دنیا کے متعلق خبریں بھی شائع ہوتی ہیں۔ ان دونوں رسائل کا معیار کافی بلند ہے اور سرکولیشن بھی بہت ہے۔ ابھی کچھ دنوں پہلے اردو رسم خط سے ناواقف حضرات کے لیے دیوناگری میں ایک رسالہ ''اردو درپن'' کے نام سے شروع کیا گیا ہے۔ یہ بھی ایک اچھی کوشش ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ قومی اردو کونسل اسی طرح فعال رہے گی اور اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے نئے نئے اقدامات کرتی رہے گی۔ ملکی حالات کے تناظر میں یہ ادارہ اردو کے لیے حیاتِ ثانیہ کے مترادف ہے۔

•••

مظفر حنفی سے گفتگو

پروفیسر مظفر حنفی (پیدائش: یکم اپریل 1936 کو کھنڈوہ مدھیہ پردیش) اردو کے ممتاز ترین شاعروں میں سے ہیں اور ہندوپاک کے ایسے منفرد غزل گو ہیں جنھیں اپنے لہجے کی بنا پر دور سے پہچانا جاتا ہے۔ حنفی صاحب 70 سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں اور تنقید کے میدان میں بھی انھیں صاحب طرز تسلیم کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اردو کی دنیا انھیں کئی معیاری کتب کے مرتب و تدوین کار، باریک بیں محقق، اچھے افسانہ نگار، بہترین مترجم اور ماہر ادب اطفال کی حیثیت سے بھی خوب پہچانتی ہے۔ ان کے ادبی سفر اور موجودہ ادبی صورت حال پر ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی نے خصوصی گفتگو کی، جس کے اقتباسات پیش ہیں:

سوال: آپ نے جس دور میں اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا، وہ کیسا دور تھا اور آپ کے گرد و پیش کا کیا ماحول تھا؟

جواب: ویسے تو انسانی فطرت ہے کہ اسے ماضی ہمیشہ سنہرا نظر آتا ہے۔ لیکن عرض واقعہ یہ ہے کہ جس زمانہ میں ہمیں ادبی ذوق کی لت لگی وہ ایک ایسا زمانہ تھا، میں سن 47 کے آس پاس کی بات کر رہا ہوں، یعنی آزادی سے پیش تر ہمارے یہاں کچھ اس قسم کا ماحول تھا کہ یقین جانیے

کھیتوں میں ہل چلاتے ہوئے کسانوں کو مسدس حالی کے پورے پورے بند گنگناتے ہوئے میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔ بسوا فتح پور ورنا کولر مڈل اسکول پاس کیا تھا اور ساتویں کلاس میں کھنڈوا مدھیہ پردیش منتقل ہو گیا تھا۔ وہاں میرے تایا زاد بھائی کا بڑا کاروبار تھا۔ ہندوستان، پاکستان سے نکلنے والا شاید ہی کوئی اچھا رسالہ ہو جو اُن کی دکان پر نہ آتا ہو، وہ بہت زیادہ پڑھے لکھے آدمی بھی نہیں تھے اور نہ ہی کوئی زیادہ ادبی ذوق تھا لیکن باور فرمائیں کہ عالم گیر، ادبی دنیا، نیرنگِ خیال، ایک دہلی سے کہکشاں نکلتا تھا وہ، ساغر نظامی کا شاعر آتا تھا، ایشیا آتا تھا، ناگپور سے نقاد نکلتا تھا اور ایسے کم از کم بارہ تیرہ رسالے اردو کے اس جگہ پر آتے تھے، اور ہمارے جو کلاس فیلو تھے وہ ان ادبی رسالوں سے بھرپور استفادہ کرتے تھے۔ مشاعروں میں صورت حال یہ تھی کہ میں نے جگر، فراق، نشور واحدی، ناطق گلاوٹھی، ماہر القادری، ساغر نظامی جیسے شعرا کے ساتھ ساتھ دلی لکھنوی اور اس قسم کے مشاعروں کے مقبول شاعروں کو شریک ہوتے دیکھا ہے اور یہ بھی دیکھا کہ ادبی شعرا خواہ کتنے ہی بھونڈے انداز میں پڑھ رہے ہوں، انھیں ترنم سے زیادہ کوئی علاقہ نہیں ہوتا تھا سوائے ماہر القادری اور ساغر نظامی وغیرہ کے جو مشاعرے کے شاعر سمجھے جاتے تھے لیکن ادبی شعرا ان کے مقابلہ میں زیادہ پسند کیے جاتے تھے... یگانہ تحت میں پڑھتے تھے، شاد عارفی تحت میں پڑھتے تھے، فراق تحت میں پڑھتے تھے اور سارے نمایاں شاعر تحت میں ہی پڑھتے تھے اور زیادہ پسند کیے جاتے تھے۔ یہ وہ دور تھا میاں جب میں نے اردو ادب کی دنیا میں قدم رکھا، بچوں کے لیے کہانیاں لکھنے سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا اور اس کے بعد آگے سلسلہ چلا جس سے آپ واقف ہیں۔

سوال: آپ نے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیسے کیا، کن باتوں سے متاثر ہو کر ادبی دنیا میں قدم رکھا؟

جواب: ہمارے اساتذہ میں، مڈل اسکول میں ایک استاد احسان حمید تھے۔ وہ ادبی ذوق کو فروغ دینے کی کوشش کرتے تھے۔ ہمیں آٹھویں اور نویں جماعت میں مصرعہ طرح دیا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ اس کے اوپر شعر کہہ کر لائیے اور مجھے یاد ہے کہ پہلی مرتبہ جب مجھے مصرعہ طرح دیا گیا تھا، یہ بڑا دلچسپ واقعہ ہے، مصرع تھا: 'سمندر میں گرے گا خون کا دریا رواں ہو کر'۔

اس زمانہ میں جو دوسری عالمگیر جنگ تھی جس میں ہٹلر کو شکست ہوئی تھی، اس سلسلہ سے یہ مصرعہ متاثر تھا، میرا خیال ہے کہ یہ 44یا45 کے آس پاس کی بات ہے اور ہم نے اس میں چار پانچ مصرعے کہے، ہم لوگوں کو مشکل اشعار دے دیے جاتے تھے کہ اس کی تقطیع کر کے لے آؤ۔ یہ میں ساتویں اور آٹھویں کلاس کے طلبہ کی بات کر رہا ہوں...تو اس مصرع پر بہت سارے شعر کہتے ہوئے ایک شعر میں نے کہہ دیا: 'جوانی کی دعا بچوں کو ناحق لوگ دیتے ہیں ''یہی بچے مٹاتے ہیں جوانی کو جواں ہو کر'۔ جب میں نے غزل کے چار پانچ شعر پڑھے تو پسند کیے گئے، اور جب یہ شعر پڑھا تو آپ سمجھ لیجیے کہ برسر مشاعرہ گاہ مولوی شبراتی صاحب نے میری پیٹھ کے اوپر ایک زوردار چھڑی لگائی اور کہا کہ 'نامعقول تو جج کے یہاں چوری کر رہا ہے'۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہے، تو انھوں نے بتایا کہ یہ اکبرالہ آبادی کا شعر ہے۔ تو یہ صورت حال تھی، وہ اکبرالہ آبادی کا شعر تھا، ظاہر ہے کہ ذہن میں کہیں رہا ہوگا جو کہ غزل کہتے ہوئے درمیان میں آ گیا۔ لیکن یہ شعوری طور پر نہیں ہوا تھا۔ جب ہم گھر آتے تھے تو بہت سارے رسالے ملتے تھے۔ ہمارے بھائی صاحب کا کتابوں کے لیے سالانہ ایک خاص بجٹ تھا، مجھ سے کہتے تھے کہ بھائی تم شعروادب میں دلچسپی رکھتے ہو، کتب کی فہرست آئی ہے اس میں سے ڈیڑھ دو سو کتابیں منتخب کر لو اور اس طرح ہر سال ڈیڑھ دو سو کتابیں خریدی جاتی تھیں۔ تیرتھ رام فیروز پوری کا میں دیوانہ تھا، وہ جاسوسی ناول لکھتے تھے اور مجھے انگریزی کے جاسوسی ناول بہت پسند تھے۔ اس وقت جب میں آٹھویں جماعت میں تھا پورا سیٹ جس میں تیرتھ رام کی تقریباً سوا سو کتابیں تھیں خرید لیا تھا۔ جاسوسی دنیا کا وہ بہت ہی بڑا ناول نگار تھا لیکن اس کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے، اس پر تو پی ایچ ڈی ہونی چاہیے تھی۔

سوال: آپ نے اپنے ادبی سفر کا آغاز بچوں کے ادب سے ہی کیوں کیا؟

جواب: جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا اور بہت سارے رسالوں کے نام لیے اس میں ایک رسالہ اور جڑتا ہے، یہ تقریباً 1948 کے آس پاس کی بات ہے کہ رسالہ شمع نکلا، شمع سے پھر بچوں کے لیے رسالہ کھلونا نکلا۔ اس کا پہلا ہی شمارہ دیکھ کر میں اس پر فدا ہو گیا تھا، اور پھر یہیں دہلی سے ہی کوئی کامل اختر تھے انھوں نے پھلواری نام کا رسالہ نکالا۔ یہ دونوں رسالے

بھی وہاں (کھنڈوا مدھیہ پردیش) پہنچتے تھے، تو میں نے ان کی کہانیاں پڑھیں اور 49 میں ہی میں نے کھلونا کے لیے مختصر سی کہانی لکھی، وہ بچوں کی کاوشوں میں اس زمانہ میں چھاپا کرتے تھے، اس میں چھپی، اس کے بعد پھر آزادانہ کہانیاں لکھیں، بہت جلد ہی بچوں کے دیگر رسائل میں چھپنے لگا، جن میں کھلونا ہے، کلیاں ہے، جگنو بھوپال سے نکلتا تھا اس میں چھپا، پھول نکلتا تھا، کراچی سے دوست نکلتا تھا، اس قسم کے بہت سارے رسائل نکلتے تھے اور ان تمام رسالوں میں میں بچوں کے لیے کہانیاں لکھتا تھا۔ اس وقت میں نویں جماعت کا طالب علم تھا، اور میری عمر تیرہ یا چودہ سال رہی ہوگی۔ پھر سن 52 سے میں بڑوں کے لیے افسانے لکھنے لگا تھا، چونکہ بچوں کے لیے افسانہ لکھنے کی وجہ سے میں کافی معروف ہوگیا تھا، اسی زمانہ میں نسیم بک ڈپو نے مجھے کچھ ناول ترجمہ کرنے کے لیے دے دیے تھے، وہ کر دیتا تھا تو بڑے ادبی رسالوں میں جیسے شمع، بیسویں صدی اور ایک رسالہ کہکشاں نکلتا تھا، دہلی سے ایک صاحب آریہ ورت نکالتے تھے، ان ابتدائی دور میں ایک دو سال تک افسانے چھپے، پھر شاہراہ میں ظ انصاری صاحب نے چھاپ دیا اور جب آئینہ نکلا تو اس میں چھپنے لگا تو، سن 52 سے لے کر 58 تک میں نے مسلسل افسانے لکھے اور میں نے تقریباً ڈیڑھ سو افسانے لکھے ہیں جن کے تین افسانوی مجموعے بھی چھپ چکے ہیں۔ اسی سلسلہ میں ایک دلچسپ بات اور بھی ہے کہ میں جاسوسی ناول نگار ہوتے ہوتے بچ گیا۔ الہ آباد میں مان سرور پبلی کیشن سے گوری چند اختر مان سرور نام کا ایک رسالہ نکالتے تھے، انھوں نے مجھے جاسوسی ناول لکھنے میں لگا دیا تھا اور مجھے ایک ناول کے سوا سو روپے دیتے تھے۔ اس وقت میں نے ان کے لیے 6 ناول لکھے تھے، یہ سن 50 کی بات ہے، تو 5 یا 6 ناول میرے مان سرور میں چھپے تھے۔ ہمارے دوست تھے رضا علی عابدی جو بعد میں بی بی سی لندن میں ہو گئے تھے، ان کا میرے پاس بڑا لمبا چوڑا خط آیا کہ آپ اچھے خاصے افسانہ نگار تھے، اب یہ کیا کر رہے ہو، یہ جاسوسی ناول کیوں لکھنے لگے، محدود ہو کر رہ جاؤ گے، ان کی باتوں سے مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ اس میں کوئی مستقبل نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ آج دیکھ لیجیے ابن صفی اتنا بڑا جاسوسی ناول نگار ہے لیکن اس کو ادبی حیثیت آج تک نصیب نہیں ہوئی تو اس طرح سے افسانہ نگاری کا سلسلہ شروع ہوا اور سن 58 میں جا کر میری پٹری بدلی۔

سوال: آخر کیا وجہ ہوئی ،کون سی بات نے آپ کو اتنا متاثر کیا کہ افسانوی دنیا کو بھی چھوڑ کر آپ شاعری کی دنیا میں آ گئے؟

جواب: ہوا یہ کہ میاں، سن 58 میں ہمارے بہت سارے کھنڈوا میں دوست تھے ،کھنڈوا مدھیہ پردیش کا بہت بڑا ضلع تھا جہاں تقریبا 9 پرائمری اور مڈل اسکول تھے جو کہ اردو میڈیم اسکول تھے ، جہاں سینکڑوں کی تعداد میں لڑکے تعلیم پاتے تھے لیکن مڈل کے بعد نویں کلاس میں اردو میڈیم کے طلبہ کے لیے داخلہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی تو وہاں کے جو اردو میڈیم کے طلبہ تھے اور اردو داں طبقہ کی جو آبادی تھی وہ تلملا کر رہ جاتی تھی۔ جو اتنی استطاعت رکھتے تھے اپنے بچوں کو باہر بھیج کر پڑھانے کی وہ بورڈنگ ہاؤس وغیرہ میں رکھ کر پڑھاتے تھے ورنہ آٹھویں جماعت کے بعد لڑکے ڈراپ لے لیتے تھے ،تو ہم نے وہاں ایک تحریک چلائی کہ اردو میڈیم ہائی اسکول بھی ہونا چاہیے کیونکہ اردو میڈیم کے بچوں کا بہت نقصان ہو رہا ہے۔اس زمانہ میں محسوس یہ کیا گیا کہ جب تک آپ کے پاس کوئی آرگن نہیں ہوگا،کوئی اخبار،کوئی رسالہ نہ ہو اس وقت تک آپ کی کوئی کامیاب تحریک نہیں ہو سکتی،تو وہاں سے ہم نے روزنامہ تو نہیں لیکن ماہنامہ نئے چراغ نکالا ۔ نئے چراغ نکالنے کے لیے کیا کرنا پڑا ،ممتاز میاں آپ تو ادارت سے واقف ہیں کہ اس میں اتنا وقت لگ جاتا ہے کہ باقی ماندہ کام کے لیے وقت ہی نہیں بچتا ،افسانہ لکھنے کے لیے وقت چاہیے کیونکہ پانچ یا دس منٹ میں آپ افسانہ نہیں لکھ سکتے ،وقت کم تھا اور شعر کا معاملہ ایسا ہے کہ ایک شعر آپ نے آج کہہ لیا دوسرا شعر جب پھر کبھی موقع ملا تب کہہ لیا، یا پھر تیسرا کہہ لیا،شاعری میں یہ سہولت تھی۔ دوسرا یہ بھی ہوا کہ جس کا ذکر اس سے پیش تر میں کر چکا ہوں کہ ہمارے یہاں جدیدیت کا رجحان جسے لوگ عام طور سے 60 سے شروع ہوا مانتے ہیں لیکن نہیں سن 58 سے سات رنگ ،سویرا اور مختلف رسائل جو پاکستان سے نکلے ہیں وہ سب 58 سے نکلے ہیں ،ہمارے یہاں اتفاق سے وہ بہت زیادہ دور تک نہیں چل پایا لیکن جدید رجحان کو فروغ دینے کے لیے نئے چراغ بھی بڑا اہم کردار ادا کر گیا جس میں مخمور سعیدی ،ندا فاضلی ،راہی معصوم رضا ،عمیق حنفی، بشر نواز ، شہریار ،امین اشرف ،خلیل الرحمٰن اعظمی اس قسم کے جدید لوگ بھی اس میں شریک ہوتے تھے

اور احتشام حسین صاحب، قاضی عبدالودود صاحب، نیاز فتح پوری، نثار احمد فاروقی، خلیق انجم وغیرہ بھی اس کے مضمون نگاروں میں سے تھے۔کھنڈوا بہت ہی غیر ادبی شہر مانا جاتا تھا اور 58 کو آپ ذہن میں رکھیے کہ جب وہاں کوئی پریس نہیں تھا، کوئی کاتب نہیں تھا، ہم کتابت بھوپال سے کرواتے اور آگرہ پریس میں اسے چھپواتے تھے، اس وقت یہ تمام ادبا و شعرا اس مختصر سے رسالہ میں شائع ہوتے تھے۔ سترہ اٹھارہ شمارہ نکلنے کے بعد وہ رسالہ بیٹھ گیا۔ ظاہر ہے کہ ہم لوگوں کے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ اس سلسلہ کو جاری رکھ پاتے۔ اس زمانہ میں جدیدیت کو فروغ دینے کے علاوہ خاکسار کو شاعر بنانے میں بھی اسی کا ہاتھ ہے۔ شاد عارفی، عدم، فراق گورکھپوری وغیرہ اس میں لکھنے والوں میں تھے۔ شاد عارفی کی غزلوں سے میں بہت متاثر ہوا تھا اور دوسرا یہ کہ وقت کی کمی کی وجہ سے میں شاعری کی طرف آیا، مجھے افسانہ کے مقابلہ شاعری آسان لگی، ویسے آسان تو نہیں کہنا چاہیے، ہاں یہ ضرور ہے کہ غزل کہنے میں سہولت زیادہ تھی، تو اس طرح سے غزل کی طرف طبیعت آمادہ ہوئی۔

سوال: ملک کی تقسیم نے ادب کو کس طرح متاثر کیا اور اس تقسیم سے ادب میں کس قسم کی تبدیلیاں رو نما ہوئیں؟

جواب: ملک کی تقسیم سے ظاہر ہے کہ نقصانات ہوئے ہیں لیکن ملک نے ترقی بھی خوب کی ہے۔ اگر ملک آزاد نہ ہوا ہوتا تو ہم اتنی ترقی کر ہی نہیں سکتے۔ لیکن تقسیم کے مضر اثرات بھی تھے۔ لاکھوں لوگ تقسیم کے دوران فرقہ وارانہ فسادات میں مارے گئے، تاہم اس المیہ نے اردو ادب کو فائدہ بھی بہت پہنچایا۔ عجیب و غریب صورت حال ہے۔ اب آپ دیکھیے کہ میر تقی میر کے زمانہ میں دلّی بارہ پندرہ مرتبہ لوٹی گئی لیکن میر تقی میر کا دور غزل کا عہد زریں کہا جاتا ہے۔ یعنی سچا ادب اس وقت زیادہ پنپتا ہے کہ جب معاشرہ میں انتشار زیادہ ہو، معاشرہ میں انتشار ہوگا تو شاعر و ادیب زیادہ حساس ہوں گے، شدت احساس اور مشاہدے کی آمیزش سے ظاہر ہے کہ تخلیقات کا ایک فوارہ سا ابلتا ہے۔

سوال: اردو ادب میں شعری ادب کا کیا مقام ہے؟ کیا آج بھی شاعری ہی کو اردو ادب کہیں گے؟

جواب: میاں سچائی تو یہی ہے، دیکھیے عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ نقاد جب بھی قلم اٹھاتا ہے

شاعری پر اٹھاتا ہے لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ اردو ادب کا 75 فیصد اثاثہ شاعری میں ہے۔ آپ بہت پیچھے نہ جائیں لیکن ولی سے تو آپ لیں گے۔ ولی سن 1700 میں دہلی آئے تھے۔ 1700 سے لے کر آج اکیسویں صدی چل رہی ہے، اس تین ساڑھے تین سو سال کے سفر میں آپ دیکھیں کہ 1857 تک تقریباً دو سو سال تک اردو شاعری ہی اردو ادب کا حصہ رہی ہے، 57 کے بعد نثری دور کی شروعات ہوتی ہے۔ گویا شاعری نے ہی اردو ادب کے ارتقائی دور کا بوجھ ڈھویا، غزل اس میں سب سے زیادہ نمایاں صنف سخن تھی۔ غزل کو کبھی دوسرے درجہ کی شاعری تسلیم نہیں کیا گیا۔ از اول تا حال غزل اپنی جگہ اولیت کے منصب پر فائز ہے۔ نظم نے ترقی کی، افسانہ نے ترقی کی، مرثیہ نے ترقی کی، مثنوی نے ترقی کی لیکن یہ پھر رو بہ زوال ہو گئے۔ بظاہر یہ لگتا ہے کہ غزل بہت ہی آسان صنف سخن ہے، ہزاروں لوگ غزلیں کہہ رہے ہیں اور ان کو لگتا ہے کہ چند قافیوں کو جمع کر کے انھیں ردیف میں پرونے کا نام غزل ہے لیکن اس کا نام غزل نہیں ہے۔ میر تقی میر نے ایک جگہ کہا ہے کہ 'غزل کہنی نہ آتی تھی تو سو سو شعر کہتے تھے/ مگر اک شعر بھی اے میر اب مشکل سے ہوتا ہے'۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر آپ کو معلوم ہو جائے کہ غزل کیا ہے تو آپ کے لیے ایک شعر بھی کہنا مشکل ہو جائے گا۔ جب مجھ سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ صاحب اس دور میں غالب کیوں پیدا نہیں ہوئے؟ اس دور میں میر کیوں نہیں ہوئے، اقبال کیوں نہیں ہوئے تو میرا یہ کہنا ہے کہ ہر دور میں ایک خس و خاشاک کا سیلاب آتا ہے اور اس میں سے موتی چند رہ جاتے ہیں اور یہ موتی آگے چل کر میر، غالب اور اقبال کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ دراصل غزل کے شاعر کی اہمیت و افادیت کو اس کے بعد کا دور طے کرتا ہے۔ آج کے دور میں بھی جو اچھی شاعری ہو رہی ہے اس کا فیصلہ آنے والا نیا دور ہی کرے گا۔ موجودہ دور میں تو آپ جوڑ توڑ کے ذریعہ بڑے سے بڑا انعام حاصل کر لیجیے، ناقدین کی خوشامد کر کے اپنے بارے میں، اپنی تعریف میں مضامین لکھوا سکتے ہیں لیکن سچا شاعر کچھ الگ سی چیز ہے۔ اس سلسلہ میں میرا ایک مقطع ہے کہ: 'نقادوں کے قول نہ لاؤ/ غزلیں لاؤ مظفر جیسی'۔ یا پھر یہ کہ 'مظفر پستہ قد

تنقید سر پر تاج رکھتی ہے/کھرا شاعر کبھی عظمت کے چکر میں نہیں رہتا'۔ایک اچھا اور ایماندار شاعر اچھی شاعری کرنا چاہتا ہے، اس کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ غزلیں یا نظمیں پر تاثیر ہوں، عوام تک زیادہ سے زیادہ پہنچیں، اس کی یہ تمنا نہیں ہوتی کہ اس کو نقاد عظیم کہے، یا اسے فلاں ایوارڈ مل جائے۔ یہ فکر درجہ دوم کے شاعروں کی فکر ہوتی ہے۔کھرا شاعر جو ہے وہ نہ اعزاز و اکرام کا متمنی ہوتا ہے اور نہ وہ تنقیدی اسناد حاصل کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔وہ تو اپنے آپ کو مطمئن کرنا چاہتا ہے۔

سوال: آج کہا جا رہا ہے کہ اچھی تخلیقات وجود میں نہیں آ رہی ہیں حالانکہ لکھا بہت جا رہا ہے، اس میں کتنی سچائی ہے اور اس کے کیا اسباب ہیں؟

جواب: ممتاز صاحب یہ ایک جزوی سچائی ہے، آج لکھنؤ، دہلی میں دیکھیے ہمارے دور میں اگر تلاش کرنے نکلیں گے تو ہزار دو ہزار شاعر دہلی میں آج کے دور میں نکل آئیں گے لیکن ان میں سے زندہ رہنے والے کتنے ہیں؟ کسی دور میں بھی سیکڑوں کی تعداد میں بھی بڑے شاعر سامنے نہیں آئے میر کے دور میں بھی نہیں۔ بہر حال بقول میر پونے تین شاعر تھے، تین سمجھ لیجیے آپ، سودا میر تقی میر اور میر درد۔ غالب کے دور میں دیکھ لیجیے، اقبال کے دور میں دیکھ لیجیے ایک سیلاب سا آتا ہے، خس وخاشاک کا، اس میں چند ہی موتی ہوتے ہیں۔ یہی صورت حال آج کی ہے، آپ جب آج کے دور کے خس وخاشاک کا تجزیہ کچھ وقفہ کے بعد کریں گے تو اس میں سے کچھ موتی یقیناً نکلیں گے لیکن بہت بڑی تعداد میں نہیں نکل سکتے کیوں کہ تخلیق کو آپ بہر حال ایک کارخانے میں ڈھال کر ایک طرح کا مال مارکیٹ میں نہیں لایا جا سکتا۔ تخلیق کار تو ہمیشہ محدود تعداد میں ہی پائے جائیں گے۔ اگر ہم نے اٹھارہ انیس سو غزلیں کہی ہیں۔ یقین جانیے میں سوچتا ہوں اگر میرے دس شعر بھی سو سال بعد عوام میں رائج ہوئے تو میں سمجھوں گا کہ میں کامیاب شاعر ہوں۔ اس اعتبار سے کوئی بھی دور ایسا نہیں رہا جس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ یہ آج کے دور سے زیادہ کھرا تھا یا آج کے دور سے زیادہ زرخیز تھا۔

سوال: آپ کو کیا لگتا ہے کہ جو نئی نسل ہے وہ جلد بازی میں ہے، وہ چاہتی ہے کہ اس پر بہت کچھ لکھ دیا جائے، ان کو وہ سب کچھ جلد از جلد مل جائے کہ جس کے لیے ایک مدت درکار ہوتی ہے؟

جواب: آپ نے بالکل درست کہا، میں خود اس بات سے فکر مند ہوں، آپ نے کسی جلسہ میں مجھ سے ایک سوال کیا بھی تھا، یہ نئی نسل کے لکھنے والے سونا جاگنا، اٹھنا بیٹھنا حرام کر دیتے ہیں، ہفتہ میں پانچ سات کتابیں آتی ہیں ایک بار مجھے بہت برا لگا تھا کہ گیان چند جین صاحب نے کہا تھا کہ مجھے لوگ کتابیں نہ بھیجا کریں۔ میرے گھر میں کتابوں کے رکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔ آج معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ کیوں کہتے تھے۔ میرا ماشاءاللہ تین منزلہ مکان ہے لیکن جب میں اس میں ایک نیا کمرہ بنواتا ہوں تو بیوی کہتی ہیں کہ یہ میرے کس کام آئے گا اس میں آپ پھر کتابیں بھر دیں گے۔ ہر ہفتہ پانچ سات کتابیں آتی ہیں اور ہر شخص پیچھے پڑا رہتا ہے خطوط کے ذریعہ سے اور اب تو موبائل اور ٹیلی فون ہے اس کے ذریعہ سے یہ اصرار رہتا ہے کہ کچھ لکھ دیا جائے۔ بھائی مہینہ میں اگر تیس کتابیں ملی ہیں تو میں ایک مہینہ میں تیس مضامین کیسے لکھ سکتا ہوں۔ میرا بیٹا انگلینڈ میں شاعر ہے، وہاں کے اچھے مشاعروں میں شرکت کرتا ہے۔ اچھے رسالوں میں چھپ رہا ہے، اس کا پرویز مظفر نام ہے، وہ ساقی فاروقی کا شاگرد ہے، غزلیں میں دیکھ لیتا ہوں، میں نے اس کو سختی سے منع کر رکھا ہے کہ ابھی مجموعہ لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے پندرہ سال تک مستقل اچھے رسائل میں چھپو اس کے بعد مجموعہ لانے کی سوچنا۔ ابھی اس کا پرسوں فون آیا تھا کہ پاپا چودہ سال ہو گئے ہیں۔ میں نے اسے منع کیا کہ ابھی نہیں کم از کم میری زندگی میں اسے نہ شائع کرو۔ تو یہ صورت حال، واقعہ یہ ہے کہ لوگوں میں صبر و تحمل نہیں ہے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب آج جب ہم غزل پر نظر ڈالتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ غزل کئی راستوں پر گامزن ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اصل غزل کیا ہے؟

جواب: ہمارے ایک دوست بشیر بدر ہیں وہ یہی کہتے ہیں کہ جو شعر حسن و عشق سے متعلق ہے یا اس کے ارد گرد گھومتا ہے وہ تو غزل کا شعر ہوا باقی جو عصر حاضر اور سماجی معنویت رکھنے والے اشعار ہیں اس کو وہ کہتے ہیں کہ یہ ریختہ ہے، لیکن میں اس بات کا قائل نہیں۔ غزل

تو دراصل ایک ہیئت کا نام ہے۔ ایک مخصوص ہیئت میں آپ شعر کہیں بس۔ موضوعات کا تعین تو قصیدہ اور مرثیہ کے لیے ہے۔ غزل کے لیے پانچ شعر، سات شعر، پچیس یا پچاس شعر جتنے بھی شعر ہوں، اس میں موضوع کا کوئی تعین نہیں ہوتا۔ اس میں دنیا کا کوئی بھی موضوع خواہ وہ مذہب ہو، سیاست ہو، فلکیات ہو، طنزیہ ہو یعنی کوئی ایسا موضوع نہیں ہے جو غزل کا موضوع نہیں ہو سکتا۔ سات شعروں میں سات مختلف موضوعات ہو سکتے ہیں۔ ہمارے یہاں ایک خاص دور ایسا گزرا جس میں لوگ کہتے تھے کہ خالص غزل کے شعر سنیں۔ تو خالص غزل کے شعر سے لوگ یہی مراد لیتے ہیں کہ شاید حسن وعشق، زلف و رخسار سے متعلق بات ہو گی لیکن یہی زلف و رخسار والی شاعری ہے جسے حالی نے کہا تھا کہ غزل کا شعر پڑھ کر تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہم سنڈاس میں داخل ہو گئے ہیں۔ سب سے اچھی صنف سخن انھوں نے کہا کہ مرثیہ ہے۔ اکثر میں نے اپنے مضامین میں یہ بات کہی ہے کہ غزل عورتوں سے گفتگو کرنے کا فن ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس کا مطلب عورتوں کے ساتھ بیٹھ کر جنسی گفتگو کرنا ہے، کہا یہ جاتا ہے کہ مقصد لہجہ ہے، یعنی غزل کا لہجہ ایسا ہونا چاہیے کہ اگر کوئی غنڈا بھی چار عورتوں کے درمیان بیٹھا ہے تو وہ بھی اپنی گفتگو میں شائستگی لانے کی کوشش کرے گا، وہ گالی گلوج سے گریز کرے گا۔ متانت، شرافت، لطافت کے انداز میں گفتگو کرے گا جو کہ غزل کی اہم خصوصیات ہیں اور غزل کہتے وقت یہی لہجہ اختیار کیا جاتا ہے، اس لیے کہا جاتا ہے کہ غزل عورتوں سے گفتگو کرنے کا نام ہے۔

سوال: اپنے معاصرین کے سلسلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: بھائی بہت سے معاصرین ہیں، بہت اچھے شعرا تھے لیکن وہ جوڑ توڑ کر کے منظر عام پر نہیں آسکتے تھے، ناقدین کو خوش نہیں رکھ سکتے تھے، یا وہ ادبی مراکز سے دور تھے، مثال کے طور پر علی گڑھ سے، جامعہ ملیہ اسلامیہ سے یا حیدرآباد سے یا لاہور سے تعلق رکھنے والے جو لوگ تھے ان کو نقاد بھی ساتھ میں ملے اور ماحول بھی ملا، جو لوگ ان مراکز سے دور ہیں ان کی طرف نقادوں کی توجہ کم جاتی ہے۔ بمل کرشن اشک، فضا ابن فیضی جیسے اہم شاعر کو نقادوں

نے بالکل نظر انداز کر دیا۔ سلطان اختر پٹنہ میں بیٹھا ہوا، ابھی جب وہ 75 سال کا ہو گیا ہے تب فاروقی صاحب کا مضمون اس کے اوپر آیا ہے۔ اس سے پہلے اس کے اوپر میں نے کوئی مضمون نہیں دیکھا تھا۔ اعزاز افضل جیسا شاعر اپنے اعتراف کو ترستا ہوا مر گیا۔ ہندوستان کے ہمارے معاصرین میں پچاسوں شعرا ایسے ہیں لیکن معاصرین میں نمایاں وہ ہوئے کہ جن لوگوں میں تخلیقی جوہر کم تھا۔ بیشتر شعرا کے یہاں خام کاری بہت ہے اور اگر فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو اتنے کمزور شعر، بحر سے خارج شعر ہیں لیکن ان کو شاعری کا سب سے بڑا انعام دیا گیا، ان کے یہاں تازہ ترین غزلوں میں بحر سے خارج اشعار موجود ہیں۔ دوسروں سے کہلوانے کا اعتراف انھوں نے خود کر رکھا ہے۔ بہت سارے ایسے معاصرین ہیں کہ جن کی شاعری بہت پسند کی جاتی ہے لیکن ان کی 90 فیصد شاعری میں اہمال ہے، وہ شعر خوبصورت معلوم ہوتے ہیں لیکن جب آپ اس شعر میں کچھ تلاش کرنے جائیں گے تو کچھ نہ ملے گا جب کہ شعر میں کوئی نہ کوئی مفہوم ضرور ہونا چاہیے، ابہام اگر پرتیں ڈال رہا ہے تو ایک سے زیادہ معنی نکلنا چاہیے، یہ بہت اچھی بات ہے لیکن اگر آپ نے اتنا مبہم بنا دیا کہ ایک بھی مفہوم نہیں نکلا تو وہ شعر مہمل ہو گیا۔ اس شعر نے گویا خودکشی کر لی، ایسے بہت سارے مشہور شعرا ہیں جن کا میں یہاں نام نہیں لے سکتا ان کے 90 فیصد اشعار مہمل ہیں۔ لیکن نام کے ساتھ جڑا ہوا ہے اس لیے یہ ہوتا ہے کہ فلاں صاحب نے کہا ہے تو اس میں کچھ بات تو ہوگی۔ جو حقیقی شعرا ہیں ان سے اُن کو بالاتر کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔ اب تو آنے والا دور طے کرے گا مگر معاصرین میں اچھے شعر کہنے والے لوگوں کی کمی بھی نہیں ہے۔

سوال: نظریاتی بحث سے ادب کو فائدہ ہوا یا نقصان، آپ کو کیا لگتا ہے کہ اردو ادب کے لیے نظریاتی بحثیں کتنی کارآمد رہی ہیں؟

جواب: میں سمجھتا ہوں کہ اس سے نقصانات ہی زیادہ ہیں۔ نظریاتی بحثیں جو ہوتی ہیں ان میں ایک قسم کا شدت پسندانہ رویہ پیدا ہو جاتا ہے۔ آج کل جدیدیت اور مابعد جدیدیت اور اِس کا اُس کا چکر چل رہا ہے، اس سے پہلے جدیدیت اور ترقی پسندی کا چکر چل رہا تھا۔ کبھی کسی

ترقی پسند نے یہ تسلیم نہیں کیا کہ جدیدیت بالاتر ہے اور نہ ہی کبھی کسی جدیدیت پسند نے یہ تسلیم کیا کہ ترقی پسند بالاتر ہے۔

سوال: نئی نسل جو ادبی دنیا میں داخل ہو رہی ہے اس کے سلسلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: میں نئی نسل کے سلسلہ میں بہت اچھی رائے رکھتا ہوں۔ افسوس کہ یہ لوگ ذرا تعجیل پسند ہیں لیکن کل ملا کر نئی نسل سے مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اچھے شاعر، اچھے افسانہ نگار، اچھے ناول نگار اور دوسری اصناف میں اچھے لکھنے والے آ رہے ہیں۔ تنقید لکھنے والے بھی کافی اچھے آ رہے ہیں۔ اس لیے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

سوال: مستقبل میں آپ مزید اور کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟

جواب: شدید احساس میں مبتلا رہتا ہوں کہ ابھی تک میں کچھ نہیں کر پایا حالانکہ کتابوں کی تعداد 70یا80 ہو گئی ہے۔ اصل میں مختلف اصناف میں میرا کام ہے، بارہ تیرہ شعری مجموعے ہیں تنقیدی کتابیں ہیں بارہ تیرہ، تحقیقی کام ہے، وضاحتی کام ہے، چونکہ مختلف اصناف کی وجہ سے اتنی کتابیں ہو گئی ہیں۔ میں کچھ ایسی چیزیں لکھنا چاہتا ہوں کہ جو زندہ رہ جائیں میں ابھی اپنے کام سے مطمئن نہیں ہوں۔ بوڑھا بھی ہو گیا ہوں اس لیے زیادہ کام بھی نہیں کر سکتا لیکن لگا رہتا ہوں، غزلیں وزلیں کہنے کا سلسلہ جاری ہے۔ پہلی اپریل کو میری زندگی کے 75 سال ہو جائیں گے۔ غزلیں ابھی تک ہو رہی ہیں سوتا ابھی خشک نہیں ہوا۔

•••

شاہد حسن کمال سے گفتگو

پروفیسر شاہد حسن کمال گورنمنٹ کالج کراچی میں اردو کے استاد ہیں۔ آپ نہ صرف ایک اچھے شاعر ہیں بلکہ ایک معتبر نقاد بھی ہیں۔ آپ کا شعری مجموعہ ''رسم تکلم'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ''کراچی میں اردو غزل اور نظم''، ''جائزہ ادبیات اردو'' اور ''جہان قواعد انشا'' آپ کی تنقیدی تصانیف ہیں۔ آپ نے کئی اچھے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ گذشتہ دنوں جناب شاہد حسن کمال غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے منعقدہ بین الاقوامی سمینار میں شرکت کی غرض سے ہندوستان آئے تھے۔ یہ گفتگو اسی موقع سے کی گئی۔

سوال: آپ کی شاعری کا آغاز کب ہوا اور اس کے محرکات کیا تھے؟

جواب: میں کراچی کے جس علاقے میں پیدا ہوا وہاں علمی و ادبی ماحول تھا۔ میرے دادا جان شعر و سخن کے دلدادہ تھے اور انھی کی صحبت میں رہ کر شعر و ادب سے مجھے رغبت ہوئی۔ میں تیسری چوتھی جماعت میں ''بانگ درا'' اور ''آتش گل'' پڑھ چکا تھا۔ میں آٹھویں جماعت میں تھا جب پہلی نظم لکھی۔ اسے لے کر داد کی غرض سے دادا جان کے پاس گیا لیکن خلاف توقع بیداد ملی۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ ابھی پڑھنے لکھنے کی عمر ہے، ذرا بڑے ہو جاؤ پھر شعر گوئی کی

طرف توجہ کرتا۔ اس کے بعد کافی عرصے تک میں نے شاعری نہیں کی۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد پھر اس جانب مائل ہوا۔

سوال: آپ ہندو پاک کے کن شعرا سے متاثر ہیں؟

جواب: اردو کا پورا کلاسیکی شعری سرمایہ مجھے متاثر کرتا ہے۔ دورِ جدید میں برصغیر کی شاعری نظریے سے متاثر رہی ہے۔ نظریے کا مقصد پورا ہونے کے بعد وہ شاعری اپنی افادیت کھو بیٹھتی ہے۔ اس کے باوجود کچھ شعرا ایسے ہیں جن کے یہاں فکر اور فن کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ مجروح صاحب نے بہت اچھا لکھا۔ کیفی اعظمی، شہریار، مصطفٰے زیدی، شکیب جلالی، جون ایلیا، سلیم کوثر، احمد فراز اور سراج الدین ظفر کی شاعری مجھے بہت پسند ہے۔

سوال: پاکستان کی علاقائی زبانوں کی شکایت ہے کہ خصوصاً اردو والے مہاجر وہاں کی علاقائی زبانوں کا مطالعہ نہیں کرتے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر صوبۂ پنجاب سیاسی اعتبار سے طاقتور نہ ہو تو پنجابی زبان بھی کنارے کردی جائے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: ہمارے یہاں اس طرح کا کوئی تنازعہ نہیں ہے۔ چند لوگ ہیں جو اس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ اردو کے سرمایۂ الفاظ میں ہر زبان کے الفاظ موجود ہیں اور یہ سب کو خوش دلی سے قبول کرتی ہے۔ اردو اور پنجابی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ پنجابیوں نے اردو زبان و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ حالی، اقبال، فیض، احمد ندیم قاسمی، امجد اسلام امجد، انور سجاد، انور سدید، قتیل شفائی، عبیداللہ علیم، سلیم کوثر سب کا تعلق پنجاب سے ہے۔ رہا سوال مہاجرین اور پاکستان کی علاقائی زبانوں کے رشتے کا تو اردو بیشتر مہاجرین کی مادری زبان ہے۔ کراچی اور حیدرآباد میں جو مہاجرین آئے تو فطری طور پر ابتدا میں ان کا ذریعۂ تعلیم اردو بنی۔ بہ طور خاص مہاجروں میں آج بھی اردو کے تئیں بہت جوش و خروش ہے اور وہ پاکستان میں بہ حیثیت مجموعی اردو کے بہتر مستقبل کے لیے کوشاں ہیں۔

سوال: پاکستان میں اردو زبان و ادب کی صورت حال پر کچھ روشنی ڈالیے؟

جواب: ہمارے یہاں شاعری بہت اچھی ہو رہی ہے، تحقیق کا معیار بھی اعلیٰ ہے۔ کراچی یونیورسٹی میں تحقیق کا معیار اعلیٰ ہے۔ ہندوستان میں نثر خصوصاً کہانیاں بہت اچھی لکھی جا رہی ہیں۔

یہاں اردو کے شعبے اور کتب خانے بھی زیادہ ہیں۔ پاکستان میں آج کل فلمی نغمے اتنے اچھے نہیں لکھے جا رہے ہیں جتنے کہ ہندوستان میں، یہاں جاوید اختر بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ جہاں تک اردو تعلیم کا سوال ہے تو ہمارے یہاں جو تعلیمی اصول ہے وہ ہندوستان کے سہ لسانی اصول سے کچھ حد تک مختلف ہے۔ ہندوستان میں ایک صوبائی زبان، دوسری ہندی بطور سرکاری زبان جسے آئین ہند میں Official Language of the Union کہا گیا ہے، اور ایک انگریزی۔ جنوبی ہند کی بعض ریاستوں میں یہ گنجائش بھی ہے کہ اگر کوئی طالب علم چوتھی زبان پڑھنا چاہے تو اسے اس کی آزادی ہوگی۔ اس اصول سے مادری زبان اور ہندی کے درمیان، ہندی اور انگریزی کے درمیان تصادم ختم ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں یہ بہت بہتر صورت ہے۔

سوال: ہندوستان اور پاکستان کے درمیان غلط فہمیوں اور دوریوں کو ختم کرنے کے لیے ادبی سطح پر کیا کیا جا سکتا ہے؟

جواب: پاکستان میں آسانی سے ہندوستانی کتابیں دستیاب نہیں ہو پاتی ہیں۔ جب تک دونوں ملکوں میں کتابوں کی آزادانہ تجارت نہ ہو اس وقت تک ادب کی سطح پر بھی دوری رہے گی اور دیگر معاملات میں بھی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کتب و رسائل اور ادیبوں اور شاعروں کی دونوں ممالک میں آزادانہ آمد و رفت ہوتا کہ ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے کا موقع ملے۔ اس دوستانہ اور آزادانہ فضا میں جو ادب تخلیق ہوگا وہ ایک خوشگوار فضا پیدا کر سکے گا۔

سوال: کیا آپ ہندوستان اور پاکستان کی اردو کے درمیان کوئی فرق محسوس کرتے ہیں؟

جواب: ہمارے یہاں اردو میں علاقائی زبانوں کے الفاظ کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ اب تک علاقائی زبانوں کے کم از کم پچاس ہزار الفاظ پاکستان کی اردو میں شامل ہو چکے ہیں اور مستعمل ہیں، لیکن ہندوستان کی اردو میں وہ الفاظ استعمال نہیں ہوتے۔ ہندوستان اور پاکستان کی اردو میں یہیں سے حد فاصل کا آغاز ہوتا ہے۔ یہیں سے ایک نیا لسانی مسئلہ پیدا ہوتا ہے جو کئی لسانی پیچیدگیوں کا سبب ہے۔ اس کی وجہ سے ہندوستانی اور پاکستانی اردو کا منظر نامہ آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا جا رہا ہے۔

سوال: ادبی سطح پر ہندوستان اور پاکستان کی اردو میں کیا فرق ہے؟

جواب: پاکستان شمالی مغربی برصغیر میں واقع ہے اور یہ علاقہ شمالی، مشرقی اور جنوبی برصغیر سے لسانی اعتبار سے مختلف ہے۔ یہاں کے اردو ادب میں علاقائی حسیت اور علاقائی ضروریات کے تحت زبان و بیان اور محاورے میں تبدیلیاں، اور علاقائی ضروریات کے تحت زبان و بیان اور محاورے میں تبدیلیاں، اور علاقائی زبانوں کے اثرات روز بروز نمایاں ہوتے جارہے ہیں۔ حد فاصل کی بحث سے قطع نظر، پاکستان میں لکھے جانے والے ناولوں اور افسانوں اور شاعری کی زبان پر وہاں کے معاشرتی تناظر کے اثرات واضح طور پر نمایاں ہیں۔

سوال: پاکستان کے کن موجودہ شاعروں اور ادیبوں کے یہاں سیاسی حالات کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے؟

جواب: گزشتہ 59 برس کے عرصے میں شاید ہی کوئی ایسا اہم واقعہ ہوا ہو جس کو پاکستانی شعرا نے موضوع نہ بنایا ہو۔ فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، حبیب جالب، احمد فراز، جون ایلیا، حسن عابدی، فارغ بخاری، ظہیر کاشمیری، عزیز حامد مدنی، سحر انصاری، انجم اعظمی، امجد اسلام امجد، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، واحد بشیر، فاطمہ حسن، ناصر حمید جیسے تمام شاعروں کی تخلیقات میں احساس کی سطح پر واضح ردعمل کا اظہار موجود ہے۔ پاکستان کے ادیبوں، شاعروں اور عوام کا کلیدی جذبہ جمہوریت رہا ہے۔

سوال: عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستانی شاعروں کی موجودہ نسل پر فیض کا اثر کچھ زیادہ ہے۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: پاکستانی ادب پر فیض کے گہرے اور دوررس اثرات ہیں لیکن وہاں کی نئی نسل نے مجروح سلطانپوری اور اختر الایمان سے بھی خاصا اکتساب کیا ہے حالانکہ فیض اور مجروح میں مجروح زیادہ کلاسیکی ہیں اور یورپی شعرا سے کم متاثر بھی۔ اختر الایمان کی نظموں میں منفرد انداز ملتا ہے۔ انھوں نے چست اور گٹھی ہوئی نظمیں تخلیق کی ہیں۔ ان کے یہاں وحدت تاثر آخر تک برقرار رہتی ہے۔ بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ وہ ڈکشن سے بے خبر ہیں مگر یہ بے خبری خود اختیاری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فیض کے مقابلے میں اختر الایمان زیادہ شعوری فنکار ہیں۔

سوال: پاکستان میں کن ہندوستانی شاعروں اور ادیبوں کو شہرت حاصل ہے؟

جواب: ہندوستانی ادیبوں میں کئی شخصیات ایسی ہیں جو بے مثال ہیں۔ میرے خیال میں شمس الرحمٰن فاروقی عصر حاضر کے عظیم نقادوں میں سے ایک ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، شمیم حنفی بہت اچھے نقاد ہیں۔ قرۃ العین حیدر ہندوستان میں رہتی ہیں یہ آپ لوگوں کی خوش قسمتی ہے مگر ان کی بہترین تحریریں قیام پاکستان کے زمانے میں وجود میں آئیں۔ ہندوستانی شعرا میں شجاع خاور کے یہاں ایک نیا رنگ و آہنگ دیکھا جاسکتا ہے۔

•••

علقمہ شبلی سے بات چیت

جناب علقمہ شبلی نے پورے مغربی بنگال کو اپنے ادبی کاموں سے متاثر کیا ہے۔ 1991 میں مغربی بنگال اردو اکادمی کے وائس چیئرمین رہے۔ ڈاکٹر مظہر کبریا کو آپ کی حیات اور شاعری پر پی۔ایچ۔ڈی۔ کی ڈگری بہار یونیورسٹی سے تفویض ہوئی۔ لٹریری سب کمیٹی، مسلم انسٹی ٹیوٹ نے 25 فروری 2007 کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک شاندار تقریب کا اہتمام کیا آپ گیارہ ادبی کتابوں اور بیس سے زیادہ درسی کتابوں کے مصنف ہیں۔

سوال: آپ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

جواب: میری پیدائش یکم نومبر 1930 کو ریاست بہار کے ایک گاؤں میر غیاث چک ضلع نالندہ میں ہوئی۔

سوال: اپنی تعلیمی زندگی کے بارے میں براہ کرم تفصیل سے بتائیں۔

جواب: ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ میرے والد مولانا عبد الجبار جید عالم تھے۔ میرے بڑے ابا حکیم عبد العزیز اور خالو جان مولانا نعیم الدین بھی علم و ادب پر دسترس رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم انھی بزرگوں کی زیر نگرانی ہوئی۔ والد محترم اور خالو جان کے ساتھ کچھ دنوں الٰہ آباد میں

بھی قیام رہا۔ پھر جب والد محترم کا دربھنگہ کے دارالعلوم مشرقیہ حمیدیہ میں مدرس اور مفتی کی حیثیت سے تقرر ہوا تو میں بھی ان کے ساتھ وہاں منتقل ہوگیا۔ 1945 میں بہار مدرسہ اگزامینیشن بورڈ سے مولوی اور 1948 میں مسلم اسکول لہریا سرائے سے میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اس کے بعد سی ایم کالج دربھنگہ میں داخلہ ہوا اور 1952 میں بہار یونیورسٹی سے بی کام کی ڈگری لی۔ 1959 میں کلکتہ یونیورسٹی سے بی ٹی کی سند لی اور 1963 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کا پرائیویٹ امتحان دیا اور فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوا۔ مجھے والد محترم کے علاوہ دوسرے اساتذہ کی شفقت بھی حاصل رہی۔ ان بزرگوں نے دل میں وہ ذوق مطالعہ پیدا کر دیا جس نے ایک نئی دنیا کی سیر کا حوصلہ دیا۔

سوال: آپ کی شاعری کا آغاز کب ہوا۔ اس زمانے کی علمی و ادبی حالات پر کچھ روشنی ڈالیں۔

جواب: میری شاعری کا باضابطہ آغاز 1948 میں ہوا۔ ملک کی آزادی سے پہلے لوگ آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے تھے جن میں اہل قلم بھی تھے۔ اس لیے نظم ونثر دونوں میں حب الوطنی کی لَے تیز تھی اور سامراجیت اور استعماریت کے خلاف احتجاجی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ آزادی کے بعد صورت حال بدل گئی اور ادیبوں اور شاعروں میں وہ پہلا سا جوش و خروش نہیں رہا۔ تقسیم ملک کے نتیجے میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اور انتقال آبادی کی وجہ سے ایک طرح کی شکست خوردگی کے احساس نے سر اٹھایا۔ شعروادب میں خطیبانہ لہجے کی جگہ رمزیت واشاریت نے لے لی۔ اسی وجہ سے غزلوں کی طرف توجہ زیادہ ہوئی۔

سوال: آپ نے کہاں کہاں ملازمت کی اور آخر میں کہاں سے سبکدوش ہوئے؟

جواب: میں 1952 میں تلاش معاش میں کلکتہ پہنچا اور ایم ایل جبلی انسٹی ٹیوشن میں تدریسی خدمت پر مامور ہوگیا۔ یہاں چند سال ملازمت کرنے کے بعد تقریباً پانچ سال تک کلکتہ میونسپل کارپوریشن اسکول میں ہیڈ ماسٹر کے عہدے پر فائز رہا۔ 1965 سے 1990 تک ہندوستان کی معروف درس گاہ مدرسہ عالیہ، کلکتہ کے اینگلو پرشین ڈپارٹمنٹ سے بحیثیت استاذ وابستہ رہا۔ وہاں سے سبک دوش ہونے کے بعد کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں تقریباً تین سال تک گیسٹ لیکچرار رہا۔

سوال: صدام حسین کی پھانسی پر آپ نے احمد سعید ملیح آبادی صاحب کی گذارش پر دو تین گھنٹوں میں ایک تاثر انگیز نظم لکھی جو آپ کی زود گوئی کی عکاس ہے۔

جواب: ملکی اور بین الاقوامی اہم واقعات سے ہر شاعر بقدر ظرف متاثر ہوتا ہے اور یہی تاثر اس کی شاعری میں طرح طرح سے جلوہ نما ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یہ تاثر اتنا شدید ہوتا ہے کہ احساس کو اظہار کی منزل تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ صدام حسین کی پھانسی کا حادثہ اسی طرح کا ایک دل دہلا دینے والا واقعہ تھا جس نے مجھ سے نظم لکھوالی۔ یہ مخصوص کیفیت ہوتی ہے، ضروری نہیں کہ اس کیفیت سے شاعر ہمیشہ دو چار ہو۔

سوال: آپ کی شعری اور نثری تخلیقات کے کتنے مجموعے اب تک منظر عام پر آ چکے ہیں؟

جواب: میرے شعری مجموعے ہیں ''حرف وصوت'' (1975)، ''بے چہرہ لمحے'' (1975)، ''تارے زمین کے'' (1976)، ''پھول آنگن کے'' (1979)، ''خواب خواب زندگی'' (1990)، ''زادِ سفر'' (1990)، ''دھوپ دھوپ سفر'' (2003)، ''صلوا علیہ وآلہٖ'' (2004) اور ''چہار آئینہ'' (2007) ''دیار حرم میں'' اور ''بوستاں کی کہانیاں'' نثری کتابیں ہیں۔

سوال: آپ کی کن کتابوں پر انعامات واعزازات ملے ہیں؟

جواب: ''بے چہرہ لمحے'' کو اتر پردیش اور بہار اردو اکادمی انعامات، ''تارے زمین کے'' کو بہار اردو اکادمی انعام، ''پھول آنگن کے'' کو اتر پردیش اردو اکادمی انعام، ''خواب خواب زندگی'' کو مغربی بنگال اور بہار اردو اکادمی انعامات، ''دیار حرم میں'' کو اتر پردیش اور مغربی بنگال اردو اکادمی انعامات اور ''صلوا علیہ وآلہٖ'' کو بہار اردو اکادمی انعام مل چکے ہیں۔ مغربی بنگال اردو اکادمی نے 1997 میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ایوارڈ سے اور حمد ونعت اکادمی، دہلی نے 2007 میں حضرت حسان ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ بھارتیہ پریشد کولکاتا کا رجت جینتی سمان 1999 میں ملا۔

سوال: آپ مرزا غالب اور میر تقی میر میں کس کو پسند کرتے ہیں اور کیوں؟

جواب: میں میر اور غالب دونوں کو پسند کرتا ہوں۔ میر میرے روح و دل کو سرشار کرتے ہیں۔ غالب میرے ذہن و دماغ پر حکمرانی کرتے ہیں۔ ان کے اشعار گنجینۂ معنی کا طلسم آشکارا کرتے ہیں۔ ان دونوں کی شاعری ہمارا ادبی وتہذیبی سرمایہ ہے۔

سوال: آزاد نظم جدید شاعری کی دین ہے۔ کیا اس صنف سخن کو آپ سہولت پسندی نہیں مانتے؟

جواب: کوئی صنف سخن ہو، اسے سہل پسندی راس نہیں آتی۔ جو شعرا زبان کی لطافتوں اور شاعری کی نزاکتوں کے رمز آشنا ہیں، انھوں نے اس صنف کو بھی کامیابی سے برتا ہے۔

سوال: نئی نسل کے شعرا اور ادبا کو آپ کوئی مشورہ دینا چاہیں گے؟ شعر و ادب کے فروغ میں نئی نسل کے قلمکار کہاں تک معاون ثابت ہو رہے ہیں؟

جواب: نئی نسل کے شعرا اور ادبا اگر شعر و ادب میں اپنا مقام بنانا چاہتے ہیں تو انھیں مشاہدہ و مطالعہ اور مشق و ریاضت کو اپنا رہنما بنانا چاہیے۔ مشاہدہ و مطالعہ سے نظر میں وسعت اور فہم و ادراک میں گہرائی پیدا ہوتی ہے اور مشق و ریاضت سے فن میں پختگی آتی ہے۔ روایت کی مثبت قدروں پر بھی نگاہ ہونی چاہیے اور تازہ ہوا کے جھونکوں کے لیے بھی دل و دماغ کے دریچوں کو کھلا رکھنا چاہیے۔

سوال: آپ بچوں کے لیے بھی مسلسل لکھتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کا تجربہ کیا کیا ہے؟

جواب: اس سلسلے میں میرا تجربہ کچھ خوشگوار اور حوصلہ افزا نہیں۔ بچوں کے لیے لکھی گئی چیزوں کو قابل توجہ نہیں سمجھا جاتا اور ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس کے لیے شعری و ادبی محاسن پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں، محض تک بندی سے کام چل جاتا ہے۔ حالانکہ ادب اطفال کے لیے ادبی و شعری محاسن کے علاوہ بچوں کی نفسیات اور ان کے مزاج سے باخبر ہونا بھی ضروری ہے۔ اب صورت حال میں کچھ تبدیلی آئی ہے اور ادب اطفال کو اہمیت دی جارہی ہے۔

سوال: رومانیت، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ان تحریکوں یا رجحانوں کے ادب پر کیا اثرات پڑے؟

جواب: زندگی کی طرح ادب بھی جامد نہیں۔ تغیر و تبدل اس کی سرشت میں داخل ہیں۔ ادب کی مثال ایک رواں دواں دریا کی ہے جس کا پانی ساکن نہیں رہتا۔ ہمیشہ اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے۔ اسی طرح ادب میں کسی تحریک یا رجحان کو دوام نہیں۔

•••

زبیر رضوی سے گفتگو(۱)

زبیر رضوی 1936 میں امروہہ (یو. پی.) کے ایک ممتاز دینی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کا شمار اردو کے سینئر شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی ادبی شخصیت بڑی ہمہ جہت اور متنوع ہے۔ نظم ونثر کی متعدد اصناف کے توسط سے انھوں نے اپنی تخلیقی انفرادیت کے نقوش ثبت کیے ہیں۔ کلاسیکی شعری اصناف مثلاً غزل، نظم، قطعہ ورباعی کے ساتھ ہی گیت، آزاد نظم، نثری نظم، اوپیرا وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی کلیات ''پورے قد کا آئینہ'' کے نام سے شائع ہوئی جس میں آٹھ شعری مجموعوں کا انتخاب شامل ہے۔ حال ہی میں ان کی نظموں کا مجموعہ ''سبزۂ ساحل'' شائع ہوا ہے۔ علاوہ ازیں ''نئی نظم: تجزیہ اور انتخاب'' کے نام سے نئی نظم پر ترتیب دی جانے والی کتاب بھی قابلِ توجہ ہے۔ نثر میں غالب پر ان کی دو کتابیں ''غالب اور فنونِ لطیفہ'' اور ''تماشا مرے آگے'' غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی نے شائع کی ہیں۔ ''اردو ڈرامے کا سفر'' کے عنوان سے مین اسٹریم تھیٹر پر آٹھ ڈراموں پر مبنی ان کی مرتب کردہ کتاب حال ہی میں نیشنل بک ٹرسٹ نے شائع کی ہے جس کا مقدمہ بطور خاص مطالعے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ فل لینتھ اور یک بابی اردو ڈراموں پر مشتمل دو جلدوں میں کیا جانے والا

انتخاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی نے شائع کیا ہے۔ نیز گذشتہ دنوں ہندوپاک سے بیک وقت شائع ہونے والی ان کی خودنوشت سوانح 'گردشِ پا' کا بھی اردو کے ادبی حلقوں میں خاصا چرچا رہا ہے۔

زبیر رضوی کی رنگارنگ شخصیت کا ایک رنگ میڈیا سے متعلق بھی ہے۔ بحیثیت میڈیا پرسن اور براڈ کاسٹر کے ان کے تجربات تقریباً تیس برسوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ 1988 میں انھوں نے سیول اولمپک اور 1992 میں بیجنگ ایشین گیمس نیز کرکٹ ورلڈ کپ دہلی کا کوریج کیا۔ ڈھاکا میں پاکستانی فوج کی خودسپردگی کی کمینٹری اور اٹاری بارڈر سے اٹل بہاری واجپئی سے نواز شریف کی ملاقات کی ٹی.وی کمینٹری بھی زبیر رضوی ہی نے پیش کی۔ موصوف سینئر ڈائرکٹر (اسپورٹس) کے منصب سے 1993 میں سبکدوش ہوئے۔

ادبی صحافی اور لٹریری ایکٹیوسٹ کے طور پر بھی زبیر رضوی اپنی ایک شناخت رکھتے ہیں۔ 'ذہنِ جدید فورم' اور 'جن وادی لیکھک سنگھ' جیسی ادبی اور ثقافتی تنظیموں کے تحت ان کی سرگرمیوں کی بات کی جائے، تھیٹر، رقص، مصوری، کارٹون، فلم اور فوٹوگرافی جیسے فنونِ لطیفہ سے ان کی غیر معمولی دلچسپی کا ذکر کیا جائے، اردو اکادمی دہلی کے فعال سکریٹری کی شکل میں ان کی کارکردگی کو دیکھا جائے، اردو مشاعرے کے اسٹیج سے ان کی نصف صدی پر پھیلی ہوئی وابستگی پر نظر کی جائے یا ان کے سہ ماہی رسالے 'ذہنِ جدید' کے معیار اور منفرد شناخت کو موضوعِ گفتگو بنایا جائے، ان کے ہمہ جہت اوصاف نیز شعروادب اور اس کے متعلقات سے ان کے غیر معمولی شغف کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔

سوال: زبیر صاحب۔ آپ کے وطن امروہہ کی ایک تہذیبی اور ادبی تاریخ ہے، عام طور پر لوگ اس معاملے میں خاصے جذباتی ہوجاتے ہیں۔ آپ اپنے وطن اور جائے پیدائش سے متعلق کن حوالوں سے گفتگو کرنا چاہیں گے؟

جواب: جی ہاں! امروہہ میری جائے پیدائش ہے اور آبائی وطن بھی۔ میری پرورش دینی ماحول میں ہوئی۔ میرے دادا مولانا احمد حسن محدث تھے جو مولانا قاسم نانوتوی کے شاگردِ عزیز

تھے اور شیخ الہند مولانا محمود حسن کے معاصر محدث اور عالم دین تھے۔ میرے لڑکپن والی سوجھ بوجھ میں جب باتوں کو، ماحول کو اور شہر کو سمجھنے کی کونپلیں پھوٹنے لگیں تو میری گھریلو زندگی اور گھر سے باہر کے ماحول میں میرے دادا کے تذکرے، اہلِ صلیب سے ان کے مناظرے اور جنات کو درس دینے کے واقعات کی بڑی طلسماتی کہانیاں اور قصے ابھی بڑے بوڑھوں کی گفتگو میں شامل تھے۔ ان دنوں میرے کانوں میں اکثر آوازیں آتی تھیں "میاں بڑے دینی ورثے کے وارث ہو"، میری والدہ کو بھی اس ورثے کا شدید احساس تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ مولانا کے آٹھ پوتوں میں سے کوئی تو ان کے چھوڑے ہوئے ورثے اور دینی تفکر کا سچا وارث بن جائے مگر ایسا ہو نہ سکا۔ میرے والد خود بھی اپنے والد کی دینی اور علمی شخصیت کو اپنے وجود میں پوری طرح ضم نہ کر سکے اور حیدرآباد آکر سرکاری اسکولوں میں اردو اور عربی پڑھانے لگے۔ میرا بچپن امروہہ میں قسطوں میں گزرا۔ میں اپنے اسی بچپن کو پوٹلی میں باندھ کر والد کے ہمراہ دوسری بار حیدرآباد آگیا۔ میں نے پولیس ایکشن کے فوری بعد والے حیدرآباد میں ہائر سیکنڈری والی تعلیم کے پانچ برس گزارے۔ جو سوجھ بوجھ والی کونپلیں امروہہ میں پھوٹنے لگی تھیں ان میں ذہانت وسنجیدگی کے برگ وبار اسی زمانے سے بہار دینے لگے تھے۔ امروہہ میری پرورش اور تہذیب وتربیت کا ایک ایسا قدیم مقام تھا جس میں دین اور عقیدے کی صدیاں مسجدوں، مدرسوں اور خانقاہوں کے حوالے سے میرے حافظے کا حصہ بنی ہوئی تھیں۔ حیدرآباد نے ہندوستان کی سب سے بڑی مسلم ریاست کے آمرانہ اور رئیسانہ ٹھاٹ باٹ کا وہ نقشہ میری آنکھوں میں منجمد کر دیا جس نے مجھ پر ایک قوم کے عروج وزوال کے اسباب ورموز منکشف کیے، اس طرح امروہہ اور حیدرآباد دونوں میرے تخلیقی آمیزے میں اپنے تلخ وترش شامل کرتے رہے ہیں۔ عمر کے ابتدائی شب وروز ادیب وفنکار کی شخصیت کا ایسا حصہ بن جاتے ہیں جو اس کی تحریر اور فن پاروں میں زندگی کے آخری سانس تک ابھرتا ڈوبتا رہتا ہے۔ اسی لیے یہ کہا جاتا ہے کہ تخلیقی ادب اور اس کی رونقیں بڑی حد تک ادیب کی ذات اور اس کے سوانحی گلیاروں سے گزرتی رہتی ہیں۔

سوال: کیا آپ نے بھی شاعری کا آغاز غزل ہی سے کیا تھا؟ اس سلسلے میں کوئی خاص بات آپ قارئین کو بتانا چاہیں گے؟

جواب: شہپر صاحب! سچی بات تو یہ ہے کہ جب میں دوسری بار حیدرآباد ہائر سیکنڈری کرنے کے لیے آ گیا تو میرے پاس استاد کوثر امروہوی کی دی ہوئی پانچ چھ غزلیں تھیں۔ مگر جب یہ غزلیں غیر اہم محفلوں میں سناتے سناتے باسی ہو گئیں تو میں نے اپنے طور پر شعر کہنے کی مشق شروع کر دی۔ جی ہاں! پہلے پہل تو غزل ہی کہی تھی جو تقلیدی تھی۔ اسی زمانے میں شاذ تمکنت اور عوض سعید سے دوستی ہوئی۔ یہ دونوں ادب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے اور مجھ سے زیادہ نئے ادب سے باخبر تھے۔ انھی دوستوں کی مدد سے نئے ادب کے کئی مجموعے پڑھے اور یوں فیض، سردار جعفری، مجاز، ساحر اور مخدوم جیسے شعرا کے نام کانوں میں پڑے اور ادب و شاعری کا سارا ذائقہ ہی بدل گیا۔ اب میں نظم بھی لکھنے لگا تھا اور یہ دونوں دوست جو میری ہی طرح اسکول میں تھے۔ ابھی تک انھوں نے شاعری اور افسانہ نگاری شروع نہیں کی تھی، میرے سامع ہوا کرتے تھے۔

سوال: ''شاعر کو بعض اوقات راستے کے کسی موڑ پر یا زندگی کی کسی کروٹ پر نظم مل جاتی ہے۔ لیکن عام آدمی کو اس کا احساس تک نہیں ہو پاتا۔'' اس قول کی روشنی میں یہ بتائیے کہ کیا پیدائشی طور پر شاعر ہونے میں کوئی سچائی ہے یا اس معاملے میں ذوق، ماحول اور مشق کی تثلیث معاون ثابت ہوتی ہے؟

جواب: جناب آپ نظم لکھنا چاہتے ہیں یا غزل اس کا فیصلہ تو آپ کی افتادِ طبع کرتی ہے۔ اردو ادب میں بطور صنفِ سخن غزل نے عرصے تک تاجداری کی ہے اس لیے غزل کہے بغیر چین بھی نہیں آتا لیکن کب کون سا مشاہدہ، تجربہ، کیفیت، جذبہ یا خیال آپ سے نظم یا غزل لکھوا لے اس کی خبر شاعر کو اس وقت ہوتی ہے جب تخلیقی سرشاری اسے کچھ دیر کے لیے ایک ماورائی گمشدگی کا حصہ بنا دیتی ہے۔ شاعری کو الہامی ماننے والے اس ماورائیت کے زیادہ قائل نہیں ہوتے۔ میرے خیال میں غزل کے مقابلے میں نظم گوئی زیادہ پیچیدہ تخلیقی عمل سے عبارت ہے۔ طویل نظم کے برخلاف چھوٹی چھوٹی نظمیں بھی آپ سے کئی طرح سے

Perfection کا مطالبہ کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک بات اور عرض کروں کہ نظم کا موضوع یا نفسِ مضمون کتنا ہی اچھوتا یا اثر آفریں ہو مگر نظم محض نفسِ مضمون کے سہارے تن کر کھڑی نہیں ہوتی جس طرح بانوں کا پلنگ اس وقت تک استراحت کا لطف نہیں دیتا جب تک پلنگ کے آخری سہارے پر ادوائن سلیقے سے نہ کسی جائے یعنی ہر نظم، پلنگ کی طرح اپنی ادوائن کا بھی تقاضا کرتی ہے۔

سوال: زبیر صاحب آپ نے نظم اور غزل کے تعلق سے بڑی معنی خیز گفتگو کی۔ حالانکہ میرے سوال کا ایک حصہ ابھی باقی رہ گیا ہے۔ خیر چھوڑیے۔ اب میں ایک طویل سوال کرنے والا ہوں۔ راجندر سنگھ بیدی سے جب یہ پوچھا گیا کہ کیا پریم چند سب سے بڑے افسانہ نگار ہیں تو انھوں نے کہا: ''ہاں اسی طرح بڑے ہیں جیسے ایک باپ اپنے بیٹے سے بڑا ہوتا ہے، ان کے یہاں نفسیاتی حقائق کھل کر سامنے نہیں آئے۔ اب افسانہ بہت آگے بڑھ گیا ہے۔'' زبیر صاحب اگر ہم شاعری کے سلسلے میں گفتگو کریں اور غالب سے متعلق یہی سوال قائم کریں تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟

جواب: میرا خیال یہ ہے کہ ادیب اور اس کا ادب یا تو اچھا ہوتا ہے یا اہم یا پھر وہ بڑا ہوتا ہے۔ پریم چند اور غالب دونوں ہی بڑے تھے۔ ایک اور بات یہ کہ ادیب اور ادب کے بارے میں رائے زنی کرتے ہوئے ہم خود کو کسی معیارِ نقد کا پابند نہیں رکھتے اس لیے ہم سامنے کے احوال و کوائف کو پیشِ نظر رکھ کر، جسے معمولی یا اوسط کہنا ہو اس کو اہم یا عظیم بنا دیتے ہیں۔ ہماری تنقیدی تحریروں میں اچھے، اہم اور عظیم کی جس طرح مٹی پلید کی جاتی ہے وہ ہم سب پر واضح ہے۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ ادب اور اس کی دوامیت کے فیصلے دس بیس برسوں کے اندر نہیں ہوتے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کون سی بات، کون سی نظم، کون سی غزل، کون سی کہانی یا ناول اپنے زمانے اور وقت کو عبور کرتے ہوئے نئے قاری کے لیے خود کو دلچسپ اور اہم بنائے رکھتا ہے۔ رسوا کا ناول ''امراؤ جان ادا'' اپنے موضوع کے پرانے پن کے باوجود ایک بڑے ناول کے طور پر آج بھی نہ صرف زندہ اور Relevant ہے بلکہ تھیٹر اور فلم جیسے میڈیم میں بھی اپنی عصری معنویت کا اعتراف کروا رہا ہے۔ میری نظر میں ادب کی طویل

تاریخ میں اپنے ادبی کارناموں اور کارگزاریوں کا ذکر اور حوالہ پانے کا مسئلہ ہر جینوئن ادیب کو اسی طرح پریشان کرتا ہے جس طرح ایک معرکہ پسند جیالا سپاہی مستقبل کے رزمیے میں اپنی جانبازی کا ذکر درج کرانے کے لیے جان پر کھیل جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر ادیب غالب اور منٹو تو ہوتا نہیں کہ جسے اپنے تخلیقی استغراق کے ماورائی لمحوں میں یہ عرفان ہو جائے کہ:

ثبت اَست بَر جریدۂ عالم دوامِ ما

سوال: اس وقت میدانِ ادب میں تین نسلیں بیک وقت سرگرمِ عمل ہیں۔ تخلیق کی رنگارنگی ہے، بڑی تنقید کے نام پر چھوٹی چھوٹی باتیں بھی لکھی جارہی ہیں، انعامات اور ایوارڈس اندھے کی ریوڑیوں کی طرح بانٹے جارہے ہیں اور نہ جانے کیا کیا ہو رہا ہے۔ اس ادبی منظرنامے (بلکہ غیر ادبی منظرنامے) سے متعلق آپ کیا سوچتے ہیں؟

جواب: میں نے ابھی دیرپا ادبی اقدار رکھنے والے ادب اور اس کے لکھنے والے کی بات کی ہے لیکن موجودہ ادبی منظرنامہ دراصل ان لوگوں کی تگ و دو اور چہل پہل کا منظرنامہ ہے جو اپنی زندگی ہی میں اپنی ادبی حیثیت کو پھلتا پھولتا اور خود کو پھولوں کے ہار اور گجرے پہنے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادب کے رنگ منچ پر مرکزی کردار تخلیق کار کو ادا کرنا ہوتا ہے۔ آج ادھ کچرے ادیب و شاعر اپنے ہاتھوں میں انعامات و اعزازات کی نشانیاں لیے کیمرے کی طرف منہ کیے ہوئے کھڑے ہیں۔ اس سارے کھیل میں بڑی بھومیکا گروہ بندی میں یقین رکھنے والے ان نقادوں نے نبا ہی ہے جن کا ادبی مستقبل رسائل و جرائد کے توصیفی نمبروں کی اشاعت کے بعد بھی مشکوک ہے۔ اگر ٹالسٹائی، چیخوف اور کافکا جیسے انگنت ادیب نوبل انعام کے اور کرشن چندر، عصمت چغتائی، اختر انصاری، خواجہ احمد عباس، بلونت سنگھ، قاضی سلیم، اقبال مجید، رتن سنگھ، گمیق حنفی، عابد سہیل اور زاہدہ زیدی جیسے ادیب ساہتیہ اکادمی انعام کے مستحق قرار نہیں دیے گئے تو ان کی ادبی حیثیت پر اس کا کیا اثر پڑا؟ میرا دکھ یہ ہے کہ اس ادبی منظرنامے میں تخلیق یعنی اچھی نظم، اچھی غزل، اچھی کہانی، اچھا ناول یا اچھی کتاب، سب کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے اور Dummy ایکسٹرا اسٹیج کو گھیرے

میں لیے ہوئے ہیں۔ اس صورت حال سے اردو کا ادب خاص طور پر متاثر ہے، دراصل اس کا موجودہ منظرنامہ میڈیا کرس (Mediocres) کا منظرنامہ بن کر رہ گیا ہے۔ افسوس!۔

سوال: زبیر صاحب! اب میں ایک ایسا سوال کرنا چاہتا ہوں جس میں بیک وقت دو باتیں پنہاں ہیں۔ ایک تو گلوبلائزیشن کے اس عہد میں آفاقی امداد اور نئے نئے نظریات کی چکاچوندھ میں ہماری ذہنی قدروں، مقامی روایات نیز زندگی کے قریبی اور جیتے جاگتے حوالوں کی گمشدگی کا مسئلہ ہے اور دوسرا میڈیا کی ڈکٹیٹرشپ، ہماری گھریلو زندگی میں اس کی بے جا مداخلت اور زبان کے نہ صرف غلط استعمال بلکہ اس کی مٹی پلید کرنے کا معاملہ ہے۔ ایک میڈیا پرسن اور ایک ادیب کی حیثیت سے ان امور پر آپ کا کیا ردِ عمل ہے؟

جواب: دیکھیے شہپر صاحب! ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ میڈیا کا عہد ہے۔ اب میڈیا کا کام لوگوں کو صرف معلومات بہم پہنچانا، ان کی تہذیب کرنا اور انھیں تفریح فراہم کرنا ہی نہیں رہ گیا ہے بلکہ فی زمانہ میڈیا کا بنیادی کام اشیائے صَرف کی بڑے پیمانے پر تشہیر کرنا تصور کر لیا گیا ہے اور باقی تمام باتیں تشہیر کے فریم کے اردگرد زیبائشی سامان کی طرح ہیں۔ میڈیا کی خرابی یہ ہے کہ وہ خود احتسابی کا عمل نہیں کرتا۔ ممبئی کے تاج محل ہوٹل کے واقعے کو الیکٹرانک میڈیا نے جس انداز سے، جس زاویے سے چاہا کور کیا۔ ہم نے دیکھا کہ ہر نامہ نگار اس وقت ایک بڑا مبصر تھا۔ سامنے کچھ بھی نہیں تھا مگر اندازے اور انکلیں خوب لگائی جارہی تھیں۔ بالآخر سرکار اس پر چونکی اور میڈیا کی سرزنش کی گئی لیکن اس کے باوجود میڈیا وہی کر رہا ہے جو اس کو اپنے تشہیری تقاضوں کے تحت کرنا ہے۔ دنیا کا ہر ملک گلوبلائزیشن کے پھیر میں ہے۔ ہندوستان بھی بڑی تیزی کے ساتھ خود کو وہ شکل دیتا جارہا ہے جو پیدا کردہ صارف کلچر کا تقاضا ہے یا اس کی لازمی ضرورت ہے۔ اس بار لوک سبھا کا الیکشن پوسٹر بازی، باجے تاشے اور جلسے جلوس کے بغیر میڈیا کے ذریعے ہی لڑا گیا۔ آج کا میڈیا معاشرتی قدروں اور تقاضوں کو ٹھوکر پہ رکھتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ کس بے خوفی اور کھلے پن کے ساتھ ٹی وی چینلوں پر انڈرگارمینٹس کی تشہیر ہورہی ہے۔ آنے والے دنوں میں انسانی معاشرہ میڈیا کی مٹھی میں ہوگا۔ ڈرائنگ روم اور بیڈروم کا فرق باقی نہ رہے گا، دیکھا جائے تو اب بھی کہاں باقی ہے۔

اب آتا ہے زبان کا مسئلہ۔ میڈیا چٹ پٹی، کھلے اظہار والی بلکہ گالی نما زبان سے عار نہیں رکھتا۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اپنی تشہیری زبان میں وہ مزید کھلے پن کو جگہ دے گا۔ جیسے میڈیا کے لیے یہ مثالی تشہیری جملہ ہے "ٹھنڈا ٹھنڈا کول کول"۔ آنے والے دنوں میں ہمارا ماضی بھی مزید دھندلا دیا جائے گا۔ مثلاً ہماری وہ دیو گاتھائیں کہاں ہیں جن کو ہم چوپاروں پر اجتماعی طور پر سنتے تھے اور وہ ہمارے جذبات میں تازگی نیز جسم میں تھرتھری پیدا کر دیتی تھیں۔ آنے والے ہندوستان میں تاج محل، کونارک، اور اجنتا کی گپھاؤں کا مذاق اڑایا جائے گا کیونکہ اس وقت تک ہندوستان نے زمین پر اور زیرِ زمیں بھی نہ جانے کیسے کیسے حیرت انگیز کارنامے انجام دے دیے ہوں گے۔ کل کی نئی نسل اپنے زمانے کے میڈیا کو ماتھی آنکھ سے نہیں بلکہ انسان کے بازاری تقاضوں کی روشنی میں دیکھ کر اپنے ترقی یافتہ ہونے پر فخر کرے گی۔ میڈیا سے متعلق یہ گریہ وزاری ہماری آپ کی نسلوں کا ہی مقدر ہے۔ آنے والے برسوں میں گلوبلائزیشن کے تحت ٹیکنالوجی کے توسط سے ابھی اور بھی پیوندکاری ہوگی۔ آنے والا یگ اس کو کیا نام دے گا اس پر فی الحال گفتگو کرنا فضول ہے۔

سوال: آپ ہندی میں بھی لکھتے ہیں۔ جن وادی لیکھک سنگھ کی محفلوں اور مباحثوں میں شریک ہوتے ہیں۔ کیا اردو اور ہندی کی ادبی صورتِ حال میں کوئی نمایاں فرق محسوس کیا ہے آپ نے؟

جواب: میں اگر ادب سے اپنی نہایت سرگرم دلچسپی اور وابستگی کے ابتدائی اور درمیانی عرصے کی بات کروں تو میں کہنا چاہوں گا کہ ہم پر ان دنوں ایک جنون کی سی کیفیت طاری رہتی تھی۔ ہر شام ہم ٹولیاں بنا کر اپنے زمانے میں لکھے جانے والے ادب، کتابوں، رسالوں، ادبی رویّوں اور رجحانات پر گھنٹوں گفتگو کرتے رہتے تھے۔ نئے نئے ادبی رسائل کی ورق گردانی اور انھیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھنے کا پاگل پن سب کو ایک عجیب سے سحر میں گرفتار رکھتا تھا۔ ہماری ان سرگرمیوں میں ہمارے پیش رو ادیب بھی ہمارے درمیان آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ جذبی، اختر الایمان، خورشید الاسلام، جاں نثار اختر، مخدوم، کیفی اور سردار جعفری وغیرہ بلا تکلف بحثوں میں حصہ لیتے تھے۔ ہماری نشستوں کے انگنت ٹھکانے تھے، کافی ہاؤس، ٹی

ہاؤس اور فلپا تھو پر بنی ریلنگ ہمارے میٹنگ Point ہوا کرتے تھے۔ آج وہ کیفیت ہے ہی نہیں اور ہو بھی کیسے کہ اب ادب کی جنوں سامانی کی جگہ ہوشمندی نے لے لی ہے۔ معاشرتی حالات نے وقت اور فرصتوں کی فراوانی کو بھی تنگی میں بدل دیا ہے۔ جہاں تک ہندی کے ادبی منظرنامے کا تعلق ہے وہ مجھے آج بھی زیادہ سرگرم، روشن اور جنوں ساماں نظر آتا ہے۔ لوگ اپنا ادب پڑھتے ہیں۔ اور عالمی ادب پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہندی کی سرحدیں پھیلتی جارہی ہیں۔ ہندی والوں میں معاصر ادب سے باخبری کمال کی ہے۔ ہندی کے ادبی رسالوں میں اپنے ٹیگ کا احساس دلانے والی تحریریں کافی ہوتی ہیں۔ پہاڑی اور دیہی علاقوں کے ساتھ ساتھ قومی دھارے سے جڑی ہوئی زندگی کی کہانیاں بھی بے شمار شائع ہوتی ہیں۔ مجھے بعض ہندی ادیبوں کی یہ ادا بھی اچھی لگتی ہے کہ وہ معاصر ہندوستانی زندگی سے بھرپور معانقہ کرنے کے خیال سے مختلف علاقوں میں کچھ دنوں کی بود و باش کے لیے نکل جاتے ہیں۔ باسی موضوعات پر لکھنے کا رویہ ہندی کے بیشتر ادیب بالکل چھوڑ چکے ہیں۔ اس صورت حال کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ ہندی میں پبلشروں کی ایک لمبی قطار موجود ہے جو ہندی بیلٹ میں دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ میرے خیال میں اردو ہندی کے ادبی منظرناموں کا تقابل اردو کو اور زیادہ حقیر فقیر بنا دے گا۔

سوال: یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ آپ کے یہ جملے مہمیز کا کام کریں اور اردو والوں کی نئی نسل کھوئی ہوئی قوت نیز فراموش کی ہوئی روایات کو پھر سے حاصل کرلے۔

جواب: خدا کرے ایسا ہو۔

سوال: آپ کے رسالے ''ذہن جدید'' میں ادب کے ساتھ ساتھ مصوری، موسیقی، رقص، فلم، تھیئٹر، کارٹون، فوٹوگرافی، ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ادب اور مغربی ادبی سرگرمیوں کا تعارف اور بے لاگ مباحثے بھی ہوتے ہیں۔ یقیناً یہ اردو کے دوسرے رسائل سے مختلف ہے۔ ایسا رسالہ شائع کرنے کا ارادہ آپ نے کب کیا، اور یہ کیسے ممکن ہوسکا؟

جواب: شہپر صاحب! میں نے اپنی زندگی کے ہر اہم دوراہے پر اس راہ کو اختیار کرنا پسند کیا جس کے آس پاس کچھ نیا نیا سا نظر آنے کی امید ہو۔ شاعری اور کل وقتی ملازمت میں بھی وہی کیا جو مری

دانست میں پہلے نہ ہوا تھا۔ ''ذہنِ جدید فورم'' تو ایک ادبی تنظیم کی شکل میں پہلے ہی وجود میں آ چکا تھا اس کی ادبی نشستیں بھی دہلی میں وقتاً فوقتاً ہوا کرتی تھیں۔ ''ذہنِ جدید'' کو ایک سہ ماہی رسالے کی شکل دینے کا کام ستمبر 1990 میں ہوا۔ ''ذہنِ جدید'' اپنے صفحات پر اور اپنے مزاج و معیار کے اعتبار سے کیسا ہو اس کا خیال مجھے ریڈیو پر رہ کر ہوا۔ جہاں تنوع اور رنگارنگی ہی نشریات کا حق تھا، دوسرے ریڈیو اور براڈ کاسٹنگ میں ادب کے ساتھ ساتھ فنونِ لطیفہ کا Coverage بھی ہوتا تھا۔ اس کے لیے یہ ضروری سمجھا جاتا تھا کہ جو بھی اس وادیٔ پُر خار کا مسافر بننے کا آرزومند ہو وہ نہ صرف ساؤنڈ میڈیم کا نبض آشنا ہو بلکہ ہندوستانی فنونِ لطیفہ کے خدوخال کو بھی پہچانتا ہو۔ اس کے تعارف اور تجزیے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ بس اس خیال کے تحت میں نے ''ذہنِ جدید'' کے منفرد خدوخال کا تعین کیا اور اس کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا تاکہ میرے رسالے کا نوجوان قاری اگر چاہے تو ساؤنڈ میڈیا کی دنیا کا حصہ بھی بن سکے۔ اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی تھا کہ اردو کی ادبی صحافت کو ایک ایسا چہرہ دیا جائے جو قومی ثقافت کے نقش و نگار سے آراستہ ہو اور اپنی مثال آپ ہو۔ یہ کام بظاہر مشکل تھا خاص طور سے اس لیے بھی کہ اس کے لیے وسائل اور مالیات کی کوئی ضمانت نہ تھی مگر نیت کا خلوص اور ارادے کا استحکام کام آیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ''ذہنِ جدید'' جیسا رسالہ شائع کرنے کا کام کسی ادارے کا تھا لیکن یہ میرے جیسے تنہا فرد نے بے سروسامانی میں انجام دیا۔ یا یوں کہیے:

قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

اس لگن اور کاوشِ مسلسل نے ''ذہنِ جدید'' کے اشاعتی تسلسل کے 52ویں شمارے تک پہنچا دیا، وہ بھی اس طرح کہ عصری ادب اور فنونِ لطیفہ کے آمیزے سے ترتیب پانے والے رسالے کو ایک مکمل جریدے کی شکل میں پڑھنے والوں کے مطالعے کا حصہ بنا دیا۔ شہپر صاحب! میں نے پچاس برسوں کی ادبی زندگی میں اس قدر ذوق اور آمادگی کے ساتھ کسی ادبی رسالے کو اردو قارئین کے ایک بڑے اور قابلِ ذکر حلقے میں اپنی مثالی جگہ بناتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میرے اعتماد نے مجھے لڑکھڑانے نہیں دیا۔ آج خلقِ خدا یہ کہہ رہی ہے کہ ''ذہنِ جدید'' اردو کا اعلیٰ معیار کا متنوع اور قومی شناخت رکھنے والا ہمہ پہلو رسالہ ہے۔ مجھے

محنت کرنے کی عادت ہے اور کسی قدر منظم ہو کے کام کرنے کا مزاج بھی ہے نیز تربیت بھی اسی طرح کی ہوئی ہے، اس لیے مجھے "ذہنِ جدید" کے معیار و مزاج اور اس کے تنوع کو بنائے رکھنے میں کوئی بڑی مشکل پیش نہیں آئی۔ ادب کے علاوہ میں ہندوستانی فنونِ لطیفہ پر سیر حاصل اور خصوصی نوعیت کے مضامین شائع کرنے والے انگریزی رسائل اور کتابیں باقاعدگی کے ساتھ پڑھتا ہوں اور ہر ممکن کوشش کرتا ہوں کہ تھیٹر، فلم، رقص، پینٹنگ اور موسیقی کے پروگراموں میں شرکت کروں اور پھر ان سے متعلق "ذہنِ جدید" میں کچھ لکھوں۔ میرے خیال میں ان تمام مساعی اور ذوق و شغف نے "ذہنِ جدید" کو بڑی زبان کا زندہ رسالہ بنا دیا ہے۔

سوال: اب ایک آخری سوال زبیر صاحب! یہ فرمایئے کہ کیا نئی نسل اور نئے ادب سے اردو کے بعض ناقدین کی طرح آپ بھی مایوس ہیں؟ یا............!

جواب: جب ہم لوگ لکھ رہے تھے تو ابتدا میں ہمارا بھی یہ تاثر تھا کہ ترقی پسندوں کی پہلی صف ہماری تخلیقی کاوشوں سے ناواقف ہے، مگر یہ ادھوری حقیقت تھی۔ میں اپنے بعد کی نسل کی تخلیقی سرگرمیوں کو سنجیدگی سے دیکھتا ہوں۔ ان سے باخبر رہتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ نئی نسل کی بہترین صلاحیتوں کو "ذہنِ جدید" کے ذریعے منظرِ عام پر لاؤں۔ اس ضمن میں بے شمار مثالیں دی جاسکتی ہیں، نام لیے جاسکتے ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ آج اردو دنیا کی مختلف سرگرمیوں میں نئے لوگ خاص لگن کے ساتھ مصروفِ عمل ہیں اور اپنی جگہ بنا رہے ہیں۔ اس ارتقائی منظرنامے سے انکار ممکن نہیں۔ ادبی تاریخ ہر دور میں اپنے عصری تخلیقی منظروں سے جانی اور پہچانی گئی ہے۔ اس لیے ہر دور کی ادبی تاریخ کو اس دور کے ادبی، ثقافتی اور عمرانی تناظر میں رکھ کر مرتب کرنا ہوگا۔ ہر نیا ادبی عہد اپنی شناخت کے لیے ادبی قد و قامت نیز چہرے مہرے ساتھ لاتا ہے اس لیے یہ سوال قائم کرنا کہ میر، غالب اور اقبال کے بعد ان جیسے شاعر پیدا نہیں ہوئے یا فیض، راشد، قاسمی، اختر الایمان اور عزیز حامد مدنی جیسے شاعر جدیدیت کے شعری رجحان کے زیرِ اثر کیوں پیدا نہیں ہوئے۔ اور چونکہ نہیں پیدا ہوئے

اس لیے پہلے کے مقابلے میں بعد کا ہر دور کم مایہ اور کم پایہ دور کہا جائے گا، سراسر سطحی اور بے معنی سوچ ہے، جس پر ایک لمبا سا خطِ تنسیخ ہی کھینچا جا سکتا ہے۔

ملاقاتی: بہت بہت شکریہ زبیر صاحب، آپ نے صرف میرے سوالات کے بھرپور جواب دینے کی زحمت کی بلکہ نہایت اہم اور تفصیلی گفتگو فرمائی جو ادب سے اور اس کے متعلقات سے تعلق رکھنے والوں کے لیے یقیناً دلچسپی اور معلومات کا سامان بہم پہنچائے گی۔

•••

زبیر رضوی سے گفتگو (۱۱)

سوال: آپ کی نظم 'انجام قصہ گو کا' میں کہانی کار کہانی سنانے سے پہلے ہی مر جاتا ہے۔ آخر وہ کون سی بات ہے جو اس کی زبان پر ان کہی رہ جاتی ہے؟

جواب: یہی اس نظم کا حسن ہے۔ وہ اپنے سارے قصے صرف اس آخری قصے کو بیان کرنے کے لیے سناتا ہے۔ اسلاف کے عروج و زوال کا آخری قصہ وہ سنانا چاہتا ہی ہے کہ اس کی زبان کاٹ دی جاتی ہے۔ وہ کہنا چاہتا ہے کہ وہ حکومت جس نے ظلم و جبر کو روا رکھا ہے، بہت سے ستم اس نے ڈھائے ہیں اس کے پہلے کہ حقیقت افشا ہو اور عوام کو حاکم کی اصلیت معلوم ہو جائے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ عموماً جب آپ کسی ایسی حقیقت سے پردہ اٹھانا چاہتے ہیں جس کی پردہ پوشی حاکم وقت کے ہاتھ میں ہو تو وہ آپ کو سزا کا مستحق قرار دے کر سچ سامنے آنے سے روک دیتا ہے۔ جب تخلیق کار سچ بولنا چاہتا ہے تو سماج اس کا دشمن بن جاتا ہے۔ آج کل آپ دیکھ رہی ہیں انکاؤنٹرس ہو جاتے ہیں مگر سچ کہاں ہے؟ کتنی قبریں ایسی مل رہی ہیں جس میں لوگوں کو دفن کر دیا گیا ہے مگر سچ کون بتائے کہ اصل میں کیا ہوا۔ اب قذافی کی موت کے بعد حقیقت سامنے آ رہی ہے۔ جب تک وہ زندہ رہا اس نے کسی کو بولنے نہیں دیا۔ سب کی زبانیں کاٹ دیں۔

سوال: ایک تخلیق کار ادب تخلیق کرتے وقت اپنے ذہن میں ماضی رکھتا ہے یا مستقبل!

جواب: بھئی یہ تو مشکل ہے۔ کبھی میں ماضی میں لوٹ جاتا ہوں کبھی مستقبل میں اور کبھی حال میں رہتا ہوں۔ بڑے فنکار اپنے کسی عہد کے پابند نہیں ہوتے۔ میں آج جو کچھ شاعری کر رہا ہوں، جب میرا آج، کل بن جائے گا تو میں irrelevant ہو جاؤں گا ایسا کچھ نہیں ہے۔ جیسے غالب کو لیں۔ غالب ماضی حال مستقبل تینوں کا شاعر تھا مگر یہ بات صدیوں کے بعد دریافت ہوئی۔ یہ تخلیق کار کے اختراعی ذہن کا کمال ہوتا ہے جو اسے ہزاروں برس زندہ رکھتا ہے۔ پہلے سے کچھ کہنا مشکل ہے۔

سوال: جوگندر پال نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ تخلیق کار پیدائشی نہیں ہوتا بلکہ وہ شعوری کوشش سے بنتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: اصل میں شاعر اور ادیب کے بارے میں دو تصور ہیں۔ ایک تو یہ کہا جاتا ہے کہ شاعری جزویست از پیغمبری۔ یعنی جس طرح پیغمبر پیدا ہوتے ہیں اسی طرح شاعر یا ادیب بھی پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح پیغمبر کی سوچ دو سو تین سو سال کے عرصے پر محیط ہوتی ہے ویسے ہی ایک تخلیق کار کی ہوتی ہے اور کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ جس طرح ایک اسپورٹس مین بننے کی خواہش رکھنے والے انسان میں کچھ نہ کچھ ایلیمنٹ Sportsman کے ہوتے ہیں ٹھیک اسی طرح شاعر یا ادیب کا معاملہ بھی ہے۔ محنت، مشق استاد کی عمدہ تربیت وغیرہ مراحل کے بعد ایک شاعر یا ادیب نکھر کر چمکتا ہے لیکن اس میں شاعر یا ادیب کا ایک فطری مزاج بھی ہوتا ہے جو حادثاتی نہیں ہوتا پھر خداداد صلاحیت بھی ایک چیز ہے۔

سوال: ہماری نئی نسل ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات، فلم، موسیقی اور دوسری تفریحات کو اپنی ذہنی تھکن دور کرنے کا ذریعہ بنا چکی ہے ایسی صورت میں ادب کا فریضہ کیا بنتا ہے۔ ایک ادیب ہونے کے ناطے اس صورت حال کے مقابلے کی خاطر آپ کیا طریقہ تجویز کرتے ہیں؟

جواب: انسان کے ذہن کو سمجھ سکنا سب سے مشکل کام ہے۔ بلکہ پوری کائنات کا سب سے مشکل کام ہے۔ یہ نہایت پیچیدہ سوال ہے جو اللہ میاں نے خود انسانوں کو انسانوں کے روپ میں دیا ہے کہ پہلے اپنے آپ کو سمجھو پھر کائنات کو سمجھو۔ میں نے اپنے آپ کو پہچانا تو میں نے

اپنے رب کو پہچانا۔ انسان کو ایک معجزہ ایک کرشمے کے طور پر اس دنیا کے رنگ و بو میں رنگ بھرنے کے لیے بنایا ہے یہ اتنا پیچیدہ کردار ہے کہ اس کے ذہن تک رسائی ناممکن ہے۔ اس لیے آپ کا یہ سوال انسانی ذہن کے معمہ کی ایک طرح سے توہین ہے۔ اس کا بڑی حد تک انکار بھی ہے اور اس کا اقرار بھی۔ آپ ماڈرن ایج میں جی رہے ہیں مگر کیا آپ کی دلچسپی قدیم مظاہروں میں کم ہوئی ہے۔ انسان کے ارتقا کا سفر تو آپ کو معلوم ہے مگر اس کی انتہا آپ کو بالکل نہیں پتہ۔ کیا ہوگا؟ کیسے ہوگا؟ کیا آپ کو کچھ معلوم ہے؟ آپ صرف اپنے حصے کا کام کر کے گزر جایئے۔ Oral ٹریڈیشن کے بعد پرنٹ میڈیا آیا تو ہم نے سوچا کہ اب oral کا ٹریڈیشن ختم ہو جائے گا مگر کیا ایسا ہوا؟ قطعی نہیں ہوا۔ ٹیلی ویژن آنے کے بعد کیا ریڈیو کا چلن ختم ہوا؟ نہیں ہوا۔ تو یہ سب انسانی ذہن کے پیدا کردہ سلسلے ہیں۔ یہ یوں ہی چلتے رہیں گے اور نئی چیزیں دریافت ہوتی رہیں گی۔

سوال: ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ نئی نسل سے ڈرتے رہنا چاہیے اگر آپ چاہتے ہیں کہ نئی نسل آپ کو پہچانے تو آپ کو چاہیے کہ آپ ان کے ورثے میں شامل ہوں۔ ان کے لیے کوئی کام کر کے چھوڑ جائیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: بالکل صحیح کہا تھا۔ ہر نسل کے اوپر یہ فریضہ ہے کہ وہ آنے والی نسل کی نفی نہ کریں۔ آپ اپنے زمانے سے داد و تحسین سمیٹ کر ایک دن کرسی کو آنے والی نسل کی خاطر چھوڑ دیں نہیں تو وہ آپ کو خود رجکٹ کر دیں گے۔ مگر دیکھا گیا ہے کہ ہر پرانی نسل اپنے existance پر اصرار کرتی ہے۔ میرے وجود کو مانو۔ میرے ذہن کو مانو میری صلاحیتوں کو مانو میری بالادستی کو مانو اور میری عظمت کا اعتراف کرو۔ میرے لیے اچھا خیال رکھو۔ نئی نسل اپنی جگہ گھیرتی ہے۔ وہ کہتے ہے اب مصلیٰ اٹھایئے۔ بہت نمازیں ہو چکیں۔ اب آپ ہمیں بھی امامت کرنے دیجیے اور ہمیں نماز بھی پڑھنے دیجیے۔ یہ سب ہمارا ہے۔ سب کچھ ہمارے حوالے کیجیے ورنہ ہم سب چھین لے لیں گے اور اسی چھین کو ہم مفاہمت کہتے ہیں اسی چھین کو ہم جنگ بھی بولتے ہیں۔ اس عمل کو ہم انقلاب سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

سوال: کسی مضمون کا خیال آپ کو کیسے سوجھتا ہے۔ کیا آپ یادداشت سے کردار ڈھونڈتے ہیں یا کوئی فوری واقعہ آپ کے لکھنے کا سبب بنتا ہے؟

جواب: کچھ پتہ نہیں۔ (ہنستے ہوئے) زبر نے کہہ کر تھوڑی آتے ہیں۔ یہ کب مجھے بلا کر چلا جاتا ہے کچھ معلوم نہیں۔ ذہن میں کچھ بلونے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ ان میں ایک تخلیقی کرب کچھ مخصوص موقعوں پر ان سے تخلیق کروالیتا ہے مگر مجھے ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ میں بہت شور میں بھی لکھ سکتا ہوں اور تنہائی میں بھی۔ تخلیقی عمل کا طریقہ کار سب کے یہاں الگ الگ ہوتا ہے۔ میرے یہاں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں نظم وارد ہوتی ہے۔ ایک بار ایک مصرعہ کہہ لیا پھر دو مصرعہ کہہ لیا۔ ذہن ہی میں کبھی گونجتے رہتے ہیں کبھی باہر آجاتے ہیں۔ مگر اس پورے دوران میں ایک نارمل لائف میں رہتا ہوں۔ کوئی پریشانی بے چینی، گھبراہٹ یا کوئی اور دقت نہیں ہوتی۔

سوال: رسالہ ذہن جدید میں ڈرامہ، Paintings اور تھیٹر سے متعلق مضامین مختصر مگر معلوماتی ہوتے ہیں تاہم تنقیدی مضامین تو محض ایک یا دو ہوتے ہیں جو عموماً کسی دوسری میگزین سے مستعار ہوتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا اچھے لکھنے والے لوگ موجود ہیں؟

جواب: ہم کیا کہیں۔ حقیقت ظاہر ہے۔ ہمارے یہاں رسالوں کا ایک تصور ہوتا ہے ادبی رسالوں کی ہمارے یہاں سو برس کی تاریخ ہے۔ ہمارے پاس شروع میں بہت اچھے اچھے رسالے تھے۔ نذیر احمد کے رسالے اور ناولوں سے متاثر ہو کر اس وقت خواتین سے متعلق بہت سے رسالے نکالے گئے۔ چند ایک اردو رسالے موسیقی وغیرہ کے بارے میں بھی نکلے ہیں لیکن ہمارا جو Concept ہے وہ منفرد ہے۔ اردو ہی کیا ہندی میں بھی ایسے رسالے نہیں ہیں البتہ بنگالی میں یہ چیزیں مل جاتی ہیں۔ کیونکہ ان کے یہاں ناچ گانا اور تھیٹر کی ایک روایت موجود ہے اس لیے ان موضوعات پر رسالے مل جاتے ہیں بلکہ چند ایک تو ہم سے بھی بہتر ہیں کیونکہ وہ بہت بکتے ہیں۔ میرے ذہن میں ایک بات تھی کہ اگر قاری کو زیادہ کشادہ ذہن بنانا ہے تو اس کے لیے ذہن جدید جیسے پرچے کی ضرورت ہے۔ خاص طور سے کہ آپ ایک جمہوری ملک کے معاشرے کی تعمیر کرنے جا رہے ہیں۔ تو ذہن بھی نہایت کشادہ ہونا لازمی

ہے۔ادب بھی انسان کو مہذب بناتا ہے لیکن اگر ساری کائنات کے ساتھ جڑ جائیں تو غور و فکر میں مزید وسعت کی گنجائش ہے۔اس سے قاری کا کینوس بڑا ہوتا ہے۔سطح میں بلندی آتی ہے۔اب تک ہم صرف ایک ہی کھڑکی سے جھانک رہے تھے اس لیے صرف غزل، افسانہ، نظمیں ہی نظر آ رہی تھیں مگر اب جس بھی کھڑکی کو کھولیں نئی اور تازہ ہوا ہمارے دل و دماغ کو معطر کر دیتی ہے۔اردو کا جب کوئی اخبار یا رسالہ نکلتا ہے تو میں یہ دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ اس کا قاری کون ہے؟ اور اگر ہے تو اس کی کلاس کون سی ہے۔اردو بولنے والے English لوگ یا اوسط درجے کے یا نچلے درجے کے اردو بولنے والے لوگ۔آپ کا Target کون ہے یہ بات کوئی نہیں سوچتا۔مگر میرا ٹارگیٹ وہ ہے جو جمہوریت کا دلدادہ ہے جو فائن آرٹ کا شوقین ہے جو تھیٹر بھی جاتا ہے ہم اسے اپنا رسالہ پڑھنے کی دعوت دیتے ہیں۔نہ ہم نے اساتذہ کو منایا اور نہ ہی اردو کے روایتی طالب علم سے اصرار کیا ہے۔اس پرچے کے لیے کوئی سرکاری امداد بھی نہیں لیتا ہوں۔میں یہ کام ایک مشن کی طرح کرتا ہوں۔

(میرے سوال کے دوسرے حصے کا جواب غائب کر دیا)

سوال: ایک ادیب کی حیثیت سے آپ نقادوں کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔

جواب: کوئی اہمیت نہیں دیتا۔

سوال: اردو کے نام پر جو اتنے ادارے قائم ہوئے ہیں آپ کے خیال میں ان اداروں کے تحت اردو زبان و ادب کی کتنی ترقی ہوئی ہے۔

جواب: کوئی ترقی نہیں ہوئی ہے۔

سوال: ہمارے یہاں شاعری کے مقابلے میں فکشن کو زیادہ فروغ حاصل نہیں ہو سکا اور ہماری زبان اردو ادب نے جتنے بڑے شاعر پیدا کیے ہیں اتنے بڑے افسانہ نگار یا ناول نگار پیدا نہیں کیے۔آپ کے ذہن میں اس کا کیا تجزیہ ہے؟

جواب: میں ایسا نہیں مانتا۔

سوال: کلیات 'پورے قد کا آئینہ' آٹھ برس پہلے آیا تھا۔ کیا آپ اس کلیات کو شائع کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں آپ کیا کچھ ایڈیٹ کرنا چاہتے ہیں اور کیوں؟

جواب: دیکھیے عموماً کلیات ایک ہی بار چھپتی ہے اور لوگ کلیات تبھی چھاپتے ہیں جب وہ سمجھتے ہیں کہ اب وہ کچھ نیا نہیں لکھ سکیں گے۔ وہ عمر کی ایسی منزل پر پہنچ جاتے ہیں کہ تخلیقی زرخیزی تقریباً ختم ہونے لگی ہے اور وہ بار بار نظمیں اور غزلیں لکھنے میں کمزوری محسوس کرتے ہیں تو وہ سوچتے ہیں کہ کیوں نہ منتخب کلام چھاپ دیں تا کہ لوگوں کو کچھ پڑھنے کو ملتا رہے۔ لیکن اگر میرے جیسے آدمی کو کلیات چھاپنے کو کہا جائے تو اول تو میں یہ کام کروں گا نہیں۔ چونکہ ایک مرتبہ آپ نے یہ غلطی کر لی کہ شروع سے لے کر اب تک آپ نے جو کچھ کہا تھا اسے کسی ترمیم و اضافے کے بغیر ہی آپ نے شائع کر دیا۔ آپ نے سنا ہوگا کہ لوگ کہتے ہیں کہ تخلیق میں تو اپنی ہر چیز عزیز ہوتی ہے۔ جیسے اپنی ساری اولادیں والدین کو برابر سے عزیز ہوتی ہیں مگر یہ بیکار ہے، مہمل جملہ ہے۔ کئی اولادیں بیکار بھی ہوتی ہیں اور ہم انھیں عاق کرتے ہیں تو شعر کے معاملے میں بھی یہی ہے۔ کچھ شعر اچھے ہوتے ہیں کچھ اوسط اور کچھ بھرتی کے اشعار ہوتے ہیں۔ تو اب جب کہ میں اپنی پوری شاعری پر نظر دوڑاتا ہوں تو وقت کے ساتھ میری پسند بھی تبدیل ہوئی ہے مگر ایک چیز جو سب سے خاص ہے وہ یہ کہ میں نے اپنی شاعری میں ایک خاص معیار برقرار رکھنے کی کوشش ہمیشہ کی۔ تا کہ میرے اشعار Reliable ہوں اہم ہونا تو بہت بڑی بات ہے۔

•••

چانگ شی شوان سے گفتگو

گذشتہ دنوں دہلی میں مشاعرہ جشن بہار کے موقع پر چین کے ممتاز اردو شاعر چانگ شی شوان (قلمی نام۔انتخاب عالم) ہندوستان تشریف لائے۔ چینی لب و لہجے کے باوجود ان کی اردو شاعری پوری طرح قابل فہم تھی۔ وہ اشتراکی نظریات کے حامی ہونے کے ساتھ ساتھ انسان دوستی کے علمبردار ہیں۔ موصوف دوسری بار ہندوستان آئے تھے ویسے پاکستان میں ہر دو یا تین سال پر جاتے رہتے ہیں۔

سوال: آپ نے اردو شاعری کب شروع کی؟

جواب: میں نے براڈ کاسٹنگ انسٹی ٹیوٹ سے 1963 میں اردو میں گریجویشن کیا۔ لیکن شاعری پندرہ سال بعد 1978 میں شروع کی۔ میں چینی زبان میں بھی نظمیں لکھتا ہوں لیکن اردو شاعری کی بات الگ ہے خصوصاً اردو غزل کا نشہ کچھ الگ ہی ہے۔ غنائیت، وزن اور بحر تینوں اردو غزل کی اثر انگیزی میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس میں تخیل کی پرواز سے بھی بڑا کام لیا جاتا ہے جس کی بدولت بات میں تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔

سوال: ڈینگ کی وجہ سے اشتراکی گرفت ختم ہو جانے کا چینی ادب پر کیا اثر پڑا؟

جواب: یہ غلط فہمی ہے کہ ڈینگ شیاؤ پنگ کی وجہ سے اب چین میں سرمایہ داروں کی حکومت ہے۔ ابھی بھی وہاں اشتراکی نظام ہی ہے لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ جاگیرداری کے بعد سیدھے سماج واد نہیں آتا، بیچ میں سرمایہ داری بھی آتی ہے۔ سرمایہ داری کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں پیداوار خوب بڑھتی ہے۔ ڈینگ شیاؤ پنگ نے واضح کیا تھا کہ ابھی یہ سماج واد کا ابتدائی دور ہے۔

سوال: چین میں امیر غریب کا فرق بہت ہو گیا ہے، سماجی بے اطمینانی بھی بڑھ رہی ہے۔ کیا اس کی جھلک چین کے ادب میں دکھائی دے رہی ہے؟

جواب: دیکھیے چین میں معیشت نے بہت ترقی کی ہے لیکن اس ترقی میں کچھ لوگوں کا معیار زندگی زیادہ بہتر ہوا اور کچھ لوگوں کا کم۔ ترقی کے دور میں یہ ناگزیر ہے کہ ایسا نہ ہو۔ ڈینگ شیاؤ پنگ نے کہا تھا کہ پہلے کچھ لوگوں کو امیر ہونے دو ورنہ کوئی امیر نہیں ہوگا۔ آپ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ لوگ اس سال 40000 بار سڑکوں پر اتر آئے، میں نے تو نہیں دیکھا لیکن اگر آپ کی اطلاع صحیح ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ چین میں مظاہرے کی آزادی ہے اور یہ لازمی ہے کہ اگر کوئی اپنے عہدے کا غلط استعمال کرتا ہے تو اس کے خلاف مظاہرے ہونے ہی چاہئیں۔

سوال: چین کی اردو شاعری میں محبت کا کیا مقام ہے؟

جواب: ہر زبان کی شاعری میں کچھ چیزیں مشترک ہوتی ہیں۔ ان میں محبت ہمیشہ موزوں رہا ہے۔ اسی طرح نیکی، انسانیت، غم، فکر، بدی کے خلاف آواز بلند کرنا ہر زبان کی شاعری میں موجود ہے۔ خواہ وہ چین کی شاعری ہو یا کہیں اور کی۔

سوال: کیا جدید چینی ادب میں جنسی آزادی کو موضوع بنایا جا رہا ہے؟

جواب: نہیں چین میں جنس پر گفتگو کے معاملے میں کبھی آزادی نہیں رہی۔ اگر کوئی چوری چھپے جنسی تعلقات قائم کرتا ہے تو لوگ اس کی مذمت کرتے ہیں۔ سیکس کا کھلا پن تو مغربی ممالک میں ہی زیادہ دیکھنے میں آتا ہے چینیوں پر کنفیوشس کا اثر ہے جو آج بھی موجود ہے۔ کنفیوشس کی تعلیمات میں کھلے سیکس پر پابندی ہے اسے بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے وہاں کے ادب میں جنسی آزادی کے موضوعات کا کوئی مقام نہیں۔

سوال: لیکن چین میں تو نیکیڈ بیچ (Naked Beach) کھل رہے ہیں تا کہ مغرب کے سرمایہ کار اپنی طرز زندگی کے مطابق رہ سکیں۔ اس بات کی گواہی "چائنا ڈیلی" بھی دیتا ہے؟

جواب: نہیں یہ غلط ہے کہ ایسا کوئی سمندر ساحل ہے جہاں عورتوں اور مردوں کو تمام کپڑے اتار کر نہانے کی اجازت ہے۔

سوال: چین کی نئی نسل کے مزاج میں کچھ تبدیلی آ رہی ہے؟

جواب: پرانی نسل کے مقابلے میں انانیت پسندی کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ پرانی نسل کو تعلیم دی جاتی تھی: پہلے قوم اور انسانوں کے بارے میں سوچنے کی، بعد میں اپنے بارے میں سوچنے کی، لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ میں نے تین سال صحافت کی تعلیم دی ہے، میں اس میں خوش تھا لیکن مجھے اردو پڑھنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ میں نے یہ تسلیم کر لیا اور مناسب خیال کیا کہ قوم اور ملک کو اس کی ضرورت ہے۔ اگر آج کے طلبہ کو یہ حکم دیا جائے تو وہ نہیں مانیں گے۔

•••

متفرقات

رامسے کلارک سے بات چیت

رامسے کلارک ریاستہائے متحدہ کے سابق اٹارنی جنرل ہیں۔ انھوں نے امریکی تحریک برائے خانگی حقوق کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جارج ڈبلو۔بش کی تعزیری کارروائی کی مخالفت کرنے والی تحریک سے منسلک رہ چکے ہیں۔ عراقی خصوصی عدالت کے سامنے صدام حسین کی حمایت کرنے والے وکلا کی جماعت میں شامل رہے۔ ماضی قریب میں وہ کولکاتا کے سفر پر تھے۔ وہاں ان سے مارکس ڈام نے جو انٹرویو کیا تھا اس کے چند اقتباسات پیش ہیں۔ یہ انٹرویو ''دی ہندو'' کی 17 دسمبر 2007 کی اشاعت میں چھپا تھا جسے اردو میں جناب معید الرحمٰن نے منتقل کیا ہے۔

سوال: اگر کوئی یہ بات کہے کہ مروجہ سیاسی محاورہ ''بین الاقوامیت'' ایک پرفریب نعرہ ہے، جس کے پیچھے ریاستہائے متحدہ امریکا موجودہ عالمی نظام میں اپنے مفادات کی توسیع کر رہا ہے تو اس پر آپ کا کیا ردِ عمل ہوگا؟

جواب: میرا ماننا ہے کہ جو لوگ عالم کاری کی توسیع کے لیے کام کر رہے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ پوری دنیا نفسیاتی طور پر اپنے آپ کو ایک گروہ سمجھے اور یہ ان کے منصوبے کو آسان بنانے کے لیے ہے۔

سوال: عالم کاری کی لہر جو امریکی سرمایہ دارانہ طرز کو قبول کرنے سے مضبوطی سے جڑی ہوئی ہے، پوری دنیا میں عدم مساوات کو بڑھاوا دے رہی ہے۔ اس رویے کو آپ کس زاویے سے دیکھتے ہیں؟

جواب: یہ تہذیب کے لیے، انسانیت کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ نہ صرف سیاسی خطرہ بلکہ معاشی بھی۔ مزید برآں کہ یہ نوع انسانی کی رنگا رنگ تہذیب وثقافت پر حملہ ہے۔ ایک ٹیکنالوجی، ایک طرز تفریح، ایک اشیائے خورد ونوش، ایک زبان، جو صرف اقتصادی قوت پر مبنی ہو؛ یہ ذہنیت دنیا کے متعدد جہات میں پھیل رہی ہے۔ صارفیت اور مادیت کی اپنی ایک طاقت ہے اور شاید تہذیب وثقافت سب سے زیادہ اس کی زد میں ہیں۔ جس طریقے سے یہ دنیا پر غالب آ رہی ہے۔ وہ افسوس ناک ہے۔

سوال: لیکن دنیا کے مختلف خطوں میں نمو پذیر ترقیات کے متبادل طریقہ ہائے کار، امریکی طرز فکر کے لیے جوابی حیثیت رکھتے ہیں جو اپنے ماتحت سیاسی اقتدار قائم کرنے کے خواہاں ہیں۔ اس پر آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ عالم کاری کے نتیجے میں پیدا شدہ مسائل سے آگاہی میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ ہم عالم کاری کی رفتار کو مدھم ہوتے ہوئے اور اس سے اہم بات یہ ہے کہ اس کے حقیقی معنی سے لوگوں کو آشنا ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں کہ انفرادی سماج پر عالم کاری کے کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

سوال: عالم کاری نو استعماریت کی ایک شکل بھی قرار دیا جا رہا ہے، کیا آپ اس سے متفق ہیں؟

جواب: قدیم سرمایہ داری اور نئی عالم کاری کے طریقہ کار کے درمیان فرق کی واضح مثال ہندوستان ہے۔ وہ ملک جو بیرونی استیلا کے ظلم وستم کا شکار رہا جس کے نتیجے میں وہ مفلس و نادار تو بنا لیکن عالم کاری سے قبل تک، مثال کے طور پر ہندوستانی فلم اور صنعت وحرفت کو لیں، اس کی ظاہری شکل وصورت ہندوستانی ہی رہی۔ اب عالم کاری کی شدت زندگی کے ہر شعبے پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ خواہ وہ کامیڈی ہو یا سیر وتفریح۔ موسیقی بھی اب تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ فی الحقیقت یہ حالات صارفیت اور مادیت کو اسلحوں کے حصول سے زیادہ خطرناک بنا دیتے ہیں۔ قدیم استعماریت میں آپ اپنے دشمن سے بخوبی واقف تھے، آپ جانتے تھے کہ آپ

کی پشت پر چھری ہے۔ آپ آگاہ تھے کہ اچھی زندگی کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ جدید صارفیت کے دور میں آپ محبوس اور بے خبر ہیں۔ جب ایک قیدی اپنی زنجیروں سے ناواقف ہوگا تو وہ بے بس ہوگا۔ اگر آپ گلوبلائزیشن/ عالم کاری کا مشاہدہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کے تخیلات اور جذبات پر پابندی ہے، جو ایک تشویشناک امر ہے۔

سوال: ہمارے ملک میں ان دنوں ریاستہائے متحدہ کے ساتھ نیوکلیائی معاہدے پر دستخط کے سلسلے میں سیاسی مباحثے جاری ہے اور بائیں بازو اسے ایک علاحدہ معاملہ سمجھنے اور دونوں ممالک کے مابین مشاورتی طریقۂ کار کا حصہ نہ سمجھنے کو سادہ لوحی قرار دے رہا ہے، کیا آپ اس پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہیں گے؟

جواب: ہندوستان کے لوگ بہت ذہین ہیں، وہ جانتے ہیں کہ وہ کیا کرنے جا رہے ہیں۔ اگر چہ ان کے اور امریکا کے مقاصد الگ الگ ہونے کے امکانات ہیں۔ مختلف وجوہات کی بنا پر دونوں جمع ہو رہے ہیں لیکن اگر آپ نیوکلیائی اسلحوں پر امریکا کے مضبوط حلیف ہیں تو پھر آپ عالم کاری کی توسیع اور تہذیبوں کو مٹانے پر آمادہ ہیں۔

سوال: یہاں ہم صرف نیوکلیائی اسلحہ معاہدے کی نہیں بلکہ نیوکلیائی باہمی تعاون کے مکمل معاہدے کی بات کر رہے ہیں؟ اس پر آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: نہایت چابکدستی اور تیزی سے ٹیکنالوجی چیزوں کو بدل سکتی ہے اور بدلے گی۔ وہ اس صلاحیت کو دو چند کر دے گی جسے ہم اجتماعی تباہی کا اسلحہ (WMD) کہتے ہیں۔

امن کے نام پر نیوکلیائی ہتھیاروں میں اضافہ کرنے والے ممالک کی حفاظت کی اگر ہم بات کرتے ہیں تو کس امن کی بات کرتے ہیں؟ ان ممالک کے حوالے سے جو بہت زیادہ طاقتور ہیں یا عالمی امن کی؟ میرے کہنے کا منشا یہ ہے کہ اگر نیوکلیائی اسلحوں کا مالک صرف میں ہوں اور کہیں بھی اسے تقسیم کرنے کی استعداد محض میرے پاس ہے تو پھر امن پر میری ملکیت ہے او رکسی کی نہیں۔ یہ ناجائز موقف ہے۔ انسانیت کے خلاف شدید تخریبی موقف ہے۔

سوال: عراق میں امریکی جارحانہ جنگ کے خلاف مختلف مہمات سے آپ منسلک رہے ہیں اور ممتاز وکلا کی اس جماعت میں بھی شریک تھے جو صدام حسین کے دفاع کے لیے رضا کارانہ

طور پر تشکیل دی گئی تھی۔ کیا گذشتہ چند مہینوں میں عراق کے تئیں امریکی موقف میں کوئی تبدیلی آئی ہے؟

جواب: کیا اس جارحانہ جنگ میں امریکا کو کوئی قیمت نہیں چکانی پڑی؟ کیا عراقی مزاحمت شدید نہیں تھی اور امریکا کے لیے پریشان کن نہیں تھی؟ نہ صرف جانی نقصان کی رو سے بلکہ عالمی وقار اور عزت کی رو سے بھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو عالمی امن کے لیے یہ تباہ کن بات ہوتی۔ عراق نے تو امریکا کو دھول چٹا دی۔ درحقیقت امریکا کی یہ جارحانہ جنگ عظیم بین الاقوامی جرم تھا...... انسانیت پر ظلم...... عراق میں اگر آپ لوگوں کی حالت دیکھیں گے تو دل پھٹ جائیں گے۔ زندگی کی ہر سطح پر بربادی ہوئی ہے، ناقابل برداشت بربادی۔ انسانیت کے فقدان کی کوئی ایسی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ تقریباً ڈھائی ملین لوگ اپنے ملک سے باہر دربدر ہیں۔ ایک ملین سے زائد مارے جاچکے ہیں۔ 75 فیصد بغیر بجلی اور پانی کے رہ رہے ہیں۔ مزید یہ کہ ہمیشہ خدشہ لگا ہوا ہے۔ کسی بھی لمحے قتل کیے جانے کا اندیشہ لگا رہتا ہے۔ دنیا کو اس سے زیادہ تشویش ناک حالات دیکھنے پڑیں گے۔ اسے روکنے کے لیے ہمیں متحد ہونا چاہیے۔

سوال: وہ دہشت گردی، امریکا جس سے جنگ کرنے دعویٰ کرتا ہے کیا اس کی خودساختہ ہے؟

جواب: دہشت گردی کے نام پر جنگ دراصل اسلام کے خلاف جنگ ہے۔ اکثر سیاستداں اسے اسلامی دہشت گردی کا نام دیتے ہیں، فی الحقیقت وہ اسلام کو خطرہ تصور کرتے ہیں۔ اسلام کے خلاف جنگ دراصل مسلمانوں کے اس تناسب کو ختم کرنا ہے جس کی نظیر اس سے پہلے دیکھنے کو نہیں ملتی۔

سوال: اسلام سے یہ خطرہ کیوں ہے؟ ریاستہائے متحدہ کے ناقدین کا کہنا ہے کہ یہ ایک نفسیاتی خوف ہے۔ جس طرح سرد جنگ کے دوران اس کے لیے کمیونزم ایک خدشہ بنا ہوا تھا، کیا آپ کے خیال میں اب یہ اسلام کی شکل میں ہے؟

جواب: جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے اس نے اس زمانے میں بہتر کام انجام دیے جب کوئی اقدار و اصول موجود نہیں تھے۔ مال و زر کی حرص اور قوت بازو کا

دور دورہ تھا۔ امریکا میں اسلام ان افریقی امریکنوں کی زندگی میں پیوست ہوگیا، جو گلیوں میں ہونے والے تشدد میں ملوث ہوا کرتے تھے اور اپنی زندگی کے لیے جدوجہد کیا کرتے تھے۔ اچانک جب ان میں اسلام داخل ہوا تو وہ امن واطمینان، وقار اور عقیدے سے بہرہ ور ہوئے، ایسا عقیدہ جس پر وہ یقین کرسکتے ہیں۔

امریکا کا خوف برحقیقت ہے۔ عالم کاری کے در پردہ مادی اقدار ہیں جیسا کہ مارک ٹوین کا خیال ہے کہ اگر آپ زیادہ چیزیں پیدا کرنا چاہتے ہیں، زیادہ مکانات تعمیر کرانے کی خواہش رکھتے ہیں، کثیر مقدار میں چیزیں فروخت کرنے کی تمنا ہے، وافر مقدار میں روپیہ جمع کرنے کی آرزو ہے تو غیر ضروری اشیا کو ضروری بنا کر پیش کرنا ہوگا۔ اس کے نتیجے میں خطرناک واقعہ یہ برپا ہوگا کہ ہر ملک میں مالدار لوگ مالدار ترین اور غریب لوگ مزید مفلوک الحال ہوتے جائیں گے۔ عالمی پیمانے پر غریبوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہورہا ہے۔ اسی کے ساتھ دولت کا ارتکاز بھی ترقی پر ہے۔ یہ ایک غیر صحت مندانہ رویہ ہے۔

امریکی حکومت کو ہمیشہ دشمن کی ضرورت رہتی ہے اور نئے دشمن کی تلاش درحقیقت اپنے ملک کو متحد رکھنے کا ذریعہ ہے۔ اپنے مقاصد کی تکمیل کا یہ ایک طریقہ ہے جسے بے اصولی کی انتہا کہا جاسکتا ہے۔ وطن کی محبت مقصود نہیں ہے، اصل محرک تو دوسروں پر تسلط اور ان کا استحصال ہے۔ اس طرح دشمنی کے لیے زمین تو ہموار کرنی ہی پڑتی ہے۔ پھر عسکری قوت کا معاملہ آتا ہے۔ امریکا دوسرے ممالک کے مجموعی بجٹ سے زیادہ اپنے ہتھیاروں پر صرف کرتا ہے۔ یہ بات اس وقت اور بھی سنگین ہوجاتی ہے جب امریکا نیوکلیائی ہتھیاروں کی افزائش پر دوسرے ملکوں کو صفحۂ ہستی سے ختم کرنے کی دھمکی دیتا ہے جب کہ وہ خود مختلف قسموں کے نیوکلیائی ہتھیار تیار کررہا ہے اور ایسے ایسے راکٹ بنا رہا ہے جو ایک منٹ میں کہیں بھی داغے جاسکتے ہیں۔

سوال: دنیا کے مختلف خطوں میں ایسے ممالک ہیں جو ریاستہائے متحدہ کے تسلط کے خلاف ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: استحصال کرنے کے لیے کسی پر آپ قابض ہوتے ہیں تا کہ آپ کسی طرح اس کی دولت حاصل کرلیں۔ اس کے مال وزر پر تصرف حاصل کرنے کے لیے آپ اسے زیر کرتے ہیں۔ آپ اسے اس بات سے غافل رکھتے ہیں کہ وہ تبدیلیوں کو محسوس کر سکے اور یہ دیکھ سکے کہ آپ اس کے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ اگر لاطینی امریکا کی نئی آزادی کا آپ مشاہدہ کریں تو یہ چونکانے والی ہے۔ قدیم کیوبائی انقلاب آپ کے سامنے ہے جس کا احیا ہی کرشمہ ہے۔ عرصے سے زبردست پابندیاں عائد ہونے کے باوجود خواندگی کی شرح وہاں کے نصف کرۂ جنوب میں سب سے زیادہ ہے۔ وینزویلا کو لیجیے کہ وہاں ارجنٹائنا میں کیا ہو رہا ہے۔ برازیل اور چائل پر ایک نگاہ ڈالیے جہاں ایک عورت پنوچٹ کے ذریعے قید کر لی گئی۔ 1947 میں اس کے باپ کو قتل کر دیا گیا، اب وہاں وہ صدارت کے عہدے پر ہے۔ ان ممالک نے غلامی کی زنجیروں کو توڑ دیا ہے اور وہ آگے بڑھ رہے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ہندوستان بھی اپنے دشمنوں کو اسی نظریے سے دیکھ رہا ہے۔ حالانکہ قبل ازیں ایسا کبھی نہیں ہوا اور یہی رویہ چین کا بھی ہے۔ ان ممالک کے پاس طاقت ہے جس کی وجہ سے ان کی اہمیت ہے۔ ریاستہائے متحدہ ان پر آسانی سے اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ اب ہمارا یہ فرض ہے کہ ان مسائل کے شعور کو عام کریں۔ عسکری قوت میں عدم تناسب کی وجہ سے ہم دہشت ناک خونیں دور سے دوچار ہو سکتے ہیں جو ابھی نظر نہیں آ رہا ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود ہمیں اپنی اقدار کی جانب واپس آنا چاہیے جو محض صارفیت سے بدرجہا بہتر ہے۔ صارفیت کا مفہوم یہ ہے کہ مجھے صرف چیزیں چاہئیں، بہتر غذا، بہتر مکان اور ایک لمبی سی کار، بالفاظ دیگر دنیا کے ہر قسم کے کھلونے ہم اپنے بچوں کے لیے خریدنا چاہتے ہیں۔

•••

شاہ فیصل سے ملاقات

وادیِ کشمیر میں ضلع کپوارہ کے دور افتادہ گاؤں سوگام سے تعلق رکھنے والے شاہ فیصل نے اس برس سول سروس امتحان میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔ وہ یہ اعزاز پانے والے پہلے کشمیری نوجوان ہیں اور انھوں نے اُردو کو بطورِ اختیاری مضمون لے کر یہ کارنامہ انجام دیا۔ وہ کہتے ہے کہ اُردو زبان وادب میں طالب علم کو کامیابی دلانے کی مکمل توانائی اور اہلیت موجود ہے۔ پرویز احمد نے اُن کے ساتھ ایک تفصیلی گفتگو کی ہے، جس کے اقتباسات یہاں پیش ہیں:

سوال: آپ اپنی کامیابی کا سہرا کس کے سر باندھتے ہیں؟

جواب: اپنی ماں کے سر۔ اس نے بے پناہ مشکلات کے باوجود مجھے اور میرے دوسرے بھائی بہن کو پڑھوایا۔ حالانکہ والد صاحب کی وفات کے بعد ہماری گھریلو حالت ناگفتہ بہ ہوئی مگر پھر بھی میری والدہ نے سخت محنت کرکے ہمیں اپنی تعلیم جاری رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اس لیے میری کامیابی انھی کی محنت ومشقت کی بدولت ہے۔ اس کے علاوہ میرے اساتذہ، میرے رہبر، دوست اور رشتہ دار سب نے میرا ساتھ دیا۔

سوال: کیا آپ کو یقین تھا کہ آپ اوّل پوزیشن حاصل کر پائیں گے؟

جواب: مجھے امتحان پاس کرنے کا پختہ یقین تھا مگر مجھے یہ کوئی اندازہ نہیں تھا کہ میں اوّل پوزیشن حاصل کر پاؤں گا۔

سوال: تو اوّل پوزیشن حاصل کر کے آپ نے کیا محسوس کیا؟

جواب: میں بہت خوش ہوا۔ تاہم میں نہیں سمجھتا کہ میں نے کچھ ایسا کیا جو ناممکن ہو۔ ہر برس کوئی نہ کوئی اوّل پوزیشن حاصل کر ہی لیتا ہے۔ لہذا میں نے کچھ ایسا نہیں کیا جو اس سے قبل کسی اور نے نہ کیا ہو۔

سوال: آپ نے کم عمری میں ہی اپنے والد صاحب کو کھو دیا۔ اس کے باوجود آپ اپنے کیریئر پر کیسے بھر پور توجہ دے پائے؟

جواب: یہ حقیقت ہے کہ والد صاحب کی موت کے بعد ہمارا گھر اُجڑ گیا تھا۔ پہلے پہلے تو مجھے ایسا لگا کہ شاید اب مجھے گھریلو ذمے داریاں سنبھالنی پڑیں گی کیونکہ میں اپنے والدین کی بڑی اولاد ہوں۔ مگر میری والدہ نے میرا حوصلہ بڑھایا یوں ہم بہن بھائیوں نے تعلیم جاری رکھی۔

سوال: ایک تاثر ہے کہ مسابقاتی امتحانات میں کشمیری مسلمانوں کے ساتھ امتیاز برتا جا رہا ہے۔ آپ کے تجربات کیا ہیں؟

جواب: یہ بالکل غلط ہے۔ ہرگز کوئی بھید بھاؤ نہیں برتا جا رہا ہے۔ بلکہ مجھے لگتا ہے کہ کشمیری ہونے کی وجہ سے میری زیادہ ہی حوصلہ افزائی کی جاتی رہی۔

سوال: آپ ایک ڈاکٹر تھے اور بظاہر اچھا کیریئر آپ کے پاس پہلے ہی موجود تھا پھر کس چیز نے سول سروس کی جانب راغب کیا؟

جواب: دراصل MBBS کی ٹریننگ کے دوران ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں سول سروس کے لیے کوشش کروں گا۔ کیونکہ میں نے سوچا تھا کہ سول سروس ایک ایسا کیریئر ہے جہاں ڈاکٹری کی بہ نسبت میں لوگوں کی زیادہ خدمت کر پاؤں گا۔ وہاں آدمی کو اختیار ملتا ہے اور اگر اس اختیار کو مناسب طور استعمال کیا جائے تو سماج میں لازماً ایک تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔

سوال: آپ کیا تبدیلی لانا چاہتے ہیں؟

جواب: میں بلند بانگ دعوے نہیں کروں گا کہ میں سسٹم کو بدل دوں گا یا کوئی نا قابلِ یقین تبدیلی لاؤں گا۔ البتہ میں نے عہد کر رکھا ہے کہ میں اپنی ذاتی حیثیت میں وہ سب کچھ کروں گا جس سے عام انسان کو راحت ملے۔ ایک ایماندار اور عوام دوست سول سرونٹ کی حیثیت سے میں مقدور بھر کوشش کروں گا کہ لوگوں کو فائدہ پہنچے۔

سوال: کیا آپ نہیں سمجھتے کہ ڈاکٹری چھوڑ کر آپ اپنے مریضوں سے دور ہو گئے ہیں؟

جواب: سچ پوچھیں تو کہہ دوں کہ اپنے مریضوں کے ساتھ میرا ایک جذباتی رشتہ پیدا ہو گیا تھا۔ مجھے ان کا علاج معالجہ کر کے روحانی سکون ملتا تھا۔ میں اب بھی ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنے مریضوں کے لیے حاضر خدمت رہوں گا۔

سوال: اُردو کو بطورِ مضمون اختیار کرنے کا پس منظر بتایئے؟

جواب: میرے والد صاحب اُردو کے دل دادہ تھے۔ انھوں نے بچپن میں مجھے اُردو زبان و ادب کی طرف راغب کیا۔ میں نے اسکولی ایام میں کلامِ رومی اور فارسی کی کتاب پند نامہ عطار کے علاوہ علامہ اقبال اور فیض کی شاعری پڑھی ہے۔ ڈاکٹری کے دوران بھی اُردو شاعری کے ساتھ میری دل چسپی برقرار رہی۔ اس لیے میں نے IAS کے لیے اُردو کو بطورِ اختیاری مضمون لے لیا۔

سوال: امتحان کے لیے آپ نے کن کتابوں کا مطالعہ کیا؟

جواب: بہت ساری کتابیں پڑھیں۔ مثلاً ڈاکٹر خلیل احمد بیگ کی 'اُردو کی لسانی تشکیل'، پروفیسر مسعود حسین کی 'اُردو زبان کی لسانی تاریخ'، ڈاکٹر سنبل نگار کی 'اُردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ' اور 'ادب نما' وغیرہ۔ اس کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے میں نے اُردو ادب، رومانی تحریک اور ترقی پسند تحریک کے موضوعات پر کتابیں منگوائیں۔

سوال: اُردو کو بطورِ مضمون اختیار کر کے جس مواد کی آپ کو ضرورت پڑی کیا وہ آسانی سے دستیاب ہوا؟

جواب: چونکہ میں ہمدرد اسٹڈی سرکل دہلی میں رہا اس لیے وہاں کی لائبریری میں مجھے سب مواد فراہم ہوا۔ میں دوسروں سے نوٹس وغیرہ لینے کا عادی نہیں ہوں بلکہ موضوعات پر اصل کتابیں پڑھا کرتا ہوں۔

سوال: سول سروس کے لئے جو لوگ اُردو کو بطور اختیاری مضمون لینا چاہیں گے اُنھیں آپ کیا مشورہ دیں گے؟

جواب: اُن سے میری گزارش ہے کہ اُردو آپ بلاشبہ مضمون کی حیثیت سے لیں مگر چند چیزوں کی طرف خاص دھیان دیں۔ اِملا، ہینڈ رائٹنگ اور تخلیقی طرز۔ سوالات کے جوابات لکھنے کے دوران ان تین چیزوں کی طرف از حد توجہ کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ شاعری کے ساتھ لگاؤ ضروری ہے کیونکہ سوالوں کے جواب لکھنے میں تخلیقی طرز تحریر کافی اہمیت کی حامل ہے۔ مزید یہ کہ Vocabulary بڑھانے کی کوشش کی جانی چاہئے۔

سوال: نو جوانوں میں اُردو کی جانب رغبت روز بہ روز کم ہوتی جارہی ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اُردو کیریئر کی تعمیر میں مدد نہیں دیتی ہے۔ آپ کا اس پر کیا کہنا ہے؟

جواب: دیکھئے میرا اُردو مضمون اختیار کر کے کامیابی پانا ثابت کرتا ہے کہ اُردو زبان میں طالب علم کو کامیابی دلانے کی بھر پور طاقت اور مواقع موجود ہیں۔ میں نے اُردو سے لو لگائی اور اس زبان نے مجھے اس منزل پر پہونچا دیا جس کی مجھے آرزو تھی لہٰذا دوسروں کے لئے بھی یہ زبان فائدہ بخش ثابت ہو سکتی ہے۔

سوال: ایک تاثر ہے کہ اُردو زبان کئی طرح کی ناانصافیوں کی شکار ہے۔ آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: دکھ کی بات یہ ہے کہ اُردو کو مذہب کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ میری رائے میں کسی بھی زبان کو مذہب کے ساتھ جوڑنا ناانصافی ہے کیونکہ ایسا کرنے سے اُس زبان کے فروغ کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ اُردو زبان کے تعلق سے ایک تعصب کی فضا پائی جاتی ہے۔ اُس صورتِ حال سے اس زبان کو آزادی دلانا ضروری ہے۔ تب جا کر یہ زبان پھلے پھولے گی۔

سوال: سرکاری دفاتر میں چونکہ کام کاج کی زبان انگریزی ہے ایک آفیسر کی حیثیت سے آپ اُردو کے لیے کیا کریں گے؟

جواب: اُردو میرا passion ہے، جذبہ ہے۔ اس زبان کے ساتھ مجھے اُلفت ہے۔ لہٰذا اُردو کے ساتھ میرا رشتہ ہر حال میں برقرار رہے گا۔

سوال: سول سروس امتحان میں شرکت کے خواہاں کشمیری طالب علموں کے لیے آپ کا کیا پیغام ہے؟
جواب: میری اُن سے گزارش ہے کہ وہ سول سروس امتحان میں حصہ لیں۔ میری کامیابی اس بات کا ثبوت ہے کہ کشمیری نوجوانوں میں بھرپور صلاحیتیں موجود ہیں اور وہ کچھ بھی حاصل کرنے کے اہل ہیں۔ میں امتحان کی تیاری کے لیے اُن کی ہر طرح سے مدد کرنے کے لیے تیار رہوں گا۔

•••

امیتابھ گھوش سے گفتگو

4 جنوری 2004 کا دن خلائی سائنس کی تاریخ میں اس وقت یادگار بن گیا جب ناسا کا اسپرٹ روور مریخ پر پہنچا اور وہاں پر موجود چیزوں کی سہ ابعادی تصویریں بھیجنی شروع کیں۔ اب وہ دن زیادہ دور نہیں جب مریخ پر بھی انسانی قدموں کی آہٹ سنائی دے گی۔ مشن مریخ سے متعلق مختلف موضوعات پر ناسا کی تجربہ گاہ میں کام کرنے والے 33 سالہ ہندستانی نژاد ماہر ارضیات امیتابھ گھوش سے نونا والیا کی گفتگو' ٹائمس آف انڈیا' نئی دہلی 12 جنوری 2004 کے شکریے کے ساتھ قارئین کی نذر ہے۔

سوال: ناسا کے پاسا ڈینا میں واقع جیٹ پروپلسن لیبوریٹری میں کام کر رہے لوگوں کو اس وقت کیسا لگا جب اسپرٹ روور نے مریخ کی رنگین تصویریں بھیجنی شروع کیں؟

جواب: تجربہ گاہ میں کام کر رہے لوگوں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اسپرٹ مریخ پر صحیح وسلامت اتر گیا ہے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اب چیزیں سچ ہوتی نظر آ رہی ہیں۔ مریخ سے تصویریں آ رہی ہیں یہ بہت بڑی بات ہے۔ ہم لوگ ایک تاریخ بنا رہے ہیں۔ ہم لوگ جشن منا رہے تھے۔ ہم اپنا حوصلہ بڑھانے کے لیے چیخ رہے تھے، گا رہے تھے اور نعرے بازی کر رہے تھے۔

آپریشن ریڈینیس ٹیسٹس (Operation Readiness Tests) کے بعد اب ہم لوگ انسانی معلومات کی سرحدیں پار کر رہے ہیں۔

روور اسپرٹ (Rover Spirit) کے لیے سب سے مشکل کام 300 ملین میل کا سفر (جو کہ دہلی اور ممبئی کے درمیان تین لاکھ بار سفر کرنے کے برابر ہے) طے کرنا نہیں تھا بلکہ اس کے لیے سب سے اہم مسئلہ تھا مریخ کی فضا میں داخل ہونا اور اس پر اترنا، ایک ایسا عمل جس میں 370 سلسلہ وار ہدایتیں تھیں۔ ہمارے جہاز راں یقیناً اہمیت کے حامل ہیں۔ حقیقت میں وہ بہادر ہیں۔ ہمارے مشن کے سربراہ اسٹیو اسکوائرس (Steve Squyers)، جو کہ 100 لوگوں کی ایک جماعت کی رہنمائی کرتے ہیں، نے ہم لوگوں کی حوصلہ افزائی کی۔

سوال: آج جب کہ تخیل پر حقیقت بازی مار رہی ہے، کیا مریخ پر انسانی مہم جانے کا مشن کامیاب ہوگا؟

جواب: دیکھیے، کل تک جو چیزیں خیالی تھیں، آج وہ حقیقت میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ ذرا سوچیے کہ آج سے لگ بھگ سو سال پہلے وھائٹ برادران نے کیا کیا تھا؟ مریخ پر انسانی مشن کو جانے میں سو سال اور لگیں گے۔ ابھی تو ہم لوگ صرف پانی کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ انسانی مشن کو مریخ پر جانے کے لیے، وہاں ٹھہرنے کے لیے وہاں سے واپس آنے کے لیے پانی کی ضرورت ہے، مریخ پر ایک بار جانے کے لیے سائنس دانوں کو اور جس چیز کی ضرورت ہے، وہ ہے دو سال تک کے لیے پانی کی فراہمی۔

سوال: مریخ سے موصول ہونے والی رنگین تصویروں کے بارے میں کیا خیال ہے، جو کہ ناسا کو کسی دوسری دنیا سے ملنے والی پہلی رنگین تصویریں ہیں؟

جواب: آپ نے ابھی اچھی تصویریں نہیں دیکھی ہیں۔ ایک بار جب ہمارا سیر بینی کیمرہ (Panoramic Camera) تصویریں لینا شروع کر دے گا تو سہ ابعادی تصویریں موصول ہوں گی۔ ہم لوگ مریخ سے بہترین تصویروں کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔ پاتھ فائنڈر کے نتائج کے مقابلے میں مریخ کا افق غیر حقیقی معلوم ہوتا تھا۔ اس بار چٹانیں چھوٹی ہیں اور کچھ علاقوں میں گڈھے ہیں۔

درحقیقت، اب ہم لوگ اس پر موجود گڑھوں کی اسٹڈی کر رہے ہیں اور یہ پتہ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ کیسے وجود میں آئے۔200 ملین امریکی ڈالر (جتنی رقم ٹائیٹینک کو بنانے میں خرچ ہوئی تھی) کے بجٹ پر روور مریخ کی دنیا میں ایک قابل قدر سائنسی کارنامہ انجام دینے جا رہا ہے۔ طیف پیما (Spectrometers) اور کیمروں کے ساتھ ساتھ پہلی بار روور میں خورد بینی برما بھی لگایا گیا ہے۔ ہم لوگ اس پر موجود چٹانوں کا تفصیل سے مطالعہ کرنے جا رہے ہیں۔ ہم لوگ بہت اہم سوالات اٹھانے جا رہے ہیں۔ مریخ کے میدانی علاقے میں موجود چٹانوں والی خشک زمین کی کیا وجہ ہے؟ کیا مریخ پر پانی ہے؟ اس لیے آنے والے کچھ سال ہمارے لیے کافی اہم ہیں۔

سوال: کیا اس سرخ سیارے میں زندگی کے آثار موجود ہیں؟

جواب: ہمیں یقین ہے کہ مریخ پر کبھی زندگی تھی لیکن ابھی وثوق سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں بھی زمین کی طرح زندگی ہے۔ کیا مریخ پر آب وہوا جو فرق ہے جسے یہاں زمین پر جس میں زندگی ہے؟ پچھلے کچھ دنوں سے اسی بات کا مطالعہ کر رہا ہے کہ کیا انتہائی ماحول میں بھی زندگی ممکن ہے؟ گواہ رہے کہ ہم لوگ مریخ پر پانی کی کھوج میں لگے ہوئے ہیں۔

درحقیقت، ہمارا اوور اسپرٹ گوساف پر اترا ہے جو کہ ایک خشک جھیل ہے کہ ایسا ممکن ہے کہ مریخ پر قدیم ترین زندگی کی کوئی شکل موجود ہو۔............ ہے کہ مریخ پر پانی ہے۔ لیک یہ ایک بہت مشکل سوال ہے کہ یہ نکالے جا سکنے والی شکل میں ہے یا نہیں۔

سوال: کیا آنے والے دنوں میں اسپرٹ کو کوئی مشکل درپیش آ سکتی ہے؟

جواب: ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اسپرٹ بہت ہی مخالف ماحول میں کام کر رہا ہے اور آنے والے دنوں میں اس کا کام اور بھی مشکل ہو جائے گی اور اس وقت لینڈر پر ہے ہم لوگ جلد ہی اس کو وہاں سے نیچے اتاریں گے اور اس کے اردگرد اس کو گھمایا جائے گا تا کہ چٹانوں کا تجزیہ کیا جا سکے۔ اس وقت ہم اس کی اور بہت ساری تصویریں حاصل کر لیں گے۔ مریخ پر اسپرٹ کو پڑاؤ کو یقینی بنانے کے لیے ہم لوگ ہم پہلے ہی اس کی فوری جانچ شروع کر چکے ہیں۔ روور کو بہت احتیاط کے ساتھ حرکت دیا جائے گا تا کہ جب کسی چٹان کے اوپر یہ

جائے تو الٹ یا گر نہ جائے۔ سب سے بڑی مشکل اس کو مریخ پر چلانا ہے۔ جلد ہی اسپرٹ کا جڑواں Opportunity مریخ کے دوسرے حصے پر اترے گا اور چٹانوں کے ارد گرد حرکت کرے گا تاکہ یہ پتا لگایا جاسکے کہ وہاں پانی موجود ہے یا نہیں۔

سوال: National Geographic Channel کے ذریعے ناسا تجربہ گاہ میں مریخ مشن کی تمام تیاریوں اور پھر روور اسپرٹ کو خلا میں بھیجے جانے کی تمام تفصیلات دکھائے جانے کے بارے میں ناظرین کا ردعمل بہت غیر معمولی ہے۔ ناسا ویب سائٹ کے پاس ایک ملین سے زیادہ اہم کامیابیاں موجود ہیں تو کیا مشن مریخ کو بھی کوئی کامیابی ملے گی؟

جواب: آنے والے کچھ دن بہت اہم ہوں گے۔ ہم لوگوں کو ابھی معلومات کی نئی سرحدیں عبور کرنی ہیں۔ ساری دنیا کی نگاہیں اسی سیارے پر لگی ہوئی ہیں۔ پورا گروہ، سائنس کی ٹیم جس کا ایک حصہ میں بھی ہوں،، لانچ ٹیم، بحری ٹیم وغیرہ تمام ٹیمیں جانفشانی سے کام کر رہی ہیں۔ National Geographic Channel نے الٹی گنتی شروع ہونے تک تمام تاریخی مناظر کو کیمرے میں قید کیا ہے۔

ہمارے ویب سائٹ کو ہر روز لاکھوں لوگ دیکھتے ہیں۔ ہم لوگ دو، APEX اور mini، TEs آلات پر کام کر رہے ہیں جو کہ ماحولیاتی سائنس اور اترنے کی جگہ کے ارضیاتی ماپ تول میں کافی معاون ہے۔

•••

دیوآنند سے گفتگو

ہندی فلموں کے سدابہار ہیرو دیوآنند کو سال 2002 کا دادا صاحب پھالکے ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ فلمی صنعت کا یہ سب سے بڑا اعزاز ہندستانی فلمی صنعت میں ان کی قابل قدر خدمات کے لیے دیا گیا ہے۔ دادا صاحب پھالکے ایوارڈ کے طور پر دو لاکھ روپے نقد، ایک شال اور طلائی تحفہ دیا جاتا ہے۔ دیو آنند نے بطور ہیرو اور بطور فلمساز ہندی سنیما کو کئی یادگار فلمیں دی ہیں ''بازی''، ''ٹیکسی ڈرائیور''، ''سی آئی ڈی''، ''کالا پانی''، ''جیول تھیف''، ''پیئنگ گیسٹ''، ''ہم دونوں''، ''تیرے گھر کے سامنے''، ''گائیڈ''، ''جانی میرا نام''، ''ہرے راما ہرے کرشنا'' اور ''دیس پردیس'' ان کی کامیاب فلمیں ہیں۔

سوال: دادا صاحب پھالکے ایوارڈ ملنے کے بعد آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟

جواب: بہت اچھا لگ رہا ہے، میں ابھی مہابالیشور میں ہوں اور ایک نئی فلم کا اسکرپٹ لکھ رہا ہوں، یہ سرد اور کچھ حد تک کوہستانی علاقہ ہے۔ یہاں اگر میں اپنی آنکھیں بند کرلوں تو مجھے فطرت سے نزدیک ہونے کا احساس ہو سکتا ہے۔ قدرتی مناظر سے قریب رہنا میرے لیے زندگی کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ یہ مجھے کافی پسند ہے لیکن اگر آپ پوچھتے ہیں کہ دادا صاحب

پھالکے ایوارڈ میرے لیے کیا معنی رکھتا ہے تو میں کہوں گا کہ میں نے ایوارڈ کے متعلق کبھی نہیں سوچا، میں اپنے آپ میں پوری طرح مشغول رہتا ہوں۔ جس سے مجھے بے حد طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ جیسے ہی ایک فلم مکمل کر لیتا ہوں اور وہ فلم بینوں کے درمیان جاتی ہے، جلد ہی دوسری فلم پر کام شروع کر دیتا ہوں۔ کون جانے وہ فلم اچھی ہے یا بری اور کسے پرواہ ہے کہ وہ کامیاب ہوگی یا نہیں۔

سوال: مستقبل میں کیا کیا منصوبے ہیں؟

جواب: میں امریکی موسیقی پر مبنی ایک فلم "Song of Life" بنا رہا ہوں لیکن بدقسمتی سے یہ تنازعہ کا شکار ہوگئی ہے۔ یہ فلم روی شنکر اور ان کی بیٹی نوراجانس کے بارے میں نہیں ہے اور نہ ہی اس کا اس خاندان سے کچھ لینا دینا ہے۔ یکسانیت صرف یہ ہے کہ یہ فلم ایک موسیقار اور اس کی بیٹی سے متعلق ہے۔ بہرحال "Song of Life" میری اپنی تخلیق ہے...... ہم اپنی موسیقی کے اعتبار سے کافی شہرت رکھتے ہیں۔ میں امریکی موسیقاروں اور اداکاروں کو لے کر اس طرح کی ایک میوزیکل کمپنی بنانا چاہتا ہوں تو اس میں غلط کیا ہے؟

سوال: ہندی فلم کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: ہندی فلم بینوں کے لیے میں ایک فلم "Beauty Queen" (ملکۂ حسن) بنا رہا ہوں۔ حقیقتاً، ابھی مہابالیشور میں اسی فلم کا اسکرپٹ لکھ رہا ہوں۔ فطری طور پر اس فلم میں ایک نیا چہرہ ہوگا۔ جب میں Beauty Queen کا خیال کرتا ہوں تو ایک نئے چہرے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اپنی پہچان بنا چکے اور اداکار کو تو سب جانتے ہیں۔ ہمارے اردگرد اتنی ساری ذہین اور قابل لڑکیاں ہیں جنھیں مواقع نہیں مل پا رہے ہیں۔

سوال: بالی ووڈ میں آنے والی زبردست اخلاقی تبدیلیوں کے بارے میں آپ کیا سوچتے ہیں؟

جواب: جہاں تک میں سمجھتا ہوں ہماری فلموں میں اخلاقی تبدیلی نہیں آئی ہے بلکہ صرف مقابلے کا انداز بدل گیا ہے۔ آج ہماری فلموں کا مقابلہ سیٹلائٹ ٹیلی ویژن اور عالمی سنیما سے ہے۔ ناظرین اپنی حدود سے آگے نکل چکے ہیں اور اپنے فلمی Entertainment کے بارے میں کافی مخصوص نظریہ رکھتے ہیں اور انھیں ایسا کرنا بھی چاہیے۔ انھیں اپنا مخصوص نظریہ

رکھنے کا پورا حق ہے۔ یہ آج کل کے فلم سازوں کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ لہٰذا ہمیں ناظرین کے ذہن کو سمجھنا ہوگا۔ نہیں تو تفریح کا معیار کبھی بھی بہتر نہیں ہو سکے گا۔

سوال: جب آپ کے دوست اور ساتھ کام کرنے والے آپ کے جیسا جوش ولولہ اور کمٹمنٹ نہیں دکھاتے تو کیا آپ کو مایوسی نہیں ہوتی؟

جواب: مجھے مایوسی نہیں ہوتی۔ میں ان کی پیسہ کمانے کی بے صبری کو سمجھ سکتا ہوں۔ جبکہ وہ کامیابی کی منزلوں پر ہیں وہ مواقع سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اس کے لیے آپ انھیں مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔ البتہ میں صرف ان لوگوں کے ساتھ کام کرنے کی کوشش کرتا ہوں جن کے ساتھ مجھے کام کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ جو مجھے اپنا وقت دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ جو لوگ کام کرنے کے لیے اور اپنی اہلیت ثابت کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں اور میرے اصول اور کمٹمنٹ کے مطابق کام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میری فلموں میں آپ ہمیشہ نئے چہرے دیکھتے ہیں۔

•••

سوال: آپ اشتراکیت کی جانب کیسے مائل ہوئے؟

جواب: میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد والد صاحب نے سرکاری نوکری کرنے کے لیے کہا لیکن میں نے انگریزوں کی نوکری کرنے سے انکار کر دیا۔ انگریز افسر کی سفارش کے باوجود میں نے نوکری جوائن نہیں کی۔ میں نے ٹیلرنگ کا کام شروع کر دیا اور کچھ ہی دنوں میں ایک ماہر Cutter بن گیا۔ والد صاحب کے ریٹائرمنٹ کے بعد میں کراچی آ گیا۔ کراچی میں نوکری کے دوران مجھے مالک اور مزدور کی کشمکش کا ذاتی تجربہ ہوا۔ اس سے میں اشتراکی نظریے کی طرف مائل ہوا۔ میں نے طبقاتی کشمکش اور اشتراکیت پر کتابیں پڑھیں اور دھیرے دھیرے ٹریڈ یونین لیڈر بن گیا۔ 1949 میں ہندستان آیا اور 1950 میں اپٹا جوائن کیا۔ ممبئی لگ بھگ تیس چالیس سال تک میں ٹیلرنگ کے پیشے سے وابستہ رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈرامے بھی چلتے رہے۔

سوال: سجاد ظہیر سے آپ کا بے حد قریبی تعلق رہا ہے۔ ان کے بارے میں ہمیں کچھ بتایئے؟

جواب: آزادی سے دو ایک مہینے پہلے کی بات ہ، مہاجرین کا آنا جانا جاری تھا۔ میں اس وقت ٹریڈ یونینوں میں کام کرتا تھا اور کراچی میں پارٹی کا سکریٹری تھا۔ کامریڈ سجاد ظہیر کا نام تو میں نے سنا ہوا تھا لیکن کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ سنا تھا بڑے اچھے کامریڈ اور شریف انسان ہیں۔ چھوٹے بڑے پارٹی ممبروں سے برابر کا سلوک کرتے ہیں، ان کی باتیں توجہ سے سنتے ہیں اور ان سے صلاح و مشورہ بھی کرتے ہیں۔ اور بڑی بات یہ کہ اچھے ادیب اور ثقافتی قائد ہیں۔ انھی خوبیوں کی وجہ سے غائبانہ طور سے میرا کھنچاؤ ان کی طرف ہو گیا اور ملنے کو جی چاہتا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد کامریڈ سجاد ظہیر پاکستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین قائم کرنے کے لیے کراچی آئے۔ میرے ہی گھر میں ٹھہرے۔ سونے سے پہلے میری کتابوں میں سے ڈھونڈ کر مارکسزم پر لکھی گئی کتابیں پڑھتے تھے۔ میں نے جب پوچھا کہ آپ دیر تک کیوں پڑھتے ہیں اور وہ بھی اتنی بھاری بھرکم مارکسزم کی کتابیں، تو جواب ملا" سپنے اچھے آتے ہیں"۔ اب تو بنے بھائی کے انتقال کو بھی کافی عرصہ ہو گیا ہے لیکن وہ اب بھی یاد آتے ہیں۔ آج ان کی زیادہ ضرورت ہے، نہ صرف ثقافتی سرگرمیوں کے لیے بلکہ پارٹی کے لیے بھی۔

سوال: فلموں میں آپ کو کیسے کام ملا؟

جواب: فلم والوں نے میرے ڈرامے دیکھے اور میرے کام کو پسند کیا۔ ''شاگرد'' میری پہلی فلم تھی جس میں میں نے سائرہ بانو کے باپ کا کردار نبھایا۔ ''گڈی'' میں ایکٹر کے طور پر میری شناخت بنی اور مجھے کیریکٹر ایکٹر کے طور پر پسند کیا جانے لگا۔ میں نے تقریباً ڈھائی سو فلموں اور پچاس، ساٹھ ڈراموں میں کام کیا۔ ایک دو انگلش فلمیں بھی کیں۔ ''ماؤنٹ بیٹن دی لاسٹ وائسرائے'' میں سردار پٹیل کا اور ''ہری اوم'' میں حویلی کی دیکھ بھال کرنے والے ایک سو سال کے بوڑھے کا رول کیا۔

سوال: آپ کو اپنی کس فلم کا رول زیادہ پسند ہے؟

جواب: ''شعلے'' میں امام صاحب کا رول میرا یادگار رول ہے۔ اس کے علاوہ نمک حرام، ارجن، کورا کاغذ، باورچی، شرارت اور لگان کے رول بھی مجھے پسند ہیں۔

سوال: آج کل فلموں میں فحاشی عام ہے، اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: فحاشی اور عریانیت نتیجہ ہے کمرشیلائزیشن کا۔ آج پیسہ کمانے کے لیے لوگ کچھ بھی کر گزرنے کے لیے تیار ہیں۔ فلم ہی نہیں ہر جگہ یہی حال ہے۔ آج کی فلموں میں جسم تو ہے لیکن روح نہیں ہے۔ آج کا ہیرو صرف Muscle کی نمائش کرتا ہے اور اکثر ہیروئنیں بدن کی نمائش پر زیادہ زور دیتی ہیں، اداکاری پر کم۔ اس کے لیے ہمارا معاشرہ بھی بہت حد تک ذمے دار ہے۔ لوگ ایسی فلموں کو دیکھنا بند کر دیں تو فحاشی اور عریانیت خود بخود کم ہو جائے گی۔

سوال: موجودہ دور میں جب ہر جگہ ٹیلی ویژن اور فلم کا بول بالا ہے، کیا اس صورت حال میں تھیٹر کا وجود خطرے میں نہیں ہے؟

جواب: تھیٹر اور نوٹنکیاں کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ فلم اور ٹی۔ وی سے ان کی مقبولیت میں کچھ کمی ضرور آئی ہے لیکن سماج میں ان کی جڑیں بہت گہری ہیں اور یہ کبھی ختم نہیں ہوں گی۔

سوال: آپ کے سپنوں کا ہندستان کیسا ہونا چاہیے؟

جواب: میں ایک ایسے سماج کا آرزومند ہوں جس میں ظلم، استحصال، بدعنوانی اور ذات پات کا بھید بھاؤ نہ ہو، ہر طرف معاشی آسودگی ہو سب کو اظہار رائے کی آزادی ہو، تمام لوگوں کو

اے۔ کے۔ ہنگل سے گفتگو

جناب اے۔ کے۔ ہنگل فلم اور تھیٹر کی مشہور و معروف شخصیت ہیں۔ فلم ''شعلے'' میں امام صاحب کا یادگار کردار ادا کرنے والے ہنگل صاحب کی پیدائش 1916 میں سیالکوٹ میں ہوئی۔ آپ اب تک 250 فلموں اور تقریباً 60 ڈراموں میں کام کر چکے ہیں۔ ہنگل صاحب انڈین پیپل تھیٹر ایسوسی ایشن کے کل ہند صدر ہیں اور آج بھی فلم اور تھیٹر سے گہرے طور پر وابستہ ہیں۔ گذشتہ دنوں ہنگل صاحب کونسل کی طرف سے منعقدہ سمینار ''ہندستانی مشترکہ کلچر کی تعمیر: سجاد ظہیر اور دوسرے ترقی پسند ادیبوں کی خدمات'' میں حصہ لینے دہلی آئے۔ اس موقعے پر ان سے ہوئی بات چیت کے اہم اقتباسات قارئین کی نذر ہیں۔

سوال: آپ تھیٹر سے کیسے وابستہ ہوئے؟

جواب: مجھے گانے بجانے کا شوق شروع سے ہی تھا۔ پیشاور میں میرے والد صاحب نوکری کرتے تھے۔ چنانچہ میری میٹرک تک کی تعلیم وہیں ہوئی۔ اور پیشاور کے فنکاروں سے ڈھیرے

دھیرے میرے تعلقات قائم ہو گئے میں وہاں کی ''ہارمونیکا کلب'' میں شامل ہو گیا۔ وہاں مجھے بیگم اختر کے والد خاں صاحب عاشق علی خاں کے ساتھ ہارمونیم پر سنگت کرنے کا موقع ملا۔ یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات تھی۔ پھر میں تھیٹر کی طرف مائل ہوا اور اسٹیج کے علاوہ ریڈیو پر بھی ڈرامے پیش کرنے لگا۔ آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ 16 اگست 1947 کو میں نے پاکستان ریڈیو سے ''بکس'' کے عنوان سے ڈراما پیش کیا۔

سوال: آپ جب سنِ شعور کو پہنچے وہ زمانہ بے حد افراتفری اور آویزش کا تا۔ ایک طرف ہندستان میں آزادی کی تحریک شباب پر تھی، دوسری طرف دنیا دوسری عالمی جنگ کے دہانے پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس دور کے متعلق کچھ بتائیے؟

جواب: اس زمانے میں پورے ملک میں آزادی کی لہر چل رہی تھی۔ ہمارے یہاں کانگریس کی باگ ڈور سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں کے ہاتھ میں تھی۔ اس زمانے میں لال کُرتی پارٹی کی قیادت میں کسان اور مزدور بھی ملک کی آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ میں بھی اس سے متاثر تھا۔ کچھ دنوں بعد میرے ہیڈ ماسٹر علامہ مشرقی نے ''بیلچہ پارٹی'' قائم کی تو میں اس کا سرگرم کارکن بن گیا۔ اس پارٹی کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ عدم تشدد اس کا بنیادی اصول تھا۔ سارا سرحدی علاقہ اس کے زیر اثر آ گیا۔ گاندھی جی اور سرحدی گاندھی کی گرفتاری کے بعد پیشاور میں عظیم الشان جلوس نکلا۔ میں بھی اسکول سے بھاگ کر اس میں شریک ہوا۔ کابلی دروازے سے باہر قصہ خوانی بازار میں انگریز افسر نے گڑھوالی رجمنٹ کو مظاہرین پر گولی چلانے کا حکم دیا لیکن سپاہیوں نے نہتھے لوگوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ پھر برٹش آرمی بلائی گئی۔ بہت سے لوگ مارے گئے۔ میں کسی طرح بچ نکلا۔ بھگت سنگھ کی پھانسی کے بعد پیشاور میں تعزیتی میٹنگ ہوئی جس میں ہزاروں سوگواروں نے شرکت کی، سارے لوگ رو رہے تھے۔ عبدالرب نشتر نے اس میٹنگ کی صدارت کی تھی۔

سوال: آپ اشتراکیت کی جانب کیسے مائل ہوئے؟

جواب: میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد والد صاحب نے سرکاری نوکری کرنے کے لیے کہا لیکن میں نے انگریزوں کی نوکری کرنے سے انکار کر دیا۔ انگریز افسر کی سفارش کے باوجود میں نے نوکری جوائن نہیں کی۔ میں نے ٹیلرنگ کا کام شروع کر دیا اور کچھ ہی دنوں میں ایک ماہر Cutter بن گیا۔ والد صاحب کے ریٹائرمنٹ کے بعد میں کراچی آ گیا۔ کراچی میں نوکری کے دوران مجھے مالک اور مزدور کی کشمکش کا ذاتی تجربہ ہوا۔ اس سے میں اشتراکی نظریے کی طرف مائل ہوا۔ میں نے طبقاتی کشمکش اور اشتراکیت پر کتابیں پڑھیں اور دھیرے دھیرے ٹریڈ یونین لیڈر بن گیا۔ 1949 میں ہندستان آیا اور 1950 میں اپٹا جوائن کیا۔ ممبئی لگ بھگ تیس چالیس سال تک میں ٹیلرنگ کے پیشے سے وابستہ رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈرامے بھی چلتے رہے۔

سوال: سجاد ظہیر سے آپ کا بے حد قریبی تعلق رہا ہے۔ ان کے بارے میں ہمیں کچھ بتایئے؟

جواب: آزادی سے دو ایک مہینے پہلے کی بات ہ، مہاجرین کا آنا جانا جاری تھا۔ میں اس وقت ٹریڈ یونینوں میں کام کرتا تھا اور کراچی میں پارٹی کا سکریٹری تھا۔ کامریڈ سجاد ظہیر کا نام تو میں نے سنا ہوا تھا لیکن کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ سنا تھا بڑے اچھے کامریڈ اور شریف انسان ہیں۔ چھوٹے بڑے پارٹی ممبروں سے برابر کا سلوک کرتے ہیں، ان کی باتیں توجہ سے سنتے ہیں اور ان سے صلاح و مشورہ بھی کرتے ہیں۔ اور بڑی بات یہ کہ اچھے ادیب اور ثقافتی قائد ہیں۔ انھی خوبیوں کی وجہ سے غائبانہ طور سے میرا کھنچاؤ ان کی طرف ہو گیا اور ملنے کو جی چاہتا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد کامریڈ سجاد ظہیر پاکستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین قائم کرنے کے لیے کراچی آئے۔ میرے ہی گھر میں ٹھہرے۔ سونے سے پہلے میری کتابوں میں سے ڈھونڈ کر مارکسزم پر لکھی گئی کتابیں پڑھتے تھے۔ میں نے جب پوچھا کہ آپ دیر تک کیوں پڑھتے ہیں اور وہ بھی اتنی بھاری بھرکم مارکسزم کی کتابیں، تو جواب ملا" سپنے اچھے آتے ہیں"۔ اب تو بنے بھائی کے انتقال کو بھی کافی عرصہ ہو گیا ہے لیکن وہ اب بھی یاد آتے ہیں۔ آج ان کی زیادہ ضرورت ہے، نہ صرف ثقافتی سرگرمیوں کے لیے بلکہ پارٹی کے لیے بھی۔

سوال: فلموں میں آپ کو کیسے کام ملا؟

جواب: فلم والوں نے میرے ڈرامے دیکھے اور میرے کام کو پسند کیا۔ ''شاگرد'' میری پہلی فلم تھی جس میں میں نے سائرہ بانو کے باپ کا کردار نبھایا۔ ''گڈی'' میں ایکٹر کے طور پر میری شناخت بنی اور مجھے کیریکٹر ایکٹر کے طور پر پسند کیا جانے لگا۔ میں نے تقریباً ڈھائی سو فلموں اور پچاس، ساٹھ ڈراموں میں کام کیا۔ ایک دو انگلش فلمیں بھی کیں۔ ''ماؤنٹ بیٹن دی لاسٹ وائسرائے'' میں سردار پٹیل کا اور ''ہری اوم'' میں حویلی کی دیکھ بھال کرنے والے ایک سو سال کے بوڑھے کا رول کیا۔

سوال: آپ کو اپنی کس فلم کا رول زیادہ پسند ہے؟

جواب: ''شعلے'' میں امام صاحب کا رول میرا یادگار رول ہے۔ اس کے علاوہ نمک حرام، ارجن، کورا کاغذ، باورچی، شرارت اور لگان کے رول بھی مجھے پسند ہیں۔

سوال: آج کل فلموں میں فحاشی عام ہے، اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: فحاشی اور عریانیت نتیجہ ہے کمرشیلائزیشن کا۔ آج پیسہ کمانے کے لیے لوگ کچھ بھی کر گزرنے کے لیے تیار ہیں۔ فلم ہی نہیں ہر جگہ یہی حال ہے۔ آج کی فلموں میں جسم تو ہے لیکن روح نہیں ہے۔ آج کا ہیرو صرف Muscle کی نمائش کرتا ہے اور اکثر ہیروئنیں بدن کی نمائش پر زیادہ زور دیتی ہیں، اداکاری پر کم۔ اس کے لیے ہمارا معاشرہ بھی بہت حد تک ذمے دار ہے۔ لوگ ایسی فلموں کو دیکھنا بند کر دیں تو فحاشی اور عریانیت خود بخود کم ہو جائے گی۔

سوال: موجودہ دور میں جب ہر جگہ ٹیلی ویژن اور فلم کا بول بالا ہے، کیا اس صورت حال میں تھیٹر کا وجود خطرے میں نہیں ہے؟

جواب: تھیٹر اور نوٹنکیاں کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ فلم اور ٹی۔وی سے ان کی مقبولیت میں کچھ کمی ضرور آئی ہے لیکن سماج میں ان کی جڑیں بہت گہری ہیں اور یہ کبھی ختم نہیں ہوں گی۔

سوال: آپ کے سپنوں کا ہندستان کیسا ہونا چاہیے؟

جواب: میں ایک ایسے سماج کا آرزومند ہوں جس میں ظلم، استحصال، بدعنوانی اور ذات پات کا بھید بھاؤ نہ ہو، ہر طرف معاشی آسودگی ہو سب کو اظہار رائے کی آزادی ہو، تمام لوگوں کو

روٹی، کپڑا اور مکان ملے۔ مذہبی آزادی ہو لیکن اسے سیاسی مفاد کے لیے استعمال کرنے کی آزادی نہ ہو۔

سوال: ''اردو دنیا'' کے قارئین کو آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

جواب: عام فہم اردو لکھیے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیجیے۔ ہندی فلمیں جنوبی ہند میں بھی مقبول ہیں کیونکہ ان کی زبان بے حد آسان ہے۔

•••

غلام علی سے گفتگو

غلام علی کا شمار عصر حاضر کے صف اول کے غزل گائکوں میں ہوتا ہے۔ ان کی گائی ہوئی غزلیں نہ صرف برصغیر بلکہ جہاں بھی اردو کے شیدائی ہیں، سنی اور پسند کی جاتی ہیں۔ اردو کے بعض بڑے شاعروں کی شہرت میں غلام علی کی غزل گائکی کا اہم کردار ہے مثلاً احمد فراز کی اولین شہرت غلام علی مرہون منت ہے جو کی ابتدا کی غزل (محبتیں) ہی ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ" سے کوئی تقریباً تیس برس پہلے ہوی۔ غلام علی کی گائی ہوئی غزل "چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے" جسے بی آر چوپڑہ کی فلم "نکاح" میں شامل کیا گیا، آج بھی لوگوں کے ذہن میں تازہ ہے۔ غلام علی نے ایسی لاتعداد لازوال غزلیں گائی ہیں جن میں "دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی"، "ہم کو کس کے غم نے مارا"، "ہنگامہ ہے کیوں برپا"، "پتہ پتہ بوٹا"، "دل، یہ پاگل دل مرا"، "اپنی دھن میں رہتا ہوں"، "کل چودھویں کی رات تھی" اور "آج دل سے دعا کرے کوئی" وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ گذشتہ دنوں وہ ہندوستان تشریف لے آئے۔ پیش خدمت ہے اس موقعے پر ان سے کی گئی گفتگو کے اہم اقتباسات۔

سوال: آپ 26 سال سے ہندوستان آ رہے ہیں۔ کیا آپ کو ملک میں کوئی تبدیلی محسوس ہوتی ہے؟

جواب: میرا خیال ہے کہ میں اب بھی سیکھ رہا ہوں۔ میں پوری دنیا میں گھوما ہوں لیکن ہندوستان کے لیے میرے دل میں ایک نرم گوشہ ہے۔ میری رائے میں ہندوستان میں بہت زیادہ تبدیلی نہیں آئی ہے۔

سوال: گذشتہ برسوں میں ہندو پاک رشتوں میں جو تبدیلی آئی ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: ہاں، دونوں ممالک کے رشتے خوشگوار ہوئے ہیں، اختلافات ختم ہو رہے ہیں۔ چہرے، خورد و نوش، زبان عادتیں، مزاج اور ماحول ہر اعتبار سے دونوں ممالک میں تبدیلیوں کا انداز یکساں ہے۔ اب بس سُر ملنے چاہئیں۔

سوال: ہندوستان سے اتنی طویل وابستگی سے متعلق کوئی خصوصی واقعہ جو آپ کے لیے یادگار ہو؟

جواب: ایک بار میں پروگرام پیش کر رہا تھا، میں نے دیکھا کہ پنڈت بھیم سین جوشی سامعین کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ میرے جیسے نوآموز کو سننے کیوں چلے آئے۔ پنڈت جی نے مجھ سے کہا کہ میری بیوی سے پوچھیے کہ ان کا پسندیدہ فنکار کون ہے۔ نام جان کر مجھے بہت اچھا لگا اور اس سے بھی اچھا اس وقت لگا جب پنڈت جی نے اپنے ہاتھوں سے مجھے شال پیش کی اور مجھ پر اپنا پیار نچھاور کیا۔ اس سے زیادہ مجھے اور کیا چاہیے۔

سوال: جب آپ اسٹیج پر پروگرام پیش کر رہے ہوتے ہیں تو کن باتوں کا خیال رکھتے ہیں؟

جواب: میں سامعین کو مدنظر رکھتا ہوں۔ میں سامعین کے چہرے پڑھ لیتا ہوں اور ان کی پسند کے مطابق غزلیں گاتا ہوں۔ میں انھیں ایسی چیزیں نہیں سناتا جو وہ سمجھ ہی نہیں سکیں۔

سوال: آپ کے پروگراموں میں نوجوانوں کی شرکت کیسی رہتی ہے؟

جواب: میرے حالیہ پروگراموں میں زیادہ سے زیادہ نوجوانوں نے شرکت کی اور میری پذیرائی کی لیکن میرا خیال ہے کہ انھیں اپنے بزرگوں کے بنائے ہوئے اصولوں پر عمل کرنا چاہیے اور اپنی اعلیٰ قدروں کی پاسداری کرنی چاہیے۔

•••

پروفیسر اختر الواسع سے گفتگو

سائل: سب سے پہلے تو آپ کو حکومت ہند کا اتنا بڑا ایوارڈ ملنے پر ڈھیر ساری مبارکباد!

مسئول: بہت بہت شکریہ!

سوال: اتنا بڑا ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟

جواب: ہر اعزاز آپ کے لیے فرط وانبساط کا باعث ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ فرط وانبساط ایک احساس ذمے داری کا موجب بنتا ہے۔ آپ کو یہ احساس ہوتا ہے کہ لوگ آپ کے کام اور آپ کی محنت کو دیکھ رہے ہیں۔ اس لیے آپ کا رویہ اور بھی ذمے دارانہ ہونا چاہیے۔ آپ سے بہتر رویوں کی توقعات کی جاتی ہے اس لیے آپ ان پر کھرے اتریں کیونکہ ہر ایوارڈ آپ کو منکسر المزاج نہیں بناتا ہے۔

سوال: آپ ایک ایسی شخصیت کے طور پر جانے جاتے ہیں جس نے ادب وزبان، اسلامیات، سماجی خدمات وغیرہ کے شعبے میں کافی کام کیا ہے۔ اس ایوارڈ کے بعد اور مستقبل میں آپ کے کیا عزائم ہیں؟

جواب: ایک معمولی انسان جو کہ ایک نچلے اور متوسط گھرانے میں پیدا ہوا۔ علی گڑھ شہر، دہلی گیٹ

علاقہ کی بود و باش میرے وجود میں بسی ہوئی ہے۔ اللہ کا شکر گزار ہوں اور اس کا فضل ہے کہ اس نے ایک ایسے گھرانے میں پیدا کیا، تعلیم و تربیت ایک ایسے گھرانے میں کی کہ میں کسی قابل بن سکا۔ میں آج بھی اپنے کام سے مطمئن نہیں، مجھے سماج کی خدمت کرنے کا موقع ملا لیکن حق ادا نہیں کر پایا، لیکن بہر حال جو بھی جیسا بھی اور جس طرح بھی ممکن ہو سکا وہ میں نے کرنے کی کوشش کی اور اس بات کی کوشش کی کہ کسی کو بے وجہ مجھ سے شکایت نہ ہو اور مجھے شرمندگی نہ ہو۔ جہاں تک اردو زبان سے میرا معاملہ ہے وہ مجھے اپنے ماں کے دودھ کے ساتھ ورثہ میں ملی ہے۔ میرے نطق کی ہر صدا میری ماں کی عطا ہے، جہاں تک اسلامیات کا تعلق ہے وہ میرے لیے عقیدہ کا معاملہ نہیں بلکہ وجہ نام و افتخار ہے۔ تیسرے مجھے اپنے رب کا اس لیے بھی شکر ادا کرتے رہنا چاہیے کہ اس نے مجھے ہندوستان جیسے جنت نشان ملک میں پیدا کیا۔ وہ سرزمین جو جنت سے نکالے گئے آدم کا پہلا مسکن بنی، جہاں سے میر عرب کو ٹھنڈی ہوائیں آتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ امیر خسرو اور اقبال نے جس کی عظمت کے ترانے گائے اور وارفتگیِ شوق میں حالی تو یہاں تک کہہ بیٹھے کہ تیری ایک مشت خاک کے بدلے، لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے۔

سوال: آپ کو اس سے قبل بھی سر سید احمد خاں ایوارڈ، محمد علی جوہر ایوارڈ ملے ہیں اور فل برائٹ فیلوشپ سے بھی نوازا گیا ہے۔ آپ کی اس کامیابی کا راز کیا ہے؟

جواب: اصل میں تعریف داتا کی ہونی چاہیے۔ دینے والوں کا کمال ہے۔ ہر ایوارڈ آپ میں عاجزی انکساری پیدا کرے اور خوب سے خوب کرنے کی جستجو آپ میں پیدا کرے اس لیے کوئی بھی منصب ہو، اعزاز ہو وہ آپ کو گمراہ نہ ہونے دے۔

خواب تو دیکھے ہیں اور دیکھتے ہیں یا تو مجھے سلیقہ نہیں یا موقع نہیں ہے۔ جو کچھ ہوا ہے زندگی میں وہ صرف اور صرف میرے رب کا فضل ہے۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ صراطِ مستقیم پر گامزن رکھے اور خدمت خلق سے غافل نہ ہونے دے۔

سوال: آپ قومی اردو کونسل کے رکن ہونے کے ساتھ ہی دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین بھی ہیں۔ ایک ساتھ دو دو اہم ذمے داریاں نبھاتے ہوئے آپ کیسا محسوس کرتے ہیں؟

دونوں اداروں کے کام کاج تھوڑے مختلف ہیں اس لیے اس سوال کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

جواب: دہلی کی وزیراعلیٰ محترمہ شیلا دکشت کا شکر گزار ہوں جنھوں نے مجھے لگاتار دوسری مرتبہ دہلی اردو اکادمی کا وائس چیئرمین نامزد کرایا۔ مجھے اس بات پر ہمیشہ فخر رہے گا کہ انھوں نے مجھ پر غیر معمولی طور پر اعتماد کیا اور اب تک دوسری مرتبہ کسی کو اس منصب کے لیے نامزد نہیں کیا تھا مگر یہ عزت میرے حصے میں آئی۔ اکادمی انتہائی سرگرم اور فعال اردو اکادمی ہے جس نے زبان، ادب، تہذیب، ثقافت اور تعلیم تمام میدانوں میں غیر معمولی کام کیا ہے۔ کلاسیکی اور نیم کلاسیکی ہمارا لٹریچر تھا اس کی از سر نو اشاعت کے ذریعے پرانی دہلی کی بازیافت کا کام بھی اس اکادمی نے کیا اور ہمیں خوشی ہے کہ جب سے مجھے اپنے رفقا اور کارکنانِ اکادمی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ لال قلعے کے میدان میں اردو وراثت میلے کا انعقاد ایک غیر معمولی کوشش ہے اس کے علاوہ کوشش رہی کہ اکادمی اردو والوں کے پاس جائے اور ان کی توقعات پر پوری اترنے کی کوشش کرے۔ تیسرے یہ کہ یہ اکادمی جب دہلی اردو اکادمی ہے تو واقعی دہلی والوں کی اکادمی لگے اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں کہ ہم بڑی حد تک اس احساس کو پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

جہاں تک قومی اردو کونسل کا سوال ہے مجھے ارجن سنگھ صاحب کے زمانے سے اس ادارے سے وابستگی کا موقعہ ملا اور بعد ازاں محترم کپل سبل صاحب نے مجھے اس کی گورننگ کونسل اور ایگزیکیوٹیو بورڈ دونوں میں جگہ دی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا امتیاز و اختصاص یہ ہے کہ اس ادارے نے محض کتابوں کی طباعت اور اصطلاحات سازی کا کام نہیں کیا، محض فرہنگ اور لغات کی ترتیب میں دلچسپی نہیں دکھائی بلکہ جس طرح کمپیوٹر لٹریسی کو اردو کے ساتھ جوڑا اور تقریباً ایک دہائی سے زیادہ قبل آنے والے زمانوں کا ادراک کر کے ہماری نئی نسل اور اردو والوں کی نئی نسل کو کمپیوٹر سے جوڑ دیا اس کے نتیجے میں ہزاروں لڑکے لڑکیاں نہ صرف برسرِ روزگار ہو سکے بلکہ طباعت کی دنیا میں ایک نیا انقلاب آ گیا۔ جن لوگوں کو ڈر تھا کہ خطاطی کا فن معدوم ہو جائے گا انھوں نے دیکھا کہ خطاطی کو گرافکس کے نام سے ایک نئی زندگی مل گئی۔ اسی طرح قومی اردو کونسل کے اس پروگرام کے نتیجے میں اردو

صحافت نئے امکانات سے نہ صرف اپنے کو ہم آہنگ کر پائی بلکہ آج وہ کسی بھی دوسری زبان کی اگر ہمسری کر رہی ہے تو اس میں اس پروگرام کا بڑا دخل ہے، یہاں ایک بات کی طرف اور بھی اشارہ کرتا ہوں گو کہ یہ قصہ قومی کونسل پیش رو ادارے ترقی اردو بورڈ کا ہے۔ جب شری راجیو گاندھی کی ذاتی دلچسپی سے دنیا میں پہلا اردو ٹیلی پرنٹر ہندوستان میں بنایا گیا۔ ادھر ہمیں خوشی ہے کہ کونسل نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ادھر اس نے اپنی کتابوں کو ڈیجیٹلائز کیا ہے آن لائن اردو پروگرام کے ذریعے اردو زبان سکھانے کا جو کورس شروع کیا ہے جس میں تلفظ، املا، سب کا خصوصی خیال رکھا گیا ہے۔ وہ صرف بول چال کی اردو کے فروغ کے لیے نہیں بلکہ رسم الخط کی بقا اور ترویج کا بھی موجد ہے۔ اس کے علاوہ جس طرح اب گوگل سے اردو کو جوڑنے کی کوشش ہو رہی ہے، سرچ انجن سے اردو کے ربط وضبط کے لیے کام ہو رہا ہے۔ وکی پیڈیا کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے منصوبہ بندی ہو رہی ہے۔ advertising کی دنیا میں اردو والوں کے لیے موجود غیر معمولی امکانات کے تحت ان کی تربیت کے لیے جو سوچ وچار ہو رہا ہے اس کے لیے بجا طور پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اس کے ذمے دار اور کارکنان سب بجا طور پر ہماری مبارک باد اور شکریہ، دونوں کے مستحق ہیں۔ ایک آخری بات جو بہت ضروری ہے کہ دہلی کی اردو اکادمی ہو یا قومی اردو کونسل۔ یہ دونوں وہ ادارے ہیں جہاں جو کچھ حکومت دیتی ہے وہ تمام بجٹ پوری طرح ختم ہو جاتا ہے اور حکومتوں سے مزید کا مطالبہ جاری رہتا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اگر آپ کام کریں اور اچھا کام کریں تو وسائل رکاوٹ نہیں ہیں:

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے

سوال: اردو زبان وادب کی ترقی کے لیے آپ کے پاس کیا لائحۂ عمل ہے؟

جواب: زبانیں نہ تو کسی ایک فرد کے سہارے زندہ رہتی ہیں اور نہ کسی ایک حکومت کے۔ زبانیں زندہ رہتی ہیں اپنے بولنے والوں کے دم پر۔ اور جمہوریت میں تو عوام کی طاقت ہی سب کچھ ہے۔ آپ آج کی بات مت کیجیے آج تو سلطانیِ جمہور کا زمانہ ہے آپ کبھی پیچھے مڑ کر دیکھیے اس ملک میں آٹھ سو سال جو مسلمانوں کی حکمرانی رہی ہے اس میں دو سو سال فارسی

کی حکمرانی رہی پھر کیا وجہ تھی کہ اردو ایک دم فارسی کو بے دخل کر کے قلعہ معلیٰ کی سرکاری زبان بن گئی۔ یہ بازار کی قوتیں اور عوامی دباؤ تھا کہ جس نے ظل الہی کو عام لوگوں کی خواہشات کے آگے سر جھکانے پر مجبور کر دیا۔ اگر کل یہ ممکن ہوسکتا ہے تو آج کیوں نہیں؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ اپنے بچوں کو اردو میڈیم اسکولوں میں تعلیم کیوں نہیں دلاتے۔ اگر دلائیں تو بہت اچھی بات ہے۔ لیکن اگر ایسا نہیں کر سکتے تو کم سے کم انھیں بحیثیت مضمون تو اردو پڑھوا سکتے ہیں؟ اگر وہ ایسے اسکول میں پڑھتے ہیں جہاں اردو بحیثیت مضمون بھی نہیں پڑھائی جاتی تو اپنے گھر پر ان کے لیے اردو کی تعلیم کا معقول انتظام کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمیں اسکول میں داخل اس وقت کرایا گیا جب گھر پر مولوی اسماعیل کی پانچوں کتابیں پڑھوا دی گئیں اور تختی پر لکھنا سکھا دیا گیا۔ پھر کیا آپ اردو کی کتاب اور اخبار خریدتے ہیں کیا صارفین کی حیثیت سے آپ بازار پر ایسا دباؤ بنانے کی کوشش کرتے ہیں جن کے اشتہار اردو میں بھی شائع ہوتے ہیں۔ یہی ساری چیزیں ہیں جن پر اردو کا مستقبل منحصر ہے۔

سوال: دہلی میں اردو تعلیم کی صورت حال پر روشنی ڈالیں؟ اسکولوں میں اردو تعلیم کو کس طرح ضروری بنایا جا سکتا ہے؟

جواب: دہلی میں اردو تعلیم کا منظر نامہ اطمینان بخش نہیں۔ سرکار کی عدم توجہی اور بعض سرکاری ایجنسیوں کا اردو مخالف رویہ اس کے لیے بڑی حد تک ذمے دار ہے۔ مثال کے طور پر اردو میڈیم اسکولوں میں اردو میڈیم ٹیچرز کا نہ ہونا اور اردو میڈیم اسکولوں میں ایسے پرنسپل ہونا جو اردو جانتے ہی نہیں۔ این سی ای آر ٹی کے ذریعے وقت پر اردو کی کتابیں فراہم نہ کرانا، سی بی ایس سی کے ذریعے ہونے والے ٹیسٹوں اور امتحانوں میں اردو والوں کے لیے بھی اردو میں پرچہ نہ آنا یہ ساری پریشانیاں ہیں لیکن ان کے لیے جدو جہد بھی مستقلاً جاری ہے۔ سرو شکشا ابھیان کے تحت محترمہ شیلا دیکشت کے حکم پر سو کے قریب اسامیاں تشہیر ہوئیں اور ان پر تقرری کا عمل جاری ہے۔

سوال: اقلیتوں کی تعلیم کے لیے بنائی گئی مانیٹرنگ کمیٹی کے آپ سربراہ ہیں۔ اس سمت میں کیا پیش رفت ہو رہی ہے؟ ہمیں اس حوالے سے جانکاری دیں؟

جواب: یہ جو کمیٹی ہے اس میں اردو زبان کے فروغ ، انگریزی کی استعداد میں اضافہ کر کے مسابقت کے لیے اقلیتوں کو تیار کرنے سے متعلق مجھے سربراہ بنایا گیا ہے اور اس کی رپورٹ بہت جلد وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے وزیر اور چیئرمین کو پیش کر دیں گے۔ میرا ماننا ہے کہ آرٹی آئی اور آرٹی ای دو ایسے بڑے ہتھیار ہیں جن کے ذریعے آپ اپنی راہ میں آنے والی تمام مشکلات کا سدباب کر سکتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا آپ اس کے لیے تیار ہیں؟ ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ قرآن کریم میں خدا بزرگ و برتر نے اس بات کو واضح کر دیا کہ ''وہ (خدا) بھی ان کی حالت نہیں بدلتا جنھیں خود اپنی حالت بدلنے کا خیال نہیں ہوتا۔'' تو جو کام خدا نہیں کرتا اس کی توقع سرکار سے کیوں کرتے ہیں؟ پہلے خود کو تیار کیجیے پھر دوسروں سے توقع کیجیے۔

سوال: اردو دنیا میگزین اور اس کے ٹیلی ایڈیشن پر آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: میں سمجھتا ہوں کہ دیدہ زیب ہونا میگزین اور ٹیلی ویژن پروگرام دونوں کے لیے ضروری ہے لیکن اصل رنگوں میں حسن دوبالا جب بھی ہوتا ہے جب ان کے اندر کوئی معنویت ہو۔ اصل میں جو اردو دنیا کا ٹی وی پروگرام ہے، رسالہ ہے ایک تو یہ کہ تنوع ہے، معلومات افزا ہے، صرف کونسل کی تشہیر نہیں بلکہ دوسری انجمنیں، تنظیمیں اردو کی، اردو زبان و ادب، تہذیب اور فنون لطیفہ کے حوالے سے بھی ہمیں واقفیت ہوتی ہے اور یہ کام میگزین بھی بہت اچھی طرح سے کر رہا ہے اور ٹی وی پروگرام کے ذریعے بھی۔ ایک بڑی بات یہ ہو رہی ہے کہ ای ٹی وی کی رینج غیر معمولی ہے۔ اردو کی نئی آبادیوں تک اس کی رسائی ہے۔ ایک بڑے حلقے تک نہ صرف قومی کونسل بلکہ ہندوستان بھر میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ دونوں کو پتہ چل رہا ہے۔

ملاقاتی: اردو دنیا سے بات چیت کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ!

مسئول: بہت شکریہ!

استفسار کی راہ سے حاصل شدہ براہ راست معلومات یا علم و آگہی کا حصول انٹرویو کہلاتا ہے۔ یہ کسی مسئلہ، موضوع یا معاملہ میں اس مخصوص شعبے سے متعلق فرد یا شخصیت کے تجربات، مشاہدات اور خیالات سے آشنائی کے فن کا نام ہے، جو مزاجاً محض معلومات کے اکٹھا کرنے جیسی تکنیک سے بالکل مختلف ہے۔ معلومات کے موجودہ عہد میں انٹرویو کی صنفی حیثیت دو چند ہوئی ہے۔ خاص طور پر میڈیا اور ذرائع ابلاغ کے شعبے میں اس کی معنویت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ 'ملاقاتیں' انٹرویو کا مجموعہ ہے، جو وقتاً فوقتاً یا بسا اوقات تسلسل کے ساتھ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ماہنامہ ترجمان 'اردو دنیا' میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ علمی اور ادبی اعتبار سے ان کی حیثیت دستاویزی ہے۔

اس کتاب کے مرتب پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین فی الوقت جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ صحافت بطور خاص اردو زبان کو جدید میڈیا سے جوڑنے میں موصوف کا نمایاں کردار ہے۔ اردو میڈیا اور اردو کے نئے تکنیکی وسائل اور امکانات کے علاوہ تعارف و تنقید، اردو کی شعری اصناف، اسلامی تاریخ کے اہم شہر (ترجمہ)، اردو سفرناموں میں ہندستانی تہذیب و ثقافت اور نوائے آزاد (فارسی شاعری) جیسی کتب ان کی ہمہ جہت علمی فعالیت کا ثبوت ہیں۔

ISBN: 978-93-5160-074-9
9 789351 600749
NCPUL
New Delhi
₹ 241

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی ـ 110025